محمد سلمان منصورپوری
مدرسہ شاہی، مرادآباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دعوتِ فکر و عمل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّنْ دَعَآ إِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحاً. (حم السجدة ٣٣)

دعوت فکر وعمل

عصر حاضر کے سلگتے ہوئے دعوتی، اصلاحی، اور سماجی موضوعات پر پُرسوز اور فکر انگیز تحریروں کا قیمتی مجموعہ

از :

(مفتی) محمد سلمان منصورپوری

مرتب ماہنامہ ''ندائے شاہی'' مرادآباد
استاذ جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد

ناشر:

مرکز نشر وتحقیق، لال باغ مرادآباد

نام کتاب :
دعوت فکروعمل

مرتب :

(مفتی) محمد سلمان منصور پوری

مرتب ماہنامہ ''ندائے شاہی'' مراد آباد

استاذ جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد

صفحات : ۵۴۰

قیمت : ۱۵۰ / روپیہ

ناشر :

مرکز نشر وتحقیق، لالباغ مراد آباد

MARKAZ-E-NASHR-O-TAHQIQ

LALBAG.MORADABAD.U.P.

INDIA. PIN. 244001

9412635154

ملنے کے پتے :

کتب خانہ نعیمیہ جامع مسجد دیوبند

کتب خانہ یحیوی سہارنپور

فرید بکڈ پو مٹیا محل دہلی

کمپیوٹر کتابت: کمال احمد خاں سیتاپوری مدرسہ شاہی مراد آباد

محمد حمران اعظمی نعمت کمپوزنگ، دہلی

پہلی اِشاعت : (۱۱۰۰)

ذیقعدہ ۱۴۲۳ھ مطابق جنوری ۲۰۰۳ء

طباعت : نائس پریس خوریجی دہلی

سرورق : شیروانی پریس، دہلی

اللہ کی طرف دعوت

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ ○

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّنْ دَعَآ إِلَی اللّٰہِ وَعَمِلَ صَالِحاً وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ○ (سورۂ حم السجدۃ : ۳۳)

ترجمہ :

اور اس سے بہتر کس کی بات ہوسکتی ہے جو (لوگوں کو) خدا کی طرف بلائے اور (خود بھی) نیک عمل کرے، اور کہے کہ میں فرمانبرداروں میں سے ہوں۔

اِظہار شکر اور دلی دعا

از: مخدوم معظم والد مکرم

حضرت مولانا قاری سید محمد عثمان صاحب منصور پوری دامت برکاتہم

استاذ حدیث و نائب مہتمم دار العلوم دیوبند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

رسائل کے ادارتی مضامین عموماً اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، اور انھیں بڑی توجہ سے پڑھا جاتا ہے، کیونکہ ان میں وقت کے اہم مسائل پر گفتگو ہوتی ہے اور حالات کا تجزیہ کر کے قارئین کی رہنمائی کی جاتی ہے، خصوصاً جبکہ مدیر، کتاب وسنت کی روشنی میں مخاطبین کے حالات کی رعایت کرتے ہوئے، خیر خواہی و ہمدردی کے جذبہ سے دلنشیں اور مؤثر انداز میں اداریہ تحریر کرے اور بوقت ضرورت کسی اختلافی معاملہ میں متانت وسنجیدگی کے ساتھ بحث کرے۔

خداوند کریم کا بے حد فضل وکرم ہے کہ عزیزم مولوی مفتی محمد سلمان منصور پوری سلمہٗ اللہ تعالیٰ کے ادارتی مضامین (جو تیرہ سال کے اندر ''ندائے شاہی'' میں شائع ہوئے ہیں) دعوت الی اللہ کے اصول ثلاثہ (حکمت، موعظت حسنہ، مجادلۃ بالتی ہی احسن) کے مطابق ہیں۔ چنانچہ معروف اہل قلم علماء وصحافی حضرات نے اپنی تقریظات میں ان مضامین کی صحت، علمی وادبی حیثیت اور افادیت کو اجاگر فرمایا ہے جو آں عزیز کے لئے بڑی سعادت کی چیز ہے۔

دلی دعا ہے کہ خداوند قدوس مزید توفیق سے نوازے، اور تمام مسلمانوں بلکہ تمام انسانوں کو ان مضامین سے استفادہ کے مواقع میسر فرمائے، جس کے ذریعہ انکے افکار ونظریات صحیح اسلامی فکر کے سانچہ میں ڈھل جائیں، اور اعمال واحوال بھی استقامت کی اعلیٰ درجہ کی صفت سے متصف ہو جائیں۔ آمین۔

محمد عثمان منصور پوری عفی عنہ

خادم دار العلوم دیوبند

۸/ ذیقعدہ ۱۴۲۳ھ

فہرست مضامین

احساس ذمہ داری ۲۵

اسلامی عبادات اور ان کے تقاضے ۶۵

فکر اسلامی ۱۳۷

اصلاح معاشرہ ۲۴۵

بے حیائی پر نکیر ۳۴۳

مدارس اسلامیہ ۳۷۳

افکار باطلہ کی تردید ۴۰۷

پیش لفظ

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم، اما بعد!

۱۴۱۰ھ میں جب احقر جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد کی خدمتِ تدریس پر مامور ہوا تو مہتمم جامعہ حضرت مولانا رشید الدین صاحب حمیدی نور اللہ مرقدہ نے از راہ شفقت جامعہ کے ترجمان ماہنامہ ''ندائے شاہی'' کے ادارتی مضمون ''نظر وفکر'' لکھنے کی خدمت بھی احقر کے سپرد کردی، احقر اپنی کم مائیگی اور طبعی لاابالی پن کی بنا پر اس طرح کی ذمہ داری سے گریزاں تھا لیکن حکم کی تعمیل میں طوعاً و کرہاً اسے قبول کرنا پڑا، تاہم بعد میں یہ ذمہ داری احقر کے لئے خیر کا ذریعہ بن گئی، بایں طور کہ ہر مہینہ رسالہ کے تقاضے کی وجہ سے وقت پر چار و ناچار کچھ نہ کچھ لکھنا ہی پڑا، اور اس بہانے قلم سے رشتہ مضبوط ہوگیا، واقعہ یہ ہے کہ اگر رسالہ سے اس نوع کا تعلق نہ ہوتا تو احقر کے لئے طبعی سستی اور کاہلی کی وجہ سے لکھنے کا تسلسل برقرار رکھنا مشکل تھا۔

ان میں سے اکثر مضامین دیگر مصروفیات کے سبب سے زیادہ تر ایسے وقت میں لکھے گئے ہیں جب کہ کاتب نے یہ کہہ دیا کہ اب نظر وفکر کے علاوہ کچھ لکھنے کو نہیں بچا، تو پھر غور وفکر کر کے قلم اٹھایا گیا، لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمتِ خاصہ مسلسل شاملِ حال رہی اور ''قطرہ قطرہ دریا شود'' کے بمصداق ۱۳ سال میں مضامین کا بڑا ذخیرہ جمع ہوگیا، جو اکثر دعوتی اور اصلاحی موضوعات پر مشتمل ہیں۔ **فالحمد للّٰہ علیٰ توفیقه وکرمه.**

احقر کی نظر میں اعمال سے زیادہ فکری اصلاح کی ضرورت ہے، اس لئے کہ اگر فکر میں سدھار ہوجائے تو رفتہ رفتہ اعمال میں بھی سدھار ہوجاتا ہے، اور اگر فکر راستی پر نہ ہو تو ظاہری اعمال کی استقامت اور قبولیت کی بھی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی، آج امت کا سب سے بڑا المیہ فکر کا بگاڑ ہے، اور اعمال کی سبھی خرابیاں اسی فکری بگاڑ کے مظاہر و نتائج ہیں، اسی بنا پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **اَلَا اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ اَلَا! وَهِیَ الْقَلْبُ.** (مسلم شریف ۲/ ۲۸)

''یاد رکھو! بدن میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے وہ اگر سدھرا رہے تو پورا بدن ٹھیک رہے گا اور وہ اگر خراب ہوجائے تو سارا بدن خراب ہوجائے گا، اچھی طرح سن لو! وہ ٹکڑا انسان کا دل ہے''۔

آج ضرورت ہے کہ قوم کا مزاج اسلامی اور دینی بنایا جائے، قوم کا ہر فرد اپنے ہر معاملہ کو دین کی روشنی میں دیکھنے اور حل کرنے کا عادی بن جائے، دنیا کے نقصان کے مقابلہ میں دین کے نقصان کی اہمیت زیادہ ہو اور اسے دور کرنے کی فکر آدمی پر غالب ہو، پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک دعا میں امت کو اسی دینی مزاج پیدا کرنے کی اس طرح تعلیم دی ہے، **اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ مُصِیْبَتَنَا فِیْ دِیْنِنَا وَلَا تَجْعَلِ الدُّنْیَا اَکْبَرَ هَمِّنَا وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا.** (الحزب الاعظم) ''اے اللہ! ہمارے دین میں ہمیں آزمائش میں

نہ ڈال، اور دنیا کو ہمارا سب سے بڑا مقصود، اور منتہائے علم نہ بنا'' یہ تعلیم اس بات کی متقاضی ہے کہ ہمیں ہر موڑ پر دین کا مفاد سب سے زیادہ عزیز رہے، اور ہمیشہ دنیا کے مفادات کے مقابلے دینی نفع ہی کو مقصود بنایا جائے۔

بفضلہٖ تعالیٰ زیر نظر مضامین کے مجموعہ میں یہی ''فکری نظریہ'' آپ کو جا بجا نظر آئے گا، بلکہ یوں کہئے کہ اسی نظریہ کی اشاعت کو مقصد بنا کر یہ مضامین لکھے گئے ہیں۔ مضامین اگرچہ موضوعات کے اعتبار سے الگ الگ عنوانوں میں بانٹ دئے گئے ہیں لیکن سب کا لب لباب یہی ہے کہ ہمارا مزاج دینی بن جائے، اور ذہن ودماغ انصاف پسند بن کر اعتدال کی راہ پر گامزن ہو جائے۔ آخری حصہ ''افکار باطلہ کی تردید'' میں بھی جو گفتگو کی گئی ہے۔ اس کا منشاء بھی صرف یہی ہے کہ دلائل کی روشنی میں لوگ خالی الذہن ہو کر فیصلہ کر سکیں کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط؟ محض بحث بازی اور کٹھ حجتی مقصود نہیں ہے۔ اور بعض جگہ جو تعبیر میں شدت ہے وہ فریق مخالف کی دریدہ دہنی کے مقابلے میں عشر عشیر بھی نہیں ہے۔ خدا کرے کہ یہ تحریریں واقعی دینی مزاج بنانے کا ذریعہ بن جائیں۔ آمین۔

اس وقت جب کہ یہ مضامین طباعت کے لئے تیار ہیں احقر کو اس بات کا شدید احساس بلکہ ندامت ہے کہ احقر کی خود اپنی زندگی اور کردار ان باتوں سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں جن پر ان مضامین میں زور دیا گیا ہے۔ ہوسکتا ہے یہی احساس آئندہ کچھ کر سکنے اور سدھار کی راہ پر گامزن ہونے کا ذریعہ بن جائے، اللہ تعالیٰ کی شان سے کچھ بعید نہیں۔ تاہم قارئین حضرات سے درخواست ہے کہ وہ احقر کی ذات سے موازنہ کرنے کے بجائے مضامین میں پیش کردہ مواد پر نظر رکھیں، اور احقر کے حق میں دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اس ناکارہ کو بھی قول وعمل میں توافق کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

اغلاط سے محفوظ رہنے کا کوئی شخص دعویٰ نہیں کر سکتا، اس لئے عین ممکن ہے کہ مضامین میں لفظی یا معنوی غلطیاں رہ گئی ہوں لہذا ناظرین سے گذارش ہے کہ اگر کسی غلطی پر نظر پڑے تو اس سے مطلع فرمائیں۔ تاکہ آئندہ اس کی تصحیح کی جا سکے۔

احقر اپنے مؤقر حضرات اساتذۂ کرام زید مجدہم ومدت فیوضہم، کا بے حد ممنون ومشکور ہے کہ انھوں نے ازراہ کرم کتاب کے بارے میں گراں قدر کلمات تحریر فرمائے۔ بالخصوص عربی اور اُردو کے صاحب طرز ادیب، مکرم ومحترم حضرت مولانا نور عالم صاحب خلیل امینی رئیس تحریر ''الداعی'' واستاذ ادب عربی دارالعلوم دیوبند نے جن وقیع تاثرات کا اظہار فرمایا ہے وہ احقر کے مرتبہ سے بہت بلند اور موصوف کے پرخلوص حسن ظن پر مبنی ہیں، احقر کے لئے بڑوں کا یہ حسن ظن عظیم سعادت کا باعث ہے، کاش کہ یہ خوش گمانی حقیقت میں بدل جائے۔

اخیر میں بارگاہ رب العزت میں دعا ہے کہ یہ کتاب اس کی بارگاہ میں قبولیت حاصل کرے اور احقر کے لئے تا قیامت صدقۂ جاریہ کا مصداق بن جائے۔ آمین یارب العالمین۔ فقط واللہ الموفق

احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ

۱۴۲۳/۱۱/۹ھ

تقریظات:

❑ حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب اعظمی، استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند

الحمد للّٰہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین وعلی اٰلہ وصحبہ اجمعین!

امابعد! ''دعوتِ فکروعمل'' جوعزیزم مولانا مفتی محمد سلمان حفظہ اللہ کے ندائے شاہی میں تحریر کردہ شذرات کا مجموعہ ہے اور مختلف النوع مضامین پر مشتمل ہے کہ اس میں کارِنبوت کی بھی تفصیلات ہیں، اور عبادات یعنی نماز، روزہ، حج وزکوٰۃ کے بارے میں بھی مفید تر مقالات ہیں، اور عہد حاضر کے مسائل پر بھی سیر حاصل گفتگو ہے۔

خصوصاً مغربی ممالک ـ جن میں امریکہ سرِفہرست ہے ـ جو یہ چاہتے ہیں کہ عیسائیت کی تحریک احیاء وتجدد جس نے عیسائی مذہب کی بہت سی بنیادی باتوں میں تبدیلی کردی اور ان کے مفہوم میں ترمیم کرڈالی، اہل اسلام بھی اسی طرح اسلامی بنیادوں میں وہی انداز اختیار کریں، خصوصاً جہاد کے مسئلہ میں، جس کو وہ دہشت گردی سے تعبیر کرتے ہیں۔ مولانا موصوف نے ان تمام مسائل میں اسلامی طرزفکروعمل کو سلیقہ کے ساتھ پیش کیا ہے۔

دعا ہے کہ پروردگارعالم انہیں اپنی تمام علمی وفکری صلاحیتوں کو دین کے لئے صحیح طور پر استعمال کرنے کی توفیق ارزاں فرماتا رہے اور ترقیات سے نوازے۔ آمین۔ واخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العلمین.

نعمت اللہ غفرلہ، خادم تدریس دارالعلوم دیوبند
۱۷/شوال ۱۴۲۳ھ

❑ حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری، استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم.

''دعوت فکروعمل'' جناب مولانا مفتی محمد سلمان صاحب منصور پوری زیدمجدہٗ استاذ مدرسہ شاہی مرادآباد کے ان شذرات کا مجموعہ ہے جو وہ بارہ سال تک ''ندائے شاہی'' میں ماہ بہ ماہ لکھتے رہے ہیں۔ ان قیمتی مضامین کو موصوف نے سات عناوین پر تقسیم کیا ہے۔ جو یہ ہیں: (۱) احساس ذمہ داری (۲) اسلامی عبادات اور ان کے تقاضے (۳) فکر اسلامی (۴) اصلاح معاشرہ (۵) بے حیائی پر نکیر (۶) مدارس اسلامیہ (۷) افکار باطلہ کی تردید۔

مصنف سلمہٗ نے یہ بات بالکل درست لکھی ہے کہ ''فکر اصل ہے اور عمل اس کی فرع'' اچھے فکر پر

اچھے ثمرات مرتب ہوتے ہیں۔اورسوچ اگر خدانخواستہ غلط ہوجائے تو میٹھے پھل کی امید فضول ہے ''دعوت فکر وعمل''، میں صحیح اسلامی فکر اپنانے کی دعوت اوراس کے مطابق عمل کو ڈھالنے کی ترغیب ہے۔ میں نے یہ مضامین ندائے شاہی میں بھی پڑھے ہیں۔اوراب جب کہ وہ کتابی شکل میں اشاعت کے لئے تیار ہیں، ایک طائرانہ نظر ڈالی تو نہایت قیمتی اور مفید افادات کا گلدستہ نظر آیا۔مکرمی مفتی سلمان صاحب پختہ قلم کار ہیں، سنجیدہ لکھتے ہیں، سلیس عبارت میں بات پیش کرتے ہیں اور سوز دروں کی چاشنی ملاتے ہیں۔اللہ تعالیٰ اس کتاب کو قبول فرمائیں اور امت کو اس سے فیض یاب فرمائیں۔(آمین)

کتبہٗ: سعید احمد عفا اللہ عنہ پالن پوری، خادم دارالعلوم دیو بند
۲/ذی قعدہ ۱۴۲۳ھ

❑ حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری، استاذ حدیث دارالعلوم دیو بند

الحمد للّٰہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ محمد وعلی آلہ وصحبہ اجمعین!

اداریہ میں عام طور پر ان مسائل کو اظہار خیال کے لئے منتخب کیا جاتا ہے جو مدیر کی نظر میں اس وقت سب سے زیادہ اہم اور توجہ طلب ہوتے ہیں۔

ماہنامہ ''ندائے شاہی'' مرادآباد کے مدیر مسئول جناب مولانا مفتی محمد سلمان صاحب زید مجدہم دل دردمند رکھنے والے معتبر عالم دین ہیں، انہوں نے ''ندائے شاہی'' میں عرصۂ دراز تک جن مسائل پر بصیرت افروز اداریے سپرد قلم کئے تھے انہیں اب ''دعوتِ فکر وعمل'' میں خاص ترتیب کے ساتھ جمع کردیا گیا ہے۔

زندگی ایک قدر مشترک حقیقت کا نام ہے، اس لئے ملی زندگی میں پیش آنے والے مسائل، اور ان کے بارے میں کئے گئے اظہار خیال کو ہمہ وقت تازہ سمجھنا چاہئے۔

روش صدیقی نے کہا ہے ؎

اک درد مشترک سے عبارت ہے زندگی ☆ سب پر گذر رہی ہے جو ہم پر گذر گئی

اور اگر بعض مسائل کو ہنگامی اور وقتی قرار دیا جائے تب بھی سوز اندرونی کی حفاظت کے لئے ان کو یاد رکھنا فائدے سے خالی نہیں ہے۔

تازہ خواہی داشتن گرداغ ہائے سینہ را ☆ گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ''فکر وعمل'' کی اس دعوت خیر کو ہم مسلمانوں کے لئے فوز وفلاح کا ذریعہ بنائے اور وہ خود صاحب قلم کے لئے دین اور دنیا کی ترقی کا سبب قرار پائے۔ **والحمد للّٰہ اولاً و آخراً۔**

ریاست علی غفرلہٗ، خادم التدریس دارالعلوم دیو بند
۹/شوال ۱۴۲۳ھ

تعارف وتأثر :

از : حضرت مولانا نورعالم صاحب خلیل امینی
رئیس تحریر، ماہ نامہ ’’الداعی‘‘ واستاذ ادب عربی دارالعلوم دیوبند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میں اکثر کہا کرتا ہوں اور میں نے مادرِ علمی دارالعلوم دیو بند کے عربی ترجمان: ماہ نامہ ’’الداعی‘‘ کے ’’اشراقہ‘‘ کے کالم میں متعدد مرتبہ لکھا بھی ہے کہ تقریر وتحریر میں نہ صرف اثر اندازی کی باطنی طاقت؛ بل کہ ظاہری آب تاب بھی اُسی وقت پیدا ہوتی ہے جب تقریر وتحریر، مقرر ومحرر کے صرف ’’قال‘‘ کی ترجمان نہ ہو؛ بل کہ ’’حال‘‘ کی عکّاس ہو۔ یعنی کہنے اور لکھنے والے کی زبان نے وہی کچھ کہا ہو اور قلم نے وہی کچھ لکھا ہو جس پر وہ اپنی زندگی میں عمل پیرا ہو۔ واعظ کی خوش بیانی اور قلم کار کی سحر نگاری، اُسی وقت دوآتشہ ہوتی ہے جب بہ قول جگر مرادآبادی (م ۱۹۶۰ء) وہ سرورِ عشق سے سرشار ہو اور اس کے چہرے سے ایمان ویقین کی روشنی پھوٹی پڑتی ہو۔ علامہ اقبالؒ (م ۱۹۳۸ء) نے معجزۂ فن کی نمود کے لیے خونِ جگر کی آمیزش کو شرط قرار دیا ہے۔ خود اُن کے کلام کی معجزانہ تاثیر کی اصل وجہ یہی خونِ جگر ہے۔ خونِ جگر ایسا کیمیا ہے کہ اُس کی وجہ سے نہ صرف چنگ ورباب اور حرف وصوت میں جادو کی تاثیر پیدا ہو جاتی ہے؛ بل کہ رنگ اور خشت وسنگ جیسی بے جان وبے آواز اشیاء میں بھی دل کشی ودل ربائی کی بھرپور صلاحیت عیاں ہو جاتی ہے ؎

نقش ہیں سب ناتمام، خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام، خونِ جگر کے بغیر

الغرض واعظ کا ارشاد ہر طرح بجا ہونے کے باوجود اور نویسندہ کی تحریر بہت دل چسپ ہونے کے باوصف، اُسی وقت دل وجگر میں سماتی ہیں اور عقل وخرد کو شکار کرتی ہیں جب اُن دونوں کا سرچشمہ اِخلاص ہو اور وہ دل وزبان کے اتحاد کا نتیجہ ہوں۔ جو تقریر یا تحریر اِس شرط یا وصف سے عاری ہوتی ہے، وہ کسی ٹھوس انقلابِ حال کا ذریعہ نہیں بنتی۔ وقتی طور پر کچھ مؤثر بھی ہو تو دل ونگاہ کے بگاڑ کو باقاعدہ طور پر دور کرنے میں مُمِدّ ومُعَاوِن نہیں ہو پاتی۔ یہ ایسا مسئلہ ہے جس پر انسانی دنیا کے تمام عُقَلا ومفکرین کا اتفاق ہے، کسی مذہب ومسلک کے کسی صحیح المزاج ’’امام‘‘ یا ’’مفتی‘‘ کا اِس حوالے سے کوئی اختلاف میری نظر سے نہیں گذرا۔

زیرِ نظر کتاب ''دعوتِ فکر و عمل'' ایک ایسے جواں سال صالح عالم کے قلم سے ہے، جس کو خداے پاک نے علم و فضل کے ساتھ ساتھ، حرکتِ فکر و عمل، جگر سوزی، اِخلاص کیشی، یقینِ محکم اور عملِ پیہم کی دولتِ بے بہا سے بھی نوازا ہے؛ اِسی لیے نسبتاً کم عمری کے باوجود اُس کی تحریر و تقریر میں اللہ پاک نے ایسی تاثیر دی ہے، جو اُس کے معاصرین میں سے شاید و باید کسی کے حصّے میں آئی ہے۔

میری مراد مولانا مفتی محمد سلمان قاسمی منصور پوری استاذ جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد و چیف ایڈیٹر ماہ نامہ ''ندائے شاہی'' اردو، سے ہے، جن کا قلم تیرہ سال سے، سمتِ مستقیم میں، تسلسل کے ساتھ، کسی تکان کے بغیر محوِ سفر ہے۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں، وہ ''از دل خیزد بر دل ریزد'' اور ''دل سے جو بات نکلتی ہے، اثر رکھتی ہے'' کا ہو بہو مصداق ہوتا ہے؛ اِسی لیے اُن کی تحریریں برصغیر کے تمام باتوفیق دینی حلقوں میں ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہیں اور اُن کی تالیفات و رسائل ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے ہیں۔ ان کی بعض کتابوں کے صرف ایک سال کے اندر کئی اڈیشن نکلتے ہیں اور دیکھتے دیکھتے بازار سے غائب ہو جاتے ہیں۔

اُن کے مضامین دعوتی و اِصلاحی اور دینی مسائل کے شرح و بیان سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ فکری اِصلاح پر زور دیتے ہیں۔ اُن کی زبان سادہ، سلیس اور عام فہم ہوتی ہے؛ اِس لیے اُن کی نگارشات عوام و خواص دونوں میں یکساں طور پر مقبول ہیں۔ بہت لکھنا، بہت اچھا لکھنا اور بہت مفید لکھنا، یہی اُن کا کمال نہیں ہے؛ بل کہ اُن کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ جو کچھ لکھتے ہیں، صحیح اِسلامی فکر کے مطابق لکھتے ہیں۔ اکابر و اسلاف کی ڈگر پر اپنی تمام تحریروں کو استوار کرتے ہیں۔ فکرِ دیوبند کی نمایندگی کرتے ہیں۔ قاسمؒ و رشیدؒ کے افکار و خیالات کے دائرے اور تھانویؒ و مدنیؒ کے فکر و نظر کے زاویے سے سرِ مو انحراف نہیں کرتے۔ کسی اہلِ قلم کا بہت لکھنا، اصل کمال نہیں؛ بل کہ اصل کمال یہی ہے کہ وہ راہِ مستقیم سے بے گانہ اور فکرِ راست سے بے سمت نہ ہو۔ مولانا مفتی محمد سلمان منصور پوری کو اللہ تعالیٰ نے نہ صرف فکری لغزشوں، بل کہ ''قلمی پھسلنوں'' سے بھی محفوظ رکھا ہے۔ بھول چوک کے سلسلے میں تو بڑے بڑے اہلِ علم و فضل کو بھی معصوم قرار نہیں دیا جا سکتا کہ اِس سے کوئی فردِ بشر مُبرَّا نہیں۔

مذکورہ بالا باتوں سے یہ بات بھی عیاں ہو جاتی ہے کہ نہ صرف اُن کے فکر کا دھارا صحیح سمت میں بہتا ہے؛ بل کہ ان کا علم پختہ، ٹھوس اور مُستحضَر ہے۔ دین داری، عبادات و معاملات میں شریعت کی اِمکانی پابندی، صحابہ و ائمہ و صالحین و اَولیاے متقین سے سچی محبت، دورِ آخر میں اہل سنت والجماعت کے صحیح ترین نمایندے: علما و مشائخِ دیوبند اور ولی اللّٰہی مکتبِ فکر کے علما و صلحا و داعیانِ دین و شارحینِ شرعِ متین سے

با معنی وابستگی ووفاداری؛ بل کہ عشق نے اُن کے فکر ونظر کو آب دار کرنے کے ساتھ ساتھ، اُن کے وقت اور زندگی کے دورانیوں کو بابرکت بنادیا ہے۔ وہ تھوڑے وقت میں، جس کی تنگ دامانی کا میں ذاتی طور پر بڑا شاکی رہا کرتا ہوں، بہت کام کرلیتے ہیں۔ تدریسی مشاغل، تقریری سرگرمیوں، ضروری اسفار، عوامی ارتباط، دعوتی واِصلاحی ملاقاتوں کے ساتھ ساتھ، اُن کی زودنویسی اور تخلیقی عمل کا تسلسل قابلِ رشک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اُن نوجوان فضلاے دیوبند میں سے ہیں جن سے آیندہ بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ میرے نزدیک وہ مثالی گنے چنے نوجوان علما میں سے ایک ہیں۔

زیرِنظر کتاب، دراصل اُن کے اِدارتی مضامین کا مجموعہ ہے، جو وہ ''نظر وفکر'' کے مستقل عنوان کے تحت ۱۳ سال کے دوران ''ندائے شاہی'' میں لکھتے رہے ہیں۔ مضامین کی نوعیت کے اعتبار سے اور قارئین کے لیے، استفادے کی سہولت کے پیشِ نظر، اُنھوں نے اِن مضامین کو، اِحساسِ ذمّے داری؛ اِسلامی عبادات اور اُن کے تقاضے؛ فکرِ اِسلامی؛ اِصلاحِ معاشرہ؛ بے حیائی پر نکیر؛ مدارسِ اسلامیہ؛ اَفکارِ باطلہ کی تردید، جیسے مرکزی عناوین پر تقسیم کرکے، اُن کے تحت ہر عنوان کے دائرے میں آنے والے مضامین جمع کردیے ہیں۔ ہر مضمون میں ضرورت کے مطابق کئی کئی ذیلی سرخیاں قائم کردی ہیں؛ تا کہ قاری کے لیے، مضمون کی طوالت کا اِحساس باعثِ اکتاہٹ نہ ہو اور مضمون کے مزاج ومذاق کا اِدراک طائرانہ نظر کے ذریعے بھی ممکن ہو۔ یوں تو سارے مضامین لائقِ مطالعہ اور انتہائی مفید ہیں؛ لیکن فکرِ اِسلامی کے تحت جمع کردہ مضامین بہ طورِ خاص اُمّت اور مِلّت کے موجودہ دکھ درد اور امید وآرزو کی خوب صورت اور حقیقت پسندانہ ترجمانی کرتے ہیں اور ساتھ ہی اُن مادی ومعنوی امراض کی تشخیص بھی جو ہماری مشکلات اور پریشانیوں کی اصل وجہ ہیں۔ اِسی طرح اِصلاحِ معاشرہ کے تحت ہمارے اِسلامی کہے جانے والے سماج کی برائیوں، اُن سے بچنے کی تدبیروں اور اُن اُصول وضوابط پر روشنی ڈالی گئی ہے، جن پر کاربند ہوئے بغیر معاشرے کی تطہیر اور ہمارے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے فروغ کا کوئی خواب کسی تعبیر سے ہم کنار اور اُس کی کوئی تدبیر کسی طرح کارگر نہیں ہوسکتی۔

مدارس اسلامیہ کے عنوان کے تحت شمولہ مضامین میں نہ صرف مدارس کو درپیش مسائل ومشکلات کا جائزہ کیا گیا ہے اور ان سے چھٹکارے کی راہیں اُجاگر کی گئی ہیں؛ بل کہ ہمارے تعلیمی ومدرسی نظام کی موجودہ خلل پذیری اور معائب اور اندرونی امراض کو بھی ہم دردانہ انداز میں آشکارا کرکے، دعوتِ فکر وعمل دی گئی ہے؛ تا کہ مدارس کے اصلی کردار اور رجال سازی وآدم گری کے اصل فریضے کی طرف بازگشت

آسان ہواور ہمارے مدارس کے نظام کا باطن، درستگی سے ہم کنار ہوکر، ہماری ظاہری دشواریوں کے لیے تریاق کا کام دے سکے۔

اَفکارِ باطلہ کی تردید کے تحت، بہت سے اُن فرقوں اور مذاہب پر، اُصولی طور پر، رووقدح یا اُن کا ابطال کیا گیا ہے، جو اِسلام کی صفوں میں انتشار برپا کرنے کے لیے مشہور ہیں۔ نیز اِسی عنوان کے تحت ''وندے ماترم'' وغیرہ کے سلسلے میں، سیر حاصل بحث کی گئی ہے کہ مسلمانوں کے لیے یہ کیوں قابلِ قبول نہیں ہے؟۔ اِسی طرح قرآنِ کریم میں ترمیم اور اِسلام کے تصوّرِ جہاد وغیر پر، پُرمغز گفتگو اور معاصر دنیا میں اقوامِ متحدہ کی طرف سے، مسلمانوں کے خلاف جانب دارانہ؛ بل کہ ظالمانہ کردار کو الم نشرح کیا گیا ہے۔ دیگر عناوین کے تحت بھی گراں قدر اور چشم کشا مضامین شاملِ کتاب ہیں، جن کا پڑھنا ہر مسلمان کے لیے بے حد ضروری ہے۔

راقم الحروف کو یقین ہے کہ مؤلف کی دیگر کتابوں اور رسائل کی طرح، یہ کتاب بھی ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی اور اُن کے لیے ذخیرۂ آخرت وذریعۂ نیک نامی ثابت ہوگی۔ اللہ پاک مؤلف کے قلم کو ہمیشہ ناآشنائے تعب رکھے، اُنھیں دین وعقیدے کی مزید خدمت کی توفیق بخشے۔ میں ان کا شکر گذار ہوں کہ اُنھوں نے مجھے، اِن سطور کے لکھنے کی فرمایش کے ذریعے، اِس صدقۂ جاریہ میں شراکت کا موقع دیا۔ اللہ پاک اُنھیں اِس کے لیے بھی نوازے۔

اَللّٰھُمَّ تَقَبَّلْ مِنَّا، إِنَّکَ أَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ،

وَصَلَّی اللّٰہُ وَسَلَّمَ وَبَارَکَ عَلٰی عَبْدِہٖ وَرَسُوْلِہٖ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا وَحَبِیْبِنَا وَشَفِیْعِنَا : مُحَمَّدٍ وَعَلٰی آلِہٖ وَصَحْبِہٖ أَجْمَعِیْنَ، وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ.

نور عالم خلیل امینی
رئیس تحریر ماہ نامہ ''الداعی'' عربی
واستاذ ادب عربی دارالعلوم دیوبند

۱۱ بجے، شبِ دوشنبہ:
۴ر شوال ۱۴۲۳ھ
۹ر دسمبر ۲۰۰۲ء

حضرت مولانا مفتی شبیر احمد صاحب، مفتی واستاذ حدیث مدرسہ شاہی مرادآباد

الحمد للّٰہ الذی جعل رجالاً لاتلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله والصلوة علی سید الکونین وعلی الہ وصحبہ اجمعین، امابعد !

حضرت مولانا مفتی محمد سلمان صاحب زید مجدہ اس زمانہ کے مشہور صحافیوں میں سے ایک ہیں، مدرسہ شاہی کے ترجمان رسالہ ''ندائے شاہی'' کے روح رواں ہیں، انہوں نے اب تک جو اداریئے لکھے ہیں جو ''ندائے شاہی'' کے ہر شمارہ میں آتے رہے ہیں ان کا دس بارہ سال میں ایک بڑا ذخیرہ جمع ہو چکا ہے، اس میں عوام وخواص کے لئے بڑی ہدایت اور عبرت کے مضامین ہیں، فرق باطلہ کے باطل عقائد اور معاندین کے عناد کے مدلل اور خوبصورت جوابات ہیں۔ امید ہے کہ یہ مضامین کتابی شکل میں شائع ہونے سے ہر مسلمان کے لئے رشد ہدایت کا عمدہ سامان ہوگا۔ احقر نے اس کو جستہ جستہ مقامات دیکھا ہے اللہ پاک سے امید ہے کہ شرف قبولیت سے نوازے اور موصوف کے لئے ذخیرۂ آخرت بنے۔ آمین۔

شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸/ رمضان ۱۴۲۳ھ

حضرت مولانا اشہد رشیدی صاحب مہتمم واستاذ حدیث مدرسہ شاہی مرادآباد

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم !

دینی اور صحافتی حلقوں میں نہایت مقبول ماہنامہ ''ندائے شاہی'' کے مرتب محترم مولانا مفتی محمد سلمان صاحب کے پرسوز اور دردمند قلم سے نکلنے والا ''دعوت فکر وعمل'' کا یہ مجموعۂ مضامین حقیقت میں اسم بامسمیٰ ہے۔

یہ موصوف کی نہایت دور اندیشی اور مومنانہ فراست کی بات ہے کہ ہر ماہ ''ندائے شاہی'' کے ''نظر وفکر'' میں شائع ہونے والے مضامین کو زندہ جاوید رکھنے کے لئے مستقل کتاب کی شکل میں پیش کر رہے ہیں۔

اس نادر اور قیمتی مجموعہ کے بارے میں صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ اس کے مندرجات پہلے ہی اہل عقل ودانش سے داد تحسین وصول کر چکے ہیں اور اب نئے عناوین کے ساتھ کتاب کی شکل میں تو گویا ''نور علی نور'' ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو مفید عام وخاص بنائے۔ (آمین)

اشہد غفرلہ، خادم مدرسہ شاہی مرادآباد
۱۴۳۲/۱۱/۵ھ

احساسِ ذمہ داری

حسن نیت

دین کے ہر کام میں حسن نیت ضروری ہے۔نیت کی درستی ہی اعمال کو باوزن بناتی ہے اوران کی برکتوں کودیرپا بنانے کا ذریعہ بنتی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا:اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ (بخاری شریف ۱/۲) یعنی اعمال (کے مقبول ہونے یانہ ہونے) کا مدارنیت پر ہے۔جیسی نیت ہوگی ویسے ہی اس عمل پر ثمرات مرتب ہوں گے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مقولہ ہے: لَاعَمَلَ لِمَنْ لَّانِیَةَ لَــہ' ، یعنی جس کی نیت صحیح نہیں ہے اس کے عمل کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یحیٰی بن کثیر فرماتے ہیں کہ ''نیت کرنا سیکھو اس لئے کہ یہ عمل کرنے سے زیادہ اہم ہے:'' داؤد طائی کہتے ہیں کہ ''حسن نیت'' ہی تمام بھلائیوں کا مجموعہ ہے''۔(جامع العلوم والحکم ۱۲)

مگر نیت کی درستگی جس قدر ضروری ہے اسی قدر اس کا استحضار اور ہر موقع پر اس کا تصورایک انتہائی مشکل کام ہے۔عبادات ظاہرہ مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ اورحج وغیرہ میں استحضار بآسانی ہوجاتا ہے، لیکن زندگی کے دیگر شعبوں اور معاملات میں ''حسن نیت'' کالحاظ رکھنا آسان نہیں ہے اسی بناپر حضرت سفیان ثوریؒ نے ارشادفرمایا کہ ''میں اپنی نیت سے زیادہ کسی چیز کی نگرانی نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ مسلسل الٹتی پلٹتی رہتی ہے۔'' اور حضرت یوسف بن اسباطؒ فرماتے ہیں کہ ''نیت کو فاسد ہونے سے بچانا اہل عمل کے لئے لمبی لمبی عبادتوں سے زیادہ بھاری ہے۔'' اور حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کا ارشاد ہے کہ ''بہت سے معمولی اعمال نیت کی صحت کی وجہ سے عظیم الشان ہوجاتے ہیں اور بسا اوقات بہت بڑے بڑے اعمال نیت کے فساد کی وجہ سے معمولی بن جاتے ہیں''۔(حوالہ بالا)

اورنیت کا تعلق چونکہ صرف دل سے ہے اس لئے اس کے فساد کا جلدی سے پتہ بھی نہیں چل پاتا۔ اور شیطان بسا اوقات خفیہ سازش رچاتے ہوئے ہماری نیت بگاڑ کر ساری محنت پر پانی

پھروادیتا ہے۔ اس لئے ہر وقت اپنی نیت کا تنقیدی جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ خاص کر جو حضرات دین کی عظیم تعلیمی اور تبلیغی خدمات انجام دینے میں مصروف ہیں، انھیں اپنے کام کی عظمت اور اپنے بلند پایہ منصب کا لحاظ کرتے ہوئے اپنی نیتوں کی درستگی اور اصلاح کی طرف خاص طور پر دھیان دینا چاہئے۔

دینی کام کرتے ہوئے صرف دین کی سربلندی کا خیال رہے، اپنے ادارہ، اپنی جماعت اور اپنے طریقۂ کار کی ترویج واشاعت اور اشتہار اصل مقصود نہ ہو، اور اس کی ایک بڑی نشانی یہ ہے کہ مثلاً اگر ہم کسی مدرسہ میں استاد ہیں، اور وہاں کوئی دوسرا ایسا استاد آجائے جو ہم سے زیادہ بہتر انداز میں تدریس کا کام انجام دے سکتا ہو تو ہمیں طبعی طور پر خوشی ہونی چاہئے کہ چلو اچھا ہوا اب دین کا کام اور بہتر طریقہ پر ہوگا۔ اسی طرح اگر ہم کسی شہر میں وعظ ونصیحت اور دعوت وتبلیغ کا کام انجام دیتے ہوں اور وہاں کوئی اور ایسا عالم آجائے جو ہم سے بہتر انداز میں یہ سب امور انجام دے اور لوگوں کو اس کی ذات سے دینی نفع ہونے لگے، تو حسن نیت کا اثر یہ ہوگا کہ ہم اس کے درپے آزار ہونے کے بجائے اللہ تعالیٰ کے حضور میں سجدۂ شکر بجالائیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی خدمت کے لئے ہم سے بہتر انتظام فرمادیا۔ اسی طرح اگر ہماری جماعت کوئی دینی اور اصلاحی کام شروع کرے اور بعد میں کوئی اور جماعت بھی اس کام کو لے کر آگے بڑھنے لگے تو ہمیں یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ یہ کام تو ہم نے شروع کیا تھا، لہٰذا اسے ہم ہی کرسکتے ہیں کسی دوسری جماعت کو اس کا اختیار نہیں ہے۔ بلکہ ہمیں اور خوش ہونا چاہئے کہ دوسروں کے متوجہ ہونے سے دین کا کام زیادہ اچھی طرح انجام پائے گا۔

یادرکھیں، دین کے کام پر کسی خاص فرد یا جماعت کی اجارہ داری نہیں ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے انداز میں قومی اور ملی مصالح کا خیال کرتے ہوئے دینی خدمات انجام دے سکتا ہے۔ اصل چیز اصلاح اور قرب خداوندی کا حصول ہے۔ یہ دولت کسی طرح بھی ملے اسے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اور اس سلسلہ میں آپسی تعاون کے جذبہ کو فروغ دینا چاہئے۔

آج یہ واقعی افسوس کا مقام ہے کہ خود ہمارے اندر سے حسن نیت کی نشانیاں ناپید ہوتی جارہی ہیں۔ اب ادارے اور جماعتیں صرف اپنی ترقیات پر محنتیں کرتی نظر آتی ہیں۔ مدارس سے لے کر تبلیغی اور دینی جماعتوں تک میں یہ مرض عام ہے۔ کہیں دین کو اداروں میں محدود کرلیا گیا تو کہیں مذہب کو اپنے متعینہ طریقۂ کار میں مقید کردیا گیا ہے۔ اور کوئی اپنے دائرہ کار سے نکل کر دوسرے کا ساتھ دینے کو تیار نہیں ہے۔ یہ چیزیں حسن نیت اور اخلاص کے منافی ہیں۔ نیت کی درستگی اسی وقت معلوم ہوگی جبکہ نام کے بجائے کام اور صرف کام کو مقصود بنالیا جائے۔ صحیح دین کی ترویج اور اس کی بقاء کے راستہ میں تعاون کی راہیں ہموار کی جائیں۔ اور نام کی پروا کسی بھی مرحلہ میں ہماری نیت کو نہ بگاڑ سکے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حسن نیت کی دولت سے سرفراز کرے۔ آمین۔

(ندائے شاہی، فروری ۱۹۹۷ء)

دعاءابراہیمؑ اور کارنبوت

مکہ معظّمہ میں اللہ کے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام، اورآپکے ہونہار فرزند حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے جب اللہ کے حکم سے بیت اللہ کی تعمیر کا عظیم کام مکمل کر دیا تو ان پر عظمت باپ بیٹوں کے ہاتھ بے اختیار آسمان کی طرف اٹھ گئے۔زبان سے دعائیں الفاظ کے پیکر میں ڈھلنے لگیں۔دعائیں کیا تھیں؟ ان دونوں بزرگوں کے تدبر اور فراست کی جیتی جاگتی تعبیر تھیں جن میں انھوں نے اپنے لئے اور اپنی آنے والی نسلوں کے واسطے دینی اعتبار سے وہ سب کچھ مانگ لیا تھا جس سے آگے مانگنے کا کوئی تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ان دعاؤں میں سب سے اہم دعا یہ تھی:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ. (البقرہ ۱۲۹)

اے ہمارے پروردگار اور بھیج ان میں ایک رسول انہی میں کا کہ پڑھے ان پر تیری آیتیں اور سکھلائے انکو کتاب اور حکمت کی باتیں، اور پاک کرے ان کو، بے شک تو ہی ہے بہت زبردست حکمت والا۔

بیت اللہ شریف کی تعمیر کے اس مبارک و مستجاب موقع پر مانگی گئی اس دعا نے بکمال شرف، قبولیت کا مقام حاصل کیا اور ربیع الاوّل کی ۹/ تاریخ (م۲۲/ اپریل ۵۷۰عیسوی) پیر کے مبارک دن، کائنات کے سب سے معزز خاندان بنوعبد المطلب میں، مکہ کے سب سے شریف اور افضل نوجوان عبداللہ کے گھر میں، اور عرب کی سب سے پاکباز اور پاکیزہ ماں آمنہ کی مبارک گود میں مذکورہ ''دعائے ابراہیمی'' کا واحد اور تنہا مصداق، انبیائے سابقین کی خوش خبریوں اور پیش گوئیوں کا

مظہر اتم، محض رسول ہی نہیں بلکہ رسولوں کا سردار، اور سلسلۂ نبوت کا آخری تاجدار، محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ کی صورت میں مکہ معظّمہ میں نمودار ہوا۔ صبح کے جھٹپٹے میں ستاروں نے جھک کر سلامی دی، نور خداوندی نے پورے گھر پر چاندنی پھیلا دی، ادھر باطل طاقتیں حق کے اس کامل و مکمل ظہور سے لرزہ براندام ہوگئیں، کسریٰ کے محل کے مضبوط ۱۴ کنگورے گر پڑے، سیکڑوں سال سے جلتی ہوئی آتش خانہ کی آگ نے بجھنے میں ہی عافیت سمجھی، دریائے ساوہ خشک ہوگیا، شیطان اور اسکے حمایت کاروں میں کھلبلی مچ گئی۔ (دلائل النبوۃ للبیہقی)

کیوں؟ اس لئے کہ ہدایت کا سورج طلوع ہو چکا ہے اب کسی اندھیری کو تاریکی پھیلانے کی ہرگز اجازت نہ ہوگی اب حق کی طرف سے شرک کے لئے تار و پود بکھیر دینے کی تیاری مکمل ہو چکی ہے آج سے جو بھی شیطان اس راہ میں رکاوٹ بنے گا اسے خس و خاشاک کی طرح تہس نہس کر دیا جائیگا، اب بہیمیت کے بجائے انسانیت آئے گی، اب جاہلیت کی جگہ تعلیم اور شعور کو زندگی ملے گی، اور اب روشنی اس طرح افق عالم پر پھیلے گی کہ دنیا کا یہ ظلمت کدہ بقعۂ نور بن کر عالم ہستی میں جگمگانے لگے گا۔

برکتیں ہی برکتیں

عرب کا یہ دستور تھا کہ چھوٹے بچوں کو دودھ پلانے اور پرورش کے لئے دیہات کی صاف شفاف آب و ہوا میں رکھنے کا انتظام کرتے تھے، تا کہ بچہ خالص عربیت کے ماحول میں پروان چڑھے اور تہذیبی آداب اسکے رگ و پے میں بس جائیں، ہر سال دیہات کی عورتیں دودھ پیتے بچوں کی تلاش میں آتیں اور گھر والوں سے بچوں کو لیجاتی تھیں، ہر دودھ پلانے والی عورت کی یہ کوشش رہتی کہ کسی بڑے مالدار گھرانہ کا بچہ اسے ملے تا کہ بعد میں واپسی کے وقت اسے بہترین نذرانوں اور تحفے تحائف سے نوازا جائے، اس سال قبیلۂ بنوسعد کی دس عورتیں بھی بچوں کی تلاش میں مکہ معظّمہ آئیں جن میں ایک خوش نصیب خاتون حلیمہ سعدؓ یہ بھی تھیں، بنوسعد میں قحط پڑا ہوا تھا، فقر و فاقہ کا دور دورہ تھا اور ان میں بھی سب سے زیادہ غربت میں حلیمہؓ کے گھر والے مبتلا تھے، انکے پاس

سواری کے لئے ایک لاغر اونٹنی تھی جسکے تھن چارہ نہ ملنے کی وجہ سے خشک ہو چکے تھے اور ایک سواری کی گدھی تھی جو بمشکل تمام چل پاتی تھی، خود حلیمہؓ کی کمزوری کا حال یہ تھا کہ ساری ساری رات انکا شیر خوار بچہ بلکتا رہتا مگر انکے سینہ میں دودھ کے چند قطرات بھی نہ اترتے کہ اپنے لخت جگر کے حلق کو تر کرسکیں۔ حلیمہؓ فرماتی ہیں: کہ ہم میں سے ہر عورت کے سامنے پرورش اور رضاعت کے لئے حضرت محمد (ﷺ) کو پیش کیا گیا مگر جب یہ معلوم ہوتا کہ آپ پیدائش سے پہلے ہی یتیم ہو چکے ہیں تو کوئی عورت آپ کو قبول کرنے کو تیار نہ ہوتی اور یہ سوچتی کہ جب اسکا باپ ہی نہیں ہے تو ہمیں بہتر معاوضہ کون دے گا؟ سب عورتوں نے اپنی کوشش سے من پسند بچے منتخب کر لئے مگر حلیمہؓ کی بے سروسامانی کی بنا پر انہیں کوئی بچہ میسّر نہ آیا تا آنکہ قافلہ کی واپسی کا وقت آ پہنچا، اب حضرت حلیمہؓ نے اپنے شوہر حارث ابن عبدالعزّیٰ سے کہا کہ مجھے یہ پسند نہیں ہے کہ میں تو خالی گود جاؤں اور میرے ساتھ والی عورتیں بھری گود واپس ہوں اس لئے کوئی اور نہیں ملتا تو چلو اسی یتیم بچے محمد کو لے لیتے ہیں، خالی ہاتھ لوٹنے سے تو یہی اچھا ہے، حارث نے اس خیال کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ کوئی حرج نہیں ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بچہ کو ہی ہمارے لئے باعث خیر و برکت بنادے۔ چنانچہ حضرت حلیمہؓ نے آپکی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ بنت وہب کے پاس جا کر انکے لخت جگر اور نور نظر اسم بامسمّیٰ احمد، سراپا محمد کو حاصل کر کے دین و دنیا کی بے حد وحساب برکتیں اور سعادتیں اپنے دامن میں سمیٹ لیں، یہ بچہ جسے حلیمہؓ نے مجبوری میں "یتیم" سمجھ کر لیا تھا، وہ یتیم نہیں بلکہ "دریتیم" تھا، جسکا اندازہ حلیمہؓ کو گود میں لیتے ہی ہو گیا۔ حلیمہؓ فرماتی ہیں: کہ میں اس مبارک ومسعود بچہ کو لیکر جب اپنی قیام گاہ پر پہنچی تو میرے پستان دودھ سے بھرے ہوئے تھے۔ آپ نے جی بھر کر دودھ نوش فرمایا پھر آپ کے رضاعی بھائی نے پیا اور دونوں سو گئے جبکہ ہم فقر و فاقہ اور کمزوری کی وجہ سے کئی روز سے سو نہ سکے تھے۔ پھر جب میرے شوہر نے ہماری اونٹنی کو دیکھا تو اسکے تھن بھی دودھ سے بھرے ہوئے نظر آئے جلدی جلدی برتن میں دودھ نکالا پھر ہم دونوں نے جی بھر کر پیا۔ اور وہ رات ہم نے بڑے آرام سے بسر کی، صبح اٹھکر میرے شوہر بولے کہ حلیمہؓ یاد رکھنا یہ سب اسی مبارک بچہ کی برکت

ہے، میں نے جواب دیا اللہ کی قسم مجھے بھی یہی امید ہے، پھر ہم اپنے قبیلہ کی طرف روانہ ہوئے۔ میں نے اپنی سواری پر آنحضرتؐ کو ساتھ بٹھالیا، تو وہ سواری حیرت ناک طریقہ پر اتنی تیز چلنے لگی کہ قافلہ کی ساری سواریاں پیچھے رہ گئیں، تو میرے ساتھ والی عورتیں کہنے لگیں اری حلیمہؓ ! یہ تیری وہی سواری تو ہے جس پر سوار ہو کر تو ہمارے ساتھ گھر سے آئی تھی۔ تو میں نے جواب دیا کہ ہاں یہ وہی سواری ہے۔ اس پر وہ عورتیں بولیں کہ آج تو اسکی بڑی شان نظر آتی ہے۔ حلیمہؓ فرماتی ہیں: کہ پھر ہم اپنے قبیلہ بنوسعد میں پہنچ گئے۔ اور اس وقت ہمارا یہ علاقہ شاید ساری دنیا میں سب سے زیادہ قحط زدہ علاقہ تھا، لیکن ہمارے گھرانے پر اس مبارک جان کے وسیلہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے برکتوں کا فیضان اس طرح ہوا کہ ہماری بکریاں جب شام کو چر کر واپس آتی تھیں تو وہ پوری طرح مطمئن ہوتی تھیں اور ان کے تھن دودھ سے مکمل بھرے ہوئے ہوتے تھے، جبکہ ہمارے پڑوس کی بکریاں اس حال میں لوٹتیں کہ وہ بھوکی ہوتیں اور انکے تھنوں میں ایک قطرہ بھی دودھ نہ ہوتا تھا، یہ منظر دیکھ کر پڑوسی اپنے چرواہوں سے کہتے کہ تم اپنی بکریوں کو وہاں کیوں نہیں چراتے جہاں حلیمہؓ کی بکریاں چرتی ہیں۔ جب تک حضور اقدس ﷺ ہمارے گھر میں رہے انہی بے مثال برکتوں کا ظہور ہوتا رہا۔ اور آپ عام بچوں کے مقابلہ میں بہت تیزی سے پروان چڑھتے رہے دو سال کی عمر ہی میں آپؐ اچھے خاصے ہونہار مستعد معلوم ہونے لگے، حضرت حلیمہؓ فرماتی ہیں: کہ دو سال پورے ہونے کے بعد ہم آپؐ کو لیکر آپؐ کی والدہ کے پاس پہونچے لیکن ہماری دلی خواہش یہ تھی کہ ہم آپؐ کی برکتوں سے مزید فائدہ اٹھاتے رہیں چنانچہ ہم نے آپؐ کی والدہ ماجدہ سے کچھ اور وقت کے لئے آپؐ کو اپنے پاس رکھنے کی اجازت لے لی اور واپس اپنے قبیلے میں لے آئے۔ (سیرت ابن ہشام مع الرّوض الانف ۱/ ۲۸۸)

واقعۂ شق صدر

دعاء ابراہیمی کی تکمیل کے لئے چونکہ آپؐ کا ہدایت کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز ہونا ازل سے مقدر تھا اس لئے ابتداء ہی سے آپؐ کی ظاہری اور باطنی پاکیزگی کا انتظام اس طرح کیا گیا کہ

جب آپؐ قبیلۂ بنوسعد میں مقیم تھے اور عمر مبارک چار سال کے قریب تھی تو ایک مرتبہ جنگل میں بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام ایک فرشتے کے ساتھ تشریف لائے اور آپؐ کو لٹا کر سینۂ مبارک چاک کیا پھر دل کو نکالا اور اس میں سے ایک خون کا جما ہوا حصہ الگ کر کے فرمایا کہ یہ وہ حصہ ہے کہ جس پر شیطان اثر ڈالتا ہے۔ پھر ایک سونے کے طشت میں رکھکر دل کو زمزم کے پانی سے دھویا پھر اسے برابر کر کے اپنی جگہ رکھ کر سینۂ مبارکہ کو سی کر ٹھیک کر دیا، یہ منظر دیکھ کر آپؐ کے ساتھ کھیلنے والے بچے دوڑے دوڑے گھر آئے اور آپؐ کی رضاعی والدہ حضرت حلیمہؓ سے کہا کہ ہمارے بھائی محمد کو قتل کر دیا گیا ہے سب گھر والے دوڑے تو آ کر دیکھا کہ آپؐ کا رنگ متغیر ہے اور چپ چاپ بیٹھے ہیں۔ حضرت حلیمہؓ نے آپؐ کو چمٹا لیا اور پوچھا کہ بیٹا کیا ہوا ؟ تو آپؐ نے پورا قصہ بیان کیا۔ (مسلم شریف مع فتح الملہم ۱/۳۲۳ سیرت ابن ہشام ۱/۲۸۸) سینہ بند کرنے کے بعد اسی موقع پر آپؐ کے دونوں شانوں کے درمیان مہر نبوت لگا دی گئی۔ (الرّوض الانف ۱/۲۸۹)

اس حیرت ناک واقعہ سے آپؐ کے رضاعی ماں باپ فکر میں پڑ گئے اور آپ کو لیکر فوراً والدہ محترمہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو والدہ نے پوچھا کہ تم لوگ تو اس بچے کو زیادہ دن تک رکھنے پر مُصِر تھے آخر اتنی جلدی کیوں لے آئے ؟ حضرت حلیمہؓ نے بہت چھپانے کی کوشش کی لیکن بالآخر سینہ مبارک چاک کرنے کا واقعہ بیان کرنا پڑا اس پر آپؐ کی والدہ ماجدہ نے فرمایا کہ اللہ کی قسم شیطان کا بس میرے اس بچّے پر نہیں چل سکتا اور یہ میرا بیٹا بڑی امتیازی شان کا مالک ہے۔ (ابن ہشام ۱/۲۸۹)

بچپن میں قلب کی اس شاندار پاکیزگی کا اثر یہ ہوا کہ پوری زندگی کسی بھی گناہ اور معصیت کا خیال بھی آپؐ کے دل میں نہیں آیا اور نہ کبھی کسی بے حیائی کے کام میں شرکت ہوئی حتیٰ کہ بچپن کا زمانہ بھی ورع وتقویٰ کے اعتبار سے اس شان سے گذارا کہ جسکی مثال پیش نہیں کی جاسکتی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے بچپن میں بھی آپؐ کو ایسی صاف شفاف زندگی عطا فرمائی کہ بڑے ہونے کے بعد نبوت کے اعلان پر مخالفت کا جو طوفان کھڑا ہوا تو کسی بڑے سے بڑے بدترین مخالف کو بھی آپؐ کی زندگی کے کسی بھی لمحے پر اخلاقی اعتبار سے ادنیٰ سی انگلی اٹھانے کا بھی موقع نہ مل سکا۔

دنیوی سہارے ہٹادئے گئے

اللہ کی حکمت بھی کتنی عجیب ہے کہ اس آخری دریتیم کی پیدائش اس حال میں ہوئی کہ اس کے والد ماجد عبداللہ نورنظر کے وجود سے پہلے ہی وفات پا چکے تھے، پھر جب آپؐ رضاعت کے لئے اپنی والدہ کی آغوش میں آئے تو کچھ ہی عرصے کے بعد آپؐ کی والدہ بھی آپؐ کو چھ سال کی عمر میں چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوگئیں، پھر آپؐ کی کفالت کی ذمہ داری دادا عبدالمطلب نے لی لیکن آٹھ سال کی عمر میں وہ بھی داغ مفارقت دے گئے۔ (ابن ہشام وغیرہ)

دل میں سوال اٹھتا ہے کہ اللہ نے اپنے محبوب کو اتنی جلدی ان قریبی سہاروں سے کیوں محروم کردیا.؟ تو اسکی حکمت صاف طور پر یہ معلوم ہوتی ہے کہ انسان کی تربیت میں سب سے بڑا دخل ماں باپ کا ہوتا ہے اسی طرح پرعظمت آباء واجداد کی توجہات سے بھی انسان میں نکھار آتا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ انبیاء کی تربیت بلاشرکت غیر خود ہی فرماتا ہے اسے یہ منظور نہیں ہے کہ اسکے منتخب بندوں کو کوئی اور تربیت دے یا ان کی تربیت کا انتساب اللہ کے علاوہ کسی اور جانب ہو، یہاں اگر رسول اکرم ﷺ کے والدین بڑی عمر تک حیات رہتے تو آئندہ جب آپؐ نبوت ورسالت کا اظہار فرماتے اور قرآن کریم کی آیات پڑھکر سناتے تو کسی کہنے والے کی زبان پر یہ بات آسکتی تھی کہ ان آیات واقوال حکمت کا ظہور والدین اور دادا کی حسن تربیت کا نتیجہ ہے اور انکی بہترین صحبتوں کا ثمرہ ہے اسلئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس خیال کی بنیاد ہی کو مٹادیا، اب یہ کسی کو کہنے کا موقع نہیں ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے ذاتی کمالات، اخلاق فاضلہ اور صفات عالیہ کے حصول میں کسی قریبی نگراں یا استاذ کا کوئی دخل ہے اوّل سے آخر تک آپؐ کی مکمل تربیت براہ راست اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمائی اور زندگی کا ہر دن آپؐ کے لئے روحانیت کے اعتبار سے ترقیات سمیٹنے کا عنوان بنتا رہا، مکّہ اور اسکے اطراف میں آپؐ کی انسانیت نوازی، صدق ووفا اور امانت ودیانت کا شہرہ ہوا، لوگوں کے دلوں میں آپؐ کی عزت وعظمت اور آپؐ کی ذات والا صفات پر کامل اعتماد برابر بڑھتا رہا آپؐ کے اخلاق فاضلہ سے متأثر ہوکر مکہ کی سب سے باوجاہت خاتون حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے خود پیش

کش کر کے آپؐ کے حرم میں آنا قبول کیا اور اپنی خوش قسمتی کی بنا پر اللہ کے آخری نبیؐ کی مونس و غمخوار بن گئیں۔ ''ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء''۔

منصب نبوت پر سرفرازی

دیکھتے ہی دیکھتے چالیس سال کی عمر گذر گئی اب آپؐ کو صبح کی روشنی کے مانند سچے خواب نظر آنے لگے اور قدرتی طور پر محبت و معرفت کی ایسی کیفیات طاری ہونے لگیں کہ شہر کی پر رونق زندگی چھوڑ کر تنہائی اور خلوت کی زندگی آپؐ کو محبوب ہوگئی چنانچہ آپؐ کئی کئی روز کے لئے گھر کو چھوڑ کر جبل رحمت پر واقع غار حراء میں جانے لگے یہ وہی غار ہے جو آپؐ کے دادا عبدالمطلب کی خلوت گاہ تھا پھر وہاں سے بیت اللہ شریف صاف نظر بھی آتا تھا اور اس کا جائے وقوع بھی اس انداز کا تھا کہ بالقصد جائے بغیر کوئی شخص وہاں تک رسائی حاصل نہیں کرسکتا تھا، انہی وجوہات کی بنا پر آپؐ نے اس جگہ کا انتخاب فرمایا۔ رمضان المبارک کی ۱۷/ تاریخ تھی جب اسی مقدس مقام پر سب سے پہلے آپؐ پر مقدس ترین فرشتے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے توسط سے سب سے پہلی وحی اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ .الخ (پڑھئے اپنے اس رب کے نام سے جو ہر شئ کا خالق ہے) نازل ہوئی۔ وحی کے تحمل کا یہ پہلا تجربہ تھا اسلئے فطری طور پر کچھ آپؐ کو ڈر محسوس ہوا، فوراً آپؐ حضرت خدیجہؓ کے پاس تشریف لائے اور فرمایا زمّلونی زمّلونی (مجھے چادر اڑھاؤ مجھے چادر اڑھاؤ) جب کملی اڑھانے سے کچھ سکون ہوا تو آپؐ نے پورا واقعہ حضرت خدیجہؓ کو سنایا۔ حضرت خدیجہؓ بڑی ذہین سمجھدار اور فراست والی خاتون تھیں انھوں نے آپؐ کو بہت مؤثر انداز میں دلاسہ دیتے ہوئے فرمایا کہ قسم بخدا! اللہ تعالیٰ آپ کو ہرگز رسوا نہ کرے گا، کیونکہ آپ نہایت اعلیٰ صفات کے حامل ہیں، آپ صلہ رحمی کرتے ہیں آپ مصیبت زدوں کے کام آتے ہیں، آپ اعلیٰ درجہ کے مہمان نواز ہیں، آپؐ یتیموں اور فقیروں کا سہارا ہیں، اور آپ قومی حادثات میں ہر ممکن تعاون کرتے ہیں، بھلا ایسی صفات والا شخص رسوا ہو جائے یہ نہیں ہوسکتا، پھر حضرت خدیجہؓ آپکو اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو بت پرستی سے بیزار

ہوکر دین عیسوی پر قائم تھے انہوں نے واقعہ معلوم کر کے تصدیق کی کہ جو فرشتہ آپکے پاس وحی لایا ہے یہی فرشتہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بھی وحی لایا کرتا تھا اور ساتھ میں یہ وعدہ بھی کیا کہ جب آپکی قوم اعلان حق پر آپکے درپئے آزار ہوگی اور مکہ سے نکلنے پر مجبور کرے گی تو اگر میری زندگی رہی تو میں آپکی ہر ممکن مدد کرونگا۔ (بخاری شریف، مسلم شریف، سیرت ابن ہشام، البدایہ والنہایہ وغیرہ)

کارنبوت کی انجام دہی

مقام نبوت پر فائز ہونے کے بعد آپؐ نے پورے عزم و ہمت اور حوصلہ کے ساتھ اپنے فرائض انجام دینے شروع کر دئے جب آپؐ کو دعوت وتبلیغ کا حکم ہوا اور اپنے قریبی اعزاء سے دعوتی کام کا آغاز کرنے کی تلقین کی گئی تو آپؐ نے اپنے تمام اہل خاندان کو اجتماعی اور انفرادی طور پر اسلام کی دعوت پیش کی، جس پر ابولہب اور ابوجہل جیسے لوگ چراغ پا ہوگئے، اور مکہ معظّمہ کی فضا جو اس وقت آپؐ کے حق میں سازگار تھی اچانک ناسازگار ہوگئی، جو لوگ کل تک آپؐ کے اخلاق فاضلہ پر فریفتہ تھے وہی دشمنی میں آگے بڑھتے نظر آنے لگے حتیٰ کہ اپنے قریبی لوگوں نے بھی نظریں پھیرلیں۔ آپؐ کو حکومت، دولت اور عورت کے لالچ دیکر توحید کی دعوت چھوڑ دینے کی پیش کش کی گئی مگر آپؐ نے صاف جواب دیدیا کہ چاہے کچھ بھی ہوجائے میں اپنے منصبی فرض کو نبھانے میں کوئی کوتاہی نہ کرونگا۔ مکہ والوں نے آپؐ کو اور آپکے جانثار صحابہؓ کو ستانے میں بھی کوئی کسر نہ اٹھا رکھی حتیٰ کہ آپؐ کو پورے خاندان سمیت شعب ابی طالب میں تین سال تک مقاطعہ اور سوشل بائیکاٹ کا سامنا کرنا پڑا، مگر یہ وقتی حالات آپکے پائے استقامت میں ادنی سی جنبش بھی نہ پیدا کر سکے۔ اور آپ کلمۂ لا الہ الا اللّٰہ کی صدا پیغمبرانہ شان سے بلند فرماتے رہے۔ اور اس راہ میں ہر مصیبت کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتے رہے، اور اپنی وسعت کے مطابق اللہ کے بندوں کو خالق سے ملانے کا کارنامہ برابر انجام دیتے رہے، اتنے سخت اور ناقابل تصور جاں گسل حالات میں اپنے مشن پر مضبوطی سے ثابت قدم رہنا اولوالعزم نبی آخر الزماں کے ہی شایان شان تھا، عام آدمی تو ان حالات کا کسی بھی درجہ میں گمان بھی نہیں کرسکتا۔

تلاوت، تعلیم اور تزکیہ

اللہ کی مقدس کتاب قرآن کریم کے نزول کا جو سلسلہ غار حراء سے شروع ہوا تھا اسکی تکمیل ۲۳ سال میں ہوئی اور دعائے ابراہیمی کے موافق آپؐ نازل شدہ آیات قرآنیہ کی عوام وخواص کے سامنے تلاوت کر کے اپنا فرض ادا کرتے رہے۔ قرآن کریم آپ اتنا عمدہ پڑھتے تھے کہ لمبی قراءت کے باوجود کبھی بھی سننے والوں میں کوئی اکتاہٹ نہ ہوتی، بلکہ یہی جی چاہتا رہتا کہ ابھی آپ اور پڑھتے رہیں۔ (مشکوۃ شریف ۱/ ۷۹) خود آپ کو قرآن کریم سے اتنا شغف تھا کہ بسا اوقات راتوں رات نماز میں قراءت میں گذار دیتے اور تھکاوٹ کا احساس بھی نہ ہوتا۔ (شمائل ترمذی شریف ۱۹) آپ نے امت کو تلاوت کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا کہ قرآن کے ہر ہر حرف پر ایک ایک نیکی مقرر ہے۔ (ترمذی شریف ۲/ ۱۱۹) اور فرمایا کہ: جو مکمل قرآن پڑھتا رہے گا اسکا مقام جنت کا سب سے اونچا درجہ ہوگا۔ (الترغیب والترہیب ۲/ ۲۲۸) آپ نے قرآن کریم کو بہترین خوبصورت آواز میں پڑھنے کی تلقین فرمائی اور خوشخبری سنائی کہ خوش آوازی سے قرآن پڑھنے والے کی طرف اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت متوجہ ہوتی ہے۔ (الترغیب والترہیب ۲/ ۲۳۶ وغیرہ) آپ نے بحکم خداوندی حضرت ابی ابن کعبؓ کو قرآن کریم خاص طور پر پڑھکر سنایا تا کہ وہ آپؐ کا انداز اور لہجہ محفوظ کر کے امت تک پہنچائیں۔ (اسد الغابہ ۱/ ۶۲) پھر آپ نے حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ سے خود پڑھوا کر قرآن کریم کی سماعت فرمائی اور فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ دوسرے سے پڑھوا کر سنوں اور جب حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ سورۂ نساء پڑھنے لگے تو شدت تاثر سے آپؐ پر گریہ طاری ہو گیا۔ (بخاری شریف ۲/ ۷۵۵)

الغرض کتاب اللہ کی تلاوت اور اسکے الفاظ وحروف کی حفاظت کی ذمہ داری آپؐ نے باحسن وجوہ پوری فرمائی اور حضرات صحابہؓ کے ذریعہ قیامت تک کے لئے اللہ کی اس عظیم امانت کی حفاظت کا انتظام فرمادیا۔

کتاب اللہ کی تفہیم وتشریح

کتاب اللہ کی تلاوت کیساتھ اسکے مطالب ومعانی کی وضاحت اوراسکے مضامین کی تشریح بھی نبی کی بنیادی ذمہ داری ہے اللہ کی کتاب کومحض لغت اورزبان جاننے سے سمجھانہیں جاسکتا۔ اگرمحض لغت دانی سے کتاب اللہ سمجھ میں آجاتی تواس کے ساتھ نبی کوبھیجنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی اس لئے اس حقیقت پرایمان ضروری ہے کہ اللہ کی کتاب کونبی کے توسط کے بغیرسمجھانہیں جاسکتا۔ نبی کودنیامیں مبعوث فرمانے کاایک اہم مقصدیہ بھی ہے کہ وہ امت میں وحی خداوندی کی تفسیروتشریح کافریضہ انجام دے۔ نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے اپنی اس منصبی ذمہ داری کوبھی کامل طریقے پرانجام دیا۔ چنانچہ ذخیرۂ احادیث میں بکثرت ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ آپؐ نے حضرات صحابہ کوقرآنی آیات کے صحیح معانی بتائے اورحضرات صحابہ ظاہری طورپرجومعانی سمجھ گئے تھےان کی تصحیح فرمائی۔

(۱) مثال کے طورپرجب رمضان کے روزوں سے متعلق قرآن کی یہ آیت وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ (اورکھاتے پیتے رہو یہاں تک کہ تمہارے سامنے کالے دھاگے سے سفید دھاگہ ممتاز نہ ہوجائے) نازل ہوئی تو بعض حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کااپنے طورپرمطلب سمجھتے ہوئے یہ عمل شروع کردیاکہ کالا اور سفید دھاگا بستر کے نیچے رکھ کرسوجاتے تھےاورجب تک اتنی روشنی نہ پھیل جاتی کہ وہ دونوں الگ الگ نظرآنے لگیں کھاتے پیتے رہتے تھے۔ چنانچہ حضرت عدی بن حاتمؓ فرماتے ہیں کہ میں نے بھی یہی عمل کیااورصبح کوجاکرحضوراکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پوراقصہ بیان کردیاتوآپؐ نے اس آیت کاصحیح مطلب واضح کرتے ہوئے فرمایا:

اِنَّ وَسَادَكَ اِذاً لَعَرِيْضٌ اِنَّمَا ذٰلِكَ بَيَاضُ النَّهَارِ وَسَوَادُ اللَّيْلِ.

(تفسیر ابن کثیر عن الصحیحین ۱۵۰)

(اگرتمہاری سمجھ درست ہےتو) تمہارابستر بہت چوڑا ہے (جس میں مشرق ومغرب کی وسعتیں جمع ہوگئیں ایسانہیں ہے بلکہ آیت میں کالےاورسفید دھاگے سے مراد) دن کی روشنی اوررات کی اندھیری ہے۔

دیکھئے یہ حضرات صحابہ اگر چہ عربی داں تھے لیکن جب تک پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے وضاحت نہیں فرمائی قرآن کی صحیح مراد تک نہیں پہنچ سکے۔

(۲) اسی طرح جب سورۂ انعام کی آیت **اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْا اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ**. الخ نازل ہوئی جس میں کامیابی اور ہدایت کا مدار اس پر رکھا گیا ہے کہ آدمی اپنے ایمان کے ساتھ کسی طرح کے ظلم کو شامل نہ کرے تو حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اس آیت کے ظاہری معنیٰ سے بہت بے چین ہو گئے اور حضور اکرم ﷺ سے سوال کیا کہ **یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَیُّنَا لَمْ یَظْلِمْ نَفْسَہٗ** ؟ (اے اللہ کے رسول ہم میں سے کون ایسا ہے جو اپنے اوپر ظلم نہ کرتا ہو یعنی کوئی نہ کوئی گناہ تو ہو ہی جاتا ہے) تو آنحضرت ﷺ نے حضرات صحابہؓ کی غلط فہمی یہ ارشاد فرما کر دور کی:

اِنَّہٗ لَیْسَ الَّذِیْ تَعْنُوْنَ اَلَمْ تَسْمَعُوْا مَا قَالَ الْعَبْدُ الصَّالِحُ یَا بُنَیَّ لَاتُشْرِكْ بِاللّٰہِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ اِنَّمَا ھُوَ الشِّرْكُ.

(نقلہ الحافظ ابن کثیر عن الامام احمد ٤٨٤)

اس کا وہ مطلب نہیں ہے جو تم سمجھتے ہو کیا تم نے اللہ کے نیک بندے (حضرت لقمانؑ) کا یہ قول نہیں سنا کہ میرے بیٹے اللہ کے ساتھ شرک مت کرنا بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے اس لئے یہاں آیت میں ظلم سے شرک ہی مراد ہے۔

(۳) علاوہ ازیں آنحضرت ﷺ کی پوری زندگی قرآن کریم کی آیات کی عملی تفسیر تھی جو بھی اخلاق اور روحانی ہدایات قرآن کریم میں امت کو دی گئیں حضور اکرم ﷺ نے اپنی پوری زندگی کو ان ہدایات میں اس طرح کامل طور پر ڈھال لیا تھا کہ آپؐ کی زندگی خود قرآن کی تفسیر بن گئی تھی۔ اور اس میں اس حد تک مطابقت عیاں تھی کہ قرآن سمجھنے کے لئے آپؐ کی زندگی کا مطالعہ کرنا ناگزیر تھا اسی طرح خود آپکی ذات کو سمجھنے کے لئے الگ سے کوئی بات کہنے کے بجائے قرآن کریم کے مطالعہ کا مشورہ دیا جاتا تھا اسی لئے روایت میں وارد ہے کہ جب حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ اماں جان! یہ بتائیے کہ آنحضرت ﷺ کے اخلاق کیا تھے؟ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے برجستہ جواب دیا کہ آنحضرت ﷺ کے اخلاق طیبہ تو

قرآن کریم کی بیان کردہ صفات طیبہ کی عملی تشریح تھے آپ نے سورۂ مؤمنون کی ابتدائی آیتیں جن میں اہل ایمان کی امتیازی صفات بیان کی گئی ہیں پڑھکر سنائیں اور فرمایا کہ یہی آنحضرت ﷺ کے اخلاق تھے۔(اخرجه النسائی فی تفسیره تفسیر ابن کثیر ۹۰۸)

اسی طرح کی اور بہت سی مثالیں ذخیرۂ احادیث میں موجود ہیں جو اس بات کی بیّن دلیل ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے قرآن کریم کے معانی کی تفہیم میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اور اس ذمہ داری کو ادا کر کے اپنے مقصد بعثت کی تکمیل فرمائی۔

حکمت کی تعلیم

حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دعا میں جس رسول کو مبعوث کرنے کی درخواست کی گئی ہے اس کی ذمہ داریوں میں یہ بھی شامل ہے وہ حکمت کی تعلیم دے۔حکمت ایک جامع لفظ ہے جس کے معنی گیرائی کی باتوں کے آتے ہیں۔اس میں قرآن کی تفسیر بھی شامل ہے اور فقہ وحدیث کے تمام ذخیرے بھی اسی لفظ کے مفہوم میں داخل ہیں۔اور بلاشبہ حضور اکرم ﷺ نے اپنی امت کو حکمت کی باتوں کی تعلیم دی ہے۔احادیث کی کتابیں ان قیمتی باتوں سے بھری ہوئی ہیں۔جن کے مطالعہ اور استحضار سے دلوں میں ایسا نور اور روشنی پیدا ہوتی ہے کہ ہر دینی مسئلہ کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔جس کو یہ دولت نصیب ہو جائے اس کے لئے اس سے بڑھکر کوئی سعادت نہیں۔اسی لئے قرآن کریم میں فرمایا:**ومن یوت الحکمة فقد اوتی خیرًا کثیرا.** (جس کو حکمت عطا کردی گئی تو اسے خیر کثیر سے نوازا گیا)اور آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لَاحَسَدَ اِلَّا فِی اثْنَتَیْنِ رَجُلٌ اَعْطَاهُ اللّٰهُ مَالًا فَسَلَّطَهٗ عَلٰی هَلْکَتِهٖ فِی الْحَقِّ وَرَجُلٌ اَعْطَاهُ اللّٰهُ حِکْمَةً فَهُوَ یَقْضِیْ بِهَا وَیُعَلِّمُهَا.

حسد (رشک) صرف دو شخصوں کے بارے میں کرنا جائز ہے اول وہ شخص جسے اللہ نے مال ودولت سے سرفراز فرمایا پھر اسے راہ حق میں خرچ کرنے کی توفیق عطا فرمائی اور دوسرے وہ شخص

(مسند احمد ۳۶۵۱ تفسیر ابن کثیر ۲۱٤) جسے اللہ تعالیٰ نے حکمت سے نوازا جس کے ذریعے سے وہ فیصلے کرتا ہے اور اسکی تعلیم دیتا ہے۔

حکمت کے متعلق آنحضرت ﷺ کا یہ حکیمانہ ارشاد بھی مروی ہے کہ: **رَأْسُ الْحِكْمَةِ مَخَافَةُ اللّٰہِ.** (کشف الخفاء ۳۷۲/۱) یعنی حکمت کی بنیاد خوف خداوندی پر ہے۔ جو شخص جتنا زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوگا اتنا ہی اس کی زبان سے اقوال حکمت کا صدور ہوگا۔ ظاہر ہے کہ حضور اکرم ﷺ سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا کون ہوسکتا ہے؟ اس لئے آپکی زبان مبارک سے انتہائی جامع مفید اور نفع بخش حکمت کے مضامین پوری زندگی سامنے آتے رہے جوامت کے لئے ہر موڑ پر رہنمائی کا ذریعہ ہیں۔ یہ اقوال حکمت جنہیں احادیث کہا جاتا ہے امت اسلامیہ کا وہ بے نظیر قیمتی سرمایہ ہے جسکی مثال کسی اور امت میں اس شان کے ساتھ نہیں ملتی۔

تزکیہ کا اہتمام

کتاب اللہ کی تلاوت و تعلیم کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس بات کی نگرانی کیجائے کہ کتاب اللہ پڑھنے والے لوگ آیا اس کے تقاضوں کو پورا بھی کررہے ہیں یا نہیں؟ اور یہ کتاب ہدایت ان کی زندگی کے رگ وریشے میں اور اعمال واخلاق میں نفوذ کررہی ہے یا نہیں؟ اسی نگرانی کا نام تزکیہ ہے۔ جو انبیأ علیہم السلام کی اہم ترین ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ تعلیم اور رہنمائی تو نسبتاً آسان ہے لیکن تربیت اور تزکیہ کے ذریعے افراد سازی انتہائی مشکل اور بیدار مغزی کا کام ہے۔ تزکیہ میں دو چیزیں خاص طور پر پیش نظر رہتی ہیں۔(۱) **التحلی من الفضائل** (اخلاق فاضلہ سے آراستہ کرنا)(۲) **التخلی عن الرذائل** (اخلاق رذیلہ سے نجات حاصل کرنا) تمام انبیأ علیہم السلام کی محنت ان ہی دو نکات کے اردگرد گھومتی نظر آتی ہے۔ ہمارے آقا سرور کائنات فخر موجودات سیدنا ومولانا محمد رسول ﷺ نے امت کے تزکیہ کا کام اس شان سے کیا کہ بڑے سے بڑے بگڑے ہوئے لوگ آپکی ادنیٰ توجہ اور تربیت سے منٹوں سکنڈوں میں روحانیت کے ایسے اعلیٰ درجوں پر فائز ہوگئے کہ ان کے بعد آنے والا کوئی بڑے سے بڑا عبادت گذار یا عالم ان کے

پاسنگ تک بھی نہیں پہنچ سکتا۔ حضور اکرم ﷺ کے فیض صحبت سے جن حضرات کو کچھ بھی استفادہ اور استفاضہ کا موقع مل گیا وہ چند لمحوں میں کندن بن گئے بعد میں آنے والا امت کا کوئی فرد ان کا ہمسر ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ آنحضرت ﷺ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے ایک عمل پر اور ایک ایک حرکت پر پوری گہرائی سے نظر رکھتے تھے۔ اور جب بھی یہ محسوس فرماتے کہ صحابہ سے کوئی ایسا کام صادر ہو رہا ہے جو ان کی شان صحابیت سے فروتر ہے آپ فوراً متنبہ فرما کر ان کا رُخ صحیح نظریہ کی طرف پھیر دیتے تھے۔

(۱) مثال کے طور پر انصار کے قبیلہ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ (جو انتہائی جلیل القدر صحابی تھے) کے غزوۂ خندق میں ایک زخم لگنے کی بنا پر جب انکا حادثۂ وفات پیش آیا اور صحابہ نے اسے بہت محسوس کیا تو اس کے کچھ دنوں کے بعد حضور اکرم ﷺ کی مجلس میں امیر دومۃ الجندل کی طرف سے ریشم کے کچھ کپڑے آئے۔ صحابہؓ ان کپڑوں کی عمدگی دیکھکر تعجب کرنے لگے اور بار بار ان کو ہاتھ لگا کر دیکھنے لگے نبی اکرم ﷺ کو احساس ہو گیا کہ ان حضرات کی توجہ آخرت سے ہٹ کر دنیا داری کی طرف ہونے لگی ہے۔ اس لئے فوراً آپ نے حضرات صحابہ کی توجہ آخرت کی طرف مبذول فرمائی اور یہ ارشاد فرمایا: **لَمَنَادِیْلُ سَعَدِ بْنِ مُعَاذٍ فِی الْجَنَّةِ خَیْرٌ مِّنْ هٰذَا** (مسلم شریف ۲/۲۹۴) یعنی ان دنیوی ریشم کے رومالوں میں کیا رکھا ہے؟ جنت میں حضرت سعد بن معاذؓ کو جو رومال پیش کئے گئے ہیں وہ اس سے کہیں زیادہ بہتر ہیں۔ یہ ارشاد سن کر حضرات صحابہؓ متنبہ ہو گئے اور دنیا داری کی طرف ان کی جو توجہ ہونے لگی تھی وہ وہیں ختم ہو کر رہ گئی۔

(۲) اسی طرح ایک مرتبہ یہ واقعہ پیش آیا کہ آپ وضو کرنے کے لئے تشریف فرما ہوئے حضرات صحابہؓ حسب معمول آپ کے ارد گرد جمع ہو گئے اور آپ کے وضو کا پانی زمین پر گرنے سے پہلے اپنے ہاتھوں پر لے لے کر چہرے اور سینے پر ملنے لگے۔ یہ منظر دیکھ کر حضور اکرم ﷺ نے سوال کیا کہ آخر تم لوگ یہ عمل کیوں کر رہے ہو؟ تو حضرت صحابہؓ نے جواب دیا کہ اللہ

اور اس کے رسول سے محبت کیوجہ سے ہم یہ عمل کر رہے ہیں ان کا یہ جواب سن کر پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے محسوس فرمایا کہ کہیں یہ جذبات محبت صرف چند رسمی اعمال تک محدود ہوکر نہ رہ جائیں اس لئے حضرات صحابہ کی تربیت کی غرض سے بہت جامع ہدایت ان الفاظ سے ارشاد فرمائی :

مَنْ سَرَّهُ اَنْ يُّحِبَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اَوْيُحِبُّهُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ فَلْيَصْدُقْ فِيْ حَدِيْثِهٖ اِذَا حَدَّثَ وَلْيُؤَدِّ اَمَانَتَهٗ اِذَائْتُمِنَ وَلْيُحْسِنْ جِوَارَ مَنْ جَاوَرَهٗ.

(شعب الایمان ۲/۲۰۱)

جس کو یہ بات اچھی لگے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرے یا وہ اللہ اور اس کے رسول کا محبوب بن جائے تو اسے چاہئے کہ جب گفتگو کرے تو سچ بولے اور جب اسے امین بنایا جائے تو امانت ادا کرے اور اپنے پڑوسی کا حق ہمسائیگی بہتر انداز میں ادا کرے۔

اس شاندار ہدایت سے امت کو یہ نصیحت ملی کہ دعویٰ محبت میں محض زبانی جمع خرچ کافی نہیں بلکہ اس کے تقاضوں پر عمل کرنا لازم ہے۔ احادیث طیبہ میں جابجا انسانیت اور شرافت کی تعلیم دی گئی ہے اور ہر اس کام سے صراحتاً منع کر دیا گیا ہے جس سے دنیا میں فساد پھیلے یا انسانیت داغدار ہو۔ یہ سب اخلاقی ہدایات روحانی تزکیہ کا موثر ترین ذریعہ ہیں۔ زندگی میں روحانی انقلاب لانے کے لئے وہی طریقے موثر ہیں جن کو تزکیہ کے لئے حضور اقدس ﷺ نے اختیار فرمایا ہے۔

نبوت کا مشن جاری رہے گا

آنحضرت ﷺ کی نبوت چوں کہ تا قیامت جاری رہے گی اس لئے آپ کے پردہ فرمانے کے بعد بھی آپ کا مشن برابر جاری رہا اور ان شاء اللہ تا قیامت جاری رہے گا۔ ہر دور میں ہر جگہ اللہ کے ایسے مُوفّق من اللہ بندے موجود رہے ہیں جو کار نبوت کی انجام دہی میں ہمہ تن مشغول رہتے ہیں۔ امت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے رسول ﷺ کے تمام کاموں کو جاری رکھنے کے لئے ہر ممکن توجہ دے۔ اور بہتر انتظام کرے۔ بالخصوص اس پُرفتن دور میں علماء امت کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ تعلیم

کتاب وسنت کے ساتھ تزکیہ کی طرف خاص توجہ مبذول کریں کیوں کہ عمل کی طاقت کے بغیر محض علم ترقی نہیں کرسکتا۔ مدارس ومکاتب میں تزکیہ کا خاص اہتمام ضروری ہے پڑھانے والے اللہ والوں کے صحبت یافتہ ہونے چاہئیں تاکہ ان کی پُر تاثیر صحبت سے ان کے شاگرد فائدہ اٹھاسکیں۔ خوف خدا اور فکر آخرت ہمہ وقت پیش نظر رہنی چاہئے۔ دیانت وامانت اور اخلاق فاضلہ کے حصول کی برابر کوشش جاری رہنی چاہئے۔ اور ہر قسم کے رذائل سے خود بچنے اور دوسروں کو بچانے کا اہتمام ہونا چاہئے۔ یہی چیز ہر مسلمان کے لئے عند اللہ اور عند الناس مقبولیت کی بنیاد ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ محض اپنے فضل اور کرم سے اور اپنی خاص توفیق سے نبوت کے مشن میں حصّہ لینے اور دین کی خدمت میں شریک رہنے کی توفیق ارزانی فرمائے اور تاقیامت تعلیم وتزکیہ کے مراکز کو آبادی وشادابی عطا فرمائے اور ان کو داخلی وخارجی ہر طرح کے فتنوں سے محفوظ رکھے۔ آمین

(ماہ نامہ ندائے شاہی جولائی، اگست ۲۰۰۰ء)

دین کے اُصول وفروع

اللہ کے مقرب بندوں کی منجملہ خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ خداداد دِقتِ نظر اور گیرائی کی بدولت چند الفاظ میں ایسے حقائق بیان فرما دیتے ہیں جن کی شرح کے لئے بڑی بڑی کتابیں بھی ناکافی ہوتی ہیں۔ مثلاً ابوعبداللہ الصبیحیؒ ایک بڑے بزرگ گزرے ہیں۔ ان سے ایک مرتبہ لوگوں نے سوال کیا کہ دین اسلام کے اصول وفروع کیا ہیں؟ تو آپ نے نہایت جامعیت کے ساتھ چند جملوں میں پورے دین کا خلاصہ بیان فرما دیا۔ آپ نے فرمایا کہ دین کے اصول دو ہیں۔

پہلا اصول : صِدْقُ الْاِفْتِقَارِ اِلَی اللّٰہِ تَعَالٰی۔ یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف مخلصانہ احتیاج۔ اس جملہ میں وحدانیت کے تمام پہلو آ گئے۔ اور شرک کے ہر شائبہ سے اجتناب کا اعلان ہو گیا کہ آدمی کو ہر معاملہ میں اللہ تعالیٰ ہی کا محتاج رہنا چاہیئے۔ غیر اللہ پر بھروسہ کرنا اس کے سامنے دامن پھیلانا منتیں مانگنا اور چڑھاوے چڑھانا یہ سب اصولِ دین کے خلاف ہے۔

دوسرا اصول: حُسْنُ الْاِقْتِدَاءِ بِرَسُوْلِ اللّٰہِ صَلّٰی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔ یعنی ہر مسلمان رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شاندار اقتداء اور اتباع کی کوشش کرے۔ اور اپنے ظاہر و باطن، لباس، گفتار، رفتار ہر چیز کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق بنائے اگر اس کے خلاف کرے گا تو دینی اصول کے خلاف ورزی کرنے والا ہوگا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے بہترین نمونہ بنایا ہے۔ جو شخص اس نمونہ سے جتنا زیادہ مشابہ ہوگا اتنا ہی اپنے رب کا پسندیدہ ہوگا اور جو اس نمونہ سے جتنا مخالف ہوگا اگرچہ وہ اپنے کو کتنا ہی اچھا سمجھتا ہو وہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں ناپسند ہی رہے گا۔

شیخ ابوعبداللہؒ نے پھر آگے فرمایا کہ دین کے فروع یعنی جزئی احکام کا خلاصہ کل چار باتیں ہیں۔ جو ان باتوں کا اہتمام کرے وہ دین کے تمام جزئی احکامات پر عمل کرنے والا ہو جائے گا۔

(۱) اَلْوَفَاءُ بَالْعُهُوْدِ : یعنی اللہ نے بندے سے جو عہد لیا ہے اس کی پاسداری کرنا، تمام فرائض وواجبات اور حقوق کی ادائیگی یہ سب ایفاءِ عہد میں داخل ہے۔

(۲) وَحِفْظُ الْحُدُوْدِ : اور تمام حدود وموانع کی حفاظت کرنا۔ یعنی ہر گناہ سے اپنے آپ کو بچانا، حرام اور مشتبہ چیزوں سے اجتناب کرنا اور ہر معاملہ میں اعتدال کو اختیار کرنا۔

(۳) وَالرَّضَاءُ بِالْمَوْجُوْدِ : اور جو دنیوی ساز وسامان اللہ نے دیا ہے اس پر راضی رہنا اور شکر بجالانا۔ یہ نہیں کہ بس ہمیشہ زیادتی ہی کی فکر رہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا ہے کہ آدمی اگر دنیوی معاملات میں اپنے سے نیچے پر نظر رکھے تو اس کے دل میں شکر کا جذبہ پیدا ہوگا اس لئے جو اللہ تعالیٰ عطا فرمائے بس اس پر دل سے راضی رہنا چاہئے۔ زیادہ کی طرف نظر کر کے ناشکری نہیں کرنی چاہئے۔

(۴) وَالصَّبْرُ عَلَى الْمَفْقُوْدِ : اور جو نعمت جاتی رہے اس پر صبر کرنا۔ یہ صبر بجائے خود مومنین کے لئے رحمت ہے۔ قرآن کریم میں جابجا صبر کرنے والوں سے بے حساب اجر کا وعدہ فرمایا گیا ہے۔ حضرت ابراہیم بن ادہمؒ نے ایک شخص کو دیکھا جس کی دوکان میں آگ لگنے کی وجہ سے بہت سامان ضائع ہو گیا تھا اور وہ اس حادثہ کی وجہ سے دیوانہ سا ہو گیا تھا اور ہائے واویلا مچارہا تھا۔ حضرت ابراہیمؒ نے اسے سمجھایا: ارے اللہ کے بندے! یہ مال اللہ کا ہے وہ جب تک چاہے اس سے تجھے فائدہ پہنچائے اور جب چاہے تجھ سے لے لے اس لئے اس کے فیصلہ پر صبر کر اور شور نہ مچا۔ اور عافیت پر شکر میں سے یہ بات ہے کہ مصیبت پر آدمی صبر کرے۔ اور جو اپنی نیکی آگے پہنچادے گا وہ اسے آخرت میں پائے گا اور جو نہیں پہنچائے گا اسے آخرت میں کفِ افسوس ملنا پڑے گا۔

(شعب الایمان للبیہقی ۲۲۸/۷-۲۲۹)

کوشش کرنی چاہئے کہ ہم شیخ کے بیان کردہ اصول وفروع پر سختی سے عمل پیرا ہوں اور سچے پکے مسلمان بن جائیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق سے نوازے آمین۔ (ندائے شاہی، مارچ ۱۹۹۸ء)

❍❖❍

فکر آخرت کا عبرت انگیز نمونہ

امیر المؤمنین خلیفہ راشد سیدنا حضرت عمر بن عبد العزیزؒ اسلامی تاریخ کے اس درخشاں ستارے کے مانند ہیں جسکی ضیاباریاں زندگی کی تاریکیوں میں منارۂ نور کی حیثیت رکھتی ہیں۔حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ایسے ناموافق ماحول میں عدل وانصاف اور زہد فی الدنیا کا شاندار نمونہ پیش فرمایا جب ملوکیت کو ذاتی ملکیت بنا کر ساری احتیاطیں بالائے طاق رکھ دی گئی تھیں، فقر وفاقہ اور بے چارگی کے عالم میں زہد کا مظاہرہ کوئی بڑا کمال نہیں۔کمال تو یہ ہے، کہ انسان تمام دنیوی اسباب ووسائل اور منصب وحکومت پر پورا اختیار رکھنے کے باوجود عدل وانصاف اور دیانت وامانت پر عمل پیرا ہو اور ہر حق دار تک حق رسائی کا اہتمام کرے، یہ کام جتنا مشکل ہے اتنا ہی باعث اجر وثواب بھی ہے ایسے شخص کو میدان محشر میں عرش کے سائے میں عزت کے ساتھ تشریف رکھنے کا مژدہ سنایا گیا ہے۔(مسلم شریف ۱/۲۳۱)

لیکن اس کسوٹی پر پورا اترنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ایسے بلند کردار کے افراد دنیا میں خال خال ہی پیدا ہوتے ہیں۔انہی میں سیدنا حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کا اسم گرامی آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے اور پوری امت کے لئے مشعل راہ اور لائق اتباع ہے۔بالخصوص جو حضرات اللہ کے فضل سے کسی قومی یا ملی منصب پر فائز ہیں، اور قومی یا ملی خزانوں کی چابیاں ان کے تصرف واختیار میں ہیں انہیں چاہئے کہ وہ ہر وقت خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی شاندار اور قابل رشک زندگی کو پیش نظر رکھیں اور اس سے عبرت حاصل کریں۔ایسی ہی زندگی دراصل انسان کو ابدی زندگی میں عزت واحترام کا مقام دلا سکتی ہے۔بلکہ دنیا میں بھی اس کو حیات طیبہ سے نواز سکتی ہے۔

مشہور مورخ حافظ ابن کثیر دمشقی (المتوفی ۷۷۴ھ) حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب آپ کو اموی خلیفہ سلیمان بن عبد الملک بن مروان کے بعد خلافت اسلامیہ کا منصب عطا کیا گیا۔ اور آپ سریر آرائے خلافت ہونے کے لئے گھر سے چلنے کو تیار ہوئے۔ تو اسلامی فوج کا کمانڈر انچیف حسب معمول آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور آپ کے آگے ہتھیار بند فوج کی ایک پوری بٹالین بطور اعزاز لے چلنے کی اجازت چاہی (جیسا کہ اس سے پہلے خلفاء کے ساتھ اس کا معمول جاری تھا) تو حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے فرمایا کہ مجھے اس سے کیا غرض ! تم لوگ میرے سامنے سے ہٹ جاؤ میں بھی تو ایک عام مسلمان شخص کی طرح ہوں (پھر یہ آن بان کیسی؟) اس کے بعد آپ اپنے رفقاء کے ساتھ مسجد میں تشریف لائے اور ممبر پر پہونچ کر سب سے پہلے یہ ارشاد فرمایا :

''حاضرین کرام ! مجھے میرے مطالبہ، مشورے اور رائے کے بغیر اس عظیم منصب پر بٹھا دیا گیا ہے۔ اس لئے میں آپکے سامنے اس ذمہ داری سے بری ہوتا ہوں۔ آپ لوگ اپنے اور اپنی حکومت کے لئے جس کو چاہیں منتخب کر لیں''۔

یہ سن کر مجمع میں شور مچ گیا اور سب نے بیک آواز آپ کی اطاعت وانقیاد کا اظہار یہ کہکر کیا کہ ''ہم سب آپ سے راضی ہیں اور ہم اپنے لئے آپ ہی کو منتخب کرتے ہیں''۔ پھر جب مجمع پُر سکون ہوا۔ تو آپ نے اللہ رب العزت کی حمد وثنا کرنے کے بعد خلافت کا سب سے پہلا خطبہ اس طرح دیا :

''اے لوگو ! میں تم کو اللہ سے ڈرنے کی تاکید کرتا ہوں، اس لئے کہ اللہ کا ڈر ہر چیز کے قائم مقام ہے۔ مگر اس کے قائم مقام کوئی اور چیز نہیں۔ اور موت کی یاد کثرت سے کیا کرو کیونکہ وہ لذتوں کو بے کیف کرنے والی ہے۔ اور موت آنے سے پہلے اس کی بہتر تیاری کرو اور یہ امت اپنے خدا، اپنی کتاب اور اپنے نبی کے بارے میں اختلاف نہیں کریگی لیکن ان کا اختلاف دینار ودرہم اور روپیہ پیسہ پر ہوگا اور اللہ کی قسم میں نہ تو کسی کو ناحق دونگا اور نہ کسی کا حق روکونگا۔ پھر بلند

آواز سے فرمایا کہ اے لوگو ! جو اللہ کی اطاعت کرے اسکی اطاعت واجب ہے اور جو اللہ کی نافرمانی کرے وہ اطاعت کے لائق نہیں، اس لئے میری اطاعت اسی وقت تک کرنا جب تک میں اللہ کی اطاعت کروں اور اگر (خدانخواستہ) میں اللہ کی نافرمانی کرنے لگوں تو میری اطاعت کا کوئی حق نہیں ہے۔''

اس کے بعد آپ ممبر سے نیچے اتر آئے۔اور گھر تشریف لاکر دروازوں اور کھڑکیوں پر جو زیب وزینت کے پردے پڑے ہوئے تھے انہیں اتارنے کا حکم دیا اور جو قالینیں پہلے خلفاء کے لئے جابجا بچھی ہوئی تھیں انکو بیچ کر انکی قیمت سرکاری خزانے میں داخل فرمادی۔

اس کے بعد آپ کچھ دیر قیلولہ کرنے کے لئے کمرہ میں تشریف لے گئے تو آپ کے ایک صاحبزادے جنکا نام عبدالملک تھا تشریف لائے اور عرض کیا کہ ابا جان اب کیا ارادہ ہے؟ آپ نے فرمایا کہ بیٹے میں کچھ دیر قیلولہ کرنا چاہتا ہوں۔ بیٹے نے عرض کیا: ابھی تک مظلوموں تک ان کا حق نہیں لوٹایا گیا اور آپ آرام فرمانے جارہے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: میں گذشتہ رات جاگتا رہا اب نماز ظہر پڑھ کر یہ کام انجام دونگا۔تو صاحبزادے نے عرض کیا کہ: اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ آپ ظہر تک زندہ رہیں گے؟ یہ سن کر آپ نے اس بچے کو قریب بلایا اور اسکی پیشانی کو بوسہ دیا اور پھر یہ کہتے ہوئے بے اختیار آپکے ہاتھ بارگاہ ایزدی میں اٹھ گئے کہ:

''تمام تعریفیں اس خدائے رحمٰن ورحیم کو زیب دیتی ہیں جس نے مجھے ایسی اولاد عطا فرمائی ہے۔جو دین پر چلنے میں میری اعانت کرتی ہے''۔

پھر آپ آرامگاہ سے باہر تشریف لائے اور منادیوں کو حکم دیا کہ اعلان کردیں کہ جس کے ساتھ بھی ظلم ہوا ہو وہ آکر فریاد کرے اسکی فریاد سنی جائیگی، چنانچہ ایک ذمی شخص آیا اور اس نے اپنا مقدمہ پیش کیا، اور درخواست کی کہ اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔اس نے دعویٰ کیا کہ عبدالملک کے پوتے عباس بن ولید نے میری جائداد غصب کرلی ہے۔عباس بھی مجلس میں موجود تھا حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اسکی طرف متوجہ ہوئے اور واقعہ کی تصدیق چاہی۔تو اس نے جواب دیا

کہ جی ہاں یہ جائداد میرے قبضہ میں ہے لیکن میرے والد ولید بن عبدالملک نے اس کو میرے نام پر رجسٹرڈ کیا تھا جس کا ثبوت میرے پاس موجود ہے۔اس پر ذمی نے کہا میں تو حکم شرعی کے مطابق فیصلہ چاہتا ہوں، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے فرمایا کہ ہاں حکم خداوندی ولید کی رجسٹری سے زیادہ اہم ہے، اور عباس کو حکم دیا کہ جاؤ ابھی اسکی جائداد اسکو واپس کرو۔ اسی طرح جن جن لوگوں پر خانوادۂ بنومروان نے ظلم کر رکھا تھا وہ آتے گئے اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ان کی دادرسی فرماتے رہے۔ حتیٰ کہ حکومت کے خاندان والوں کے پاس جو جو مال استحقاق کے بغیر ثابت ہوا وہ سب مستحقین تک یا بیت المال میں واپس کرادیا۔

حضرت کا یہ طرز عمل دیکھ کر پورے خانوادے میں کھلبلی مچ گئی اور سب اہل خاندان، خاندان کی سب سے بڑی بوڑھی عورت فاطمہ بنت مروان (جو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی پھوپھی تھیں) کے پاس فریاد لیکر گئے کہ جب سے حضرت عمر کو خلافت ملی ہے ہمارا جینا دوبھر ہوگیا ہے اور ہماری عزت داؤ پر لگ رہی ہے آپ ان کو اس عمل سے روکیں چنانچہ فاطمہ نہایت غضبناک حالت میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے پاس آئیں اور شکایات پیش کیں، پہلے تو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ان کی عمر کا لحاظ کرتے ہوئے سمجھانے کی کوشش کی لیکن جب یہ دیکھا کہ ان کا غصہ کسی طرح کم نہیں ہورہا ہے تو پھر پوری صفائی کیساتھ ان سے مخاطب ہوکر ارشاد فرمایا:

''پھوپھی جان اچھی طرح سن لیجئے ! کہ جب آنحضرت ﷺ کا وصال ہوا تو آپؐ نے لوگوں کے لئے ایک پانی سے بھری ہوئی بھرپور نہر (اسلامی خزانہ) چھوڑی آپکے بعد ایسے شخص نے اس کا نظام سنبھالا جس نے اس نہر میں مرتے دم تک ذرا بھی کمی نہ آنے دی پھر دوسرا شخص اس کا ذمہ دار بنا اس نے بھی اپنے جیتے جی کوئی کمی نہ آنے دی۔ پھر تیسرے شخص نے اسکی ذمہ داری سنبھالی تو اس نے اس نہر سے ایک چھوٹی سی نہر الگ نکال لی پھر اس کے بعد جو لوگ آتے رہے وہ اپنے لئے الگ الگ نہریں نکالتے رہے تا آنکہ اصل نہر بالکل سوکھ کر رہ گئی اس میں ایک قطرہ بھی باقی نہیں بچا۔ اب اللہ کی قسم اگر مجھے زندگی نصیب ہوئی تو میں اس نہر کو پہلے ہی بہاؤ پر لیجاؤنگا۔ اب جس کو خوش ہونا ہو خوش

ہواور جس کو ناراض ہونا ہو ناراض رہے۔ (مجھے اسکی کوئی پرواہ نہیں) اور جب ظلم قریبی رشتہ داروں کی طرف سے پایا جائے جو امیر کے مشیر کار ہوتے ہیں اور امیر ان سے ظلم کا ازالہ نہ کرا سکے تو جو دوسرے لوگ ظلم کریں گے ان کو وہ ظلم سے کیسے روک سکے گا''۔ (البدایہ والنہایہ ۹/ ۲۴۹/ ۲۵۰)

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو اللہ نے اپنی ذمہ داری کا ایسا احساس اور خوف وخشیت کے ایسے غلبہ سے نوازا تھا کہ ان کی چہیتی بیوی فاطمہ بنت عبدالملک فرماتی ہیں کہ میں ایک مرتبہ آپکی خلوت گاہ میں گئی تو دیکھا کہ آپ مصلی پر بیٹھے ہیں اور اپنا دست مبارک اپنے چہرۂ مبارک پر رکھ رکھا ہے اور آنسو چہرۂ مبارک پر بہہ رہے ہیں، میں نے عرض کیا کہ کیا ہوا؟ آپ نے جواب دیا فاطمہ! مجھے اس امت کی ذمہ داری دی گئی ہے۔ تو مجھے یہ خیال آیا کہ ملک کے دور دراز علاقوں میں اگر کوئی بھوکا فقیر ہو، بے سہارا مریض ہو، کسی کے پاس کپڑے نہ ہوں، یتیم بچے ہوں، تنہا بیوہ ہو، کوئی مظلوم و مجبور ہو، کوئی مسافر یا قیدی ہو، کوئی بوڑھا یا عیالدار شخص ہو، یا محتاج غریب ہو، تو ان کے بارے میں اللہ رب العزت مجھ سے قیامت میں سوال کریگا اور ان کمزوروں کی طرف سے حضور اکرم ﷺ مجھ پر مدعی ہونگے تو مجھے ڈر ہے کہ ان کے دعویٰ پر میرے پاس کوئی جواب نہ ہو یہی سوچ کر مجھے رونا آرہا ہے۔ (البدایہ والنہایہ ۹/ ۲۳۷)

اللہ اکبر! امت کی کتنی فکر ہے اور آخرت کے خوف کا کتنا غلبہ ہے۔ اسی خوف وخشیت نے دنیا کی ہر لذت کو آپ کی نگاہ میں بے حیثیت بنا دیا تھا فکر تھی تو بس آخرت کی۔ اور شوق تھا تو بس آخرت کی کامیابی کا۔ خلافت سے پہلے آپ نرم ونازک کپڑے پہنتے تھے۔ بہترین غذائیں استعمال کرتے تھے اپنے دور کی سب سے حسین وجمیل عورت اور ناز ونعم میں پلنے والی لڑکی فاطمہ بنت عبدالملک آپکے نکاح میں تھیں، لیکن خلافت کا بارگراں اٹھاتے ہی یہ سب چیزیں آپکی زندگی سے حرف غلط کی طرح مٹ گئیں۔ خلافت کے بعد آپ نے اپنی بیوی کا سب جہیز بیت المال میں جمع کرادیا، اور تمام زیب وزینت کی چیزوں سے علیٰحدگی اختیار کرلی۔ کپڑوں میں بھی حد سے زیادہ سادگی اختیار کی کہ دیکھنے والے حیران رہ جاتے۔ ایک جوڑے کے علاوہ کوئی کپڑا آپ نے اپنے پاس نہیں رکھا۔

ابوسلیمان دارانی فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک عمر بن عبدالعزیزؒ حضرت اویس قرنیؒ سے بھی زیادہ بڑے زاہد تھے اس لئے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے تمام دنیا کی ملکیت حاصل کرنے کے باوجود دنیا سے اعراض کیا۔ جبکہ حضرت اویس قرنیؒ کے بارے میں ہمیں اس کا تجربہ نہیں ہوا کہ اگر ان کو اس طرح دنیا کی ملکیت حاصل ہوتی تو وہ کیا کرتے اور جو تجربہ میں بات آجائے۔ وہ بے تجربہ کے برابر نہیں ہوسکتی۔ (البدایہ والنہایہ ۹/ ۲۴۵)

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو آخرت کی کتنی فکر تھی اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے، کہ آپ نے زندگی کا آخری عام خطبہ دیتے ہوئے حمد وثنا کے بعد یہ ارشاد فرمایا:

''اے لوگو! تمہیں بے کار پیدا نہیں کیا گیا اور نہ تمہیں یوں ہی چھوڑ دیا جائیگا، بلکہ تمہارے لئے ایک لوٹنے کی جگہ مقرر ہے جہاں اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان فیصلہ کرنے کے لئے نزول اجلال فرمائیگا۔ وہ شخص بڑا ہی خائب وخاسر ہے جو اس دن اللہ کی رحمت سے نکل جائے۔ اور اس جنت سے محروم کردیا جائے جس کی وسعت آسمان اور زمین کے برابر ہے۔''

اے لوگو! کیا تمہیں معلوم نہیں کہ کل وہی شخص امن میں رہے گا۔ جو آج آخرت کے دن سے ڈرے اور فانی دنیا کو باقی رہنے والے اعمال کے ذریعہ بیچ دے اور ختم ہونے والی چیز کو دائمی نعمتوں کے بدلے اور تھوڑی کو زیادہ کے بدلہ اور خوف کو امان کے بدلہ فروخت کرے۔

اے لوگو! کیا تم نہیں دیکھتے کہ تم مرنے والوں کے متروکہ مالوں پر قابض رہے۔ اور یہ مال تمہارے بعد رہ جانے والوں کا ہوجائیگا اور یہی سلسلہ برابر چلتا رہے گا یہاں تک کہ رب العالمین خیرالوارثین تک سب چیزیں لوٹ آئیں گی، پھر تم ہر روز ایسے شخص کے جنازوں میں جاتے ہو۔ جو اللہ کی طرف اس طرح لوٹنے والا ہے کہ کبھی واپس نہ آئیگا، وہ اپنی عمر پوری کرچکا یہاں تک کہ تم نے اسے زمین کے گڑھے میں دبا دیا ایسی جگہ جہاں نہ تکیہ ہے نہ قالین ہے۔ اس کا اپنے دوستوں سے جدائی کے بعد مٹی اور حساب کتاب سے واسطہ پڑا ہے اب وہ اپنے عمل میں گروی رکھا ہوا ہے اپنے چھوڑے ہوئے مال سے بے پرواہ ہے اور اپنے آگے بھیجے ہوئے اعمال کا محتاج ہے۔ اس لئے

موت سے پہلے اللہ سے ڈرو۔ اور سفر آخرت سے پہلے اس کا تصور کرو، اور اللہ کی قسم میں اپنے اندر جتنے گناہ جانتا ہوں کسی کو اتنا بڑا گنہگار نہیں جانتا، اور میں اللہ سے استغفار کرتا ہوں۔“

پھر آپ نے اپنی آستین چہرہ پر رکھی، اور اتنا روئے کہ مبارک داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی اور اہل مجلس پر بھی گریہ طاری ہو گیا۔ (البدایہ والنہایہ ۹/ ۲۳۵)

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی زندگی ہمارے لئے نمونہ ہے۔ جب تک آخرت میں جواب دہی کا خوف دامن گیر نہ ہو اس وقت تک کوئی شخص بھی ملی ذمہ داری کما حقہ انجام نہیں دے سکتا، آجکل منصب کے حصول کا تو بڑا شوق ہے طرح طرح کے ہتھکنڈے کرسی حاصل کرنے کے لئے اختیار کئے جاتے ہیں لیکن ذمہ داری کی ادائیگی کے لئے جس جذبے اور تصور کی ضرورت ہے وہ ناپید ہے۔ اسی لئے ہر شخص مادیت میں پھنس کر رہ گیا ہے۔ ہر جگہ استحصال عام ہے ظلم اور حق تلفی کو گناہ ہی نہیں سمجھا جاتا، یہ صورت حال جہاں بھی ہو باعث مذمت ہے اور اگر یہ مرض دینداری کا دعویٰ کرنے والے طبقہ میں پایا جائے۔ تو اسکی شناعت اور بڑھ جاتی ہے۔ اس مرض کی دوا صرف اور صرف فکر آخرت ہے۔ جس کے بغیر صلاح وفلاح کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ امت میں فکر آخرت عام فرمائے۔ اور دیانت وامانت کی دولت سے ہر شخص کو آراستہ کرے۔ آمین.

(ندائے شاہی اپریل ۲۰۰۱ء)

عزیمت کا امتحان

عباسی خلیفہ مامون کے آخری دور میں کچھ شر پسند معتزلی علماء نے خلیفہ کو دام فریب میں گرفتار کر کے پوری امت کو سخت آزمائش اور فتنہ میں مبتلا کر دیا تھا۔ یہ علماء چاہتے تھے کہ پوری امت ان کے غلط عقیدہ کے موافق قرآن کریم کو ''اللہ کی مخلوق'' قرار دے چنانچہ خلیفہ نے تمام گورنروں کو یہ فرمان جاری کر دیا کہ ہر جگہ کے علماء سے اس مسئلہ کے متعلق سوال کیا جائے۔ جو عالم خلق قرآن کا قول کرے اسے چھوڑ دیا جائے اور جو عالم اس سے انکار کرے اسے پا بہ زنجیر دربار خلافت میں پیش کیا جائے تاکہ اسکو عبرت ناک سزا دی جا سکے، اسی دوران خلیفہ مامون کا طرسوس کا سفر پیش آیا تو اس نے بغداد میں اپنے نائب اسحق ابن ابراہیم کو اس بات کا مکلّف کیا کہ وہ یہاں کے علماء سے کلام اللہ کے مخلوق ہونے کی تصدیق کرائے، چنانچہ بہت سے لوگوں نے جبر و اکراہ کی وجہ سے خلیفہ کے منشاء کی تکمیل کر دی اور عزیمت کا راستہ چھوڑ دیا۔ مگر دو علماء حضرت امام احمد بن حنبلؒ، اور حضرت محمد بن نوحؒ پہاڑ کی طرح قرآن کے غیر مخلوق ہونے کے برحق موقف پر ڈٹے رہے اور انھوں نے باطل رائے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو بیڑیوں سے جکڑ کر ایک ہی اونٹ پر دونوں کو سوار کر کے خلیفہ کی جائے قیام کی طرف روانہ کر دیا گیا، امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ راستہ میں ایک دیہاتی شخص مجھ سے ملا اور اس نے مجھ سے اس طرح خطاب کیا۔

''حضرت! آپ قوم کے نمائندہ بن کر جا رہے ہیں لہذا آپ لوگوں کی بدبختی کا باعث نہ بنئے گا آج آپ لوگوں کے مقتدا ہیں، خبردار اگر آپ کے باطل مذہب قبول کر لینے سے لوگوں نے باطل عقیدہ اختیار کر لیا تو ان سب کا بوجھ آپ کی گردن پر ہوگا، حضرت! اگر آپ کو اللہ سے محبت ہے

تو اپنی حالت پر صبر فرمایئے۔ کیوں کہ آپ کے اور جنت کے درمیان صرف شہادت کا فاصلہ ہے، اور اگر آپ شہید نہ کئے گئے تو اپنے وقت پر وفات تو پائیں گے ہی۔ اور اگر زندہ رہ گئے تو شاندار زندگی گزاریں گے"۔

امام احمد فرماتے ہیں کہ اس شخص کی گفتگو نے میرے دلی ارادے کو مزید پختہ کردیا، اسکے بعد جب ان حضرات نے مامون کی جائے قیام سے ایک منزل پہلے پڑاؤ ڈالا تو وہاں مامون کے ایک خادم سے ملاقات ہوئی وہ امام احمد سے روتے ہوئے کہنے لگا کہ آج مامون کو جتنا سخت غصہ ہے اتنا شاید پہلے کبھی نہ ہوا ہو، اسکا پختہ ارادہ یہ ہے کہ اگر آپ نے خلق قرآن کی تائید نہ کی تو آپ کو آج زندہ نہیں چھوڑے گا۔ یہ سن کر امام احمدؒ نے آسمان کی طرف نظر اٹھا کر یہ دعاء مانگی کہ "اے اللہ اگر واقعی تیرا کلام غیر مخلوق ہے تو اس فاجر کے شر سے ہمیں بچالے" چنانچہ ابھی پوری رات بھی نہ گزرنے پائی تھی کہ مامون اسی جگہ وفات پا گیا۔ اور اسکی جگہ معتصم خلیفہ مقرر ہوا یہ بھی خلق قرآن کے معاملہ میں مامون ہی کے نقش قدم پر چلنے والا تھا، اس نے حضرت امام احمدؒ اور حضرت محمد بن نوحؒ کو بغداد لیجا کر قید میں بند کرنے کا حکم صادر کیا اور بعض قیدیوں کے ساتھ ان دونوں حضرات کو کشتی میں بٹھا کر دریائی راستہ سے بغداد روانہ کر دیا گیا۔ راستہ کی شدت کی بنا پر حضرت محمد بن نوحؒ تو درمیان ہی میں واصل بحق ہو گئے، اور حضرت امام احمدؒ کو بغداد لیجا کر کال کوٹھری میں بند کر دیا گیا اور آپ مسلسل ڈھائی سال تک قید با مشقت میں رہے۔

پھر آپ کو رہا کر کے معتصم کے سامنے پیش کیا گیا، آپ نے اس کے سامنے بھی پوری جرأت ایمانی سے قرآن کریم کے غیر مخلوق ہونے کا برملا اظہار کیا، اور تمام بدعتی شر پسند علماء کے اعتراضات کا دنداں شکن جواب دیکر انہیں ساکت وصامت ہونے پر مجبور کر دیا، مگر معتصم کو پھر بھی ہوش نہ آیا اور اس نے اپنے حواریوں کے برانگیختہ کرنے پر آپ کو بدترین مظالم کے لئے تختۂ مشق بنانے کا حکم دیا۔ آپ کے بدن کے کپڑے اتار دیئے گئے، کوڑے مارنے والی لکڑی پر جکڑ دیا گیا، آپ اس حال میں وہ حدیثیں سنا کر رحم کی درخواست کرتے رہے جن میں بے قصور کسی کو ایذا دینے

کی سخت ممانعت کی گئی ہے، مگر معتصم اپنے ارادے سے ٹس سے مس نہ ہوا اور علماء سوء اسے مزید غیظ وغضب دلاتے رہے۔ تا آنکہ چشم فلک نے یہ الم ناک منظر بھی دیکھا کہ اس مرد آھن، حق گو وحق شعار، ارشاد نبوی: " **افضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر** " (ظالم بادشاہ کے روبرو کلمہ حق کہنا افضل ترین جہاد ہے) کے حقیقی مصداق اور سخت فتنہ کے دور میں جماعت حقہ کی لاج رکھنے والے صاحب عزیمت بزرگ کو محض احقاق حق کی وجہ سے کوڑوں کی سخت تکلیف دہ پے در پے ضربوں سے لہولہان کر دیا گیا۔ خود امام احمدؒ فرماتے ہیں: کہ جب کوڑے لگتے تو تکلیف کی شدت کی وجہ سے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت معدوم ہوجاتی۔ اور معتصم اور اسکے حواری بدعتی علماء درمیان درمیان میں مجھے اپنے موقف سے باز رکھنے پر مجبور کرتے رہے مگر میں نے ان کی بات نہ مانی۔ اور پورے شرح صدر کے ساتھ حق پر قائم رہا تا آنکہ شدت تکلیف سے مجھ پر بے ہوشی طاری ہوگئی۔ (البدایہ والنہایہ ملخصاً ۱۰/۸۲-۷۸۵)

ایسے نازک اور فتنہ کے زمانہ میں حق پر جمے رہنا واقعی اولعزم لوگوں ہی کا کام ہے۔ ہما شما تو ایسی ہمت اور پامردی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے امام احمدؒ کی اس اولوالعزمی نے نہ صرف احقاق حق کی ایک مثال قائم کی بلکہ خود ان کا اسم گرامی رہتی دنیا تک کے لئے روشن ہوگیا۔ اس آزمائش سے قبل آپ کے استاد گرامی امام شافعیؒ نے خواب میں آنحضرت ﷺ کی زیارت کی تھی کہ آپ فرما رہے ہیں کہ "احمد بن حنبل کو میری طرف سے سلام پہنچا دو اور ان کو لکھو کہ انھیں آزمایا جائے گا اور قرآن کے مخلوق ہونے پر انکی تائید کرانے کی کوشش کیجائے گی مگر وہ ہرگز ان کی بات نہ تسلیم کریں، اسکے عوض میں اللہ تعالیٰ قیامت تک انکے علم کی سربلندی کا انتظام فرماویگا" یہ خواب امام شافعیؒ نے امام احمدؒ کے پاس لکھ بھیجا، حضرت امام احمدؒ اسے پڑھ کر آب دیدہ ہوگئے، پھر جو صاحب خط لے گئے تھے انھیں خواب کی بشارت سنائی اور انکے مطالبہ پر خوشی میں اپنا کرتہ اتار کر عطا کیا، جب وہ صاحب کرتہ لیکر امام شافعیؒ کی خدمت میں واپس آئے تو امام شافعیؒ نے فرمایا کہ میں یہ کرتہ لیکر تمہیں محروم تو نہیں کرنا چاہتا لیکن یہ ضرور خواہش ہے کہ اس کرتہ کو پانی میں تر کر کے وہ پانی مجھے دیدو تاکہ میں اس سے برکت حاصل کروں۔ (البدایۃ والنہایہ ۱۰/۶۸۱)

اسکے بعد اللہ تعالیٰ نے قبولیت کے سارے دروازے امام احمدؒ کے لئے کھول دئے خود خلیفہ کو اپنے اس طرز عمل پر سخت ندامت ہوئی۔ لوگوں کے دلوں کی گہرائیوں میں آپکی عظمت ومحبت سرایت کرگئی اور آپکے نام کا غلغلہ پورے عالم میں بلند ہوا جو آپکو ذلیل کرنا چاہتے تھے وہ خود ذلیل اوررسوا ہوگئے اور آپکی عزت ورفعت میں برابر چار چاند لگتے رہے۔ آپ زندگی میں فرماتے تھے کہ ہمارے اور بدعتی علماء کے درمیان فیصلہ اس دن ہوگا جب ہمارے جنازے اٹھیں گے چنانچہ آپکی یہ پیش گوئی پوری ہوئی۔ اور تاریخ نے حیرت سے یہ واقعہ نوٹ کیا کہ جب آپکی وفات ہوئی تو جنازہ میں شرکت کے لئے خلق خدا اُمڈ پڑی حتی کہ جب خلیفہ متوکل (جو آپ کا بہت معتقد اور قدرداں تھا) نے اس پوری جگہ کو ناپنے کا حکم دیا جہاں آپکی نماز جنازہ پڑھی گئی تھی تو ۲۵ لاکھ افراد کی شرکت کا اندازہ لگایا گیا، عبدالوہاب وراق کہتے تھے کہ زمانۂ جاہلیت اور اسلام کی طویل تاریخ میں امام احمد بن حنبلؒ سے بڑے کسی جنازہ کا سراغ نہیں ملتا تا آنکہ اس عظیم مجمع کو دیکھ کر اس دن بیس ہزار غیر مسلم دولت اسلام سے مشرف ہوگئے تھے، اسکے برخلاف آپکے مخالف علماء، احمد بن ابی داؤد، حارث بن اسد، بشر بن غیاث وغیرہ کی وفات پر نہ تو کسی نے غم منایا اور نہ ہی انکے جنازوں میں سرکاری اور خاندانی لوگوں کے علاوہ کسی نے شرکت کی، اور بڑی بے بسی اور بے کسی کے عالم میں وہ دنیا سے رخصت ہوگئے **فللہ الامر من قبل ومن بعد.** (البدایۃ والنہایۃ ۱۰/۷۹۳)

امام احمد بن حنبلؒ کی تابناک زندگی کا ہر ہر ورق علماء امت کے لئے حیرت انگیز اور نصیحت آموز ہے حق کے متعلق کسی مصلحت اور مداہنت کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔ حق کے مقابلہ میں آخر حکومت اور دولت کی حیثیت کیا ہے؟ یہ چیزیں تو آتی جاتی رہتی ہیں جبکہ حق اور حق والے ہمیشہ سے غالب ہیں اور برابر غالب رہیں گے، حق والے دنیا میں ظاہری بے کسی کے ساتھ دلوں پر حکومت کرتے ہیں، اور آخرت میں وہی عزت کے مستحق ہونگے جس سے بڑھکر نہ کوئی عزت ہے اور نہ کامیابی کا کوئی اور مقام۔ اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل اور کرم سے ہر مسلمان کو راہ حق کی طرف رہنمائی کرکے حق پر مرنے اور جینے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین.

(ندائے شاہی جون ۲۰۰۱ء)

علماء کی شان

مشہور مؤرخ اور محدث حافظ ابن کثیر دمشقی رحمۃ اللہ علیہ (م ۷۷۴ھ) نے حضرت وہب بن منبہؒ کے حوالہ سے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک بڑے متدین عالم کو ایسے بادشاہ کے روبرو پیش کیا گیا جو لوگوں کو خنزیر کا گوشت کھانے پر مجبور کیا کرتا تھا، جب وہ عالم بزرگ بادشاہ کے قریب پہنچے تو وہاں پولیس کے ایک افسر نے چپکے سے ان عالم صاحب سے کہا کہ آپ ایسا کریں کہ اپنے ہاتھ سے ایک بکری کا بچہ ذبح کر کے مجھے دے دیں جب بادشاہ آپ سے خنزیر کھانے کو کہے گا تو میں خنزیر کے گوشت کے بجائے یہی بکری کا حلال گوشت آپ کے سامنے رکھوا دوں گا آپ تو حلال ہی گوشت کھائیں گے، جبکہ بادشاہ اور دیکھنے والے لوگ اس مغالطہ میں رہیں گے کہ آپ خنزیر کا گوشت کھا رہے ہیں۔ اس طرح آپ حرام سے بچ جائیں گے اور آپ کی جان بخشی بھی ہو جائے گی۔ چنانچہ ان عالم صاحب نے بکری کا بچہ ذبح کروا کر پولیس افسر کو دے دیا پولیس افسر نے حسب وعدہ وہ بچہ شاہی خانساموں کے حوالہ کر دیا اور انھیں تاکید کر دی کہ جب بادشاہ ان عالم صاحب کو خنزیر کا گوشت پیش کرنے کا حکم دے تو ان کے سامنے اس بکری کے بچہ کے گوشت کو رکھ دینا۔ اس کے بعد لوگ بہت بڑی تعداد میں جمع ہو گئے اور ہر ایک یہ کہہ رہا تھا کہ اگر ان عالم صاحب نے خنزیر کا گوشت کھا لیا تو ہم بھی کھا لیں گے اور اگر وہ رُک گئے تو ہم بھی رک جائیں گے۔ پھر بادشاہ آیا اس نے اپنے کارندوں کو خنزیر کا گوشت لوگوں کے سامنے رکھنے کا حکم دیا چنانچہ گوشت لایا گیا اور خانساموں نے عالم صاحب کے سامنے پولیس افسر کی ہدایت کے مطابق بکری کا حلال گوشت رکھا، اب یہ موقع بڑی نزاکت کا تھا، اللہ تعالیٰ نے عالم صاحب کے دل میں یہ بات ڈالی کہ اگرچہ میں اس بکری کے گوشت کو کھا کر حرمت سے بچ جاؤں گا لیکن لوگوں کو اصل حقیقت معلوم نہیں ہے وہ تو یہی سمجھیں گے کہ میں خنزیر کا گوشت کھا رہا ہوں، اور میرے اس عمل کی وجہ سے جتنے لوگ بھی اس

حرام کام میں مبتلا ہوں گے ان سب کا وبال قیامت میں میرے سر ہوگا، لہٰذا میں ایسا عمل ہرگز نہ کروں گا خواہ میرے ٹکڑے ٹکڑے کردیئے جائیں اور مجھے آگ میں جلا دیا جائے، اور انھوں نے بادشاہ سے وہ گوشت کھانے سے صاف انکار کردیا۔ اس درمیان وہ پولیس افسر سامنے سے بار بار اشارہ کرتا رہا کہ یہ تو بکری کا گوشت ہے اسے آپ کھا لیجیے۔ لیکن آپ برابر انکار ہی کرتے رہے بالآخر بادشاہ نے اسی پولیس افسر کو حکم دیا کہ انھیں لے جاکر قتل کردیا جائے۔ جب وہ پولیس افسر آپ کو لے جانے لگا تو اس نے پوچھا کہ حضرت کیا وجہ ہے کہ آپ نے وہ گوشت بھی نہیں کھایا جو خود ذبح کرکے مجھے دیا تھا؟ کیا آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں ہے؟ اس پر ان عالم صاحب نے جواب دیا کہ مجھے کامل یقین تھا کہ یہ گوشت میرے لئے حلال ہے لیکن مجھے اس بات کا اندیشہ ہوا کہ لوگ ناواقفیت میں میری اقتدا کریں گے۔ اور وہ صرف یہی سمجھیں گے کہ میں نے خنزیر کا گوشت کھایا ہے۔ اور بعد میں بھی یہی کہا جائے گا کہ فلاں شخص نے یہ گوشت کھایا تھا، اور انھیں حقیقت معلوم نہ ہوگی۔ خلاصہ یہ ہے کہ ان عالم صاحب نے قتل ہونا گوارا کیا لیکن دوسروں کا وبال اپنے سر لینا برداشت نہیں کیا۔ عالم کی یہی شان ہونی چاہئے کہ وہ تہمت کی چیزوں سے بچتا رہے اس لئے کہ اس کی غلطی کو بھی لوگ باعث تقلید سمجھ کر اس کی پیروی شروع کردیتے ہیں۔ (البدایہ والنہایہ ۹/ ۳۴۱)

علماء کا کام صرف یہی نہیں کہ خود بُرائی اور گناہ سے بچیں بلکہ ان کی یہ منصبی ذمہ داری ہے کہ وہ دوسروں کو بھی بُرائیوں سے بچائیں اور کوئی ایسا حقیقی مباح عمل بھی نہ کریں جس سے غلط فہمی کی بنا پر عوام میں بُرائی پھیلنے کا اندیشہ ہو۔ افسوس ہے کہ آج عام طور پر محض عمل کا مباح ہونا کافی سمجھا جاتا ہے اور یہ خیال نہیں کیا جاتا کہ اس کے اثرات دوسروں پر کیا پڑیں گے۔ جس کی بنا پر علماء کی وقعت میں کمی آرہی ہے۔ علماء اور متقدایان ملت کو بالخصوص اس جانب توجہ برابر رکھنی چاہئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ ”آدمی کا اس وقت تک صحیح معنی میں اہل تقویٰ میں شمار نہیں ہوسکتا جب تک کہ مباح باتوں کو بھی، ناجائز عمل کے خطرہ سے ترک نہ کردے۔“ (الترغیب والترہیب ۲/ ۳۵۲)

اللہ تعالیٰ ہم سب کو بہتر عمل کی توفیق عطا فرمائے اور ہر طرح کی کوتاہی سے محفوظ فرمائے۔ آمین۔

(ندائے شاہی، اگست ۲۰۰۰ء)

عہد کی پاس داری

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد عرب کے مختلف حصوں میں فتنۂ ارتداد رونما ہوا۔ ہزاروں لوگ اسلام سے پھر گئے۔ کچھ نے جھوٹے مدعیان نبوت کی اتباع کر لی۔ اور کچھ لوگ اسلام میں رہتے ہوئے اسلامی احکامِ زکوٰۃ اور اطاعتِ اولی الامر وغیرہ سے روگردانی کرنے لگے۔ اس نازک موقع پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بے مثال جرأت واستقامت نے اسلامی جھنڈے کو سرنگوں نہ ہونے دیا۔ چنانچہ ان کے تدبر اور عاقبت اندیشی کی بدولت ایک سال کے اندر اندر سارے فتنے ٹھنڈے پڑ گئے۔ اور فتوحات اسلامی کا شاندار سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات سے چند ایام قبل محرم ۱۱ھ میں مختلف علاقوں میں محصل زکوٰۃ روانہ فرمائے تھے۔ حضرت عدی بن حاتم طائیؓ کو قبیلۂ طی اور بنو اسد کا محصل مقرر کیا گیا۔ وہ جا کر اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔ ربیع الاول ۱۱ھ میں (رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک) زکوٰۃ کے اونٹوں کی ایک بڑی مقدار ان کے پاس جمع ہو گئی تھی۔ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد ارتداد کی وباء پھیلی تو بنو اسد کے قبیلہ کے کچھ لوگ بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکے اور قبیلۂ طے کے بعض سردار بھی کشمکش میں مبتلا ہو گئے۔ چنانچہ وہ سردار حضرت عدی بن حاتمؓ کے پاس آئے اور کہا: محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد عرب باغی ہو گئے ہیں۔ اور ہر قبیلہ نے زکوٰۃ روک لی ہے۔ ان حالات میں ہمیں اپنا مالِ (زکوٰۃ) آپس میں تقسیم کر لینے کا زیادہ حق ہے۔ حضرت عدیؓ نے ان سے کہا کہ کیا آپ لوگ برضاء ورغبت عہد و میثاق پورا کرنے کا عہد نہیں کر چکے ہو؟ سردارانِ طے نے جواب دیا۔ ہم نے وعدہ ضرور کیا تھا لیکن اس وقت بالکل نئے حالات پیدا ہو گئے ہیں اور عربوں نے جو روش اختیار کی ہے وہ بھی آپ کے سامنے ہے۔

سرداروں کے یہ خیالات سن کر حضرت عدیؓ بن حاتم کی دینی حمیت پھڑک اُٹھی اور نہایت جذباتی انداز میں فرمایا:

قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں تو عہد توڑوں گا نہیں۔ میں نے کسی حبشی سے عہد کیا ہوتا تب بھی اس کو ضرور پورا کرتا۔ اگر آپ نہیں مانیں گے تو میں آپ سے لڑوں گا۔ اور یہ حاتم کا لڑکا پہلا شخص ہوگا جو ایفائے عہد کی خاطر یا تو جان دے دے گا یا زکوٰۃ ادا کر کے رہے گا۔ اس بات کی توقع چھوڑ دیجیے کہ حاتم اپنے لڑکے عدی کو قبر میں ملامت کرے۔ کسی غدار کی غداری کو دیکھ کر خود غداری کی طرف مائل نہ ہوئیے۔ (سیر ابن اسحٰق بحوالہ تاریخ ردّہ- مترجم خورشید احمد فاروق، ص ٣١)

حضرت عدی بن حاتمؓ کے یہ سنہرے الفاظ ہماری زندگی کے لئے مشعل راہ ہیں۔ اور ساتھ ہی لمحۂ فکریہ بھی، ہم نے اسلام قبول کر کے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے عہد کر رکھا ہے کہ ان کی نافرمانی نہ کریں گے۔ قرآن و حدیث کے خلاف نہیں چلیں گے۔ اسلامی احکامات و ہدایات کو پس پشت نہ ڈالیں گے۔ لیکن خود ہی سوچیں، ہم میں سے کتنے لوگ ہیں جو اس عہد کا پوری طرح پاس رکھتے ہیں۔ ہم میں سے کتنے ہیں جو شریعت پر پوری طرح عامل ہیں۔ ایک نماز ہی کو لے لیجیے۔ اگر بہت مبالغہ کیا جائے تو مشکل سے ٢٠،٣٠ فیصدی مسلمان ہوں گے جو پنجوقتہ نمازیں پابندی سے پڑھتے ہیں۔ روزہ اور زکوٰۃ کا حال تو اس سے بھی بُرا ہے۔ یہ صورتحال اسلامی معاشرہ کی تنزلی کی دلیل تو ہو سکتی ہے، ترقی کی نہیں۔ دنیا چاہے جتنی آگے بڑھ جائے۔ سائنس جتنی بھی ترقی کر لے۔ اور انسان جتنا بھی بلندی پر پہنچ جائے۔ لیکن اسلام اور مسلمان کی ترقی اور رفعت اس میں ہے کہ وہ پیچھے ہٹ کر ١٥ رسو برس پہلے آنے والے پیکر انسانیت، فخر دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ مبارکہ کو اپنائے اور اپنے اس عہد کو پورا کرے جو اس نے مسلمان ہونے کی حیثیت سے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کر رکھا ہے اور جو چیز اس عہد کے ایفاء میں حائل ہو اس کو دور کرنے میں اپنی جان کی بازی لگا دے۔

قرآن و حدیث کی یہی تعلیم ہے۔ اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی مبارک زندگی سے یہی سبق ملتا ہے۔ کاش ہم اس حقیقت سے باخبر ہوتے اور اسی کو زندگی کا ماحصل سمجھتے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں عقل سلیم سے نوازے اور توفیق خیر سے سرفراز فرمائے۔ آمین۔ (ندائے شاہی، اگست ١٩٩٩ء)

کیا ابھی وقت نہیں آیا؟

ملت اسلامیہ ہند آج جس نازک دور سے گذر رہی ہے وہ کسی بھی صاحب فکر ونظر سے مخفی نہیں ہے۔تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اب وہی حالات بنائے جارہے ہیں جو اسپین اور اندلس میں بنائے گئے تھے اور وہی تدبیریں اختیار کی جارہی ہیں جو بوسنیا میں ظالم سربیوں نے اختیار کررکھی ہیں، مسلم عوام عیش وعشرت میں مست ہیں یا پھر مایوسی کے شکار، کسی کو دولت کمانے سے فرصت نہیں تو کسی کو تبصرہ یا تبّرابازی کا مشغلہ ہاتھ آ گیا ہے۔تحریروں کا انبار ہے،تقریروں، جلسوں، میٹنگوں اور کانفرنسوں کی بھرمار ہے۔اخبارات کے صفحات سیاہ ہیں تو رسالوں کی رونق طول طویل رپورٹوں اور جائزوں نے بڑھا رکھی ہے۔تجویزوں اور مشوروں کی بھی کمی نہیں ہے۔اور موقع موقع سے گڑے مردے اکھاڑنے والوں کی بھی بن آئی ہے۔ان کے علاوہ دانشورانِ قوم، علماء اور دینی اداروں کی طرف سے بھی مخلصانہ پیغامات سامنے آئے ہیں جن میں قوم کی دینی بیداری کی ضرورت کو اُجاگر اور دفاعی تیاری کی جانب کھل کر توجہ دلائی گئی ہے اور وہ سب کچھ کہہ دیا گیا ہے جو اس وقت کہا جاسکتا ہے یہ ایسی ہدایتیں ہیں، جن کو اگر زندگی کا نصب العین بنالیا جائے اور پورے طور پر توجہ کے ساتھ ان خطوط پر کام کیا جائے تو ہماری تقدیر بدل سکتی ہے اور بگڑے ہوئے حالات میں سدھار ہوسکتا ہے۔

لیکن جس کو کام ہی نہ کرنا ہو اس کے لئے ہزاروں پیغامات بھی بیکار ہیں اور عمل کا جذبہ اور فکر ہی نہ ہو تو کوئی بھی پیغام قوم کی تقدیر نہیں بدل سکتا۔۶ر دسمبر کے سانحہ اور مسلم کش فسادات کے بعد

مسلمانوں میں جو جوش اور ولولہ اور خود اعتمادی پیدا ہونی چاہئے تھی۔ افسوس کہ وہ پیدا نہ ہوسکی۔ ایک وقتی جوش تھا جو امن وامان کے ساتھ ساتھ کافور ہوگیا۔ ہر ایک اپنے اپنے کاروبار میں مست اور اپنے تاریک مستقبل سے بے نیاز معلوم ہوتا ہے۔ ہمیں عام مسلمانوں اور ان کے خود رو قائدین سے شکایت نہیں ہمیں گلہ ہے اپنے سے اور اپنی طرح مدارس دینیہ سے وابستہ افراد سے، جنھوں آج اپنی زندگی کی حدیں مدارس کی چہار دیواریوں اور درسگاہوں کے بام ودر تک محدود کردی ہیں۔ کیا ہم نے سوچا کہ امن وامان ہی نہ رہے گا تو مدارس کیسے چلیں گے؟ اور مسلمان ہی نہ رہیں گے تو مدرسے کیسے آباد ہوں گے؟ کیا ہم نے غور کیا کہ ہماری ذمہ داریاں کیا ہیں اور ہم ان کو کہاں تک پورا کر رہے ہیں؟ ایسے ہی پر آشوب حالات میں آج سے ۷۲؍سال قبل ۱۹۲۱ء میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی نوراللہ مرقدہٗ نے علماء وقت کو للکارتے ہوئے آواز دی تھی:

''اے علماء کرام اور اے رہروان قافلہ اسلام! کیا اب بھی آپ کو ان غرق کن تھپیڑوں کا احساس نہیں ہے کیا ایسی صواعق محرقہ بھی آپ کو بیدار نہیں کرسکتیں؟ کیا اس سے بھی کسی شدید اور مہلک بگولے کا آپ کو انتظار ہے ذرا آنکھیں کھولئے! دائیں اور بائیں نگاہ دوڑائیے! خواب خرگوش سے بیدار ہوجئے، دیکھئے وحشی بھیڑیوں نے عالم میں کیا اودھم مچا رکھا ہے۔''

آپ کو خبر بھی ہے کہ افراد امت اور ان ضعفاء ملت کی بہبودیوں کی ذمہ داریاں آپ ہی سے سربستہ ہیں۔ اگر فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ. الایہ (سورۃ توبہ آیت ۱۲۲) ''(کیوں نہیں نکلتی ہر فرقہ سے ایک جماعت تاکہ دین سیکھے اور سمجھے اور پھر واپس ہوکر اپنی قوم کو ڈرائے) مسائل سیکھنے اور سمجھنے کے وجوب کی خبر دیتے ہوئے قوم کو ہر مہلک طرز عمل اور زہریلی چیزوں سے بچانا اور ڈرانا آپ کا فرض منصبی ہونا بتلا رہی ہے، تو آیت وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ. الآیہ (سورہ آل عمران آیت ۱۰۴) (چاہئے کہ تم میں ہمیشہ ایک ایسی جماعت پائی جائے جو کہ بھلائی کی طرف قوم کو بلاتی رہے اور اچھی چیزوں کا حکم کرے بُری چیزوں سے بچائے) ہر خوش گوار مفید قوم عمل اور ہر باعث نجات ونجاح کام کی

طرف بلانا بھی آپ کا ضروری ولازمی وظیفہ بآواز دہل کہہ رہی ہے۔ اگر حدیث: اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاءِ وَاِنَّ الْاَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوْا دِيْنَاراً وَّلَادِرْهَمًا وَاِنَّمَا وَرَّثُوْا الْعِلْمَ. (مشکوٰۃ شریف،۳۴) (علماء انبیاء کے وارث ہیں، انبیاء کے وارث ہیں، انبیاء نے اپنے وارثوں کے لئے روپیہ پیسہ نہیں چھوڑا فقط علم چھوڑا ہے) آپ کو حضرت خاتم النبیین جامع سیاست وشریعت علیہ السلام کا جانشین بتارہی ہے۔ تو دوسرے طریقہ پر یہ بھی کہہ رہی ہے کہ قوم کی فکر اور امت کے اعمال میں درجہ بدرجہ آپ کو سرگرداں اور شب و روز افتاں وخیزاں رہنا بھی لازم ہے۔ آپ کبھی وارث نبی نہیں ہوسکتے جب تک کہ اپنے مورث حضرات انبیاء کی طرح قوم کی بہبودی کی فکروں میں اپنی نیند کو اچاٹ، اپنی راحت کو سلام، اپنی طمع اور خواہش کو برباد اور اپنی زندگی کو وقف نہ کردیں''۔

آگے چل کر حضرت نے ارشاد فرمایا!

کیا آپ کے کانوں کے کھٹکھٹانے کو كَلَّا وَاللّٰهِ لَتَاْمُرَنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ وَلَتَأْخُذَنَّ عَلٰى اَيْدِیْ الظَّالِمِ وَلَتَاطُرَنَّهٗ عَلَى الْحَقِّ اَطْرًا وَلَتَقْصُرَنَّهٗ عَلَى الْحَقِّ قَصْراً اَوْلَيَضْرِبَنَّ اللّٰهُ بِقُلُوْبِ بَعْضِكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ثُمَّ لَيَلْعَنَكُمْ كَمَا لَعَنَهُمْ (خدا کی قسم تم ہرگز معذور نہ سمجھے جاؤ گے اور نہ عذاب سے بری ہوسکو گے یا تو بھلی باتوں کا حکم دے کر لوگوں کو اس کی طرف بلاؤ، بُری باتوں سے بچاؤ، ظالم کے ہاتھوں کو پکڑو، اس کو بھی حق پر دست اندازی سے روکو۔ اس کو حق کی حدود سے آگے بڑھنے نہ دو، ورنہ خدائے تعالیٰ تمھارے دلوں کو انھیں ظالموں کے دلوں جیسا کرتے ہوئے تم پر بھی لعنت کی بارش انہی کی طرح برسائے گا) کافی نہیں؟ اٹھئے اور انفرو اخفافاً وثقالاً کے مصداق بنئے۔

(خطبہ صدارت اجلاس ششم انجمن علماء بنگال منعقدہ ۲۵/مارچ ۱۹۲۱ء از حضرت مدنیؒ)

تاریخ کے حوالے سے یہ تقریر آج بھی ہمیں جھنجھوڑتی ہے اور دعوت عمل دے رہی ہے، ہمیں غفلت دور کر کے اپنے اندر قوم وملت کے لئے قربانی دینے کا جذبہ پیدا کرنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ ہماری مدد فرمائے۔ آمین۔

(ندائے شاہی، مارچ ۱۹۹۳ء)

اسلامی عبادات

اور ان کے تقاضے

قرآن کریم عظیم دولت ہے

قرآن کریم اللہ رب العزت کی آخری کتاب ہے جس کی حفاظت کا خود اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے ارشاد خداوندی سے: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْن ۔ (سورۂ حجر آیت ۹) (ہم نے ہی ذکر (قرآن) کو تھوڑا تھوڑا نازل کیا ہے اور ہم اس کے محافظ ہیں) پچھلی امت پر نازل ہونے والی کتابوں کی حفاظت کی ذمہ داری انہی امتوں پر ڈالی گئی تھی مگر وہ امتیں اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے میں ناکام رہیں اور زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ کتابوں میں بھی تحریف اور تبدیلی ہوتی چلی گئی۔ دنیا دار اور مفاد پرست لوگ مذہب کے ٹھیکیدار بن گئے۔ جنھوں نے محض اپنے ذاتی مفادات کے پیش نظر توریت و انجیل کے الفاظ اور معانی بدل ڈالے لیکن قرآن کریم آج تک جوں کا توں محفوظ ہے۔ اور قیامت تک اس کے الفاظ و احکام میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے خود ایسے اسباب مقرر فرمادیئے ہیں جن کے رہتے ہوئے قرآن کریم میں ترمیم وتحریف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آج اگر ساری دنیا میں پریس اور چھاپہ خانے بند کردیئے جائیں اور ساری دنیا کی لائبریریاں اور کتب خانے نذر آتش یا دریابرد کردیئے جائیں اور آئندہ کے لئے کتابوں کی طباعت و کتابت اور اشاعت پر پابندی لگادی جائے تو چند دن نہیں گذریں گے کہ پورے عالم سے کتاب نام کی ہر چیز ناپید ہوجائے گی۔ لیکن ان تمام اسباب کے معطل ہوجانے کے باوجود ہمارا یہ عقیدہ اور پختہ نظریہ ہے کہ قرآن کریم پھر بھی اسی شکل وصورت میں باقی رہے گا۔ اور اس کے کسی ادنیٰ جز میں کوئی تبدیلی یا تحریف نہ ہوسکے گی۔ اس لئے کہ قرآن کریم کی حفاظت کا مدار نہ کتابت پر ہے نہ طباعت پر، نہ کاغذ پر اور نہ قلم اور دوات پر، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کے لئے انسان

کے سینے کو منتخب کیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے معصوم بچے اس عظیم کتاب کو اتنی آسانی سے پختہ یاد کر لیتے ہیں کہ دنیا کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اتنے چھوٹے سے بچے نے کیسے تیس پارے حفظ کر لئے؟ آج دنیا میں کسی بھی دوسری مذہبی کتاب کو یہ شرف حاصل نہیں ہے کہ اس کو زبانی یاد کیا جاتا ہو اور مجالس میں حفظ پڑھا جاتا ہے اور اس کی گردان کی جاتی ہو۔ یہ امتیاز صرف اور صرف قرآن کریم کو حاصل ہے کہ لاکھوں کروڑوں لوگ ہر زمانہ میں اس کے حافظ رہے ہیں۔ اور اس کے نہ صرف الفاظ بلکہ طرز ادا، رسم الخط، اور لہجہ کی بھی حفاظت کرتے آئے ہیں۔

جس شخص کو قرآن کریم کی حفاظت کی خدمت میں شرکت کی سعادت مل جائے واقعہ یہ ہے کہ اس سے بڑا اعزاز اس کے لئے اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''قرآن کریم میں مہارت رکھنے والے شخص کا حشر باعزت اور نیک فرشتوں کے ساتھ ہوگا''۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''قیامت کے دن قرآن کریم کا حافظ و عالم آئے گا تو قرآن کہے گا کہ اے پروردگار اسے جوڑا پہنایئے، چنانچہ اس (حافظ) کو اعزاز کا تاج پہنایا جائے گا۔ پھر قرآن عرض کرے گا کہ اے پروردگار! اس میں مزید اضافہ فرمایئے تو اسے کرامت کا جوڑا پہنایا جائے گا۔ پھر قرآن عرض کرے گا کہ اے رب ذوالجلال! اب آپ اس سے راضی ہو جایئے۔ تو اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہو جائے گا۔ اور اس سے کہا جائے گا کہ پڑھتے جاؤ چڑھتے جاؤ۔ ہر آیت کے بدلہ میں ایک نیکی کا اضافہ کیا جائے گا''۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''قرآن کریم کی مثال اس پُر تکلف کھانے کی ہے جو مہمان کی آمد پر تیار کیا جاتا ہے۔ لہٰذا جہاں تک قدرت ہو قرآن سیکھنے کی کوشش کرو، یہ قرآن اللہ کی رسی ہے، وہ نور مبین ہے، وہ نفع بخش ذریعہ شفا ہے، جو شخص اس سے وابستہ ہو اس کے لئے حفاظت کا ذریعہ اور اپنے پیروکاروں کے لئے باعث نجات ہے، وہ ٹیڑھا نہیں ہے کہ اسے سیدھا کرنے کی ضرورت ہو، نہ اس میں کوئی کجی ہے کہ اسے دور کیا جائے، اس کے عجائب لامتناہی ہیں،

بار بار پڑھنے کے باوجود وہ پرانا نہیں محسوس ہوتا۔ لہٰذا قرآن کی تلاوت کیا کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کی تلاوت پر ہر ایک حرف کے عوض دس نیکیاں عطا فرماتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا ہوں کہ پورا الم ایک حرف ہے (بلکہ الف الگ حرف ہے لام الگ ہے اور میم الگ ہے) اور میں تم میں سے کسی کو اس حال میں نہ پاؤں کہ وہ پیر پر پیر رکھ کر بیٹھا رہے اور سورہ بقرہ نہ پڑھے، اس لئے کہ شیطان اس گھر میں نہیں ٹھہرتا جہاں سورہ بقرہ پڑھی جاتی ہے۔ اور سب سے زیادہ خیر اور بھلائی سے خالی وہ گھر ہے جو اللہ کی کتاب (قرآن کریم) سے خالی ہو یعنی جہاں اس کی تلاوت نہ ہوتی ہو"۔ ایک اور حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: "جس شخص نے قرآن کریم حفظ کیا اس کو اللہ تعالیٰ جنت میں داخل کرے گا۔ اور اس کے دس ایسے رشتہ داروں کے بارے میں جو اپنی بداعمالیوں کے سبب سے جہنم کے مستحق ہو چکے ہوں گے اس کی سفارش قبول کی جائے گی"۔ ابوعبدالرحمٰن سلمی کا معمول تھا کہ جب ان کے سامنے کوئی شخص قرآن کریم ختم کرتا تو اسے اپنے سامنے بٹھاتے اور اس کا ہاتھ اپنے سر پر رکھتے اور فرماتے۔ ارے بھائی! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، اگر تم نے اپنے علم پر عمل کرلیا تو میری نظر میں تم سے بہتر کوئی شخص نہیں ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی بہت عظیم دولت ہے، قرآن کریم حفظ کرنے کی جس کو سعادت مل جائے وہ بڑا خوش نصیب ہے۔ اسے اس عظیم نعمت کی قدر کرنی ضروری ہے۔ اور اس کی قدر یہ ہے کہ روزانہ اس کی زیادہ سے زیادہ تلاوت کا اہتمام کرے۔ خاص طور پر نمازوں میں قرآن کریم کا کثرت سے ورد رکھے۔ اسی طرح اپنی اولاد کو بھی حافظ قرآن بنانے کی فکر کرے تاکہ مرنے کے بعد وہ اولاد صدقۂ جاریہ بن سکے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو قرآن کریم سے تعلق مضبوط کرنے اور اس سے وابستگی کی توفیق مرحمت فرمائے۔

(نوٹ: احادیث وآثار سب ہی مقدمہ تفسیر الجامع الاحکام القرآن للقرطبی سے ماخوذ ہیں)

(ندائے شاہی، اپریل ١٩٩٧ء)

❍❖❍

قرآن کریم کی ناقدری

ہمارے علاقہ میں اگر چہ ماہ رمضان المبارک میں تراویح کا بہت اہتمام پایا جاتا ہے۔ پہلے سے حفاظ کرام طے کیے جاتے ہیں۔ مساجد کا انتخاب ہوتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن نہایت افسوس کا مقام ہے کہ ان ظاہری امور کے باوجود قرآن کریم کی ناقدری عام ہوتی جارہی ہے۔ عام طور پر بڑے شہروں میں جب سے کثرت کے ساتھ کم وقت (دس دن، پانچ دن، چھ دن) میں قرآن کریم ختم کرنے کا رواج چلا ہے۔ اس نے قرآن کو ایک کھلونا اور تفریح بنا دیا ہے۔ ایسی جگہوں پر اتنی تیزی سے قرآن پڑھا جاتا ہے کہ الامان الحفیظ۔ زیر زبر کی غلطی پکڑنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بہت سی لفظی غلطیاں بھی سامع اس خطرے سے نہیں بتا پاتا کہ جب تک وہ سوچ کر بتائے گا حافظ صاحب کئی رکوع آگے نکل چکے ہوں گے۔ پھر دہرانے میں مزید وقت لگے گا۔ آج سب سے اچھی تراویح کی جماعت اسے سمجھا جانے لگا، جہاں کم وقت میں زیادہ قرآن کریم پڑھا جاتا ہو، چاہے ایک لفظ بھی سمجھ میں نہ آئے۔ ایسی جگہ پر ایسی بھیڑ ہوتی ہے کہ مسجدیں اور مکانات وسعت کے باوجود تنگ پڑ جاتے ہیں اکثر جگہ دیکھا گیا کہ اس بھیڑ میں تفریح باز نوجوانوں کی کثرت ہوتی ہے۔ جو بالخصوص پہلی رکعت میں حافظ صاحب کے رکوع میں جانے سے پہلے تک پچھلی صفوں میں مسلسل شرارت اور چھیڑ چھاڑ میں مشغول رہتے ہیں۔ نہ خود جماعت میں شریک ہوتے ہیں۔ اور نہ دوسروں کو سکون سے نماز پڑھنے دیتے ہیں۔

اس صورت حال کے اصل ذمہ دار تو وہ حفاظ کرام ہیں جو قرآن کریم پڑھتے وقت اس کا حق ادا کرنے کا خیال نہیں کرتے اور احادیث شریفہ میں قرآن پڑھنے کا جو طریقہ بتایا گیا ہے اس کو

پیش نظر نہیں رکھتے۔ بلکہ ان کا صرف ایک ہی مقصد ہوتا ہے کہ جلد از جلد پارہ پورا کر کے بیگار ٹال دیں۔صحابی جلیل حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :

لَا تَهُذُّوْا الْقُرْاٰنَ هَذَّ الشِّعْرِ وَلَا تَنْثِرُوْهُ نَثْرَ الدَّقَلِ وَقِفُوْا عِنْدَ عَجَائِبِهٖ وَ حَرِّكُوْا بِهِ الْقُلُوْبَ وَلَا يَكُنْ هَمَّ اَحَدِكُمْ اٰخِرَ السُّوْرَةِ. (زادالمعادا/۳۴۰)

(قرآن کریم کو اشعار کی طرح جلدی جلدی نہ پڑھ۔ اور اسے بیکار کھجوروں کی طرح نہ جھڑ جھڑاؤ، بلکہ قرآن کے عجائب پر رکو، اور اس سے دلوں کو جھنجھوڑ و اور تم میں سے کسی کا مقصد صرف سورہ ختم کرنا ہی نہ ہو(بلکہ آداب کی رعایت رکھ کر سورہ ختم کی جائے)

افسوس ہے کہ جس طرح پڑھنے سے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے منع فرمایا ہے اسی طرح پڑھنے کو آج پسندیدہ بنا لیا گیا ہے۔حفاظ بھی ایسا ہی پڑھنا پسند کرتے ہیں اور منتظمین کو بھی ایسا ہی حافظ پسند ہے جو جلدی جلدی اپنا کام پورا کر دے،قرآن کریم کے بارے میں ہمارا یہ طرزِ عمل خوش آئند نہیں ہے۔حفاظ کرام کو اپنی ذمہ داری سمجھنی چاہیئے۔اور مساجد وغیرہ کے ذمہ داران کو سوچ سمجھ کر ایسا ہی حافظ تراویح کے لئے مقرر کرنا چاہیئے جو صاف صاف با تجوید قرآن کریم پڑھنے والا ہو۔اور بیگار ٹالنے والے ”سپر رفتار“ حفاظ کی حوصلہ شکنی کرنی چاہیئے تاکہ قرآن کریم کا جو مذاق اڑایا جارہا ہے اس کا سلسلہ بند کیا جاسکے۔ یہ دین کی ایک بڑی خدمت ہوگی۔اس کے لئے بہتر شکل یہ ہے کہ مساجد میں پورے مہینہ میں تراویح کا ایک ہی ختم کرنے کا رواج ڈالا جائے یہ جو عام مساجد میں عشرہ اخیرہ سے قبل ختم کرنے کا رواج پھیلتا جارہا ہے اس پر روک لگنی چاہیئے تاکہ پورے مہینہ مسجدیں پوری طرح آباد رہیں۔اور رمضان کے آخری لمحات تک تراویح کی رونق اور قرآن کریم کی برکتیں سمیٹی جاسکیں۔تراویح میں جلدی قرآن کریم ختم کے سلسلے نے آج ہمیں آخری عشرہ کی قیمتی ساعتوں کی عبادات سے محروم کر رکھا ہے حالانکہ یہی ساعتیں ماہ مبارک کی سب سے قیمتی اور بابرکت ساعتیں ہیں اور ان سے محرومی ایک بڑی محرومی ہے۔ بہرحال ہمیں قرآن کریم اور رمضان المبارک کی قدر میں اپنی طرف سے کوئی کمی نہ کرنی چاہیئے اور تمام منکرات سے بچنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

یہاں دوسری ضروری بات یہ ہے کہ تراویح میں قرآن پڑھنے پر نذرانے اور ہدایا لینے پر پابندی لگنی چاہئے۔قرآن کریم کی تلاوت ایسی چیز نہیں ہے کہ اس کو کمائی کا ذریعہ بنایا جائے، اگر کسی کو کمانا ہی ہے تو کوئی چھوٹی موٹی تجارت یا مزدوری کر کے کمالے مگر قرآن کریم پڑھنے کو کمائی کا وسیلہ نہ بنائے۔فقہاء نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اگر تراویح میں بغیر اجرت کے کوئی حافظ نہ ملے تو ''**الم تر کیف**'' سے تراویح پڑھ لی جائے مگر تراویح پر اجرت نہ دی جائے۔بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم تو حافظ صاحب کے غریب ہونے کی وجہ سے مدد کر رہے ہیں تراویح پڑھنے پر اجرت نہیں دے رہے ہیں۔تو سوال یہ ہے کہ وہ حافظ صاحب پہلے سے غریب تھے یا تراویح میں قرآن ختم کرتے ہی غریب بن گئے۔اگر وہ پہلے سے ہی غریب تھے تو پھر ان کی مدد کرنے میں قرآن پڑھنے تک تاخیر کیوں کی گئی۔پہلے ہی ان کی مدد کرنی چاہئے تھی۔ہم اس سے بالکل منع نہیں کرتے۔بلکہ غریبوں کی مدد کو کار ثواب جانتے ہیں۔مگر پہلے ایک پیسہ نہ دینا اور ختم قرآن کے موقع پر ایک خطیر رقم دینا خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ رقم غربت پر نہیں دی جارہی ہے بلکہ صرف قرآن کریم کے ختم پر دی جارہی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی حافظ کتنا ہی غریب کیوں نہ ہو جب تک وہ قرآن نہ سنائے گا نذرانہ کا مستحق نہ ہوگا۔

الغرض قرآن کو کاروبار ہرگز نہ بنایا جائے۔اور جو لوگ قرآن کو کمائی کا ذریعہ بنارہے ہیں ان کے طرز عمل پر سختی سے نکیر کی جائے اور معاشرہ میں بڑھتے ہوئے اس جرثومہ کی بیخ کنی کرنے کی کوشش کی جائے۔اللہ تعالیٰ ہماری مدد فرمائے اور دین پر چلنا آسان فرمائے۔آمین۔

(ندائے شاہی، دسمبر ۱۹۹۸ء)

نماز

غفلت کو مٹانے کا سب سے مؤثر ذریعہ

انسان کی طبعیت کچھ اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ وہ مختلف امور میں مشغول ہو کر اپنی ذمہ داریوں کو بھول جاتا ہے، اور ایک طرح کی بے حسی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس لئے ضرورت پڑتی ہے کہ ایسے اسباب اختیار کئے جائیں جن کے ذریعہ غفلت کے وقت اس کو متنبہ کیا جا سکے، اور اسے ذمہ داریوں کا احساس دلایا جا سکے، پہلی قوموں میں بار بار انبیاء علیہم السلام کی بعثت اور پے در پے کتابوں اور صحیفوں کا نزول اسی مقصد سے ہوتا تھا تا کہ انسان راہ راست پر گامزن رہے اور اپنے مقصد تخلیق سے غافل نہ ہو، تا آنکہ نبیٔ آخر الزماں، حضرت خاتم النبیین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ ہوئی. اور نبوت کا دروازہ بند کر دیا گیا، اب غفلت کو مٹانے کے لئے کوئی نیا نبی نہیں آئے گا. لیکن یہ نبوی ذمہ داری اب امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کے علماء کے کاندھوں پر ڈالی گئی ہے کہ وہ انسانیت کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے رہیں اور غافل دلوں کی غفلت دور کرنے کے لئے لگا تار کوششیں کرتے رہیں۔ علاوہ ازیں اللہ رب العزت نے امت محمدیہ کو عبادت کا ایسا نظام عطا فرمایا ہے کہ اس پر عمل کرنے سے ایک مسلمان برابر اپنے دین اور آخرت کے بارے میں مستعد رہتا ہے اور دن رات اپنی اخروی زندگی کامیاب بنانے کی جد و جہد کرتا ہے۔ اس نظام میں ''نماز'' کو سب سے بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ دنیا کا کوئی اور مذہب ایسا نہیں ہے جس میں دن میں پانچ مرتبہ پورے اہتمام کے ساتھ نماز کے انداز کی انفرادی اور اجتماعی عبادت تجویز کی گئی ہو، یہ صرف اسلام کی خصوصیت اور امتیاز ہے کہ وہ تھوڑی دیر بھی مسلمان کو غفلت میں دیکھنا نہیں چاہتا،

جہاں معمولی غفلت کا غبار آتا ہے اگلی نماز کی پکار اس کی غفلت کو توڑ دیتی ہے۔ اور بارگاہ ایزدی میں استحضار کا تصور اس کے دل میں جاگزیں کردیتی ہے۔

نماز کی اہمیت

قرآن کریم میں دسیوں جگہ نماز کی عظمت کو بیان فرما کر اسے متقی اہل ایمان کی امتیازی صفات عالیہ میں شمار کیا گیا ہے۔ اسی کی تشریح فرماتے ہوئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی احادیث شریفہ میں نماز کی اہمیت کو بیان فرمایا ہے بعض احادیث کا خلاصہ ذیل میں درج ہے!

- نماز دین کا ستون ہے۔ (کشف الخفاء ۲/ ۲۷) یعنی جس طرح ایک عمارت ستون پر قائم رہتی ہے اسی طرح انسان کے دین کی عمارت نماز کے ستون پر ٹکی ہوئی ہے۔ اگر آدمی نماز کو ضائع کردے تو گویا دین کے ستون کو گرانے والا ہوگا۔
- قیامت میں سب سے پہلے (عبادات میں) نماز کا حساب لیا جائے گا، اگر نماز کا حساب درست نکلا تو بقیہ اعمال بھی صحیح نکلیں گے، اور اگر نماز میں خرابی نکلی تو بقیہ اعمال میں بھی فساد سامنے آئے گا۔ (رواہ الطبرانی، الترغیب ۱/ ۱۵۰) یعنی نماز ہی پر بقیہ اعمال کی توفیق کا گویا کہ مدار ہے۔
- اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے اچھا اور افضل عمل نماز ہے۔ (رواہ الطبرانی، الترغیب ۱/ ۱۵۰) اس لئے کہ نماز دیگر عبادات کو انجام دینے پر آمادہ کرنے والی عبادت ہے۔
- نماز روشنی ہے۔ (مسلم شریف ۱/ ۱۱۸) یعنی نماز کے ذریعہ ظاہری نور بھی حاصل ہوتا ہے اور آخرت کی اندھیریوں میں بھی نماز ظلمتوں کو ہٹانے کا بڑا سبب بنے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔
- نماز پڑھنے سے نمازی کے گناہ اس طرح جھڑ جاتے ہیں جیسے پت جھڑ کے زمانہ میں درخت کے پتے جھڑتے ہیں۔ (مسند احمد ۵/ ۱۷۹) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز انسان کے گناہوں کی معافی کا بھی بڑا سبب ہے۔

ان چند احادیث سے شریعت میں نماز کی عظمت وضرورت کا بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

نماز سے ضمیر کو زندگی ملتی ہے

قرآن کریم میں فرمایا گیا کہ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ. (العنکبوت ۴۵)
یعنی یقیناً نماز بے حیائی اور گناہ سے روکتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی جب نماز کے لئے اللہ رب العزت سے مناجات میں مشغول ہوتا ہے۔ تو اس کے دل میں یہ تصور ہوتا ہے کہ وہ دل کی آنکھوں سے ذات باری تعالیٰ کا مشاہدہ کررہا ہے اور کم از کم یہ تصور تو یقیناً رہنا ہی چاہئے کہ اللہ علیم وخبیر اس کی ہر نقل وحرکت حتی کہ دل کے وساوس سے بھی باخبر اور واقف ہے نماز کے دوران جب یہ تصور پوری طرح مضبوط ہوجاتا ہے تو نماز کے باہر بھی اس کے اثرات ظاہر ہونے لگتے ہیں اور انسان کا ضمیر اتنا حساس اور بیدار ہوجاتا ہے کہ اب وہ ہر ایسے کام میں دلچسپی لیتا ہے جس سے اس کا رب حقیقی خوش ہو اور ہر ایسے عمل سے اسکو نفرت ہوتی ہے جو اللہ رب العالمین کی ناراضگی کا سبب ہو۔ لہٰذا نماز کی پابندی گناہوں سے اجتناب اور دیگر عبادات کا شوق پیدا کرنے میں نسخہ اکسیر کی حیثیت رکھتی ہے۔

نماز کی کثرت! آخرت میں پیغمبرؐ کی رفاقت کا سبب ہے

حضرت ربیعہ ابن کعب اسلمیؓ ایک صحابی ہیں، آپ فرماتے ہیں کہ میں پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کی چھوٹی موٹی خدمت بجالاتا تھا، کبھی وضو کا پانی رکھدیا، کبھی کوئی اور ضرورت انجام دیدی، ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''میاں ربیعہ! جو چاہو مجھ سے مانگ لو'' حضرت ربیعہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: کہ حضرت! میں آپ سے جنت میں رفاقت کی درخواست کرتا ہوں، نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''کچھ اور نہیں چاہتے؟'' میں نے عرض کیا کہ ''حضرت مجھے تو بس یہی چاہئے''۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ''تم زیادہ سجدے کرکے (یعنی زیادہ سے زیادہ نمازیں پڑھ کر) اپنے بارے میں میری مدد کرنا''۔ (مسلم شریف ۱/۱۹۳)
یعنی نامۂ اعمال میں جس قدر نمازوں کی کثرت ہوگی جنت میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت کا استحقاق اتنا ہی زیادہ ہوگا۔ انشاء اللہ۔

نماز چھوڑنے پر سخت وعیدیں

شریعت میں ہر مسلمان عاقل بالغ مرد و عورت، جوان بوڑھے، صحت مند مریض، مسافر مقیم، سب پر نماز فرض ہے۔ اعذار کی وجہ سے نماز کے احکامات میں قدرے تخفیف تو کر دی گئی ہے لیکن فرضیت ساقط نہیں کی گئی ہے۔ مثلاً مسافر کو چار کے بجائے دو رکعت پڑھنے کا حکم ہے اسی طرح مریض کے لئے کھڑے ہونے کے بجائے بیٹھ کر یا اشارے سے پڑھنے کا حکم ہے لیکن نماز بہر حال پڑھنی پڑے گی، حتیٰ کہ اگر ہوش وحواس کی حالت میں موت کا وقت آ گیا اور ذمہ میں نمازیں قضا رہ گئیں تو ان کے متعلق فدیہ دینے کی وصیت کرنے کا حکم ہے۔ اس لئے کسی مسلمان کے لئے نماز کا ترک کسی بھی حال میں جائز نہیں ہے۔ احادیث شریفہ میں نماز چھوڑنے پر سخت ترین وعیدیں وارد ہیں، بعض ارشادات نبویہ درج ذیل ہیں!

- انسان اور کفر کے درمیان بس نماز کا چھوڑنا حائل ہے۔ (مسلم شریف ۱/ ۶۱) یعنی جیسے ہی نماز چھوڑے گا گویا کہ کفر کی سرحد میں پہنچ جائے گا۔
- جس شخص نے کوئی نماز جان بوجھ کر چھوڑ دی تو کھلے عام کافر ہو گیا۔ (الترغیب والترہیب ۱/ ۲۱۵) یعنی کفر کے بالکل قریب پہنچ گیا۔
- جو نمازی نہیں اس کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں۔ (الترغیب ۱/ ۲۱۴) یعنی نماز چھوڑنے سے مسلمان اسلام کی امتیازی علامت سے محروم ہو جاتا ہے۔
- جو شخص نماز کی پابندی نہ کرے اس کا حشر قیامت کے روز قارون، فرعون، ہامان اور ابی بن خلف (جیسے بدترین کافروں) کے ساتھ ہوگا۔ (مسند احمد ۲/ ۱۲۹) یعنی بے نمازی کو سزا میں کافروں کے ساتھ رکھا جائے گا۔
- جس شخص کی کوئی نماز چھوٹ گئی ہو تو گویا کہ اس کا سب مال اور گھر والے تباہ ہو گئے۔ (الترغیب ۱/ ۲۱۸) یعنی جتنا افسوس انسان کو اپنے گھر بار کے تباہ ہونے سے ہو سکتا ہے اس سے زیادہ افسوس ایک نماز کے قضا ہونے کا ہونا چاہئے۔

یہ چند ارشادات نبویہ اس بات کی دلیل ہیں کہ نماز کا معاملہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں نہایت اہم ہے، اور اس میں کوتاہی شریعت میں بالکل ناقابل برداشت ہے۔

نماز با جماعت

شریعت میں مردوں کو مسجد میں باجماعت نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور بلا عذر جماعت چھوڑنے والے کے متعلق سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ''جس شخص نے اذان سنی اور پھر بلا کسی معقول عذر کے جماعت میں شریک نہ ہوا تو (اب اگر تنہا نماز پڑھے گا تو) اس کی نماز قبول نہ ہوگی۔ (ابن ماجہ شریف حدیث: ۷۹۳) اور ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت سخت لہجہ میں ارشاد فرمایا کہ ''لوگ جماعت چھوڑنے سے باز آجائیں ورنہ میں انکے گھر جلانے کا حکم کردونگا''۔ (ابن ماجہ شریف حدیث: ۷۹۵، الترغیب ۱/۱۷۰)

جماعت سے مسجد میں نماز پڑھنا عظیم الشان ثواب کے حصول کا ذریعہ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تنہا جماعت کے مقابلہ میں جماعت کی نماز کا ثواب ۲۷ درجہ بڑھا ہوا ہے۔ (بخاری شریف، مسلم شریف وغیرہ، الترغیب ۱/۱۵۸) ایک روایت میں ہے کہ جو شخص (کم از کم) چالیس روز مسلسل تکبیر اولی کے ساتھ باجماعت نماز پڑھ لے تو اس کے لئے دو پروانے لکھے جاتے ہیں، ایک جہنم سے آزادی کا پروانہ دوسرے نفاق سے بری ہونے کا پروانہ۔ (ترمذی شریف ۱/۵۶) الغرض نماز کی شان باجماعت پڑھنے میں ہی مضمر ہے، ہر مسلمان کو نماز باجماعت کا اہتمام کرنا لازم ہے۔ اور جس طرح اپنے کاروبار اور دنیوی امور میں دین کے تقاضوں کو یاد رکھا جاتا ہے اس سے کہیں زیادہ آخرت کے تقاضوں کو یاد رکھنا ضروری ہے۔

امت کا عمومی حال

ایک طرف نماز کے متعلق شریعت کی اس قدر تاکیدات ہیں اور دوسری طرف نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج بلا مبالغہ امت کا ۷۰ - ۸۰ فیصدی طبقہ نماز سے غافل ہے۔ عام نمازوں میں مسجدیں خالی نظر آتی ہیں۔ بڑے بڑے عقلمند، اور دانشمند کہلائے جانے والے لوگ نماز

کے اہتمام سے کوسوں دور ہیں۔ بہت سے لوگوں کا مزاج یہ ہے کہ بس ہفتہ میں جمعہ کی نماز پڑھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ ذمہ داری ادا ہوگئی، نعوذ باللہ، آج معاشرہ میں بددینی پھیلنے کی ایک بڑی وجہ نماز سے غفلت بھی ہے۔ جو معاشرہ نماز میں سست ہو وہ کبھی بھی صحیح معنی میں دیندار نہیں ہوسکتا، اس سے بھی زیادہ تشویش کی بات یہ ہے کہ آج نماز باجماعت میں کوتاہی کی وبا رفتہ رفتہ دین داروں کے طبقات اور مدارس میں بھی سرایت کرتی جارہی ہے۔ یہ کوئی معمولی کوتاہی نہیں ہے۔ بلکہ اگر اس جانب توجہ نہ دی گئی تو آنے والی نسلوں کے دین وایمان کی خیر نہ ہوگی کیونکہ اگر مدارس کے ماحول میں اور اساتذہ اور طلبہ میں نماز کی پابندی نہ ہوگی تو آخر اور کون پابندی کرے گا؟ اور تجربہ یہ بتاتا ہے کہ مدرسہ کے ماحول میں جو شخص نماز باجماعت کا پابند نہ ہوسکا اس کے لئے زندگی بھر نماز کا اہتمام مشکل ہوتا ہے۔ لہذا ہمیں خود نماز کو قائم کرنے کے لئے بھرپور جدوجہد کرنی چاہئے۔ اور ناواقف عوام کو حتی الامکان بھرپور نمازی بنانے کی تلقین کرنی چاہئے۔

(ندائے شاہی نومبر ۲۰۰۲ء)

رمضان کا پرعظمت منشور

ماہ مبارک کی آمد آمد ہے۔عبادت کا مہینہ آ رہا ہے۔وصال کا زمانہ آ رہا ہے۔قرآن کریم کی عظمت کے دن آ رہے ہیں۔مدینہ میں ہر طرف رمضان کا چرچا ہے۔صحابہ کرامؓ کی خوشی کا تو پوچھنا ہی کیا؟ جس مجلس میں جایئے رمضان کی باتیں اور جس گھر میں جایئے رمضان کی تیاریاں۔ایک عجیب سرور وانبساط اور مسرت و بشاشت، ہر چھوٹے بڑے کے چہرے بشرے سے عیاں۔اور کیوں نہ ہو؟ شہنشاہ ارض وسماء مالک الملک کے دریائے رحمت جوش میں آنے کا وقت آنے والا ہے۔عاصیوں کے لئے مغفرت کا موسم بہار آنے والا ہے۔جنت میں ماہ مبارک کی تیاریاں زورو شور سے جاری ہیں۔روزہ داروں کے استقبال کے لئے حوریں زیب وزینت میں مشغول ہیں۔وہ دیکھئے جنت کے محافظ فرشتے منتظر ہیں کہ کب ہلالِ رمضان نکلے اور سارے دروازے کھول کر پورے عالم کو جنت کی عطر بیزیوں سے معمور کردیں۔ادھر جہنم پر مامور کارندے دوزخ کے دروازے پکڑے کھڑے ہیں کہ کب حکم خداوندی ہو اور وہ جہنم کے دروازے پورے مہینے کے لئے بند کردیں۔اور یہ دیکھئے! کچھ فرشتے بیڑیاں لئے تیار بیٹھے ہیں کہ ماہ مبارک شروع ہو اور وہ شیطانوں اور سرکش جنّات کو بیڑیاں پہنادیں تاکہ اس مہینہ میں خیر کی توفیق زیادہ اور برائی کی جسارت کم سے کم ہوسکے۔

رمضان کو یہ مقام عظمت ملے ابھی زیادہ دن نہیں گذرے تھے۔اس لئے پروانہ ہائے رسالت حضرات صحابہؓ کے دلوں میں یہ تمنّا رہ رہ کر انگڑائی لے رہی تھی کہ کاش! زبان رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس بارے میں انھیں کوئی رہنمائی ملتی تاکہ وہ رہنمائی صرف ان

کے لئے ہی نہیں بلکہ رہتی دنیا تک کے لئے ہدایت کا پرعظمت منشور اور آنے والی ایمانی نسلوں کے لئے مینارۂ نور بن سکتی۔ محبوبِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جاں نثاروں کے جذبات بھانپ گئے۔ شعبان کی آخری تاریخ تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ممبر پر تشریف فرما ہوئے۔ جاں نثار صحابہؓ ہمہ تن گوش ہوگئے۔ خاموش فضا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبرانہ خطاب کے جوہر سامنے آنے لگے۔ آپ نے رمضان کا جو نبوی منشور جاری کیا وہ تاریخ کے صفحات پر اَن مٹ نقوش بن کر بکھر گیا آپؐ نے فرمایا:

''اے لوگو! تم پر ایک عظیم اور مبارک مہینہ سایہ فگن ہونے والا ہے۔ ایسا مہینہ جس میں ایک ایسی رات (شبِ قدر) ہے جو ایک ہزار راتوں سے بڑھ کر ہے۔ (یعنی اس ایک رات میں عبادت کا ثواب ایک ہزار راتوں کی عبادت سے زیادہ ملتا ہے) اللہ تعالیٰ نے اس مہینہ کے دنوں کا روزہ فرض اور راتوں کی عبادت نفل قرار دی ہے۔ جو شخص اس مہینہ میں ایک نفل نیک عمل کے ذریعہ قرب خداوندی کا طالب ہو وہ ایسا ہی ہے جیسے دیگر مہینہ میں فرض عمل کرے (یعنی نفل کا ثواب فرض کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے) اور جو شخص اس مہینہ میں کوئی فریضہ بجالائے وہ ایسا ہے جیسے دیگر مہینوں میں ستر فرض ادا کرے (یعنی رمضان میں ایک فرض کا ثواب ستر گنا ہوتا ہے)

اے لوگو! یہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا ثواب اور بدلہ جنت ہے۔ اور یہ لوگوں کے ساتھ مواساۃ اور خیر خواہی کا مہینہ ہے۔ اس مہینہ میں مومن کا رزق بڑھا دیا جاتا ہے۔ جو آدمی اس مبارک مہینہ میں کسی روزہ دار کو افطار کرائے اس کے گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں، اسے جہنم سے آزادی کا پروانہ ملتا ہے۔ اور روزہ دار کے ثواب میں کمی کئے بغیر افطار کرانے والے کو بھی اسی کے بقدر اجر سے نوازا جاتا ہے''۔

صحابہؓ کے لئے یہ خوشخبری ان کی دلی مراد براری کا خوشنما اعلان تھی۔ فرحت و مسرت کے جذبات ان کے جسم میں ارتعاش پیدا کرنے لگے۔ روزہ داروں کے افطار میں ایک دوسرے سے

سبقت لے جانے کے منصوبہ بند خیالات ان کے دلوں میں اٹڈنے لگے۔ مگر یکا یک انھیں اپنے فقرہ وفاقہ اور گرسنگی کا خیال آیا اور ان کے جذبات پر مایوسی کے بادل چھا گئے۔ اس درد کے مداوا کے لئے بھی وہ اپنے عادت کے موافق اپنے آقاؐ کی طرف متوجہ ہوئے اور عرض کیا!

''اے اللہ کے رسولؐ! ہم میں سے ہر آدمی اپنے اندر وسعت نہیں پاتا کہ وہ دوسرے کو (باقاعدہ) افطار کرائے۔'' (اور اس ثواب سے بہرہ یاب ہو)

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جاں نثاروں کو ایسا جواب دیا جس سے ان کی مایوسی خوشیوں میں بدل گئی۔ آپ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ یہ انعام ہر اس شخص پر کرتا ہے جو کسی بھی روزہ دار کو ایک گھونٹ دودھ، ایک عدد کھجور، حتیٰ کہ ایک گھونٹ پانی پلا کر بھی افطار کرادے ہاں جو شخص روزہ دار کو پیٹ بھر کھلائے تو اللہ رب العزت اسے قیامت کے دن میرے حوض کوثر سے ایسا پانی پلائیں گے جس سے کبھی پیاس نہ لگے گی تا آنکہ وہ جنت میں ہمیشہ کے لئے داخل ہو جائے گا۔''

پھر آپؐ نے فرمایا:

''یہ ایسا مہینہ ہے جس کا پہلا عشرہ رحمت، درمیانی عشرہ مغفرت اور آخری عشرہ جہنم سے آزادی کا ہے۔ جو شخص اس مہینہ میں اپنے غلام (خادم اور ملازم وغیرہ) کے بوجھ کو ہلکا کردے تو اللہ جل شانہٗ اس کی مغفرت فرماتے ہیں اور آگ سے آزادی دیتے ہیں۔

اے لوگو! اس مہینہ میں چار چیزوں کی کثرت رکھا کرو، جن میں دو اللہ کی رضا کے واسطے ہیں اور دو چیزیں ایسی ہیں جن کے بغیر تمھیں کوئی چارہ کار نہیں، پہلی دو چیزیں جن سے تم اپنے رب کو راضی کرو وہ کلمہ طیبہ (لا الٰہ الا اللہ) اور استغفار کی کثرت ہے۔ اور دوسری دو چیزیں یہ ہیں۔ (۱) جنت کی طلب کرو۔ اور (۲) آگ سے پناہ مانگو۔

(الترغیب والترہیب ۲/ ۵۷، مشکوٰۃ شریف، ۲، ۱۷، حیاۃ الصحابہ وغیرہ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رمضان کے تعارف پر مشتمل یہ خطاب محض ایک رسمی تقریر نہیں بلکہ رمضان المبارک کے باعظمت مہینے کا پرعظمت نبوی منشور ہے، اور سارے ہی مسلمانوں کے لئے اس بات کا اعلان ہے کہ اتنی سب سہولتوں اور انعامات کی فراوانی کے باوجود رمضان میں رحمت خداوندی کا مستحق نہ ہوسکنا سب سے بڑی محرومی کی بات ہے، اسی مضمون کی طرف اشارہ وہ حدیث شریف کرتی ہے جس میں یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ممبر پر تشریف فرما ہوئے اور ہر درجہ پر آمین کہا۔ بعد میں صحابہؓ کے سوال کرنے پر آپ نے آمین کہنے کی وجہ بیان فرمائی۔ جن میں ایک آمین اس شخص پر بددعا کے بعد کہی گئی تھی جس کو زندگی میں ایک بار رمضان ملا اور اس نے عبادت کر کے اپنے کو مغفرت کا مستحق نہیں بنایا۔ (الترغیب والترہیب ۲/ ۵۷)

آج غور کرنے کا مقام ہے کہ ہم کتنا رمضان کا حق ادا کرتے ہیں اور کتنی کوتاہی کرتے ہیں۔ روزہ رکھتے ہیں تو اس کے آداب کی کہاں تک رعایت رکھتے ہیں، تراویح پڑھتے ہیں تو اس میں کس حد تک نفس کی مشقت برداشت کرتے ہیں۔ ہمارا عمومی معاشرہ اس طرح کا بن گیا ہے کہ روزہ رکھ کر گالی گلوچ، جھوٹ، غیبت، مکروفریب، کسی چیز سے بچا نہیں جاتا اور نہ اس کو روزہ کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ تراویح میں ایسا حافظ تلاش کیا جاتا ہے جو جلد سے جلد الٹا سیدھا سنا کر فارغ کرے۔ عبادات میں تخفیف گوارا ہوتی ہے لیکن دنیوی کاروبار میں کسی طرح کی کمی برداشت نہیں کی جاتی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں رمضان المبارک کا حق ادا کرنے کی دولت سے نوازے۔ (آمین)

(ندائے شاہی، مارچ ۱۹۹۲ء)

❍❖❍

رمضان اور ہمارا معاشرہ

ماہ مبارک کی آمد آمد کا غلغلہ اہل ایمان کی زبانوں پر ہے۔ جذبۂ عبادت واطاعت سے لبریز قلوب رحمت خداوندی کی برسات کے بے چینی سے منتظر ہیں۔ مسلمان بچے رمضان کے مبارک چاند کے طلوع کا انتظار کررہے ہیں تو مسلم گھرانوں کی عورتیں ابھی سے سحر وافطار کے لئے تیاریاں کررہی ہیں۔ دوکانداروں کے لئے بھی ماہ مبارک مادّی خوشحالی کا پیغام بن کر آرہا ہے۔ حفاظ کرام اگر قرآن کریم کی گردان میں مشغول ہیں تو قرآن سننے کا شوق رکھنے والے حافظوں کی تلاش میں سرگرداں نظر آرہے ہیں۔ اور بہت سے مالدار نعمت خداوندی کے قدرداں اپنی زکوٰۃ کے حساب و کتاب میں مشغول ہیں تاکہ ماہ مبارک شروع ہوتے ہی اپنے فریضہ سے سبکدوش ہوں اور ستر گنا ثواب حاصل کریں۔ الغرض ہر سطح پر ماہ مبارک کے استقبال کا شعور معاشرہ میں وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ بڑھتا جارہا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انتظار کی گھڑیاں اختتام کو پہنچتی ہیں۔

تراویح

آج چاند رات ہے۔ ماہ مبارک کے اعزاز میں شہروں اور دیہاتوں کی فضا گولوں اور سائرنوں کی آوازوں سے معمور ہے۔ بچوں کے شور وشغب سے کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی۔ مسجدوں، مکانوں اور کارخانوں میں تراویح کی تیاریاں زور وشور سے جاری ہیں۔ کہیں اطمینان سے ایک ایک پارہ پڑھا جائے گا۔ بہت سی جگہوں پر تین تین پاروں کی گردان ہوگی اور کسی کسی جگہ صرف ایک ڈیڑھ گھنٹے میں پانچ پانچ پارے پڑھنے کا باقاعدہ اعلان کیا جائے گا۔ یہاں الفاظ کی سرعت دیکھ کر آبشاروں کی روانی بھی شرمائے گی اور رکوع وسجدہ کے آداب کی برسرعام

پامالی شیطان کو بھی شاباشی دینے پر مجبور کردے گی۔ان جگہوں پر سیکڑوں نہیں ہزاروں کا مجمع ہوگا۔ ایسی مساجد و مقامات پر تل رکھنے کی جگہ نہ ملے گی۔حتی کہ لاؤڈاسپیکر بھی اپنے سامعین تک آواز پہنچانے میں ناکام نظر آئیں گے۔اس عظیم مجمع کا مقصد عبادت کم،تماشہ اور نام ونمود زیادہ ہوگا اور ہر ایک یہ چاہے گا کہ جلد از جلد تراویح کی بیگار ٹال کر چائے اور کھانے کے ہوٹلوں کی راہ لے اور میوزک کے ساتھ بجنے والی نظموں اور قوالیوں کے درمیان خوش گپیاں کرتے ہوئے رات گزار دے۔

کسی کو اس ''تیز گام'' تراویح کو دیکھ کر یہ احساس تک نہ ہوگا کہ اس نے اپنے سب سے بڑے محسن ''قرآن کریم'' کی توہین میں کہاں تک حصہ لیا ہے؟ اور کتاب اللہ کے دل کو کس قدر ٹھیس پہنچائی ہے؟ دوسروں کو چھوڑیئے خود حافظ بھی اپنی تیزی پر فخر کرتا دکھائی دے گا اور اس کے دل پر قطعاً یہ بات نہ گزرے گی کہ اس نے الفاظ قرآنی کا گلا گھونٹ کر کتنی بڑی زیادتی کی ہے۔اور قرآن کو اپنے سے ناراض کر کے کتنی بڑی محرومی مول لی ہے؟

قرآن کریم کو زیادہ سے زیادہ پڑھنا اور سننا، سنانا یقیناً باعثِ اجر عظیم ہے لیکن اسی وقت جبکہ اس کا حق ادا کر کے پڑھا جائے۔حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نصیحت فرماتے ہیں''اس قرآن کریم کو شعر کی طرح جلدی جلدی نہ پڑھو اور سوکھی ہوئی کھجوروں کی طرح اسے مت گراؤ۔ بلکہ اس کے عجائب پر توقف کرو اور اس سے دلوں کو جھنجھوڑو اور تم میں سے کسی کا یہ ارادہ ہو کہ (بہرحال) سورت ختم کرنی ہی ہے۔(زادالمعاد ۱/۲۴۰) موجودہ زمانہ کے''سپر فاسٹ'' حفاظ کو خدا سے ڈرنا چاہئے اور سوچنا چاہئے کہ وہ اپنی عظیم نعمت کو کس طرح پامال کررہے ہیں؟ کاش ہمیں قرآن کی عظمت کا احساس ہوتا۔کاش ہمارے دلوں میں بہتر قرآن سننے اور سنانے کی خواہش انگڑائیاں لیتی۔اور ہم قرآن کا واقعی حق ادا کرنے والے بن جاتے۔

راتوں کی بے قدری

یہ تہجد کا وقت ہے۔رمضان کی رحمتیں ٹوٹ کر بندگانِ خدا پر برس رہی ہیں۔فرشتے صدا لگارہے ہیں''اے بھلائی کے طالب آگے بڑھ اور اسے برائی کا ارادہ کرنے والے اپنے ارادے

سے باز آ''۔ (مشکوٰۃ ۱/۱۷۳) اللہ رب العالمین اپنے بندوں کا شوق عبادت دیکھ کر فرشتوں سے فخر فرمارہا ہے۔ (الترغیب والترہیب ۲/۶۰) گویا رحمت کا دروازہ وا ہے اور شفقت و رحمت کا دریا جوش مار رہا ہے، ایسے میں کوئی خوش نصیب اپنے گرم گرم بستر کو چھوڑ کر رحمت کے حصول کی امید میں وضو کی مشقت اٹھاتا ہے اور پھر بارگاہ ایزدی میں دست بستہ کھڑے ہوکر راز و نیاز میں مشغول ہونا چاہتا ہے، مگر یہ کیا؟ وہ پڑھنا چاہتا ہے مگر پڑھا نہیں جاتا۔ وہ آگے بڑھتا ہے تو نسیان وذہول کا غلبہ اس کے قلبی اطمینان وسکون کے تار و پود بکھیر دیتا ہے۔ اس لئے کہ قوالیوں اور گانوں کی آواز سے فضا پر شور ہے، سکون مفقود ہے، عبادت جس قلبی انبساط کو چاہتی ہے اس کا دور دور تک پتہ نہیں ہے۔ کیا یہ میوزک اور گانے غیر مسلم بجا رہے ہیں تاکہ مسلمانوں کی عبادت کو غارت کیا جاسکے؟ نہیں نہیں! یہ رمضانی ہوٹلوں اور ''محبین رسول'' کے گھروں سے نکلنے والی آوازیں ہیں جنھوں نے مسلم محلوں میں تہجد کے وقت عبادت کا مزا کِرکِرا کر کے رکھ دیا ہے۔ یہ وہی گانے ہیں جن کے بارے میں ہمارے آقا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ گانا دل میں اس طرح نفاق کی آبیاری کرتا ہے جیسے پانی کھیتی کو اُگاتا ہے۔ (مظاہر حق ۴/ ۹۱، شعب الایمان ۴/ ۲۷۹)

یہ گانے اللہ کی رحمت کے بجائے اس کے غضب کے نزول کا سبب ہیں۔ رمضان کی متبرک راتوں میں شیطان نے ہمیں ان خرافات میں مبتلا کر کے اللہ کی رحمت سے دور کر دیا ہے۔ ہے کوئی اللہ کا بندہ جو اس لعنت سے قوم کو نجات دلا کر اپنے لئے اخروی سعادت کی ضمانت لے؟ اور عبادت گزاروں کی دعاؤں میں اپنا حصّہ مقرر کرالے؟

دنوں کی بے حرمتی

یہ ایک خالص مسلم آبادی کا محلّہ ہے۔ لوگوں کی چہل پہل قابل دید ہے۔ بچوں کے کھیل کود کا انداز بھی مسلم قومیت پر پوری طرح شاہد عدل ہے۔ ہونا یہ چاہئے تھا کہ یہاں رمضان کے مبارک زمانہ میں کھانے پینے کی دوکانوں پر دن میں ''ہُو'' کا عالم ہوتا، ہوٹلوں اور چائے خانوں کے دروازوں پر پڑے ہوئے تالے ببانگ دُہل مسلم معاشرہ کی اسلامیت کا ثبوت فراہم کرتے۔ مگر

افسوس! یہاں سے دن میں بھی پلیٹوں اور پیالیوں کی کھنکھناہٹ کا شور سنائی دیتا ہے۔بس فرق یہ ہے کہ رمضان سے پہلے کوئی پردہ نہیں تھا۔اوراب لوگوں کو بیوقوف بنانے یا روزہ خوروں کومکمل پناہ دینے کی غرض سے ہوٹل کے دروازے پر میلا سا پردہ ڈال دیا گیا ہے۔اگرکوئی اللہ کا بندہ ان رمضان کی عظمت سے کھلواڑ کرنے والوں سے اہانتِ دین کی شکایت کرتا ہے تو یہ ''ہوٹل کے مسلمان مالک'' الٹا اسے ہی خطاوارٹھہراتے ہیں کہ یہ شخص ہماری روزی پر لات مارنا چاہتا ہے۔ انھیں اللہ کی ناراضگی کی فکرنہیں رہتی بلکہ صرف اپنی کمائی اور ذاتی مفاد پیشِ نظر رہتا ہے۔

ذرا سوچیے ! کیا اس کھلی ہوئی بے حرمتی پر خاموش رہ کر ہم اللہ کے غضب کو دعوت نہیں دے رہے ؟

یہ سنت کا مذاق

یہ ایک نائی کی دوکان ہے۔صبح ہی سے دُکان پر شیو بنوانے والوں کی بھیڑ ہے۔نائی بھی حیران ہے کہ آج بیک وقت اتنے سارے شیو بڑھے ہوئے لوگوں نے کیوں اچانک میری دوکان پر ہلّہ بول دیا ہے؟ تحقیق سے پتہ چلا کہ یہ بھیڑ ان بدنصیب حفّاظ کی ہے جو سال بھر داڑھی جیسی عظیم سنتِ اسلام سے محروم رہتے ہیں اور جو صرف قرآن سنانے کا حق حاصل کرنے کے لئے رمضان سے چند روز قبل شیو بنانا چھوڑ دیتے ہیں اور جب دسویں شب کوختم قرآن کے بعد ان کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے تو یہ پھر اپنی سابقہ شیطانی ڈگر پر آ جاتے ہیں۔اور شیطان نے ان کے نفس کو اس محرومی کا ایسا عادی بنا دیا ہے کہ رمضان میں شیطانوں کی بندش کے باوجود ان کا اپنا نفس شیطان کی قائم مقامی کا کام انجام دیتا ہے ان کی اس جسارت کو دیکھ کر سچے صاحبِ ایمان کا کلیجہ منہ کو آ رہتا ہے۔کیا اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ اس بے ہودہ مذاق سے ہم نے بچنے کا کوئی راستہ نکالا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ایسے بے غیرت اور تارک سنت حفّاظ کا قرآن کریم سن کر ہم بھی ایک سنت کے مذاق میں جان بوجھ کر شریک ہو رہے ہیں۔کیا اس استہزا کو روکنے کے لئے ہماری اسلامی غیرت کچھ انگڑائی لے گی؟

افطار پارٹیاں

شامیانے، سجاوٹ، میز کرسیاں، اور چکا چوند روشنی دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کوئی بڑی ''خلاف شرع شادی'' ہونے والی ہے۔ پوچھنے پر پتہ چلتا ہے کہ یہ شادی نہیں ہے بلکہ ''افطار پارٹی'' کا اہتمام ہے۔ یہ پارٹیاں نئے زمانہ کے رمضان کا فیشن اور سیاست اور چاپلوسی کا پلیٹ فارم بن گئی ہیں نام ونمود اور سستی شہرت کے لئے بھی اس عنوان کا سہارا لیا جانے لگا ہے۔ ان پارٹیوں میں غریبوں اور دینداروں کے بجائے عموماً ایسے لوگ مدعو ہوتے ہیں جو ماہ مبارک کے مقصد اور روح سے ناآشنا ہیں۔ ان تقریبات کی نحوست سے بہت سی جگہ شرکاء مغرب کی نماز تک سے محروم ہوجاتے ہیں اور تراویح بھی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان تقریبات کی تصویر کشی اور ویڈیوگرافی کرکے روزہ کا ثواب برسرِ عام غارت کیا جاتا ہے۔ اور کہیں کہیں تو پارٹیوں میں مردوں اور عورتوں کا بے محابا اختلاط شرم وحیا کی چادر کو تار تار کردیتا ہے۔

درحقیقت اس طرح کی اجتماعی افطار پارٹیاں ماہ مبارک کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ بنتی جارہی ہیں۔ اور ہمیں رمضان کی اس بے ادبی کا قطعاً احساس نہیں ہے، ذرا غور کریں کیا ان منکرات و معاصی کے باوجود افطار کی یہ رسم ہمارے لئے باعث اجر وثواب بن سکتی ہے؟ آج ضرورت ہے ان مسرفانہ تقریبات پر بند لگانے اور بڑھتی ہوئی نام ونمود کی وبا پر روک لگانے کی۔ تاکہ صحیح معنی میں ہم رمضان کی برکتوں سے مالا مال ہوسکیں۔

اعتکاف سے بے رغبتی

آخری عشرہ شروع ہوچکا ہے۔ رمضان کی مقدس ومبارک ساعتیں تیزی سے اختتام کو پہنچ رہی ہیں۔ رات کے وقت مسجد میں جائیں تو عموماً مسجدیں خالی نظر آئیں گی۔ اور اگر کوئی دکھائی بھی دے گا تو ایسا بوڑھا شخص جو اپنی زندگی سے مایوس ہوچکا ہو۔ ایسا کیوں؟ کیا ان دنوں میں اعتکاف سنت موکدہ بالکفایہ نہیں؟ کیا شہنشاہِ عالم کے دربار میں برابر حاضری اہلِ ایمان کو محبوب نہیں؟ کیا ماہ مبارک کی برکتیں لوٹنے کا ان میں ولولہ نہیں؟ ہاں! ضرور ہے۔ مگر صرف زبان کی حد تک۔ جب

بات وقت کی قربانی اور عیش و آرام کو چھوڑنے کی آتی ہے تو یہ ولولہ اور جذبہ یکسر کافور ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ اعتکاف کا مطلب دوسرے لفظوں میں کاروبار کا نقصان اور دنیوی مصروفیتوں میں دخل اندازی بھی ہے جسے برداشت کرنے کا ہم حوصلہ نہیں رکھتے۔ اللہ اکبر! کاروبار چھوڑنے پر نقصان کا احساس اس قدر اور رزاق حقیقی پروردگار عالم کی رحمتوں سے محرومی پر نہ کوئی افسوس اور نہ اس کی تلافی کا کوئی جذبہ؟ آخر اس بے حسی کی کوئی حد ہے؟

اعتکاف کی وہ عبادت جس کا ہمارے محبوب سرور کائنات فخر دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم ملنے کے بعد کبھی ناغہ نہیں فرمایا۔ اور جس کے متعلق کتب حدیث میں آپ کا یہ ارشاد منقول ہے کہ جس شخص نے رمضان کے دس دن کا اعتکاف کیا اس کو دو حج اور دو عمرہ کا ثواب عطا کیا جائے گا۔ (الترغیب والترہیب ۲/ ۹۶، شعب الایمان ۳/ ۴۲۵) ایسی مہتم بالشان عبادت آج ہمارے اوپر بوجھ بن چکی ہے۔ کتنی ہی مسجدیں اور بستیاں اس اہم سنت سے محروم رہتی ہیں اور پورا علاقہ سنت کفایہ چھوڑنے کا گناہ اپنے سر لیتا ہے۔ اللہ رب العزت ہمیں اس عظیم عبادت کی انجام دہی کی سعادت سے بہرہ ورفرمائے۔ آمین۔

اُف یہ برتاؤ!

رمضان کا زمانہ ہے۔ ایک مالدار اپنی فرم کے ''کیبن'' میں پورے امیرانہ غرور کے ساتھ موجود ہے۔ گھنٹی بجتی ہے۔ چپراسی اندر آتا ہے اور خبر دیتا ہے۔ سر! ایک مولوی صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ مالدار کی پیشانی پر تکدّر کی سلوٹیں پڑ جاتی ہیں۔ کچھ سوچ کر۔ اور کچھ بڑ بڑا کر۔ نہایت ترش انداز میں کہتا ہے۔ ''بلالو۔'' مولوی صاحب ہاتھ میں بیگ لئے ہوئے کیبن میں پہنچتے ہیں۔ ابھی وہ اپنے حواس بجا نہیں کر پاتے کہ مالدار کی کرخت آواز بلند ہوتی ہے۔ ''آپ لوگوں کو کسی کے وقت کی قیمت کا قطعاً احساس نہیں۔ جب چاہا منہ اٹھا کر چلے آئے۔ چندہ کے علاوہ آپ لوگوں کا کوئی کام بھی ہے؟ مجھے اس وقت بات کرنے کی فرصت نہیں ہے۔ کسی اور وقت آیئے گا''۔ مولوی صاحب انا للہ پڑھ کر واپس ہو جاتے ہیں۔ دوسرے وقت پھر حاضر

ہوتے ہیں۔مگرمحرومی ہی رہتی ہے۔حتی کہ تیسری اور چوتھی مرتبہ میں زکوٰۃ کی معمولی رقم دے کر ان پر''احسان'' کیا جاتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر یہ چندہ اپنی ذات کے لئے مانگا جاتا تو اس ذلت آمیز سلوک پر مولوی صاحب قیامت کی چوتھی تک بھی اس کے سامنے دوبارہ ہاتھ پھیلا کر اپنی ذلت و رسوائی مول نہ لیتے۔لیکن آج ایک نہیں سیکڑوں مولوی محض اللہ کے دین کی بقا، اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی علمی وروحانی امانت کی حفاظت کے لئے اپنی اَنا کو قربان کر چکے ہیں اور اس کے برخلاف جو مالدار انھیں حقیر یا ذلیل سمجھتے ہیں۔یا بار بار چکر کٹوا کر انھیں ہراساں اور پریشان کرتے ہیں وہ علم کی بے قدری کر کے اپنی عاقبت خود خراب کرتے ہیں۔

مالداروں کو تو ان مدارس اور ان کے نمائندوں کا احسان مند ہونا چاہئے کہ یہ ان کے لئے خیرات میں حصّہ لینے کا ذریعہ اور آخرت کی فلاح کا وسیلہ بنتے ہیں۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادگرامی ہے کہ ''صدقہ خیرات کیا کرو۔اس لئے کہ عنقریب وہ زمانہ آنے والا ہے کہ ایک شخص اپنی زکوٰۃ لے کر نکلے گا تو جسے زکوٰۃ دی جائے گی وہ کہے گا کہ اگر آپ کل گذشتہ یہ رقم لاتے تو میں قبول کر لیتا اب تو مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔تو وہ مالدار کسی ایسے شخص کو نہ پائے گا جو اس کے صدقے کو قبول کر لے''۔(مسلم شریف ۱/ ۳۲۵) معلوم ہوا کہ چندہ دینا مدرسہ یا مولوی پر احسان نہیں بلکہ درحقیقت یہ اپنی ذات پر احسان ہے۔کاش ہمیں اس حقیقت کو اعتراف کی توفیق ہو سکے۔

ختم قرآن

مسجد دلہن بن رہی ہے۔اوپر سے نیچے تک لائٹوں اور رنگ برنگے قمقموں سے فضا پُر نور ہے۔ آج یہاں ختم قرآن ہوگا۔روزانہ تراویح میں زیادہ سے زیادہ ایک صف ہوتی تھی۔مگر آج اذان کے وقت ہی سے مسجد باوجود وسعت دامانی کے تنگ ہوگئی ہے۔کیوں؟ اس لئے کہ تراویح کے بعد آج مٹھائی کی تقسیم کا بھی پلان ہے۔جس کے لئے کئی دنوں سے چندہ کی تحریک چل رہی تھی۔اللہ اللہ کر کے حافظ صاحب نے وتر کا سلام پھیرا۔دُعائیں مانگی گئیں۔مٹھائیاں تقسیم ہوئیں۔ادھر

حافظ صاحب کو پھولوں سے لاد دیا گیا اور ساتھ میں طے شدہ یا بلا طے شدہ قرآن سنانے کا معاوضہ بنام ''نذرانہ'' پیش کیا گیا۔ حافظ صاحب کی دلی مراد پوری ہوئی تو دینے والوں نے بھی شکر کا سانس لیا کہ چندہ کی محنت ٹھکانے لگ گئی۔ مگر دینے والوں اور لینے والے کسی کو یہ خیال بھی نہ گذرا کہ قرآن جیسی عبادت پر یہ ''لین دین'' کیسا؟ کسی کو توفیق نہ ہوئی کہ اس بارے میں حکم شریعت سے باخبر ہوتا کہ یہ ''لینا دینا'' جائز بھی ہے یا نہیں؟

چند ٹکوں کے لئے قرآن کی اس خرید و فروخت نے آج حفّاظ کرام کی حیثیت عرفی مجروح کر کے رکھ دی ہے ہماری غیرت اس حد تک گر چکی ہے کہ ہم نے قرآن کریم سنانے تک کو ذریعۂ معاش بنا لیا ہے۔ قسم بخدا! راج مزدوری کر کے حلال روزی کمانا قرآن کریم کو کمائی کا وسیلہ بنانے کے مقابلہ میں لاکھ درجہ بہتر ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''جو شخص قرآن کریم کو اس لئے پڑھے تا کہ اس کے ذریعہ سے لوگوں سے روزی اور کھانے پینے کی چیزیں حاصل کرے تو وہ قیامت کے دن اس حال میں اٹھایا جائے گا کہ اس کے چہرہ پر صرف ہڈی ہی ہڈی ہوگی۔ گوشت موجود نہ ہوگا۔'' (مشکوٰۃ شریف ۱/۱۹۳) ذرا غور فرمائیں اللہ کی نظر میں یہ کتنا بھیانک جرم ہے جس میں ہم مبتلا ہیں۔ اور اس رواج کو ختم کرنے کے لئے ہم اپنی شرعی ذمہ داری کہاں تک نبھا رہے ہیں؟

بازاروں کی گہما گہمی

دوکان کی چمک دمک قابل دید ہے، خاص کر جوتے اور کپڑے کی دوکانیں خریداروں سے پٹی پڑی ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ یہاں ہر طرف ''صنف نازک'' کی حکمرانی ہے۔ کوئی حیادار مرد اپنے دامن حیا کو ٹھیس پہنچائے بغیر اس مجمع سے گذرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ جوں جوں رمضان المبارک کی مبارک ساعتیں قیمتی ہوتی جائیں گی اور عید مبارک کا فاصلہ کم ہوتا جائے گا، بازاروں کی رونق بھی بڑھتی جائے گی۔ جو مسلمان دوکاندار تہجد کے نام پر دو رکعت نماز پڑھنے پر کبھی اپنے کو تیار نہ کر سکے وہ اب پوری پوری رات دوکان پر جاگ کر گزار دیں گے، وہ عورتیں جنھیں پورے رمضان

ایک جگہ بیٹھ کر ایک دو پارہ قرآن پڑھنے کی توفیق نہ ہوسکی وہ آج کل رات دن بے پردہ دوکانوں پر مٹر گشتی کرتی ہوئی دکھائی دیں گی۔ان راتوں میں تراویح پڑھنے اور قرآن سننے کا تو گویا تصور ہی نہیں۔ بہت ہوگا تو ''الم ترکیف'' سے پڑھ کر احسان جتایا جائے گا۔جیسے جیسے عید قریب آتی جائے گی مسجدیں خالی اور بازار بھرتے چلے جائیں گے۔

افسوس! جو زمانہ سب سے زیادہ برکت کا تھا اور جو متبرک ساعتیں سارے رمضان کا خلاصہ اور مکھن کی حیثیت رکھتی تھیں، انھیں ہم اپنے ہی ہاتھوں گنوانے کے عادی بن گئے ہیں ہمارے اندر سے آخرت کی فکر نکل چکی ہے اور دنیا کی زیب و زینت نے ہماری آنکھیں خیرہ کردی ہیں۔انہی سب خرافات کی بدولت ہم شب قدر جیسی عظیم الشان رات کی کما حقہٗ عبادت سے بھی محروم رہ جاتے ہیں۔اور اس مبارک رات میں بھی معاصی ومنکرات میں مبتلا رہ کر اپنے کو جہنم کا ایندھن بناتے ہیں۔ ہمارے دن ٹیلی ویژن دیکھتے ہوئے، جھوٹ بولتے ہوئے، غیبت کرتے ہوئے اور راتیں خوش گپیاں کرتے ہوئے گزرتی ہیں۔

اس لئے آیئے عہد کریں کہ رمضان کی جو نعمت ہمیں نصیب ہونے والی ہے ہم اس کی پوری طرح قدر کریں گے۔ اور ان تمام خرابیوں سے خود بچیں گے دوسروں کو بھی بچائیں گے جو آج رمضان کے پُرنور زمانہ میں رائج ہوگئی ہیں۔

اے اللہ ہماری حالت بدل دے اور اپنی ذات پر سچا یقین پیدا فرما کر ہمیں اپنے عبادت گذار اور آخرت کی فکر کرنے والے بندوں میں شامل فرمادے۔آمین۔

(ندائے شاہی، فروری ۱۹۹۴ء)

رمضان اور تراویح

رمضان المبارک قریب ہے ۔اسکے استقبال کی دیگر تیاریوں کے ساتھ تراویح کے نظم وانتظام ،اور حفاظ کرام کے تقرر کے انتظامات بھی کئے جارہے ہیں۔ یہ بات باعث اطمینان ہے کہ ہمارے دینی معاشرے میں بحمدہ تعالیٰ عام طور پر تراویح میں قرآن کریم سننے کا شوق اور اہتمام کافی حد تک موجود ہے جس پر جتنا بھی شکرادا کیا جائے کم ہے۔اسلئے کہ جس قدر بھی امت کا رابطہ قرآن کریم سے زیادہ ہوگا اتنا ہی اسکے لئے خیر کے دروازے کھلیں گے اور ترقی کی راہیں آسان ہوں گی۔لیکن یہاں یہ حقیقت پیش نظر رکھنی ضروری ہے کہ شریعت میں اعمال کی اہمیت محض دل کے جذبات اور ذاتی ذوق وشوق سے نہیں ہوتی بلکہ عمل کی قدر و قیمت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ وہ کس قدر شریعت کی متعین کردہ حد کے دائرہ میں ہے، اگر کوئی عمل شریعت کی حد کے اندر ہو تو عمل کے معمولی ہونے کے باوجود اسکا اجر وثواب ناقابل تصور حد تک بڑھ جائے گا،اور اگر دائرۂ شریعت سے نکل جائے تو دیکھنے میں بڑے سے بڑا عظیم الشان عمل بھی ثواب کے اعتبار سے بے حقیقت اور بے وقعت قرار پاتا ہے۔

اس حقیقت کو سامنے رکھ کر ہمیں تراویح اور قرآن کریم کے متعلق اپنے عمل اور شوق کا جائزہ لینا چاہئے اسلئے کہ ہم میں سے بہت سے لوگ اس بارے میں شوق کے جوش میں شرعی ہدایات کو پس پشت ڈال دیتے ہیں، مثال کے طور پر بڑے شہروں میں آج کل ۳-۳ بلکہ ۵-۵ پارے تراویح میں پڑھنے کا رواج ہو چلا ہے، اور برابر بڑھتا چلا جارہا ہے، زیادہ قرآن کریم پڑھنا یا سننا منع نہیں ہے، لیکن اسکے ساتھ ساتھ اسکے آداب کی رعایت بھی ضروری ہے، یعنی اگر زیادہ سننے کا شوق

ہے تو سننے اور پڑھنے کے لئے وقت بھی زیادہ لگایا جائے، مثلاً ۳ پاروں کے لئے کم از کم دو گھنٹہ یا پانچ پاروں کے لئے تقریباً ۳ گھنٹہ۔ اسی طرح پڑھنے والا اتنا تیز نہ پڑھے کہ حروف کٹ جائیں یا غلطیاں رہ جائیں، نیز مقتدی سب ذوق وشوق سے سننے والے ہوں، اگر ان امور کا خیال رکھ کر پڑھا اور سنا جائے تو کوئی منع نہیں کرتا، لیکن اس کے برخلاف ہمارا حال آج یہ ہے کہ:

(۱) ہم چاہتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ قرآن کم سے کم وقت میں ہمیں سنا دیا جائے بہت سی جگہ معلوم ہوا کہ ایک سوا گھنٹہ میں ۳ پارے مع رکوع سجدہ، فرض و وتر سنا کر ایک طرف کیا، اور مقتدیوں کی بھیڑ بہت خوش کہ امام صاحب نے مختصر وقت میں اتنا زیادہ سنا کر کمال کر دیا۔

(۲) دوسری بات باعث تشویش یہ ہے کہ زیادہ سنانے کے شوق میں اکثر حفاظ کرام حروف کو ہی چبا جاتے ہیں جلد بازی کی بنا پر بسا اوقات آیتیں چھوٹ جاتی ہیں اور حافظ صاحب پر جلد بازی کا ایسا جنون سوار رہتا ہے کہ اگر بے چارا سامع کسی غلطی پر لقمہ بھی دینا چاہے تو اتنے وہ سانس لیتا ہے اتنے میں حافظ صاحب کہیں کے کہیں پہونچ جاتے ہیں اور لقمہ سامع کے منہ ہی میں رہ جاتا ہے، ایسی جلد بازی قرآن کریم کی سخت بے ادبی اور توہین ہے، اور جو مقتدی ایسے جلد باز حفاظ کو بخوشی سنکر اسکی تائید کرتے ہیں وہ بھی قران کی توہین میں شرکت کے مرتکب ہو رہے ہیں، حالانکہ ایسے حفاظ کی حوصلہ افزائی کی نہیں بلکہ حوصلہ شکنی کی ضرورت ہے۔

جلیل القدر صحابیٔ رسول سیدنا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم پڑھنے کے آداب بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا:

لَا تَهُذُّوا الْقُرْآنَ هَذَّ الشِّعْرِ وَلَا تَنْثُرُوْهُ نَثْرَ الدَّقَلِ وَقِفُوا عِنْدَ عَجَائِبِهٖ، وَحَرِّكُوْا بِهِ الْقُلُوْبَ وَلَا يَكُنْ هَمَّ اَحَدِكُمْ اٰخِرَ السُّوْرَةِ.

قرآن کریم کو اشعار پڑھنے کی طرح جلدی جلدی مت بڑبڑاؤ، اور ردّی کھجور کی طرح اسے مت پھینکو، اور اسکے عجیب مضامین پر توقف کر کے غور کرو، اور اسکے ذریعہ دلوں کو چھنجوڑا

(زاد المعاد ۱/۳۴۰) کرو، اور تمہاری اصل فکر سورت پوری کرنے کی نہ ہوا کرے، (یعنی سورت پورا کرنے کے فراق میں حروف مت کاٹا کرو)

(۳) تیسرے یہ کہ عام طور پر جہاں زیادہ پارے پڑھے جاتے ہیں وہاں اوباش نوجوانوں کی بھیڑ اکٹھی ہوجاتی ہے اور وہ عموماً پہلی رکعت کے رکوع ہونے تک پچھلی صفوں میں یا مسجد کی اوپری منزل میں وہ ادہم مچاتے ہیں کہ شریف آدمی کا وہاں نماز پڑھنا مشکل ہوجاتا ہے بلکہ بسا اوقات لڑائی جھگڑے تک کی نوبت آجاتی ہے۔

اس کے علاوہ چند روز میں قرآن کریم سن کر ختم کر لینے کا ایک بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ قرآن ختم ہوجانے کے بعد بقیہ دنوں میں تراویح کا اہتمام ختم ہوجاتا ہے موقع ہو تو پڑھ لی ورنہ غائب، جب کہ پورا قرآن شریف سننا تو محض مستحب ہے اور روزانہ تراویح پڑھنا یہ سنت مؤکدہ ہے جو واجب کے قریب ہے جسکو بلا عذر چھوڑنا جائز نہیں، تجربہ سے یہ بات ثابت ہے کہ جب تک قرآن ختم نہیں ہوتا تراویح کا اہتمام خود بخود باقی رہتا ہے اور ختم ہونے کے بعد اہتمام کی وہ کیفیت باقی نہیں رہتی۔

نیز جلد قرآن کریم کے ختم سے ایک محرومی یہ بھی لازم آتی ہے کہ رمضان کے آخری ایام میں جن میں زیادہ عبادت کرنا باعث صد فضیلت ہے ان میں ابتدائی ایام کے مقابلے میں عبادتوں کا معیار گھٹ جاتا ہے اور اسکی وجہ یہی بنتی ہے کہ ختم قرآن کے بعد پہلا جیسا ذوق وشوق باقی نہیں رہتا اسلئے اگر ہم رمضان کی رحمتوں کے زیادہ سے زیادہ مستحق بننا چاہتے ہیں اور قرآن کے متعلق اپنے ذوق وشوق سے واقعی فائدہ اٹھانے کے متمنی ہیں تو ہمیں ایسا انتظام کرنا چاہئے کہ پورے مہینہ ہمارے اندر شوق عبادت نہ صرف باقی رہے بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہی رہے اور ہر ایسے عمل سے اجتناب کرنا چاہئے جس سے نیکی برباد اور گناہ لازم آجائے، اللہ تعالیٰ پوری امت کو رمضان کی برکات سے مالا مال فرمائے اور ہر منکر اور معصیت سے محفوظ رکھے، آمین۔

(ندائے شاہی نومبر ۲۰۰۱ء)

اعتکاف کیجئے، برکتیں سمیٹئے!

اعتکاف یعنی عبادت کی نیت سے کسی آباد مسجد میں رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں مقیم رہنا اگرچہ شرعی اعتبار سے سنتِ کفایہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ عبادت ہر شخص پر لازم نہیں بلکہ محلّہ میں ایک آدمی بھی اگر اس عبادت کو انجام دے دے تو دیگر لوگ ترک سنت کے وبال سے محفوظ ہو جاتے ہیں مگر اس شرعی حیثیت سے اعتکاف کی افادیت اور عظمت پر کوئی فرق نہیں پڑتا، یہ تو اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے کہ اس نے اسے فرض اور واجب قرار نہیں دیا ورنہ ہمارے لئے بڑی تنگی پیش آجاتی۔ ہماری سہولت اور ضروریات کا خیال رکھتے ہوئے یہ عبادت سنت کفایہ قرار دی گئی ہے تاکہ قرب خداوندی کے متلاشی لوگ بغیر کسی مشقت اور تنگی کے اس عبادت سے بہرہ ور ہوسکیں۔

واقعہ یہ ہے کہ رمضان المبارک کے متبرک ومسعود اوقات کی قدر اعتکاف کے بغیر کامل طور پر نہیں ہوسکتی۔ آدمی کتنا ہی شوقین ہو کسی کام میں مستقل مشغول رہنے کے باعث طبیعت میں فطری اکتاہٹ پیدا ہو ہی جاتی ہے۔ اور عبادت کا تسلسل موقوف ہو جاتا ہے لیکن اعتکاف ایسی عبادت ہے کہ معتکف اگر مسجد میں خالی بھی بیٹھا رہے پھر بھی عبادت گذاروں میں شمار ہوتا ہے اور معتکف کا کوئی لمحہ ضائع نہیں ہوتا اور مسجد میں بیٹھے بٹھائے اسے بے شمار اعمال صالحہ کا ثواب ملتا رہتا ہے چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ معتکف گناہوں سے محفوظ رہتا ہے اور اسے (ان) تمام نیکیوں کا (جنھیں وہ اعتکاف کے سبب انجام نہیں دے سکتا) اتنا ہی بدلہ عطا کیا جاتا ہے جتنا نیکیاں کرنے والے کو ملتا ہے **اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمْ قَالَ فِي الْمُعْتَكِفِ هُوَ يَعْتَكِفِ الذُّنُوْبَ وَ يُجْزىٰ لَهٗ مِنَ الْحَسَنَاتِ كَعَامِلِ الْحَسَنَاتِ كُلِّهَا.** (مشکوٰۃ شریف/۱۸۳)

ایک دوسری روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ جو شخص اللہ رب العزت کی خوشنودی کی تلاش میں ایک دن کا اعتکاف کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے اور جہنم کے درمیان تین ایسی بڑی خندقیں حائل فرمادیتے ہیں جو دنیا جہان سے زیادہ چوڑی اور وسیع ہیں۔

وَمَنِ اعْتَكَفَ يَوْماً اِبْتِغَاءَ وَجْهِ اللّٰهِ جَعَلَ اللّٰهُ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ النَّارِ ثَلٰثَ خَنَادِقَ اَبْعَدَ مَابَيْنَ الْخَافِقَيْنِ ۔(الترغیب والترہیب ۲/۹۶)

اور رمضان کے آخری عشرہ کے اعتکاف کے سلسلہ میں روایات شاہد ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم ملنے کے بعد کبھی اس کا ناغہ نہیں فرمایا اور ایک روایت میں آتا ہے کہ جس شخص نے رمضان المبارک کے دس دنوں کا اعتکاف کیا اس کو دو حج اور دو عمرہ کا ثواب وعطا کیا جائے گا۔

مَنِ اعْتَكَفَ عَشَراً فِيْ رَمَضَانَ كَانَ كَحَجَّتَيْنِ وَ عُمْرَتَيْنِ . (الترغیب والترہیب ۲/۹۶)

دیکھئے! کتنی معمولی قربانی پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے کس قدر عظیم نعمتوں کا وعدہ کیا جارہا ہے۔ آج کسی شخص کو اگر کسی لیڈر اور حکمراں کی کوٹھی پر چند دن رہنے کی اجازت مل جائے تو وہ اسے بہت ہی فخر کی چیز سمجھتا ہے اور جگہ جگہ اس عظیم عزت افزائی کو جان کر اِتراتا پھرتا ہے۔ تو اگر دنیا کے ان حکام کے دربار کی حاضری اور وہاں قیام موجب عزت ہے تو کیا مالک الملک شہنشاہ عالم کے در پر جاکے پڑے رہنا باعث عزت اور قابلِ فخر نہیں؟ پھر یہ دیکھیں کہ اس چندروزہ ماحول میں رہ کر ہماری طبعیت میں کتنی بشاشت اور روحانی فرحت پیدا ہوتی ہے اور کس طرح ایمان کی زیادتی محسوس طور پر معلوم ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اعتکاف سے ماہ مبارک کا لطف دوبالا ہوجاتا ہے۔

ان سب فوائد کے باوجود غور کرنے کے بات یہ ہے کہ آج ہمارا عام معاشرہ اس عبادت سے محروم ہوتا جارہا ہے۔ رمضان المبارک میں جماعت کی نمازوں اور تراویح وغیرہ کا تو ماشاء اللہ کچھ اہتمام ہوجاتا ہے، لیکن سنت اعتکاف کی ادائیگی کی طرف رجحان کم دکھائی دیتا ہے۔ اور اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم عید کی تیاریوں میں اتنا وقت لگانا چاہتے ہیں کہ کوئی ارمان باقی نہ رہ جائے۔ اور یہ سمجھتے ہیں کہ اعتکاف کی وجہ سے سارے ارمان پورے نہ ہوں سکیں گے۔ تجارت پیشہ

لوگ تو اعتکاف کا خیال بھی دل میں نہیں لاتے اس لئے کہ یہی ان کی سال بھر کی کمائی کا وقت ہے۔ تو دنیا کی کمائی سے محرومی کا اتنا خیال ہے مگر اس رمضان کے سیزن میں رحمت خداوندی کے حصول میں جو کمی رہ جاتی ہے اس کا کوئی احساس نہیں۔ ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ سب لوگ ایک ساتھ اعتکاف کرلیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ ہر گھرانہ والے اس طرح کا نظام بنائیں کہ ان کے گھر کا ایک فرد اعتکاف کیا کرے اگر تین بھائی ہیں تو ایک اعتکاف کرے اور بقیہ بھائی اس کی خبر گیری کریں۔ اگر دوکان پر کئی لوگ بیٹھنے والے ہیں تو ایک آدمی کو ہر سال اعتکاف کے لئے متعین کردیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ اس طریقہ سے اس عبادت کی قدر پیدا ہوگی اور اس کے اثرات پورے گھرانے میں محسوس کئے جائیں گے۔ خاص کر نوجوانوں کو اس عبادت کی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت ہے۔ اعتکاف ان کے لئے ماہ مبارک میں بے شمار گناہوں سے محفوظ رہنے کا ذریعہ بنے گا۔ اور ان کو دینی تربیت کا موقع میسر آئے گا۔ عشرہ اخیرہ سے پہلے مساجد میں اعتکاف کے لئے باقاعدہ تشکیل ہونی چاہئے تاکہ اس عظیم عبادت کی طرف عمومی رجحان ہو اور مسجدیں اعتکاف کرنے والوں سے معمور ہوجائیں۔ اللہ رب العزت ہمیں خصوصی توفیق مرحمت فرمائے آمین۔

اعتکاف کے ضروری مسائل :

ذیل میں اعتکاف سے متعلق چند ضروری مسائل درج کئے جاتے ہیں۔ معتکفین حضرات ان کا خیال رکھیں۔

- رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں (بیسویں تاریخ کے غروب آفتاب سے قبل سے عید کے چاند ظاہر ہونے تک) مردوں کے لئے ایسی مسجد میں جہاں پنجوقتہ نماز ہوتی ہے، اعتکاف کرنا سنت مؤکدہ علی الکفایہ ہے۔ (مراقی الفلاح ۳۸۲)
- عورت اگر اعتکاف کرنا چاہے تو وہ اپنے گھر کے کسی کمرہ کو جائے اعتکاف بناسکتی ہے۔ وہ کمرہ اس کے لئے مسجد کے حکم میں ہوگا۔ یعنی اس کمرہ سے بلاضرورت باہر آنا مفسد اعتکاف ہوگا۔ (عالمگیری ۱/۲۱۱)

- طبعی ضرورت مثلاً پیشاب، پاخانہ، ازالۂ نجاست، غسل جنابت اور ضروری وضو کے لئے اعتکاف کی حالت میں مسجد سے باہر جانا درست ہے۔ (درمختار ۲/۱۴۳)
- شرعی ضرورت مثلاً جمعہ کی نماز کے لئے مسجد سے باہر جانا جبکہ معتکف کی مسجد میں جمعہ نہ ہوتا ہو، اعتکاف کے لئے مفسد نہیں ہے۔ (مراقی الفلاح: ۳۸۳)
- اضطرار یعنی مسجد میں آگ لگ جانے، یا منہدم ہوجانے (وغیرہ) کی وجہ سے بھی مسجد سے باہر نکلنا مفسد اعتکاف نہیں ہے۔ ایسی صورت میں دوسری مسجد کی طرف منتقل ہوجائے۔ (مراقی الفلاح ۳۸۳)
- اگر معتکف کے گھر وغیرہ سے کھانا آنے کا نظم نہیں ہے تو وہ غروب کے بعد کھانا لینے کے لئے اپنے گھر جاسکتا ہے۔ (طحطاوی علی المراقی ۳۸۴)
- بیڑی سگریٹ پینے کا عادی شخص استنجا وغیرہ کے لئے مسجد سے باہر نکلتے وقت اپنی ضرورت پوری کرلے خاص اسی مقصد سے باہر نہ جائے۔ (فتاویٰ رشیدیہ ۴۶۱، فتاویٰ رحیمیہ ۵/۲۰۲)
- بلا عذر کسی مسجد سے باہر نکلنے (خواہ بھول کر ہو) جماع کرنے، بیوی سے دل لگی کے دوران انزال ہوجانے، جان بوجھ کر روزہ توڑ دینے، مرتد ہوجانے (العیاذ باللہ) پاگل ہوجانے اور مسلسل بے ہوش رہ جانے سے اعتکاف فاسد ہوجاتا ہے۔ (شامی ۲/۱۴۵، عالمگیری ۱/۲۱۳)
- اگر معتکف پہلے سے باوضو ہے تو نیا وضو کرنے کے لئے اس کا مسجد سے باہر جانا مفسد اعتکاف ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ ۵/۲۰۱)
- اگر اعتکاف کے دوران عورت کو حیض یا نفاس آجائے تو وہ اعتکاف چھوڑ دے، پاک ہونے کے بعد صرف اس دن کی قضا کرے جس دن حیض آنا شروع ہوا ہے۔ (بہشتی زیور ۳، ص ۱۹)
- اعتکاف کی حالت میں یہ امور مکروہ ہیں، خاموشی کو عبادت سمجھ کر مستقل خاموش رہنا۔ فضول اور لایعنی باتیں کرنا۔ خرید وفروخت کا سامان مسجد میں لانا۔ (اور مختار ۲/۱۴۶)

(ندائے شاہی، فروری ۱۹۹۶ء)

❍❖❍

فریضۂ زکوٰۃ
عبادت بھی — ضرورت بھی

قرآن کریم کی تعلیمات اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ اسلام کی نظر میں انسان دنیا کے مال و اسباب کا نہ خود اصل مالک ہے اور نہ محض اپنے ذاتی اختیار سے دنیوی دولتوں کو اکٹھا کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ اسلام یہ بتا دینا چاہتا ہے کہ سارے وسائل و اسباب کی باگ ڈور اللہ رب العزت کے ہاتھ میں ہے وہ جس کو چاہے رزق سے نوازے اور جس کو چاہے کنگال بنا دے۔ اس کی مرضی کے بغیر نہ تو کوئی مالدار بن سکتا ہے اور نہ کسی کی مالداری کو کوئی چھین سکتا ہے۔ ارشاد خدوندی ہے:

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاءُ وَيَقْدِرُ . (الرعد ۲۷)

"اللہ کشادہ کرتا ہے روزی جس کو چاہے اور تنگ کرتا ہے۔"

الغرض مالداری اور تنگ دستی محض اللہ کے اختیار میں ہے۔ مالداروں کو اپنی دولت پر گھمنڈ کرنے اور غرور کرنے کا قطعاً حق نہیں۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو انھیں ایک لمحہ میں نان شبینہ کا محتاج بنا سکتا ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا۔

مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحمةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا وَمَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْ بَعْدِهٖ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ. (فاطر آیت ۲)

"جو کچھ کھول دے اللہ لوگوں پر رحمت میں سے تو کوئی نہیں اس کو روکنے والا، اور جو کچھ روک رکھے تو کوئی نہیں اس کو بھیجنے والا اس کے سوائے، اور وہی ہے، زبردست حکمتوں والا۔"

یہ اللہ کا فضل ہے

اب ہر مسلمان کو خصوصاً یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہئے کہ اسے جو کچھ بھی دولت وثروت ملی ہے اس کا اصل مالک وہ خود نہیں بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہی مالک حقیقی ہے اور اس نے محض اپنے فضل وکرم سے ہمیں اپنی ملکیت میں بطور نیابت تصرف کرنے کا حق دے رکھا ہے۔ جب اللہ ہی اس کا مالک ہے اور اسی کی قدرت کی بنا پر ہمیں یہ نعمت میسر آئی ہے۔ تو اگر وہ اپنے بندوں کو یہ حکم کرتا کہ وہ اپنا سارا مال اللہ کی راہ میں لٹا دیں تو ہمیں شکایت یا اعتراض کا کوئی موقع نہ تھا۔ کیونکہ اس کی چیز ہے وہ جہاں اور جتنی چاہے خرچ کرے۔ مگر یہ بھی اس کا فضل ہے کہ اس نے جہاں ہمیں خرچ کرنے کا حکم دیا وہاں پورا مال نہیں بلکہ کچھ حصہ خرچ کرنا ضروری قرار دیا۔ قرآن کریم میں جہاں بھی 'انفاق فی سبیل اللہ' کا حکم دیا گیا ہے وہاں ''من'' لاکر اس طرف اشارہ کر دیا گیا کہ سارا مال خرچ کرنا مطلوب نہیں۔ بلکہ کچھ حصہ دے دینا کافی ہے۔ اور ساتھ میں اس طرف بھی توجہ دلائی گئی کہ ہم تمھارا مال نہیں مانگ رہے ہیں بلکہ ہم نے جو تمھیں دیا ہے اسی میں سے تھوڑا سا حصہ لینا چاہتے ہیں تاکہ دینے والے کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔ دیکھئے، ارشادات خداوندی ہیں :

(۱) **وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ.** (البقرہ آیت ۳) (۲) **وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰه.** (النساء ۳۹) (۳) **وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرّاً وَعَلَانِيَةً يَرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ.** (فاطر ۲۹) **وَمَنْ رَّزَقْنَاهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَناً فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرّاً وَجَهْراً.** (نحل ۷۵) (۶) **وَيُنْفِقُوْا مِمَّارَزَقْنٰهُمْ سِرّاً وَّعَلَانِيَةً.** (ابراھیم ۳۱) **وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ،** (انفال ۳) (۸) **وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ.** (حج ۳۵) القصص ۵۴۔ السجدہ ۱۶۔ الشوریٰ ۳۸) (۹) **وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ.** (حدید ۷)

ان جیسی آیات میں اللہ تعالیٰ نے آگاہ کیا ہے کہ زکوٰۃ وغیرہ کا حکم کوئی ٹیکس نہیں کہ اسے بھاری سمجھا جائے بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ اپنی ہی دی ہوئی ایک امانت تم سے مانگ رہا ہے۔ لہٰذا اسے دینے میں تمھارے دل پر کوئی تنگی اور بوجھ نہ ہونا چاہئے۔ بوجھ یا تنگی تو اس وقت ہوتی جبکہ تمھاری ذاتی کوئی چیز تم سے مانگی جاتی۔

شکر ادا کیجیے

پہلے زمانہ میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں صدقہ کی قبولیت کی نشانی یہ تھی کہ صدقہ کا مال کسی جگہ رکھ دیا جاتا اور آسمان سے آگ آکر اسے جلا کر خاکستر کر دیتی گویا کہ صدقہ کا مال کسی دوسرے بھائی کے کام نہ آسکتا تھا۔ بلکہ اس کا آگ سے بھسم ہو جانا ہی اصل مقصود سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ قرآن کریم کی سورہ مائدہ (آیت ۲۷) میں حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کے قصہ کے ضمن میں اس طرف اشارہ موجود ہے اور بعض احادیث سے بھی اسی مضمون کا علم ہوتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس امت مرحومہ پر یہ کرم فرمایا کہ اس سے زکوٰۃ کی شکل میں وصول کیا ہوا مال اسی کے ضرورت مند افراد پر خرچ کر دیا جاتا ہے سورہ توبہ (آیت ۶۰) میں صدقات کے مصارف بیان کئے گئے ہیں۔ اور حدیث میں فرمایا گیا ہے۔

تُوْخَذُ مِنْ اَغْنِيَائِهِمْ وَتُرَدُّ اِلىٰ فُقَرَائِهِمْ. (مشکوٰۃ شریف/۱۰۰)

''مالداروں سے لے کر فقیروں کو دیا جائے گا''۔

اس حکم کی وجہ سے زکوٰۃ دینا اور آسان ہو گیا کہ ہم اپنے مال کو ضائع نہیں کر رہے بلکہ اپنے ہی بھائیوں کی ضرورت پوری کر رہے ہیں۔ اپنے محتاج بھائی کی حاجت روائی پر صرف کرنا دراصل اللہ تعالیٰ ہی کو دینا ہے۔ ایک صحیح حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ تبارک وتعالیٰ ایک شخص سے سوال کرے گا کہ اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا۔ وہ عرض کرے گا کہ پروردگار! بھلا میں تجھ کو کیسے کھانا کھلاتا تو دونوں جہاں کا پروردگار ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تجھ کو یاد نہیں میرا فلاں بندہ تجھ سے کھانا مانگنے آیا تھا تو نے اس کو کھانا نہیں کھلایا۔ اگر تو اس کو کھانا کھلا دیتا تو مجھ کو تو اس کے پاس ہی پاتا۔ الخ (مسلم شریف ۲/ ۳۱۸)

صرف چالیسواں حصّہ

پھر غور فرمایئے کہ پورے مال کا صرف ۴۰ واں حصّہ سال بھر میں فرض کی حیثیت سے نکالنا ضروری قرار دیا گیا اور یہ بھی مطلق نہیں بلکہ وہ مال جو اپنے اندر بڑھنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور

ضرورت اصلیہ سے زائد ہواور اس پر ایک سال اس حالت میں گذر گیا ہو کہ اس کی مقدار نصاب سے کم نہ ہوئی ہو۔ ان سب شرائط کے پائے جانے کے بعد ہی زکوٰۃ کی ادائیگی لازم ہوتی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو پچاس فیصدی یا اس سے زیادہ بھی زکوٰۃ فرض کرسکتا تھا اور مال آتے ہی وجوب کا حکم دیا جاسکتا تھا۔ مگر یہ بھی اس کا محض فضل وانعام ہے کہ اس نے تمام ممکنہ سہولتوں کے ساتھ صرف ۴۰ روپیہ میں ایک روپیہ زکوٰۃ کے طور پر فرض فرمایا ہے۔ اس انعام کے باوجود بھی کوئی شخص زکوٰۃ نکالنے میں کوتاہی کرے تو اس سے بڑا نعمت خداوندی کا ناشکرا کوئی نہیں ہوسکتا۔

نقد فائدہ بھی ہے

اور یہ بھی دیکھئے کہ عام طور پر شرعی عبادات کے ثواب اور نتیجہ کا وعدہ آخرت کی زندگی میں کیا گیا ہے۔ مثلاً نماز سے جنت میں فلاں نعمت ملے گی، روزہ داروں کو فلاں ثواب کا مستحق بنایا جائے گا وغیرہ وغیرہ۔ مگر زکوٰۃ اور صدقات کے لئے جہاں آخرت میں عظیم الشان اجر وثواب کا ذکر ہے وہیں دنیوی نقد فائدہ کو بھی بیان فرمایا گیا ہے۔ اور یہ فائدہ اتنا عظیم ہے کہ دنیا کی کسی دولت سے اس کی قیمت نہیں لگائی جاسکتی اور اس فائدہ کے حصول کے لئے انسان بڑی سے بڑی قربانی دینے اور مالی نقصان برداشت کرنے کے لئے آمادہ ہوجاتا ہے۔ وہ فائدہ یہ ہے کہ زکوٰۃ اور صدقہ ادا کرنے سے بلائیں اور مصیبتیں ٹلا دی جاتی ہیں۔ حدیث میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

بَادِرُوْا بِالصَّدَقَةِ فَاِنَّ الْبَلَاءَ لَا يَتَخَطَّاهَا. (مظاہر حق ۲/ ۱۳۱، مشکوٰۃ شریف ۱۶۷)

''صدقہ دینے میں جلدی کرو اس لئے کہ مصیبت صدقہ سے آگے نہیں بڑھتی''۔

یعنی اللہ تعالیٰ صدقہ کی وجہ سے مصیبت کو دفع فرمادیتا ہے، اور ایک دوسری حدیث شریف میں وارد ہے۔

اِنَّ الصَّدَقَةَ لَتُطْفِئُ غَضَبَ الرَّبِّ وَ تَدْفَعُ مُنْيَةَ السُّوْءِ. (مظاہر حق ۲/ ۱۳۶، مشکوٰۃ شریف ۱۶۸)

''بیشک صدقہ اللہ تعالیٰ کے غصہ کو ٹھنڈا کردیتا ہے اور بُری موت سے بچاتا ہے''۔ یعنی سخت بیماری اور سنگین حالات سے بچانے میں مفید ہے۔

علاوہ ازیں صدقہ اورزکوٰۃ کی ادائیگی کا ایک اثر یہ ہے کہ اس سے مال میں کمی نہیں آتی بلکہ برکت کے اعتبار سے زیادتی ہی ہوتی ہے۔(مظاہر حق ۱۳۲/۲)

آخرت کا نفع ہی نفع

یہ تو دنیا کا فائدہ ہے، مگر زکوٰۃ وصدقہ کے اخروی منافع بھی شمار ہیں اور اصل میں یہی منافع ہمارے پیشِ نظر رہنے چاہئیں یہاں اخروی منافع کا خلاصہ لکھا جاتا ہے۔

(۱) ایک روپیہ کے بدلہ میں سات سو گنا اجر مقرر ہے اور اخلاص وغیرہ کی وجہ سے اس میں زیادتی کا بھی وعدہ ہے۔(سورۂ بقرہ آیت ۲۶۱)

(۲) زکوٰۃ صدقہ میں خرچ گویا کہ اللہ کے ساتھ تجارت کرنا ہے جس میں کسی نقصان کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔(فاطر آیت ۲۹)

(۳) صدقہ قیامت کے دن ہمارے لئے حجت بنے گا۔(مسلم شریف ۱/ ۱۱۸)

(۴) زکوہ وصدقہ کے (معمولی حصہ) ایک کھجور کو اللہ تعالیٰ اپنے ہاتھ میں لیتا ہے اور اس کی اسی طرح پرورش فرماتا ہے جیسے انسان اپنے اونٹنی کے بچے کی پرورش کرتا ہے تا آنکہ وہ چھوٹی سی کھجور اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑے پہاڑ کے برابر تک پہنچ جاتی ہے۔(مسلم شریف ۱/ ۳۲۶)

(۵) جو شخص زکوٰۃ وصدقہ ادا کرنے والا ہوگا اس کو جنت کے خاص دروازہ باب الصدقہ سے داخل کیا جائے گا۔(مظاہر حق ۱۲۲/۲)

(۶) سات قسم کے حضرات میدان محشر میں عرش خداوندی کے سایے میں ہوں گے۔انہی میں سے ایک وہ شخص ہوگا جو اللہ کی راہ میں خفیہ خرچ کرتا ہوگا، اس طرح کہ داہنے ہاتھ سے دے تو بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو۔(مسلم شریف ۱/ ۳۳۱)

(۷) یہ صدقہ قیامت کے دن ہمارے لئے سائبان ہوگا۔(مظاہر حق ۱۴۳/۲)

الغرض یہ چند اشارات ہیں جن سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ زکوٰۃ وصدقہ ہمارے لئے کتنی بڑی رحمت کی چیز ہے اور جس کو اللہ تعالیٰ نے نصاب کا مالک بنا رکھا ہے اس کے ساتھ کتنے فضل عظیم کا

معاملہ فرمایا ہے؟ اس کے باوجود بھی اگر ہم زکوٰۃ ادا کرتے وقت اور صدقہ دیتے وقت اپنے دل میں تنگی محسوس کریں اور اسے جبری ٹیکس تصور کریں تو اس سے بڑی کسی حماقت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ہماری اولین کوشش یہ ہونی چاہئے کہ اگر ہم زکوٰۃ ادا کرنے کے اہل ہیں تو پہلی فرصت میں اپنے فریضہ سے سبکدوش ہو جائیں اور اس فرض کی انجام دہی میں قطعاً تغافل اور ٹال مٹول سے کام نہ لیں۔ خاص کر ماہ مبارک میں فریضہ کی ادائیگی کا ثواب ستّر گنا بڑھ جاتا ہے لہٰذا اس موقع سے بھی فائدہ اٹھانا چاہئے۔

تحقیر نہ کریں

زکوٰۃ کو صحیح مصرف پر خرچ کرنا نہایت ضروری ہے۔ تا کہ نظام زکوٰۃ کا پورا فائدہ سامنے آسکے۔ اور ساتھ میں ان شرائط کا لحاظ بھی لازم ہے جن کا ذکر فقہ کی کتابوں میں کیا گیا ہے۔ اس لئے زکوٰۃ ادا کرنے والے صاحبان پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ تحقیق کریں کہ جس ادارے یا جس جماعت کو زکوٰۃ دی جاتی ہے کیا وہ ادارہ اور جماعت شریعت کے اصول کے مطابق زکوٰۃ اپنے مصارف میں صرف کرتی ہے یا نہیں؟ اگر کرتی ہو تو شوق سے زکوٰۃ دی جائے ورنہ منع کر دیا جائے۔ لیکن اس تحقیق میں اتنی شدت نہ ہو کہ ہم ہر چندہ کے لئے آنے والے شخص کو شک کی نگاہوں سے دیکھیں اور اس کے ساتھ حقارت کا معاملہ کریں۔ اس لئے کہ دینی مدارس کے چندہ کے لئے آنے والے حضرات کا اس زمانہ میں صاحب نصاب لوگوں پر بڑا احسان ہے کہ وہ گھر بیٹھے آکر ان کی زکوٰۃ لے جاتے ہیں۔ ورنہ عنقریب وہ زمانہ آنے والا ہے جب مالدار زکوٰۃ لے کر نکلیں گے اور کوئی شخص اسے قبول کرنے پر تیار نہ ہوگا۔ (مسلم شریف ۳۲۶/۱) ان حضرات کی تحقیر اللہ کی نظر میں کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ان کا تعلق علم دین سے ہے۔ اسی نسبت سے ان کی قدر کرنی چاہئے۔ اس سلسلہ میں مالدار حضرات سے چند گزارشات پیش ہیں۔

(۱) مدارس یا دینی خیراتی ادارے کا کوئی فرد اگر چندہ لینے آئے تو چندہ دے کر اس پر احسان نہ رکھیں بلکہ اس کے احسان مند ہوں کہ اس نے ہمیں ایک دینی کام میں اعانت کا موقع دیا اس سے ثواب میں انشاء اللہ زیادتی ہوگی۔

(۲) جس کو جو کچھ بھی دینا ہے، پہلی مرتبہ ہی دے دیا جائے بار بار چکّر نہ کٹوائے جائیں اس لئے کہ ایسے سفرا کو کئی علاقوں میں کام کرنا ہوتا ہے، معطی حضرات کی ٹال مٹول سے سارا پروگرام درہم برہم ہو جاتا ہے۔

(۳) جس شخص کو دینے کا ارادہ نہ ہو اس سے نرمی سے منع کر دیا جائے سختی سے دھتکارا نہ جائے۔

لینے والے بھی خوف کریں

زکوٰۃ کی رقم وصول کرنا بھی بڑی ذمہ داری کا کام ہے جب تک زکوٰۃ کا مال اپنے مصرف میں خرچ نہ ہو جائے، لینے والے کا ذمہ بری نہیں ہو سکتا، اس لئے مدارس کے ذمہ دار اور خیراتی اداروں کے سربراہوں کو بھی نہایت حزم و احتیاط لازم ہے۔ انھیں بہرحال آخرت کی جوابدہی پر نظر رکھنی چاہئے اور زکوٰۃ کا پائی پیسہ مصرف میں ہی لگانا چاہئے۔ خواہ مخواہ اور بلا ضرورت تملیک کر کے شک و شبہ کی راہ نہ نکالنی چاہئے۔ قوم کے لوگ اگر آپ پر اعتماد کر کے اپنی زکوٰۃ کا امین آپ کو بناتے ہیں تو آپ کو اس امانت کا پورا حق ادا کرنا بھی ضروری ہے ورنہ دنیا کی ذلت اور آخرت کی رسوائی سے بھی آپ نہیں بچ سکتے۔ **اللّٰھم وفقنا لما تحبه وترضاه**۔

(ندائے شاہی، فروری ۱۹۹۵ء)

عید! خوشی میں اظہارِ بندگی

دنیا کی قوموں کا یہ طریقہ ہے کہ وہ اپنے تہوار اور خوشی کے دنوں میں لہو ولعب، ناچ گانے، شراب نوشی اور تفریحات کو پسند کرتے ہیں۔ اگلے پچھلے رنج وغم اور مصائب کو بھول کر وقتی خوشی میں ایسے سرشار ہو جاتے ہیں کہ انھیں اپنی سدھ بدھ ہی نہیں رہتی۔ ہم اپنے برادرانِ وطن میں ہولی اور دیوالی کے موقع پر ایسے مناظر بکثرت دیکھتے رہتے ہیں۔ اسی طرح عیسائیوں کے یہاں جب کرسمس کا دن آتا ہے تو وہ ہر طرح کے معاصی اور منکرات میں مبتلا ہو کر اظہارِ مسرت کرتے ہیں۔ یہی دستور زمانۂ جاہلیت میں بھی رائج تھا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو مدینہ کے لوگ سال میں دو دن خوشی کے مناتے تھے۔ ان دونوں دنوں میں خوب کھیل کود ہوتا تھا اور گانے باجے کی مجلسیں جمتی تھیں۔ مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب سلسلوں کو ختم فرما کر اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان دو دنوں کے بجائے دو خوشی کے دن (عید الفطر اور عید الاضحیٰ) مقرر فرمائے (ابوداؤد شریف ۱/۱۶۱) اور ان دنوں میں اظہار مسرت کا مظاہرہ کھیل کود، لہو ولعب اور تفریحات کے ذریعہ نہیں کرایا گیا بلکہ اسلام کے ماننے والوں کو حکم ہوا کہ وہ مسرت کا اظہار اس انداز میں کریں کہ وہ خوشی ان کے ظاہر اور باطن سے نمایاں ہو سکے۔ دلوں کی گہرائیوں سے سرور کی خوشبوئیں اُٹھیں، ذہن و دماغ کے گوشوں سے عطر بیز ہوائیں پھیلیں اور بدن کا رگ و ریشہ اور رواں رواں اظہار مسرت میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوششیں کرنے لگے۔

ایسی لازوال خوشی کے حصول اور اس کے اظہار کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ

انسان جس ربِّ کائنات کا بندہ ہے۔ وہ اس بندہ نواز کے سامنے اپنی بندگی کا اظہار کر کے اس کی خوشنودی کا مستحق بن جائے۔ ظاہر ہے کہ جس بندہ کا آقا اس سے خوش ہو جائے اس بندہ کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا خوشی ہو سکتی ہے؟ اسی لئے قرآن کریم میں فرمایا گیا: وَرِضْوَانٌ مِنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ (اور اللہ کی طرف سے خوشنودی سب سے بڑی نعمت ہے) اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے لئے خوشی کے دنوں میں اظہار بندگی کا حکم دے کر شکرانہ کے طور پر دوگانہ ادا کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔ یہی عید کی اصل روح ہے۔ بقیہ جو لوازمات ہیں (مثلاً نہانا دھونا، خوشبو لگانا، نئے کپڑے پہننا، بشاشت ظاہر کرنا وغیرہ) وہ سب ضمنی ہیں۔ آج کے دن کا اصل کام یہ ہے کہ بندہ اپنے عمل سے یہ ظاہر کر دے کہ وہ واقعی اپنے رب کا فرمانبردار اور اطاعت گذار ہے اور ایسے ہی بندہ کو درحقیقت آج خوشی منانے کا حق ہے۔ اسی مضمون کے اظہار کے لئے بعض علماء نے درج ذیل اقوالِ حکمت نقل فرمائے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) لَيْسَ الْعِيْدُ لِمَنْ لَبِسَ الْجَدِيْدَ اِنَّمَا الْعِيْدُ لِمَنْ اٰمِنَ مِنَ الْوَعِيْدِ: (اصل عید اس کی نہیں جو محض نئے نئے کپڑے پہنے، بلکہ عید اس کی ہے جو اللہ تعالیٰ کی وعید سے محفوظ ہو جائے) یعنی منکرات اور معاصی سے بچے اور اپنے آقا کو راضی کرنے کی کوشش کرے۔ اس کے برخلاف اگر گناہوں میں مست ہے اور محض ظاہری طور پر نئے کپڑے پہن کر عید کی خوشی میں شریک ہونا چاہتا ہے تو اسے حقیقی مسرت حاصل نہیں ہو سکتی ہے۔

(۲) لَيْسَ الْعِيْدُ لِمَنْ تَبَخَّرَ بِالْعُوْدِ اِنَّمَا الْعِيْدُ لِلتَّائِبِ الَّذِيْ لَايَعُوْدُ (اصل عید اس کی نہیں ہے جو عود کی خوشبو استعمال کرے بلکہ عید تو اس توبہ کرنے والے کے لئے ہے جو یہ عزم کر لے کہ اب کبھی گناہ نہ کرے گا) یعنی توبہ بھی محض وقتی نہ ہو بلکہ سچی اور پختہ توبہ کرنے والا ہی حقیقی مسرت سے مالا مال ہو سکتا ہے۔

(۳) لَيْسَ الْعِيْدُ لِمَنْ تَزَيَّنَ بِزِيْنَةِ الدُّنْيَا اِنَّمَا الْعِيْدُ لِمَنْ تَزَوَّدَ بِزَادِ التَّقْوٰى، (عید اس کی نہیں ہے جو دنیا کی زیب و زینت اختیار کرے بلکہ عید تو اس کی ہے جو تقویٰ کے

توشہ کو مہیّا کرے) بالخصوص رمضان المبارک کا مہینہ تو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے حصول کا بہترین سبب بنا کر امتِ محمدیہ کو مرحمت فرمایا ہے۔

روزوں کی فرضیت کا خاص مقصد بھی قرآن کریم میں یہی بیان کیا گیا ہے۔اس لئے رمضان میں جو لوگ تقویٰ سے اپنے آپ کو آراستہ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا خوف دل میں بٹھاتے ہیں وہی درحقیقت عید کی مسرتوں کے حقدار ہیں۔

(۴) لَيْسَ الْعِيْدُ لِمَنْ رَكِبَ الْمَطَايَا اِنَّمَا الْعِيْدُ لِمَنْ تَرَكَ الْخَطَايَا. (عید اس کی نہیں ہے جو سواریوں پر سوار ہو بلکہ عید اس کی ہے جو گناہوں اور غلطیوں کو چھوڑ دے) کیونکہ اگر گناہ رہیں گے تو اللہ تعالیٰ کے عذاب کا خوف اور خطرہ بھی رہے گا۔اس خطرہ کی موجودگی میں حقیقی خوشی حاصل نہیں ہوسکتی۔

(۵) لَيْسَ الْعِيْدُ لِمَنْ بَسَطَ الْبِسَاطَ اِنَّمَا الْعِيْدُ لِمَنْ جَاوَزَ الصِّرَاطَ. (عید اس کی نہیں ہے جو فرش اور گدّے بچھالے بلکہ عید تو اس کی ہے جو اپنے لئے پل صراط سے گذرنے کا انتظام کرلے۔(مظاہر حق ۱/۴۹۲)

آج افسوس کا مقام ہے کہ دیگر قوموں کی دیکھا دیکھی مسلمانوں نے بھی عید کو محض ایک تہوار سمجھ لیا ہے اور اظہار بندگی کا جذبہ ذہنوں سے بالکل محو ہوتا چلا جارہا ہے۔جیسے ہی عید کا چاند نظر آتا ہے نوجوان لڑکے لڑکیوں کی ٹولیاں بازاروں میں نکل پڑتی ہیں۔دکانوں پر مردوں عورتوں کا ہجوم ہوجاتا ہے۔گانے بجانے کی آوازوں سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی ہے۔عید کی مبارک رات مٹر گشتیوں میں ضائع کردی جاتی ہے اور پھر عید کے دن بھی دوگانہ کی ادائیگی کے بعد انہی لغویات کا سلسلہ کئی روز تک جاری رہتا ہے۔سینما ہالوں اور تفریح گاہوں کی رونقیں بڑھ جاتی ہیں۔ یہ صورتِ حال اہلِ اسلام کی اسلامی شان کے بالکل خلاف ہے۔اگر ہم بھی یہی طریقہ اپنانے لگیں گے تو ہم میں اور غیروں میں آخر کیا فرق باقی رہے گا؟ اس لئے ضروری ہے کہ عید کو اسلامی شان و شوکت کے ساتھ منایا جائے۔اور یہ شان وشوکت اسی وقت حاصل ہوسکتی ہے۔جبکہ ہم اپنی عید کو ہر

گناہ اور ہر معصیت سے محفوظ رکھیں اور بندگی کے اظہار میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کریں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ صحیح معنی میں ہمیں اپنی بندگی کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

(ندائے شاہی، جنوری ۲۰۰۰ء)

عید! لمحۂ فکریہ

اسلام ایک ایسا مبارک دین اور مذہب ہے جس کی مذہبی اقدار اور تعلیمات لہو ولعب سے کوسوں دور اور خرافات کے شائبہ سے بالکلیہ پاک ہیں۔ چنانچہ اسلامی شریعت نے جہاں انسانی فطرت کا لحاظ کرتے ہوئے اپنے متبعین کے لئے سال میں دو دن عید کے نام پر خوشی و مسرت کے لئے تجویز کئے ہیں وہیں ان میں پر عظمت عبادت دوگانہ نماز عید واجب کر کے خوشی کے جذبات کے ساتھ معرفت خداندی اور شکر نعمت جیسے واجبات کی طرف بھی توجہ دلائی ہے، عید محض مذہبی تیوہار نہیں بلکہ انعامات خداوندی کی شکر گزاری کا دن ہے۔ عید کھیل کود کا دن نہیں بلکہ خدا کی معرفت حاصل کرنے کا دل ہے۔ وہ منظر بڑا خوش نما اور عبرت آموز ہوتا ہے جب ایک ہی دن، ایک وقت، ایک ہی انداز میں اور ایک ہی جذبہ کے ساتھ دنیا کے قریہ قریہ، چپہ چپہ، شہر در شہر، مسجدوں میں، میدانوں میں، سڑکوں میں، عیدگاہوں میں، سیکڑوں نہیں، ہزاروں نہیں، لاکھ نہیں، کروڑ نہیں، بلکہ کروڑہا کروڑ، فرزندان توحید بارگاہِ ایزدی میں سجدہ ریز ہو کر نہ صرف جذبۂ عبدیت کا اظہار کرتے ہیں بلکہ اسلامی اخوت کی بھی شاندار مثال پیش کرتے ہیں۔ جب اُجلے اُجلے لباس پہنے بچے، بوڑھے اور جوان عید کی خوشیاں مناتے اور اپنے پروردگار کی تسبیح وتحمید میں مشغول نظر آتے ہیں تو دیکھنے والے صاحبِ ایمان کا دل، عظمتِ ایزدی سے سرشار اور روح، ایمانی سرور سے مسرور ہو جاتی ہے، رحمت کے فرشتے آسمان سے نازل ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے مجامع میں عاجزی و انکساری اور تضرع وزاری کے ساتھ دُعا کے لئے اُٹھنے والے ہاتھ رحمتِ خداوندی کے بے پایاں نزول کا سبب بن جاتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ عید کی رات بھی اسلام کی متبرک ترین راتوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس رات میں اللہ تعالیٰ اپنے مقبول بندوں کو انعامات سے سرفراز کرتا ہے۔ اسی لئے اس

کولیلۃ الجوائز (انعامات کی رات) کہا جاتا ہے۔ عارفین کے لئے یہ رات مسرت کا ابدی پیغام اور وصال محبوب کا عنوان بن کر آتی ہے۔ وہ انعامات خداوندی کے حصول کے لئے راتوں رات بارگاہ ایزدی میں حاضر رہ کر سربستہ راز و نیاز میں مشغول رہتے ہیں اور بیش از بیش رحمت خداوندی کے مستحق بنتے ہیں۔

لیکن اس کے برخلاف آج ہمارے معاشرہ میں عید کی رات اور اس کا دن دل کھول کر معاصی میں ابتلاء کا سمجھا جاتا ہے۔ عید کی متبرک رات عبادت میں گذارنے کے بجائے بازاروں میں تفریح اور ہوٹلوں میں بیٹھ کر گپ شپ کرنے میں ضائع ہو جاتی ہے۔ بازاروں میں بے پردہ مسلم عورتوں کا وہ ہجوم ہوتا ہے کہ الامان الحفیظ۔ گویا اللہ تعالیٰ کی رحمت کا استقبال اس کی سرعام نافرمانی کر کے کیا جاتا ہے اور انعام خداوند کا مستحق بننے کے بجائے باقاعدہ اس کے غضب کا نشانہ بننے کی سعی کی جاتی ہے اور طرہ یہ کہ یہ سب خرافات مذہبی تیوہار کے نام سے ہوتی ہیں۔ غیروں کے سامنے عید کے اصل مقصد جذبہ عبادات کا اظہار نہیں ہوتا۔ بلکہ سراپا لہو ولعب کا نظارہ پیش کیا جاتا ہے۔

قرآن وحدیث کی نظر میں یہ طریقہ مسلمانوں کا نہیں بلکہ ان گمراہ اور رحمت خداوندی سے دور یہود ونصاریٰ اور مشرکین کا ہے۔ جنھوں نے اپنے دین کو لہو ولعب بنا لیا تھا۔ جن کی شناعت بیان کرتے ہوئے قرآن کریم نے جا بجا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا. (سورہ اعراف آیت ۵۱) کے الفاظ ذکر فرمائے ہیں۔ یہ طریقے اسلامی روح کے منافی اور اسلامی خصوصیت کے خلاف ہیں۔ اسلام خوشی منانے کے خلاف نہیں، لیکن بے حیائی اور فحاشی کے ذریعہ خوشی کے اظہار سے روکتا ہے اور بدقسمتی سے آج خوشی اور تیوہار اسی کو سمجھا جاتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ بے حیائی اور بدعملی کا مظاہرہ کیا جائے۔ عید کے دنوں میں باقاعدہ سینما ہالوں اور تھیٹروں کی چاندی ہوتی ہے۔ موسیقی بھرے نغموں کی ریکارڈنگ سے کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ اب بھی وقت ہے ہمیں اپنی

بدعملی کی رِیت بدلنی چاہئے۔اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر کے قرآن وحدیث کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر اور سنت نبوی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کو حرز جان بنا کر اپنے کو رحمت اور فضل خداوندی کا اولین مستحق بنانے کی فکر کرنی چاہئے۔ **اللّٰھم وفقنا لما تحبهٗ وترضاهُ.**

(ندائے شاہی، اپریل ۱۹۹۲ء)

عید کا چاند — یا — معصیت کا پیغام

عید کا چاند ہمارے مسلم معاشرہ میں خوشیوں کا پیغام لانے کے ساتھ ساتھ اللہ کی نافرمانی اور معصیت کے دروازے پوری طرح کھولنے کی علالت بھی بنتا جا رہا ہے۔ چاند کا اعلان ہوتے ہی ہمارے نوجوان غول کے غول بنا کر بازاروں میں تفریح کے لئے نکل پڑتے ہیں دوکانوں کی چکا چوند سے اگر آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی ہیں تو بلند آواز سے بجنے والے فحش گانوں کی آوازوں سے کانوں کے پردے تک دہل جاتے ہیں۔ رات بھر ''ہیر کٹنگ'' کی دکانوں پر اگر سنت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا قتل عام ہوتا ہے تو دوسری طرف شیطانیت کے اڈے ''سینما گھر'' عید کے دن ہی سے ہماری دلچسپی کے باعث اپنی وسعت دامانی کے باوجود تنگ نظر آنے لگتے ہیں۔ کیا بچے، کیا نوجوان، کیا عورتیں کیا مرد غرضیکہ خاندان کے خاندان رکشوں میں بھر بھر کر سینما ہالوں کا رُخ کرتے ہیں اور اس معاملہ میں سخاوت کا ایسا جذبہ بیدار ہوتا ہے کہ ایک ہی آدمی پورے پورے گروپ کے ٹکٹ خود خرید کر فراہم کرتا ہے اور اس کے چہرے پر شکن تک نہیں آتی۔ سینما ہالوں کے مالکان بھی ننگے پوسٹروں پر ''عید مبارک'' لکھ کر اس مقدس تیوہار کا خوب مذاق اُڑاتے ہیں۔ اسی طرح گھروں میں ٹیلی ویژن کی فلمیں کھول دی جاتی ہیں اور وہ روحانیت جو ماہ مبارک میں عبادت کے ذریعہ کسی نہ کسی درجہ میں حاصل ہوئی تھی اسے ان معاصی کے ذریعہ خود ہی اپنے ہاتھوں سے منٹوں میں تار تار کر دیا جاتا ہے، مسجدیں عید کی رات ہی سے خالی ہو جاتی ہیں اور تلاوت کلام پاک اور ذکر واذکار اور تسبیحات پڑھنے کا جذبہ سرد پڑ جاتا ہے۔

ذرا غور فرمائیں! کیا خوشی کا یہی مطلب ہے کہ ہم اپنے معبود حقیقی کی بندگی کو بھول جائیں اور تیوہار میں ایسے مست ہوں کہ ہم اپنے رب کی بغاوت اور سرکشی پر اتر آئیں؟ مومن کے لئے تو سب سے بڑی خوشی یہی ہے کہ اسے دنیا کی لذت ملے یا نہ ملے مگر اس کا رب حقیقی اس سے راضی ہو جائے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے عید کا دوگانہ ہم پر واجب کیا ہے تا کہ ہم اپنے مقصد تخلیق سے غافل نہ رہیں اور دنیا کی دوسری قوموں کی طرح خوشیوں میں غرق ہو کر معصیت پر نہ اُتر آئیں۔ مگر اس کے برخلاف ہم آج اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کے بجائے اپنے سب سے بڑے دشمن ''شیطان لعین'' کے مددگار بنے ہوئے ہیں۔ اور اسی راستہ کو اپنے لئے نفع بخش سمجھ بیٹھے ہیں۔

عید کا چاند تو ہمارے لئے معصیت سے بچنے کی علامت بننا چاہئے۔ اسے دیکھ کر ہمیں پوری زندگی اللہ کی حقیقی بندگی کرنے اور پوری طرح اس کی اطاعت کرنے کا پختہ عہد کرنا چاہئے۔ اگر اس عہد کے ساتھ ہم نے عید کے چاند کا استقبال کیا ہے تو یہ عید ہمارے لئے واقعی امن و آشتی اور عافیت اور سلامتی کا پیغام بنے گی اور اگر اس عہد کے بغیر اور معصیت کی آلودگی کے ساتھ ہم نے عید کا استقبال ہے تو یہ دن خوشی کا نہیں بلکہ غم و افسوس اور حسرت و یاس کا دن کہلایا جائے گا۔ اور آخرت میں اس کی بدترین سزا بھگتنی پڑے گی۔

اس لئے ضرورت ہے کہ ہم خود اپنا اور اپنے گھر والوں کا جائزہ لیں اور عید کے چاند کو معاصی اور منکرات کی علامت بننے سے روکیں۔ اور جو غلطیاں ہو گئی ہیں ان پر سچے دل سے توبہ اور استغفار کریں، اور آئندہ ہر طرح کی خرافات سے بچنے اور دوسروں کو بچانے کا تہیہ کریں، اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے اور رمضان المبارک کی برکتوں کو پورے سال ہماری زندگی میں باقی رکھے۔ آمین۔

(ندائے شاہی، ۱۹۹۷ء)

حج اور اُس کے تقاضے

حج اسلام کا وہ عظیم الشان رکن ہے جس کے ہر ہر پہلو سے عشق خداوندی اور محبت ایزدی کا اظہار ہوتا ہے۔ حج کا سفر سیر و تفریح نہیں بلکہ بندہ کی جانب سے جذبۂ عاشقی کا بھرپور مظاہرہ ہے۔ حاجی احرام باندھ کر گویا اعلان کرتا ہے کہ اب وہ دنیوی علائق سے آزاد ہو کر اپنے محبوب حقیقی سے وصال کے لئے رخت سفر باندھ چکا ہے۔ اب اس کی زبان پر ایک ہی رٹ ہے۔ **لبیك اللّٰهم لبیك** (اے پروردگار میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں) وہ مکہ مکرمہ پہنچ کر دیوانہ وار بیت اللہ شریف کا طواف کر کے اپنے جذبۂ عشق کو سکون عطا کرتا ہے۔ اسی طرح اسے حکم ہے کہ وہ صفا و مروہ کے درمیان عاشقانہ ناز و انداز سے سعی کرے۔ پھر یہی عشق اسے منیٰ، عرفات اور مزدلفہ کی وادیوں میں لے جاتا ہے۔ بالآخر وہ بارگاہ ایزدی میں قربانی کر کے گویا اپنی جان کا نذرانہ محبوب کی خدمت میں پیش کر دیتا ہے۔ الغرض سفر حج کا ہر لمحہ عشق و محبت کا آئینہ دار اور بندہ کی جانب سے محبوب حقیقی سے سچی انسیت کا کھلا مظاہرہ ہے۔ اسی لئے اس عبادت کے فضائل بھی بہت عظیم الشان ہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حج مبرور کا بدلہ جنت کے سوا کچھ نہیں ہے (مشکوٰۃ شریف ص۲۲۲) دوسری حدیث میں ارشاد نبوی ہے کہ جو شخص حج کرے اور اس میں بے حیائی اور فسق و فجور نہ کرے تو وہ حج کر کے اس طرح (گناہوں سے پاک ہو کر) لوٹے گا گویا آج ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے۔ (الترغیب والترہیب ص۲۲۳) ایک روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کون سا عمل افضل ہے۔ آپ نے جواب دیا اللہ پر ایمان لانا پھر جہاد اور پھر حج مقبول جو (بقیہ) سارے اعمال پر اتنے درجہ فضیلت رکھتا ہے جو سورج

کے طلوع وغروب کے درمیان ہے۔ (احمد والطبرانی الترغیب ص۲۲۴) ایک اور حدیث میں ارشاد نبوی نقل کیا گیا ہے کہ حج گناہوں کو اس طرح دھوڈالتا ہے جیسے پانی میل کچیل کو صاف کر دیتا ہے۔ (طبرانی، الترغیب ص۲۲۴) ان کے علاوہ بھی بہت سی احادیث وآثار حج کی فضیلت وعظمت پر دال ہیں۔ جن سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں ہے کہ اس اہم ترین عبادت کو اللہ رب العزت کی بارگاہ میں خاص امتیاز حاصل ہے۔

سفر حج کی اصل روح پورے سفر کے دوران خاص طور پر منکرات وفواحش سے کلی اجتناب کرنا ہے۔ حتی کہ اس سفر میں بہت سے ایسے امور بھی ناجائز قرار دیئے جاتے ہیں جو سفر سے پہلے جائز ہوتے ہیں مثلاً بیوی سے بے حجابی کی باتیں کرنا، زیب وزینت کرنا وغیرہ، دراصل حج کی قبولیت کا مدار انہی ہدایات کی پیروی کرنے پر ہے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔

اَلحَجُّ اَشْھُرٌ مَّعْلُوْمَاتٌ فَمَنْ فَرَضَ فِیْھِنَّ الْحَجَّ فَلَارَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ یَّعْلَمْهُ اللّٰهُ. (بقرہ ع ۲۵)

''حج کے چند مہینے ہیں معلوم، پھر جس شخص نے لازم کرلیا ان میں حج تو بے حجاب ہونا جائز نہیں عورت سے اور نہ گناہ کرنا اور نہ جھگڑا کرنا حج کے زمانے میں اور جو کچھ تم کرتے ہو نیکی اللہ اس کو جانتا ہے''۔

حضرت سفیان ثوریؒ کا مقولہ ہے کہ جس حج میں بے حیائی کا کام کیا اس نے گویا اپنے حج کو فاسد کر دیا (احیاء العلوم ص۱/۱۶۴) یعنی اگرچہ اس کا فرض ادا ہوگیا لیکن قبولیت حاصل نہ کرسکا۔ حج میں یہ جذبہ اسی وقت پیدا ہوسکتا ہے جبکہ یہ عبادت خالصۃً اللہ ربّ العزت کی رضا اور خوشنودی کے لئے ادا کی جائے۔ اگر اس میں کوئی اور غرض شامل ہوگی یا منکرات سے بچنے کا اہتمام نہ ہوگا تو صحیح معنی میں حج کی غرض حاصل نہ ہوگی۔

یہ بات نہایت افسوسناک ہے کہ آج کل حج جیسی پرعظمت عبادت میں ریاکاری، شہرت طلبی، اسراف اور منکرات پر مبنی رسمیں جگہ پکڑتی جارہی ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشین گوئی پوری طرح صادق آرہی ہے کہ آخری زمانہ میں چار طرح کے لوگ حج کریں گے۔ بادشاہ تفریح کی غرض سے، امراء تجارت کے مقصد سے، فقراء بھیک مانگنے کے لئے۔ اور قرّاء اور علماء شہرت طلبی کے لئے۔ (احیاء العلوم ۱/۱۶۲) یہ غیر شرعی التزامات حاجی کے سفر پر جانے سے کافی دنوں پہلے سے شروع ہوجاتے ہیں۔ حاجی کی طول طویل دعوتیں ہوتی ہیں۔ کہیں کہیں قوالی کی محفلیں بھی منعقد کی جاتی ہیں۔ اور بجائے اس کے کہ احکام حج کو سیکھا جائے اور آتش شوق میں اضافہ کیا جائے۔ فضول ملاقاتوں میں وقت ضائع کیا جاتا ہے۔ پھر جانے والے دن سارے خاندان کے افراد مرد وعورت جمع ہوتے ہیں۔ اسی پر بس نہیں بلکہ ایک ایک حاجی کو ایئرپورٹ تک چھوڑنے کے لئے پچاسوں افراد جاتے ہیں جن میں بے پردہ عورتیں حتی کہ چھوٹے چھوٹے بچے بھی شامل ہوتے ہیں۔ اور ایئرپورٹ پر وہ شوروغوغا، فوٹوگرافی اور بے حجابی کے نظارے دیکھنے میں آتے ہیں کہ الامان الحفیظ۔ ایک میلہ لگا رہتا ہے جس میں عبادت کا جذبہ برائے نام اور سیر وتفریح اصل مقصود ہوجاتی ہے۔ حاجی کو پھولوں سے لاد کر اس کے ساتھ تصاویر کھنچوائی جاتی ہیں۔ اور بعض لوگ تو باقاعدہ ''ویڈیو فلم میکر'' کو ساتھ لے کر جاتے ہیں جو ان سب مناظر کو کیمرے میں محفوظ کرنے کا ''فرض'' انجام دیتا ہے۔ گویا پہلے ہی مرحلے میں اللہ ربّ العزت کی نافرمانی سامنے آتی ہے اور حج کے سفر کی روح نکال دی جاتی ہے۔ پھر بہت سے لوگ حج کے ارکان کی ادائیگی کے وقت بھی جائز وناجائز کی طرف قطعاً دھیان نہیں دیتے۔ بیت اللہ شریف میں حجر اسود کے بوسہ کے لئے اس قدر ازدحام ہوتا ہے کہ مرد وعورت کا امتیاز اور لحاظ باقی نہیں رہتا۔ عورتیں بے حیائی کے ساتھ غیر مردوں کے درمیان گھس جاتی ہیں۔ اور مرد بھی بے محابا اجنبی عورتوں پر گرے پڑتے ہیں۔ جبکہ اس طریقہ پر معصیت کر کے حجر اسود کا استلام ثواب نہیں بلکہ گناہ ہے۔ کیونکہ اگر بوسہ لینے کا موقع نہ ہو تو دور سے اشارہ کر کے ہاتھ چوم لینے سے بھی بعینہ وہی ثواب ملتا ہے، تو گناہ کے ارتکاب سے کیا

فائدہ؟ اس مقدس اور مبارک مقام پر اس بے حیائی کا اظہار حد درجہ مذموم اور قابل ترک ہے۔ حج کے ہر ہر لمحہ میں اس طرح کے بے حیائی کے کاموں سے مکمل اجتناب کرنا چاہئے۔ اللہ کا شکر ہے کہ حکومت سعودیہ کی توجہ سے حرم نبوی مدینہ منورہ (زادہا اللہ شرفاً) میں زیارت کے لئے مردوں اور عورتوں کے الگ الگ اوقات مقرر کردینے سے وہاں بے محابا اختلاط سے نجات مل گئی ہے۔ خدا کرے مسجد حرام میں بھی اس طرح کی کوئی شکل نکل آئے تو اس عموم بلویٰ سے چھٹکارا حاصل کیا جاسکتا ہے۔

اسی طرح اپنی نظر کی حفاظت میں لوگ بڑی کوتاہی کرتے ہیں۔ یہ بڑی محرومی اور بدبختی کی بات ہے کہ انسان وہاں جاکر بھی اپنے نفس کو قابو میں نہ رکھ سکے۔

پھر جوں جوں واپسی کا وقت قریب آتا جاتا ہے۔ بہت سے حجاج اپنا مابقیہ وقت طواف و زیارت سے زیادہ حرم کے بازاروں اور جدّہ کی مارکیٹوں میں گذارنے لگتے ہیں اور وقت کو غنیمت نہ جان کر احباب اور رشتہ داروں کے لئے تحفہ تحائف خریدنے میں مصروف ہوتے ہیں جو بجائے خود نہایت بے حسی اور محرومی کی بات ہے، گھر والوں کے لئے تحفے لانا یا خرید وفروخت ممنوع نہیں لیکن اس میں وقت کا ضرورت سے زیادہ ضیاع جذبۂ حج کے منافی ہے اور اس سے بچنا لازم ہے۔

اس کے بعد جب حاجی فریضۂ حج ادا کرکے وطن واپس ہوتا ہے تو پہلے ہی سے اس کے استقبال کے لئے ایئرپورٹ پہنچنے والے رشتہ دار (جن میں مرد وعورت سب شامل ہوتے ہیں) معصیت اور نافرمانی کی چیزیں، فوٹو اور ویڈیو کیمرے اسی طرح پھولوں اور نوٹوں کے ہار لئے تیار رہتے ہیں اور اطاعت خداوندی کا عہد کرکے لوٹنے والا حاجی آتے ہی ان معاصی میں مبتلا ہوکر قبولیت دعا کی سعادت سے محروم ہوجاتا ہے۔ اس لئے کہ حدیث میں ہے کہ حجاج سے گھر لوٹنے اور گناہوں میں مبتلا ہونے سے پہلے دُعا کراؤ۔

پھر گھر آ کر جو رسمیات اپنائی جاتی ہیں وہ سب بھی حج کی روح سے میل نہیں کھاتیں۔ امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ ''حج مبرور و مقبول کی نشانی یہ ہے کہ حاجی دنیا سے بے رغبت، آخرت کی یاد میں مستغرق اور دوبارہ زیارت حرمین شریفین کا شوق لے کر لوٹے۔ اگر یہ جذبات نہیں ہیں تو سمجھ لے کہ اس کا حج مبرور نہیں ہے۔'' (احیاء العلوم ۱/۱۶۲)

ہونا یہ چاہئے کہ حج، انسان کے اعمال میں انقلاب، اطاعت کی توفیق اور معاصی سے مکمل احتراز کا ذریعہ بن جائے جبھی سفر حج کا واقعی فائدہ حاصل ہوسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو ہدایت سے نوازے اور حج کے تقاضوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

(ندائے شاہی، اپریل ۱۹۹۳ء)

زائرینِ حرم کی خدمت میں

حج مبرور رحمتِ خداوندی سے مستفید ہونے کا نہایت اہم ذریعہ ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حج مبرور کا بدلہ جنت ہی ہے۔ وَالْحَجُّ الْمَبْرُوْرُ لَیْسَ لَهُ الْجَزَاءُ اِلَّا الْجَنَّةَ (الترغیب والترہیب۲/۱۰۴، بخاری شریف۱/ ۲۳۸، ابن ماجہ ۲۶۸) ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص اس طرح حج کرے کہ اس میں کوئی گناہ کا کام اور بے حیائی کی بات نہ کرے تو وہ گناہوں سے ایسے پاک ہوکر واپس ہوتا ہے جیسے آج ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو۔ مَنْ حَجَّ فَلَمْ یَرْفُثْ وَلَمْ یَفْسُقْ رَجَعَ مِنْ ذُنُوْبِهٖ کَیَوْمٍ وَلَدَتْهُ اُمُّهٗ. (البخاری۱/ ۲۰۶، ابن ماجہ ۲۶۸)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حج کیا کرو کیونکہ حج انسان کے گناہوں کو اس طرح دھوڈالتا ہے جیسے پانی میل کو صاف کر دیتا ہے۔ حَجُّوْا فَاِنَّ الْحَجَّ یَغْسِلُ الذُّنُوْبَ کَمَا یَغْسِلُ الْمَاءُ الدَّرَنَ. (الترغیب والترہیب۲/ ۱۰۶، الطبرانی) ایک اور روایت میں ہے کہ حاجی کی مغفرت کی جاتی ہے اور حاجی جس کے لئے مغفرت چاہتا ہے اس کی بھی مغفرت کی جاتی ہے۔ یُغْفَرُ لِلْحَاجِّ وَلِمَنْ اسْتَغْفَرَلَهُ الْحَاجُّ. (الترغیب والترہیب۲/ ۱۸) علامہ منذریؒ نے الترغیب و الترہیب میں طبرانی اور مسند بزار کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منی کی مسجد میں تشریف فرما تھے۔ آپ کی خدمت میں ایک انصاری صحابی اور ایک ثقفی صحابی حاضر ہوئے۔ اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! ہم کچھ پوچھنے کی غرض سے آئے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم چاہو تو میں تمھیں ان سوالات کی خبر دے دوں جنھیں تم معلوم کرنے آئے ہو؟ اور چاہو تو خاموش رہوں۔ اور تم خود سوال کرو؟ ان دونوں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! آپ ہی ارشاد فرمایئے چنانچہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم یہ باتیں پوچھنے آئے

تھے۔(۱) بیت اللہ کی طرف جانے کا کیا ثواب ہے؟ (۲) طواف کے بعد کی دو رکعتوں کا کیا اجر ہے؟ (۳) صفا و مروہ کی سعی کا کیا بدلہ ہے؟ (۴) وقوف عرفہ کی کیا جزاء ہے؟ (۵) کنکری مارنے پر کیا اجر ملتا ہے؟ (۶) اور قربانی کرنے سے انسان کس ثواب کا مستحق ہوتا ہے؟ یہ سن کر ان دونوں صحابیوں نے فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو نبی برحق بنا کر بھیجا ہے ہم یہی سوالات کرنے حاضر ہوئے تھے۔ پھر آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم اپنے گھر سے مسجد حرام کے قصد سے چلتے ہو تو تمھاری سواری کے قدم قدم پر ایک نیکی لکھی جاتی ہے۔ اور تمھاری ایک غلطی معاف کی جاتی ہے۔ اور طواف کے بعد کی دو رکعتوں کا اجر بنی اسمٰعیل کے غلام کو آزاد کرنے کے برابر ہے۔ اور صفا و مروہ کی سعی کا ثواب ۷۰ غلاموں کو آزاد کرنے کے مثل ہے۔ اور تمھارا میدان عرفات میں وقوف کرنا تو اس دن اللہ ربّ العزت آسمان دنیا پر نزولِ اجلال فرما کر فرشتوں کے سامنے تم پر فخر کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ میرے پراگندہ بالوں والے بندے دنیا کے کونے کونے سے میری جنت کی امید لگا کر میرے پاس آئے ہیں۔ لہٰذا ان کے گناہ اگرچہ ریت کے ذرات، بارش کے قطرات اور سمندر کے جھاگ کے برابر بھی ہوں پھر بھی میں انھیں بخش دوں گا۔ پس اے میرے بندو! جاؤ بخشے بخشائے واپس جاؤ۔ تم بھی بخش دیئے گئے اور جس کے لئے تم نے بخشش کی سفارش کی ان کی بھی مغفرت کردی گئی ہے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ: تمھارا شیطان کو کنکری مارنا تو ہر کنکری کے بدلے میں کسی بڑے گناہ کی مغفرت ہوتی ہے۔ اور تمھارا قربانی کرنا تو اس کا ثواب آخرت کے ذخیرہ میں جمع کیا جاتا ہے۔ اور احرام کھولتے وقت تمھارا سر منڈانا تو ہر بال کے بدلہ میں ایک نیکی لکھی جاتی ہے اور ایک برائی مٹائی جاتی ہے اور جب تم اس کے بعد طواف کرتے ہو تو تم گناہوں سے بالکل پاک صاف ہوتے ہو اور ایک فرشتہ تمھارے دونوں شانوں کے درمیان ہاتھ رکھ کر کہتا ہے کہ اب آئندہ کے لئے از سر نو اعمال کرو، گذشتہ سارے گناہ معاف کردیئے گئے ہیں۔ (الترغیب والترہیب ۲/۱۱۰)

الغرض اعمال و مناسک حج کا اس قدر ثواب ہے کہ اس کو کسی عدد میں محصور نہیں کیا جاسکتا یہ محض اللہ کا فضل و کرم ہے کہ اس نے امت محمدؐیہ کو ایسی عظیم عبادت عطا فرمائی ہے۔ اس عظیم الشان

نعمت کا حق یہ ہے کہ جن لوگوں کو اس کی انجام دہی کی سعادت ملے وہ پوری طرح آداب وشرائط اور سنن و مستحبات کی رعایت کرتے ہوئے مناسک کو انجام دیں۔ آج گو کہ پہلے زمانہ کے مقابلہ میں حجاج کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔ لیکن تعداد کے اضافہ کے ساتھ ساتھ شوق و ذوق اور واقعی جذبۂ عشق و محبت میں کمی واقع ہوتی جارہی ہے۔ عام طور پر اس کوتاہی کی تین وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ حج میں جیسا حلال وطیب مال لگنا چاہئے وہ نہیں لگایا جاتا۔ حالانکہ حج کی قبولیت کے لئے نفقۂ طیب اولین شرط ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب حاجی مالِ حلال کے ساتھ حج کو جاتا ہے اور تلبیہ پڑھتا ہے تو آسمان سے ندا آتی ہے کہ لبیک وسعدیک، تیرا توشہ حلال ہے، تیری سواری بھی حلال ہے اور تیرا حج مقبول اور گناہوں سے دور ہے۔ اس کے برخلاف جب کوئی شخص حرام اور مشتبہ مال کے ساتھ حج کو جاتا ہے تو منادی کہتا ہے کہ لا لبیک ولا سعدیک تیرا توشہ حرام، تیرا خرچہ حرام اور تیرا حج غیر مقبول اور موجبِ گناہ ہے۔ (الترغیب والترہیب) اس لئے خاص طور پر حج میں حرام اور مشتبہ رقم لگانے سے احتراز ضروری ہے۔

دوسری بڑی کوتاہی جو معاشرہ میں شدت کے ساتھ رائج ہورہی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اب حج کو ریا اور نمود اور شہرت وسمعت کا عنوان بنالیا گیا ہے۔ بلکہ میں تو آگے بڑھ کر یہ کہوں گا کہ اب حاجیوں کو الوداع اور خوش آمدید میں وہ طوفان بدتمیزی برپا ہوتا ہے کہ الامان الحفیظ۔ حجاج کی آمدورفت کے دنوں میں ہوائی اڈوں پر مردوں اور عورتوں کے اختلاط، ویڈیو کیمروں، پھولوں کے گجروں اور تصاویر کشی کے مکروہ مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دنیوی میلہ لگ رہا ہے۔ اسی طرح حجاج کی واپسی پر بڑی بڑی پُرتکلف دعوتوں کا چلن ہوگیا ہے۔ یہ چیزیں اخلاص کے منافی ہیں اور حج کی روح کے خلاف ہیں جن سے اجتناب ضروری ہے۔

حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پرانے کجاوہ اور ایک پرانی چادر پر حج فرمایا۔ جس کی قیمت چار درہم بھی نہ تھی۔ پھر آپ نے ارشاد فرمایا **اَللّٰهُمْ حَجَةً لَارِيَاءَ فِيْهَا وَلَاسُمْعَةَ**، اے اللہ میں ایسے حج کو چاہتا ہوں جس میں کوئی ریاکاری اور شہرت کا جذبہ نہ ہو۔ (الترغیب والترہیب ۲/ ۱۱۶، ابن ماجہ ۲۶۹، حدیث ۲۸۹۰)

تیسری اہم چیز جس کی طرف توجہ ضروری ہے وہ ارکان ومناسکِ حج سے واقفیت حاصل کرنا ہے۔اس سلسلہ میں نہایت کوتاہی ہوتی ہے۔اور بسا اوقات مسائل معلوم نہ ہونے کی وجہ سے حج فاسد یا دم واجب ہوتا ہے۔اور لاعلمی کی بنا پر احساس بھی نہیں ہو پاتا۔ یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ شریعت پر عمل کئے بغیر قبولیت کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا اس لئے ارکان حج کی واقفیت انتہائی ضروری امر ہے۔حج پر لکھی ہوئی کتابوں کا اچھی طرح مطالعہ کرنا اور واقف کار علماء سے اس سلسلہ میں معلومات حاصل کرنے کا اہتمام کرنا چاہئے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان امور کے اہتمام کی توفیق عطا فرمائے۔آمین۔اور باادب حاضری کی سعادت سے نوازے۔آمین۔

(ندائے شاہی، مارچ ۱۹۹۶ء)

حج کی تیاری

پہلے زمانہ میں جب حج کا سفر عموماً بحری جہاز سے ہوتا تھا تو سفر کے دوران مسائل وارکان سیکھنے کے لئے یکسوئی کے ساتھ کافی موقع مل جاتا تھا اور جدّہ پہنچتے پہنچتے اکثر زائرینِ حرم ضروری مسائل ومناسک سے واقف ہوجایا کرتے تھے۔ لیکن اب جبکہ بحری سفر حکومت نے بالکل بند کردیا ہے اور تقریباً سبھی ہندوستانی حجاج ہوائی جہاز سے سفر کرنے لگے ہیں تو اب نہ تو مسائل سیکھنے کا وہ شوق رہتا ہے جو ہونا چاہئے اور نہ یکسوئی کے ساتھ اس کا موقع مل پاتا ہے۔ آج حال یہ ہے کہ صبح آدمی دوکان، فیکٹری یا کسی اور دنیوی کاروبار میں رہتا ہے اور شام تک ہوائی جہاز سے مکہ مکرمہ پہنچ جاتا ہے۔ اسباب سفر کی تیاری تو ضرور ہوتی ہے۔ لوگوں سے ملاقاتیں اور دعوتیں اور ہوائی اڈہ پر الوداع کہنے والوں کی بھیڑ اکٹھا کرنے پر بھی خوب توجہ دی جاتی ہے۔ لیکن ہمارا حج بارگاہ ایزدی میں پوری طرح قبول ہو اور حج کے سبھی آداب وشرائط ہم ادا کرسکیں ان کا علم حاصل کرنے پر ہم زیادہ توجہ نہیں دے پاتے حالانکہ عازم حج کے لئے حج کے تمام مسائل اور نشیب وفراز کا جاننا واجب اور ضروری ہے اور اس میں کوتاہی کسی طرح بھی روا نہیں ہے۔

احقر نے ملیشیا میں یہ نظام دیکھا کہ وہاں حکومت نے حج کی ایک الگ وزارت بنا رکھی ہے۔ اور ملک کے تمام بڑے بڑے شہروں میں اس کے دفاتر ومراکز ہیں۔ لوگ ہر مہینہ اپنی مرضی کے مطابق نقد یا چیک یا ڈرافٹ کے ذریعہ حج کے مقصد سے اس میں رقم جمع کراتے رہتے ہیں۔ جب وہ رقم حج کے مصارف تک پہنچ جاتی ہے تو وزارت کی طرف سے کھاتہ دار کو حج کے سفر کی منظوری بھیج دی جاتی ہے۔ اور ہر سال حجاج کا سارا نظام وزارت حج خود بناتی ہے۔ پھر حاجیوں کو ان کی پرواز

سے کئی روز پہلے حسب موقع مراکز میں بلا کر علماء کے ذریعہ انھیں مسائل سے واقف کرایا جاتا ہے بلکہ عملی مشق بھی کرائی جاتی ہے۔ ان مراکز میں ایسی دوکانیں بھی ہیں جن میں احرام کی چادریں عورتوں کے لئے سر باندھنے کے رومال اور چپل وغیرہ ضروری چیزیں دستیاب ہوتی ہیں۔ اس تربیت کے بعد اس جماعت کو منظّم انداز میں حج کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ چنانچہ جو لوگ حج کو جاتے رہتے ہیں انھیں معلوم ہوگا کہ ملیشیا اور انڈونیشیا کے حجاج نسبتاً زیادہ نظم وضبط کے ساتھ حج کا فریضہ ادا کرتے ہیں، کاش کہ ہمارے ملک کی حج کمیٹی (جو ایک نیم سرکاری ادارہ ہے) کو بھی اس طرح زائرین حرم کی خدمت کی توفیق ہو سکے۔ جب تک حکومت یا کمیٹی کی طرف سے تربیت کا ایسا نظم نہ ہو تو نجی طور پر دینی اداروں کو اس جانب توجہ دینی چاہئے۔ دینی مدارس اس سلسلہ میں اچھا کردار ادا کر سکتے ہیں۔

(ندائے شاہی، اپریل ۱۹۹۵ء)

حج وزیارت کی لاج رکھیں

حج کے بعد، حرم شریف میں ایک حاجی صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ اب ہمارا احرام کھل گیا ہے کیا ہم بال وغیرہ منڈا سکتے ہیں؟ ان صاحب کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور بظاہر سوال سے ان کا مقصد یہ تھا کہ اب داڑھی کی شیونگ کرنا ان کے لئے حلال ہوا یا نہیں؟ میں نے جواب میں عرض کیا کہ دیگر جگہوں کے بال آپ منڈا سکتے ہیں لیکن داڑھی منڈانا نہ حالت احرام میں حلال تھا اور نہ احرام کھلنے کے بعد جائز ہے۔ یہ جواب سن کر وہ شرمندہ سے ہو گئے اور شکریہ ادا کر کے آگے بڑھ گئے۔ خدا کرے موصوف کی یہ شرمندگی ان کے لئے سنت اپنانے کا ذریعہ بن گئی ہو۔ آمین۔ یہی کیا کم ہے کہ انھیں سنت نبوی سے محرومی پر شرم تو آ گئی۔ ورنہ ہمارے زیادہ تر بھائی اس محرومی پر نادم تو کیا ہوتے اسے اپنے لئے عزت وافتخار کا سبب سمجھتے ہیں۔ اسی بنا پر آج محبت رسولؐ کے دعویدار مسلم معاشرہ میں اس سنت پر عمل کرنے والوں کو طعن وتضحیک کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔

شیطان نے یہ عمل ہمارے لئے اس قدر مزیّن کر دیا ہے کہ اب یہ محرومی کسی بستی اور ملک تک محدود نہیں رہی بلکہ پورے عالم میں امت مسلمہ اس کوتاہی میں مبتلا ہے۔ حج میں شریک ہونے والے عظیم مجمع کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت امت مسلمہ کے تقریباً ۸۰، ۹۰ فیصدی افراد جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس عظیم سنت سے بےزار ہیں۔ منیٰ جیسے مقدس مقام پر جہاں دسویں ذی الحجہ کو احرام کھولنے کے لئے حلق کرایا جاتا ہے وہیں بےشمار افراد داڑھی کی سنت کا بھی ''اجتماعی قتل عام'' کرتے ہیں اور انھیں ذرا بھی احساس نہیں ہوتا کہ پیغمبر علیہ السلام کی صورت سے یہ بیزاری اور آپ کی سنت کی اپنے ہی ہاتھوں یہ پامالی ان کی پیشانی پر کلینک کا ٹیکہ لگا کر انھیں سنت کے نور سے محروم کر دیتی ہے۔

حیرت کی بات ہے کہ وہ زائرین حرم جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم ڈھونڈ نے کے لئے سخت گرمی اور مشقت برداشت کر کے جبل نور اور جبل رحمت کی چوٹیوں تک پہنچ جاتے ہیں۔اور غار حراء اور غار ثور کے دہانوں تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔اور وہ حجاج کرام جو حجر اسود کے استلام کی سنت ادا کرنے کے لئے ہر وقت پروانوں کی طرح اس کے گرد جمع رہتے ہیں اور وہ مہمانان خدا جو محض اللہ ربّ العزت اور اس کے پاک رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات کی تعمیل اور سنت کی ادائیگی کے شوق میں منی، عرفات اور پھر مزدلفہ کی وادیوں کی خاک چھانتے ہیں۔اور ہر طرح کی مشقت اور مصیبت کو ہنسی خوشی گوارا کرتے ہیں، یہی سنتوں کے متوالے، یہی پیغمبر علیہ السلام پر جان چھڑکنے والے یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیوانے اور شیدائی جن کے چہروں پر ایمان کا نور اور محبت رسولؐ کی چکا چوند نظر آتی ہے۔ جب ان کے سامنے نبی جیسی صورت بنانے کا موقع آتا ہے تو ان کے تیور بدل جاتے ہیں اور حج کے مقدس سفر میں بھی شیطانی وساوس سے متاثر ہوکر وہ دشمنانِ اسلام، مشرکوں اور عیسائیوں جیسی اپنی صورت بنا لیتے ہیں۔ایمانی غیرت ہوتی تو کم ازکم حج کے مقدس سفر کی تو لاج رکھی جاتی۔ایسے مبارک ماحول اور ان متبرک مقامات کا تو احترام کیا جاتا۔جس طرح مقامات مقدسہ میں عبادت کا ثواب بڑھا ہوا ہے اسی طرح وہاں رہتے ہوئے گناہ کا وبال بھی حد سے زیادہ ہے۔ وہاں کی محرومیوں کے اسباب سے بچتے رہنا نہایت ضروری ہے۔ نیز حج کی قبولیت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ انسان حج سے قبل جن گناہوں میں مبتلا ہو۔حج کے بعد ان کو اپنی زندگی سے بالکل نکال ڈالے۔خدا کرے ہمیں اپنی کوتاہیوں کا احساس ہو سکے۔آمین۔

مدینہ حاضری

مدینہ منورہ (زادھا اللہ شرفاً وعظمۃ) جا کر دربار نبوت میں حاضری ایک مومن کے لئے نہایت عظیم سعادت ہے اور اس حاضری کے لئے جتنا بھی ادب کیا جائے کم ہے۔ جو شخص بھی اپنے سینے میں ایمانی حمیت اور دینی غیرت رکھتا ہے وہ مدینہ منورہ حاضری کے وقت یہ کوشش کرتا ہے کہ اس سے وہاں رہتے ہوئے کوئی ایسی گستاخی نہ ہو جائے جو آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے

باعث اذیت ہو، وہ آپ کی مبارک مجلس میں جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاص حیات طیبہ کے ساتھ تشریف فرما ہیں۔ اور اپنے زائرین کے صلوٰۃ وسلام کا بنفس نفیس جواب مرحمت فرماتے ہیں۔ اس حال میں حاضری کی سعی کرتا ہے اور ایسی ہیئت کے ساتھ زیارت کا اہتمام کرتا ہے کہ آپ کو اسے دیکھ کر ناگواری اور تکلیف کا احساس نہ ہو۔

لیکن کتنے افسوس کا مقام ہے کہ آج امت کا ایک بڑا طبقہ نہایت بے غیرتی کے ساتھ ایسی ہیئت وصورت کے ساتھ دربار نبوت میں حاضری دیتا ہے جو آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کی صورتوں کے مشابہ ہے۔ ذرا غور فرمایئے! ہمارا عزیز بیٹا اگر ہمارے سامنے ایسی صورت میں آئے جس سے ہمیں اذیت ہوتی ہو تو ہمارے دل پر کیا گذرے گی؟ تو جتنی محبت ہمیں اپنے عزیز ترین بیٹے سے ہوسکتی ہے اس سے کہیں زیادہ محبت ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت کے ہر فرد سے ہے۔ امت کی کوتاہیوں اور سنت سے بیزاری کے رجحان پر آپ کو سخت اذیت ہونا بدیہی ہے۔

اس لئے ہمارے تعلق اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سچی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے کسی عمل سے اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف نہ پہنچائیں۔ سرورِ دوعالم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت نہ پہنچانا ہی سب سے بڑا ادب اور زائرین حرم کا اولین فریضہ ہے۔ جو ہمارے بھائی اس معاملہ میں کوتاہی کرتے ہیں۔ انھیں ٹھنڈے دل سے اپنا احتساب کرنا چاہئے اور آئندہ کے لئے سنتوں کے اہتمام کا عزم مصمم کرلینا چاہئے۔

سفر سے واپسی

اس مبارک سفر سے واپسی کا وقت جوں جوں قریب آئے، بیت اللہ سے جدائی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے رخصتی پر غم وافسوس اور رنج وملال ہونا چاہئے اور ایک ایک لمحہ غنیمت سمجھ کر عبادت واطاعت میں لگانا چاہئے۔ پتہ نہیں پھر زندگی میں یہ مبارک لمحات میسر آئیں نہ آئیں۔ مگر آج صورت حال یہ ہے کہ سفر حج سے واپسی کے آخری ایام زیادہ تر خرید وفروخت اور بازاروں میں گھومنے پھرنے میں صرف کردیئے جاتے ہیں۔ اور اخیر وقت تک بھی یکسوئی نہیں

رہتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عشق کے جذبات کا اظہار کئے بغیر بے کیفی کے ساتھ رسمی جدائی ہوتی ہے۔ جس میں نہ آنکھیں نم ہوتی ہیں نہ دل بے قابو ہوتا ہے۔ اس بے کیفی کے ساتھ واپسی کی صورت میں راستہ کی برکتیں بھی کم ہو جاتی ہیں۔ اور سفر کے دوران دعاؤں کی قبولیت کا مبارک وقت غفلت کی نذر ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ نمازیں تک قضا کر دی جاتی ہیں اور بہت سے جہازوں میں اُڑان کے دوران فحش فلمیں دکھائی جاتی ہیں تو یہی حجاج کرام ان فلموں کو دیکھ کر گنہگار بنتے ہیں۔ پھر ہوائی اڈوں پر حاجیوں کے استقبال کے نام پر مردوں اور بے پردہ عورتوں کا جو بے ہنگم اجتماع ہوتا ہے۔ اس نے حج کے مقدس عمل کی شبیہ بگاڑ کر رکھ دی ہے۔ حج کی اصل روح اخلاص اور بے نفسی ہے اور ان منکرات اور رسومات نے اس کی روح کو فنا کر کے رکھ دیا ہے۔ حج کے عنوان سے اس تماشے اور دکھاوے کی شریعت میں گنجائش نہیں ہے۔ ہمارا یہ شرعی فریضہ ہے کہ ہم ان رسومات کی حوصلہ شکنی کے لئے آگے آئیں تاکہ یہ سلسلہ بتدریج بند کیا جا سکے۔

دعوتیں ہی دعوتیں

حاجی کے اپنے گھر پہنچنے کے بعد کسی طرح استقبال کا ہنگامہ چھٹتا ہے اور اس ہنگامے میں حصّہ لینے والے اپنی اپنی خدمات اور تعاون کے عوض (جو حج کو جانے سے پہلے حاجی کو لفافہ کی شکل میں دے دیا جاتا ہے) تحفوں سے سرفراز کئے جاتے ہیں (اگر چہ وہ تحفے دلّی سے ہی خرید کر دینے پڑیں) تو پھر دعوتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے کہیں حاجی صاحب کی دعوت کے نام پر مجلسیں جمتی ہیں اور اب کہیں کہیں نئے رواج کے اعتبار سے خود حاجی صاحب ''حج کا مقدس ولیمہ'' کرتے ہیں۔ جس میں شریک ہونے والے کے لئے حاجی صاحب کو لفافہ میں بند کر کے کچھ نہ کچھ ''نیوتہ'' دینا اتنا بڑا اخلاقی فرض سمجھا جاتا ہے کہ اگر کوئی بے چارہ اس قابل نہ ہو تو اسے ناگوار تبصروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یوں کہئے کہ اب جسے بغیر نکاح کے اپنی شادی کرانی ہوتی ہے تو وہ حج کر کے آتا ہے اور شادی کی آرزوئیں (بارات، قوالیاں، پھول اور گجرے اور پھر زوردار ولیمہ) اس کے ذریعہ سے انجام پاتی ہیں۔ یعنی اس مقدس عبادت کو نام و نمود اور سستی شہرت کا ذریعہ بنا لیا گیا ہے۔

یہ صورتحال افسوسناک ہی نہیں بلکہ تشویشناک بھی ہے۔اور معاشرہ کے بااثر اور ہوشمند افراد نے اگر اس پر سنجیدگی سے توجہ نہ دی تو حج کے نام پر کی جانے والی یہ فضول خرچیاں بڑھتے بڑھتے حج کے اصل مصارف سے بھی زیادہ ہو جائیں گی۔اور معاشرہ کے ایک عام فرد کے لئے حج ویسے ہی مشکل ہے اگر یہی صورت رہی تو اور مشکل ہو جائے گا۔اور کتنے لوگ شرعی طور پر حج فرض ہونے کے باوجود اس انتظار میں حج سے محروم رہیں گے کہ حج سے پہلے اور بعد کے اوپری خرچوں کا انتظام ہو جائے۔خدا کرے کہ ہماری آنکھیں کھلیں اور عبادت کو عبادت کی حیثیت سے انجام دینے کی توفیق حاصل ہو۔آمین۔

نئے حجاج کرام سے خاص طور پر استدعاء ہے کہ وہ کوتاہیوں پر توبہ واستغفار کر کے آئندہ صاف ستھری اور سنت کے مطابق زندگی گزارنے کی کوشش کریں۔یہ ان کے حج کی قبولیت کی بڑی نشانی ہوگی۔(واللہ ولی التوفیق)

(ندائے شاہی، جولائی ۱۹۹۶ء)

معلوم ھے :

یہ کس کریم کا دربار ہے؟

محدث جلیل حضرت عبداللہ بن المبارکؒ فرماتے ہیں کہ ایک سال میدان عرفات میں مجھے حضرت سفیان ثوریؒ کی ملاقات کا شرف حاصل ہوا، موصوف گھٹنے کے بل بیٹھے تھے اور آنکھوں سے مسلسل آنسوؤں کی جھڑی لگ رہی تھی، اسی حالت میں انہوں نے پوچھا ! جانتے ہو آج کے دن سب سے بدنصیب اور بد بخت شخص کون ہے؟ پھر خود ہی جواب دیا کہ ''وہ شخص جو یہ گمان رکھے کہ آج کے دن بھی اللہ تعالیٰ اسکی بخشش نہ فرمائے گا''۔

ایک سال میدان عرفات میں خلق خدا کی گریۂ وزاری اور تضرع وابتہال کا پراثر منظر دیکھ کر عارف باللہ حضرت فضیل ابن عیاضؒ لوگوں سے گویا ہوئے کہ: ''تمہارا کیا خیال ہے اگر اتنا بڑا مجمع کسی دنیا کے مالدار کے پاس جا کر صرف ایک دانگ (درہم کا چھٹا حصہ) دئے جانے کا مطالبہ کرے تو بتاؤ کیا وہ مالدار انکی اتنی ذراسی درخواست ٹھکرا دے گا؟ سب نے بیک زبان کہا: نہیں! ہر گز نہیں۔ حضرت فضیلؒ نے فرمایا کہ ''رب ذوالجلال کی قسم ان سب کو معاف کر دینا اور مغفرت سے نواز دینا اللہ کے نزدیک ایک دانگ دینے سے بھی معمولی ترین بات ہے''۔ (دعاء یوم عرفہ ۲۲-۲۳)

حضرت ابوذر غفاریؓ کی حدیث ہے: اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ: ''اگر تمام جنات وانسان ایک میدان میں آکر مجھ سے جو چاہیں اور جتنا چاہیں مانگیں اور میں سب کو عطا کر دوں پھر بھی میرے خزانے میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں آسکتی''۔ (مسلم شریف) کیا ٹھکانا ہے اسکی عطا کا؟ اور کیا انتہا ہے اسکی ستاری کی؟ ایک طرف اسکی بے حد وحساب نوازش دیکھئے۔ اور عالم حیرت میں غرق ہو

جائیے۔اور دوسری طرف اپنی کوتاہیوں، ناقدریوں اور احسان فراموشی کا جائزہ لیجئے۔اور اللہ کی صفت ستاری دیکھئے، ایک بڑے صاحب معرفت بزرگ حضرت ابوعبیدہ خواصؒ کو لوگوں نے میدان عرفات میں دیکھا کہ انتہائی بے چینی اور بے قراری کے عالم میں یہ دل دہلانے والے اشعار پڑھ رہے تھے:

كَمْ قَدْ زَلَلْتُ وَلَمْ اَذْكُرْكَ فِيْ زَلَلِيْ ☆ وَاَنْتَ يَا مَالِكِيْ بِالْغَيْبِ تَذْكُرُنِيْ

اے رب کریم ! میں نے کتنی لغزشیں کیں اور اپنی لغزشوں کے دوران تجھے بالکل یاد نہ کیا، اور اے میرے مالک تو پھر بھی مجھے غائبانہ میں یاد کرتا رہا۔

كَمْ اَكْشِفُ السِّتْرَ جَهْلاً عِنْدَ مَعْصِيَتِيْ ☆ وَاَنْتَ تَلْطَفُ بِيْ حِلْماً وَتَسْتُرُنِيْ

اور میں نے نادانی میں کتنی ہی مرتبہ گناہ کر کے اپنی رسوائی کا سامان کیا، مگر تو برابر اپنی صفت حلم سے میرے ساتھ مہربانی اور پردہ پوشی کا معاملہ فرماتا رہا۔ (فضائل حج ۲۲۰)

اس سال بفضل خداوندی ماہ مبارک میں بیت اللہ حاضری کی سعادت ملی۔ دنیا کے کونے کونے سے آنے والے ہزاروں ہزار تشنگان معرفت بندگان خدا اپنے رب کے دربار میں بھکاری بن کر حاضر تھے ''ملتزم'' کے ارد گرد آہ وبکا اور تضرع وزاری سے کلیجے پھٹے جا رہے تھے۔ میں نے اپنے ایک ساتھی سے کہا: ذرا غور کیجئے! دنیا کے کسی ارب پتی کے گھر پر اگر اس طرح بھکاریوں کی بھیڑ لگنے لگے تو وہ آخر کب تک اسے برداشت کرے گا؟ اگر وہ اتنی بڑی بھیڑ کو خزانہ لٹانے لگے تو جلد ہی اسکے کنگال ہو جانے کی نوبت آجائے گی۔اور دنیا میں آج تک کوئی ایسا شخص نہ پیدا ہوا اور نہ ہوسکتا ہے جو ہر ضرورت مند کی ضرورت ہر وقت پورا کرنے پر قادر ہو اور نہ کوئی ایسا وسیع الظرف ہے جو اپنے دشمن کو سیکنڈوں میں دل سے معاف کر کے اسکو اپنا محبوب اور مقرب بنالے۔ یہ شان کسی مخلوق میں ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ شان والا شان صرف اس عزت وعظمت کے مالک، رب ذوالجلال، قادر مطلق، خلاق کائنات، غفار وستار ہی کی ہے جو سب کریموں سے بڑا کریم اور سب داتاؤں سے بڑا داتا ہے۔ جسکے یہاں مانگنے والوں کا اعزاز ہے اور نہ مانگنے والوں سے ناراضگی، جسکے دربار سے محرومی کا سوال ہی نہیں، جسکا خزانہ لازوال اور جسکی عطا بے حساب ہے، مانگنے والوں کو مانگنے کا سلیقہ ہو یا نہ ہوا سکے یہاں دینے میں کمی نہیں --- پھر یہ بھی سوچئے ! یہ بھکاری اتنی بڑی تعداد میں آئے کیسے !

کیا یہ خود چلے آئے؟ نہیں ہر گز نہیں، یہ قدم اٹھے نہیں اٹھائے گئے ہیں۔ دنیا کے دو پیسے کے منصب دار افسر کے کمرے میں جب کوئی بلا اجازت پر نہیں مار سکتا تو کیا احکم الحاکمین کی بارگاہ میں کوئی بلا اجازت آسکتا ہے؟۔ بلاشبہ یہاں وہی آتا ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنا مہمان بننے کے مقدس شرف وسعادت سے نوازنا چاہتا ہے۔ اسکی مرضی کے بغیر سارے ارادے اور اسباب دھرے رہ جاتے ہیں اور جب مرضی ہو جائے تو پھر حیرت انگیز طور پر اسباب در اسباب بنتے چلے جاتے ہیں۔ اور دنیا کا کوئی بھی شریف شخص اپنے مہمانوں کی عزت واکرام میں اپنی وسعت کی حد تک کوئی کمی نہیں کرتا، بلکہ جتنا بڑا میزبان ہوتا ہے اسکے مہمانوں کا اتنا ہی اکرام ہوتا ہے اور تحفوں تحائف سے نوازا جاتا ہے۔ تو پھر یہاں تو یہ سوچنا بھی جرم ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے کسی مہمان کو محروم کردے بلکہ وہ تو اس قدر نوازے گا کہ تصور کے سارے اندازے اسکا احاطہ کرنے سے عاجز نظر آئیں گے۔ جب دینے والے کی شان یہ ہے تو مانگنے والے کی شان بھی نیازمندی، عاجزی، احساس جرم، ندامت، شرمندگی، اور اعتراف قصور کی ہونی چاہیئے۔ اور سفر سے پہلے ہی اس دربار کا تصور دل میں نقش ہو جانا چاہیئے۔ اور ہر اس سبب سے اپنے کو محفوظ کرنے کی ہر ممکن سعی کرنی چاہیئے جس سے اس مبارک سفر کی نوازشوں میں کوئی کمی نہ آجائے۔ مثلاً اگر اپنے اوپر کسی مخلوق کا حق ہو تو اسے ادا کرکے یا معاف کرا کے سفر پر جائیں۔ کسی سے اگر بلاوجہ بغض وعداوت اور بول چال بند ہو تو صلح صفائی کر کے جائیں۔ خدانخواستہ کسی گناہ کی عادت ہو تو اس سے یہیں سچی توبہ کر کے بارگاہ رب العزت میں حاضری دیں، نمازیں اور روزے قضا ہوں تو ابھی سے انکی قضا کا اہتمام شروع کر دیں۔ اور ایک وصیت لکھ کر رکھ دیں کہ "اگر موت آجائے تو میرے ترکہ سے قضا شدہ عبادات کا فدیہ ادا کیا جائے" اسی طرح حج کو شان وشوکت اور نام ونمود سے بچائیں اپنی شان مٹا کر اللہ کی شان میں فنا ہو جانا ہی تو حج کی اصل روح ہے اس روح کو باقی رکھنے کی کوشش لازم ہے، نیز حج کے احکامات کو سمجھنے اور یاد کرنے کی ضرورت ہے تاکہ یہ مقدس سفر کسی شرعی اور فقہی غلطی کی وجہ سے ناقص نہ رہ جائے۔ اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل وکرم سے ہم سب کو حج مبرور ومقبول سے سرفراز فرمائے۔ آمین.

(ندائے شاہی حج وزیارت نمبر جنوری، وفروری ۲۰۰۱ء)

❍❖❍

قربانی کی ضرورت

قربانی کا لفظ کانوں میں پڑتے ہی ایک خاص عبادت کا تصور ذہنوں میں گھوم جاتا ہے جو عیدالاضحیٰ کے موقع پر انجام دی جاتی ہے۔ اللہ کے خلیل سیدنا حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی یہ سنت اللہ تعالیٰ کو اس قدر پسند آئی کہ قیامت تک کے لئے ہر صاحب استطاعت مسلمان پر اضحیہ (قربانی) واجب کر کے اس سنت کو زندہ جاوید رہنے کا انتظام فرما دیا ہے۔ ذرا غور فرمائیں، اللہ ربّ العزت کو نہ جانوروں کے خون کی ضرورت ہے نہ ان کے گوشت کی۔ اللہ تعالیٰ کی کوئی منفعت ان سے وابستہ نہیں۔ لیکن پھر بھی یہ عبادت اپنے وقت پر اللہ تعالیٰ کی سب سے زیادہ پسندیدہ بن جاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ قربانی کرنے والے کے لئے آخرت میں شاندار کامیابی کا ذریعہ بھی بنتی ہے۔ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ حضرات صحابہؓ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار فرمایا کہ اے اللہ کے رسول یہ قربانی کیا ہے؟ (یعنی اس کا ثبوت اور ابتداء کہاں سے ہے؟) اس پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ تمھارے باپ سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت مبارکہ ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہمیں اس میں کیا ثواب ملے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جانور کے ہر بال کے بدلہ میں تمھیں ایک ایک نیکی ملے گی پھر صحابہؓ نے عرض کیا کہ اون کے بارے میں کیا حکم ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اون کے ہر ہر روئیں کے عوض ایک ایک نیکی عطا کی جائے گی۔

(مسند احمد وابن ماجہ بحوالہ مشکوٰۃ شریف ۱/ ۱۲۹)

اس حدیث کے اعتبار سے قربانی کرنے والا شخص محض ایک جانور کی قربانی کر کے ہزاروں نیکیوں کا مستحق بن جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اللہ کو یہ عبادت اس قدر کیوں پسند ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ پسندیدگی بے وجہ نہیں ہوسکتی۔ واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اس قربانی کے ذریعہ اپنی بندگی کی طرف متوجہ ہونے اور خدائے واحد کے علاوہ دنیا کے تمام مصنوعی معبودوں سے منہ موڑنے کا پیغام دینا چاہتا ہے۔ قرآن کریم نے اس عقدہ کو اس طرح حل کیا ہے۔

لَنۡ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوۡمُھَا وَلَادِمَاؤُھَاوَلٰکِنۡ یَّنَالُہُ التَّقۡوٰی مِنۡکُمۡ. (حج ۳۷)

''اللہ تعالیٰ کو نہیں پہنچتا ان کا گوشت اور نہ ان کا لہو لیکن اس کو پہنچتا ہے تمھارے دل کا ادب''۔

معلوم ہوا کہ اصل مقصود اللہ تعالیٰ کا خوف وخشیت دل میں جاگزیں ہونا اور ہر معاملہ میں شریعت اسلامی کا تابع فرمان بن جانا ہے۔ یہ قربانی ہمیں اس جانب متوجہ کرتی ہے کہ جس طرح سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے آقا کے حکم پر لاڈلے لختِ جگر اور پیارے نورِ نظر کو قربان کرنے کا تہیّہ کر کے اپنی واقعی بندگی کا ثبوت دیا۔ اسی طرح ہر انسان کو اپنی ''انا'' حکم ربی کے سامنے فنا کر دینی چاہئے۔ بلاشبہ یہ انسانیت کی معراج ہے اور عبدیت کا سب سے اونچا مرتبہ ہے۔ قربانی کا دن ہر سال چیخ چیخ کر ہمیں متنبہ کرتا ہے کہ انسان اس وقت تک تقرب خداوندی حاصل نہیں کرسکتا، جب تک کہ وہ زندگی کے ہر ہر لمحہ میں قربانی دینے والا نہ بن جائے۔ قربانی صرف جانوروں کو ذبح کر کے خون بہا دینے کا نام نہیں بلکہ قربانی دراصل عنوان ہے حکم خداوندی کے سامنے خواہشات نفسیانی کو ملیا میٹ کر دینے کا۔ اور یہ کام صرف ذی الحجہ کے تین دن ہی کا نہیں بلکہ سال کے ۳۶۵ دن کرنے کا ہے۔ آج ضرورت ہے کہ ہم قربانی سے واقعی سبق حاصل کریں اور قربانی کو اپنی زندگی کا مشن بنالیں۔ آج زندگی کے ہر ہر موڑ پر قربانی دینے والوں کی سخت ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر:

(الف) عبادات میں استقامت کے لئے قربانی کی ضرورت ہے۔ دنیا میں مشغول لوگوں کو نماز اور جماعت کے لئے وقت کا فارغ کرنا بڑا شاق ہوتا ہے۔ وہ اگر اس نفس کی تنگی کے خلاف حکم ربی کی اطاعت کرتے ہوئے عبادات انجام دیں تو یقیناً یہ ایک بڑی قربانی ہوگی اسی طرح

اشاعت دین کے لئے اور دیگر مسلمان بھائیوں کو متوجہ کرنے کے لئے اپنا وقت اور مال خرچ کرنا بھی ایک عظیم قربانی ہے۔ یہ جذبہ اگر ہر مسلمان میں پیدا ہو جائے تو امّت کے حالات بہت جلد سدھر سکتے ہیں اور تمام عبادات میں استقامت و استحکام کی توفیق نصیب ہو سکتی ہے۔

(ب) معاشرتی اصلاح، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام بھی زبردست جذبہ قربانی کا متقاضی ہے۔ آج کے معاشرہ میں اصلاح پسندوں کی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی بلکہ لوگ ان کے درپے آزار ہو جاتے ہیں۔ انھیں جابجا طعنے سننے پڑتے ہیں۔ قدم قدم پر انھیں رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بسا اوقات دنیوی ذلت بھی اٹھانی پڑتی ہے اور معاشی نقصانات کا بھی اندیشہ ہوتا ہے۔ ایسے ماحول میں وہی شخص اصلاحی کام انجام دے سکتا ہے جو اپنے مشن کے لئے ہر دنیوی مفاد قربان کر دینے کا جذبہ رکھتا ہو۔ اس قربانی کے بغیر کامیابی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

(ج) اور سب سے زیادہ ہمیں اجتماعی زندگی میں قربانی دینے کی ضرورت ہے۔ آج اقتدار پسندی خود غرضی اور مفاد پرستی کا دور ہے۔ اسی وجہ سے دلوں میں بغض و عداوت، حسد اور کینہ کی بھرمار ہے۔ دوسرے کی ترقی آنکھوں میں کھٹکتی ہے۔ اور ہر معاملہ کو کاروباری انداز میں دیکھنے کا رواج ہو گیا ہے۔ ہر طبقہ میں اور ہر سطح پر صرف اور صرف اپنے مفاد کے لئے لوگ تگ و دو کرتے نظر آتے ہیں۔ ایسے معاشرہ اور سماج میں ایثار کرنا اور اپنے اوپر دوسرے کو ترجیح دینا بڑے دل گردے کا کام ہے اور وقت کی سب سے بڑی قربانی ہے اس قربانی سے بڑے بڑے فتنے منٹوں میں دب جاتے ہیں اور سالوں کی رقابتیں لمحوں میں ختم ہو جاتی ہیں۔ اور اگر یہ جذبہ مفقود ہو تو دو سگے بھائیوں میں بھی اتفاق و اتحاد اور انس و محبت کی فضا باقی نہیں رہ پاتی۔

غرضیکہ زندگی کے ہر موڑ پر ہمیں قربانی دینے کا سبق سیکھنا چاہئے، یہ کامیابی کی کنجی اور ضمانت ہے۔ تاریخ کے صفحات گواہی دیتے ہیں کہ قوموں کا عروج ان کی قربانیوں سے ہی ہوا ہے اور قربانی

کا جذبہ سرد پڑنے کے بعد بڑی سے بڑی قومیں بھی نیست و نابود ہوکر تاریخ کے نہاں خانوں میں چلی گئی ہیں۔قربانی کی عبادت انجام دیتے وقت ہمارے سامنے صرف جانور کا گوشت پوست نہ رہے۔ بلکہ اس کے پس پشت جو آفاقی پیغام مضمر ہے اسے دھیان میں رکھ کر ہمیں اس عبادت کی سعادت سے بہرہ ور ہونا چاہئے۔اسی آفاقی پیغام کی طرف اشارہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس مبارک ارشاد میں بیان فرمایا ہے۔

لَا یُؤْمِنْ اَحَدُکُمْ حَتی یَکُوْنَ هَوَاهُ تَبْعاً لِمَا جِئَتُ بِهٖ، (مشکوٰۃ شریف،۳۰)

یعنی کسی کا ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا، جب تک اس کی نفسانی خواہش میری شریعت کے تابع نہ ہو جائے۔

شریعت کے سامنے سر تسلیم خم کر کے نفسانی تقاضہ کو دبا دینا ہی تو قربانی ہے۔ یہی تقویٰ کا مفہوم ہے اور **اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰکُمْ.** (سورۃ حجرات آیت ۱۳) کے اعتبار سے اللہ کے نزدیک اس سے بڑھ کر کوئی اکرام واعزاز کی چیز نہیں ہے۔اللہ تعالیٰ سب مسلمان بھائیوں کو واقعی جذبۂ قربانی سے سرفراز فرمائے۔آمین۔

(ندائے شاہی، مئی ۱۹۹۵ء)

فکرِ اسلامی

ایمان کی لذت

جب کسی چیز کی لذت انسان کے دل میں اتر جاتی ہے تو اس کے مقابلہ میں وہ ہر قربانی دینے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ دنیا کی زندگی میں آئے دن اس کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے۔ کسی کو کرسی کی ''چسک'' لگتی ہے تو وہ لاکھوں روپے الیکشنوں میں پھونک دیتا ہے۔ کسی کو دولت کی ''لت'' لگتی ہے تو وہ ہر آرام اور راحت کو خیر آباد کہہ کر صرف اور صرف ''روپیہ'' کے حصول میں سرگرداں نظر آتا ہے اور راستہ کی ہر تکلیف کو ہنسی خوشی گوارا کر لیتا ہے اور کتنی ہی اسے مشقت اٹھانی پڑے مگر وہ اپنے راستہ سے ہٹنا گوارا نہیں کرتا۔

کچھ اسی طرح بلکہ اور آگے کا معاملہ ایمان کی لذت کا بھی ہے کہ جب ایمان کی چاشنی اور حلاوت کسی کو نصیب ہو جاتی ہے تو پھر وہ اس حلاوت اور لذت کو ایک سکنڈ کے لئے بھی اپنے سے جدا کرنا برداشت نہیں کرتا۔ اور اس کی نظر میں یہی چیز تمام دنیا اور اس کی دولت سے زیادہ قیمتی بن جاتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن حذافہؓ بھی ایک صحابی ہیں۔ ایک مرتبہ سیدنا حضرت فاروق اعظمؓ کے زمانہ میں آپ روم کی طرف سفر جہاد میں تشریف لے گئے۔ اتفاق سے رومیوں نے آپ کو لشکر سمیت گرفتار کر لیا۔ اور آپ کو پکڑ کر اپنے بادشاہ کے پاس لے گئے اور تعارف کرایا کہ یہ شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے ہے۔ نصرانی بادشاہ نے نصرانیت قبول کرنے کی درخواست کرتے ہوئے پیشکش کی کہ اگر آپ اسے مان لیں۔ تو میں اپنی حکومت میں آپ کو شریک کر لوں گا۔ بادشاہ کی پیشکش پر حضرت عبداللہ بن حذافہؓ نے بڑی بے نیازی اور جرأت سے جواب دیا کہ:

''اگر آپ ساری دولت اور عرب کے تمام خزانے مجھے دے کر یہ چاہیں کہ میں پلک جھپکنے کے بقدر بھی اپنے آقا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین سے پھر جاؤں تو یہ ہرگز نہیں ہوسکتا''۔

بادشاہ نے کہا تو پھر میں آپ کو جان سے مارڈالوں گا۔ حضرت عبداللہؓ نے جواب دیا کہ ''آپ جانیں'' چنانچہ بادشاہ نے آپ کو سولی پر لٹکانے کا حکم دیا۔ اور تیراندازوں کو ہدایت دی کہ وہ آپ کے ہاتھ پیر کے قریب قریب تیر چلاتے رہیں (تا کہ آپ کو دہشت زدہ کردیں) اس درمیان آپ پر نصرانیت قبول کرنے کا زور ڈالا جاتا رہا۔ مگر آپ برابر انکار کرتے رہے۔ اور سولی اور تیراندازی سے قطعاً مرعوب نہ ہوئے۔ پھر آپ کو سولی پر سے اتار دیا گیا۔ اور بادشاہ نے ایک دیگچے میں پانی گرم کرنے کا حکم دیا۔ جب پانی کھولنے لگا تو بادشاہ نے ایک مسلمان قیدی کو بلوا کر دیگچے میں ڈلوا دیا منٹوں میں وہ جل بھن کر سیاہ ہوگیا۔ پھر حضرت عبداللہؓ سے نصرانیت اختیار کرنے کی درخواست کی۔ حضرت نے انکار کیا تو بادشاہ نے آپ کو بھی کھولتے ہوئے پانی میں ڈالنے کا حکم دے دیا۔ جب آپ کو دیگچے کی طرف لے جایا جانے لگا تو آپ رونے لگے۔ بادشاہ نے سمجھا کہ شاید اب موت سے ڈر کر آپ اسلام چھوڑ دیں گے۔ اس لئے آپ کو واپس بلایا اور نصرانیت کی دعوت دی۔ مگر حضرت نے صاف انکار کردیا۔ بادشاہ نے پوچھا کہ ''پھر آپ کیوں رو رہے تھے؟'' اس پر حضرت عبداللہ نے جو جواب دیا وہ اسلام کی روشن تاریخ میں آب زر سے نقش ہوگیا۔ ملاحظہ کیجیے۔ اور ایک صحابی رسول کی ایمانی قوت پر سر دُھنیے۔ آپ نے برملا فرمایا:

''مجھے اس پر رونا آرہا ہے کہ آج میرے پاس ایک ہی جان ہے جو اللہ کی راہ میں جلائے جانے کو تیار ہے۔ کاش کہ میرے بدن کے ہر ہر بال میں ایک ایک جان ہوتی اور ان سب کو اللہ کی راہ میں اسی طرح جلایا جاتا''۔

اس مضبوط ایمان کو دیکھ کر نصرانی بادشاہ کا دل پسیج گیا۔ اور اس نے کہا کہ اگر آپ میری پیشانی چوم لیں تو میں آپ کو رہا کرسکتا ہوں۔ حضرت عبداللہ نے فرمایا کہ سارے مسلمان قیدیوں کی رہائی کے عوض میں آپ کی شرط مان سکتا ہوں اور جب بادشاہ نے سب مسلمان قیدیوں کی رہائی

کا یقین دلایا تو حضرت عبداللہ نے بادشاہ کی پیشانی کا بوسہ لے کر پورے لشکر کو چھڑا لیا۔ اور امیر المومنین حضرت عمرؓ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوکر پورا واقعہ بیان کیا۔ حضرت عمرؓ کو اتنی مسرت ہوئی کہ فرمایا کہ ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ حضرت عبداللہ کی پیشانی چومے۔ پھر خود آگے بڑھ کر اپنے مبارک ہونٹ حضرت عبداللہ بن خدافہؓ کی پیشانی پر رکھ دیے۔ (شعب الایمان ۲/۲۴۴-الاصابہ ۴/۵۲)

اس واقعہ سے حضرات صحابہؓ کی ایمانی قوت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ قوت اسی لئے تھی کہ وہ ایمان کی لذت وحلاوت سے پوری طرح آشنا ہو چکے تھے۔ آج ضرورت ہے کہ ہر مسلمان اس لذت وحلاوت سے آشنا ہو، یہ ہماری بنیادی ضرورت ہے جس کے حصول کے لئے ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین باتوں کو ایمانی حلاوت کے حصول کی علامت قرار دیا ہے۔

(۱) یہ کہ انسان کی نظر میں اللہ اور اس کے رسول کی ذات کائنات کی ہر چیز سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہو جائے۔ (جس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ کوئی کام اللہ اور اس کے رسول کی مرضی کے خلاف نہ کرے)

(۲) وہ اپنے مسلمان بھائیوں سے خدا واسطے کا بے لوث تعلق رکھے۔

(۳) اور وہ اپنے لئے کفر کو اسی طرح ناپسند کرے، جیسے آگ میں جلنے کو ناپسند سمجھتا ہے۔ (مسلم شریف)

حضرات صحابہؓ میں یہ تینوں علامتیں کامل طریقہ پر موجود تھیں۔ اور آج کے معاشرہ میں ان تینوں باتوں سے لاپروائی برتی جارہی ہے۔ ہم میں سے ہر شخص خود اپنے گریبان میں منہ ڈال کر جائزہ لے کہ وہ ان علامتوں پر کہاں تک پورا اترتا ہے۔ اور کہاں تک کوتاہی کر رہا ہے؟ اللہ تعالیٰ ہمیں خود احتسابی کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

(ندائے شاہی، جولائی ۱۹۹۸ء)

دشمن کو پہچانیں

دنیا میں انسان کو بہت سے دشمنوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ کبھی اپنی ہی جنس کا دوسرا انسان دشمن بن جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے بہت سے جانی اور مالی نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں۔ اسی طرح کچھ جانور مثلاً سانپ، بچھو، شیر، اور درندے وغیرہ سے انسان کو پیدائشی دشمنی ہے۔ اگر کبھی انسان ان دشمنوں کے نرغے میں پھنس جاتا ہے تو جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ گھروں کی عمارت ایسی بنائی جاتی ہے کہ دشمن جانور وہاں راہ نہ پاسکیں۔ پہرے داری کے لئے ملازم رکھے جاتے ہیں کہ دشمن ناگاہ غفلت میں حملہ نہ کردے۔ اگر کسی راستہ میں دشمنوں کے غلبہ کی خبر ملتی ہے تو وہ راستہ ہی بدل دیا جاتا ہے تاکہ سفر امن و عافیت سے طے ہو جائے۔ وغیرہ۔ مگر یہ جتنے بھی دشمن ہیں خواہ انسان کے قبیل سے ہوں یا کسی اور جانور کی قبیل سے۔ ان سب کی دشمنیوں کا اثر نہایت محدود ہے۔ دشمن مالی نقصان پہنچائے تو اس کی بھی تلافی آسان ہے۔ جسم کو نقصان پہنچائے تو کچھ دنوں میں اس کی صحت کا بھی امکان ہے۔ اور بالفرض اگر یہ دنیوی دشمن انسان کی جان کے خاتمہ کا سبب بن جائیں تو بھی یہ نقصان صرف دنیوی زندگی تک ہی محدود رہے گا۔ مرنے کے بعد کی زندگی میں اس دشمنی سے کسی کو نقصان کی امید نہیں ہے بلکہ ممکن ہے کہ شہادت کی موت انسان کے درجات کو بلند سے بلند کردے۔

لیکن ان دشمنوں کے علاوہ انسان کا ایک اور سب سے بڑا ''مہا دشمن'' ہے جس کی بدترین دشمنی نہ صرف یہ کہ دنیا کے اندر بھیانک شکل میں ظاہر ہوتی ہے بلکہ مرنے کے بعد کی زندگی میں بھی اس کی دشمنی کے بدترین نتائج سامنے آئیں گے۔ یہ وہ کھلا ہوا دشمن ہے جس کی دشمنی قرآن کریم

میں گیارہ جگہ ثابت کرکے اس سے پوری طرح ہوشیار رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ یہ دشمن ''شیطان لعین'' ہے۔اس نے اللہ تعالیٰ کے سامنے یہ عہد کیا ہے کہ وہ ہر ممکن طریقہ پر آدم علیہ السلام کی اولاد کونقصان پہنچانے کی برابر کوشش کرتا رہے گا۔(الاعراف) اور وہ اپنے اس عہد پر پوری طرح کار بند اور مستعد ہے اور انسانوں کونقصان پہنچانے کی اس کی محنتیں بڑی بارآور اور کامیاب بھی ہو رہی ہیں۔سوچنے کی بات ہے کہ اس مشینی دور میں جبکہ ہر دشمن سے بچاؤ کے لئے بہترین سے بہترین تدبیریں ایجاد کرلی گئی ہیں، وہاں اس بدترین ''دشمن اعظم'' سے بچاؤ میں انسان کامیاب کیوں نہیں ہے؟اس کی وجہ واضح ہے کہ: انسان اس دشمن کو دشمن سمجھتا ہی نہیں ہے بلکہ برابر اس سے دوستی کی پینگیں بڑھاتا جارہا ہے۔اور ظاہر ہے کہ جب دشمن کی دشمنی کا احساس ہی معدوم ہو تو اس سے بچنے کا جذبہ کیسے سامنے آسکتا ہے؟اسی حقیقت کو سامنے رکھ کر قرآن کریم میں ہدایت فرمائی گئی۔

اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عُدُوًّا. (فاطر آیت ٦) شیطان تمہارا دشمن ہے سو تم اسے دشمن بناؤ۔تو معلوم ہوا کہ شیطان کی دشمنی سے انسان اسی وقت مامون رہ سکتا ہے جب کہ اسے اپنا دشمن تسلیم کرلے اور اس کے ساتھ وہی معاملہ کرے جو ایک دشمن سے کیا جاتا ہے یعنی اس کی سازشوں اور مکائد سے اسی طرح ہوشیار رہے جیسے ایک سخت دشمن کی چالوں سے ہوشیار رہا جاتا ہے۔

علامہ بدرالدین شبلی اپنی مشہور کتاب ''آکام المرجان فی احکام الجان'' میں نقل کرتے ہیں کہ شیطان لعین کے انسان کونقصان پہنچانے کے ٦ درجات ہیں۔

(۱) پہلے مرحلہ میں وہ انسان کو کفر وشرک میں ملوث کرنے پر محنت کرتا ہے۔اگر اس میں اسے کامیابی مل جائے تو پھر اس آدمی پر اسے مزید کسی محنت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔کیونکہ کفر وشرک سے بڑھ کر کوئی نقصان کی بات نہیں ہے۔

(۲) اگر آدمی (بفضل خداوندی) کفر وشرک پر راضی نہ ہو تو دوسرے مرحلہ میں ''شیطان لعین'' اسے بدعات میں مبتلا کردیتا ہے۔حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ: شیطان کو فسق و

فجور اور معصیت کے مقابلہ میں بدعت زیادہ پسند ہے۔اس لئے کہ دیگر گناہوں سے تو آدمی کو توبہ کی توفیق ہو جاتی ہے۔مگر بدعتی کو توبہ کی توفیق نہیں ہوتی (اس لئے کہ وہ بدعت کو ثواب سمجھ کر انجام دیتا ہے تو اس سے توبہ کا خیال بھی نہیں آتا)

(۳) اگر آدمی بدعت سے بھی محفوظ رہے تو تیسرے مرحلہ میں اسے شیطان فسق و فجور اور بڑے بڑے گناہوں میں ملوث کرنے کی کوشش کرتا ہے (مثلاً بدکاری، قتل، جھوٹ یا تکبّر، حسد وغیرہ)

(۴) اگر آدمی بڑے گناہوں سے بھی بچ جائے تو شیطان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ کم از کم آدمی کو صغیرہ گناہوں کا ہی عادی بنادے کیونکہ یہ چھوٹے چھوٹے گناہ کبھی اتنی مقدار میں جمع ہو جاتے ہیں کہ وہ انہی کی وجہ سے مستحق سزا بن جاتا ہے۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تم لوگ حقیر سمجھے جانے والے گناہوں سے بچتے رہو۔اس لئے کہ ان کی مثال ایسی ہے جیسے کچھ لوگ کسی جنگل میں پڑاؤ ڈالیں اور ہر آدمی ایک ایک لکڑی ایندھن لائے تا آنکہ ان کے ذریعہ بڑا الاؤ جلا کر کھانا پکایا کھایا جائے۔(تو یہی حال چھوٹے گناہوں کا ہے کہ وہ جمع ہوتے ہوتے بڑی تباہی کا سبب بن جاتے ہیں)

(۵) اور جب شیطان کا مذکورہ کاموں میں سے کسی مرحلہ میں بھی بس نہیں چلتا تو اس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ انسان کو ایسے مباح کاموں میں لگادے جن میں کسی ثواب کی امید نہیں ہوتی۔جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جس وقت میں انسان نیکیاں کر کے عظیم ثواب کا مستحق بن سکتا ہے، وہ وقت بلا کسی نفع کے گذر کر ضائع ہو جاتا ہے۔

(٦) اگر آدمی مذکورہ بالا ہر مرحلہ پر شیطان کے دام فریب میں آنے سے بچ جائے تو آخری مرحلہ میں شیطان انسان کو افضل اور زیادہ نفع بخش کام سے ہٹا کر معمولی اور کم نفع بخش کام میں لگانے کی کوشش کرتا ہے تاکہ جہاں تک ہو سکے انسان کو فضیلت کے ثواب سے محروم کر سکے۔(آکام المرجان ۱۲٦، ۱۲۷)

معلوم ہوا کہ شیطان انسان کونقصان پہنچانے کا کوئی موقع بھی ضائع کرنا نہیں چاہتا افسوس ہے کہ ایسے بدترین دشمن سے آج ہم غافل ہی نہیں بلکہ اس کے پکے دوست بنے ہوئے ہیں۔ بڑے بڑے دیندار بھی کسی نہ کسی مرحلہ پر شیطان کے فریب میں مبتلا نظر آتے ہیں۔اور انھیں احساس بھی نہیں ہوتا کہ ہمارے دشمن نے ہمارے ساتھ دشمنی کے کیا گل کھلا رکھے ہیں۔اب بھی وقت ہے۔ جب تک ہوش کا ساتھ ہے۔اور جسم و جان کا رشتہ برقرار ہے اس لعین دشمن سے پکی دشمنی کا اظہار ضروری ہے تا کہ یہ دشمن ہمارے دنیوی اور اخروی مفادات پر شب خون نہ مار سکے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ہر مرحلہ پر شیطان کے فریب سے بچائے اور اپنے حفظ و امان میں رکھے۔آمین۔

(ندائے شاہی، جولائی ۱۹۹۹ء)

سچی محبت

مدینہ کے درو دیوار، ارض پاک کے پاک ذرات، طیبہ کی مقدس سرزمین کے باعظمت سنگریزے اور حرم نبوی کے زیرسایہ پروان چڑھنے والے خذف پارے آج بھی اس مبارک زمانہ کو یاد کرکے تڑپ اُٹھتے ہوں گے جب انھیں آقائے نامدار، سرور کائنات، فخر دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے اور جھک کر سلام کرنے کی سعادت نصیب ہوتی تھی۔ وہ شخصیت جس کے دل میں انسانوں سے ہی نہیں بلکہ پوری کائنات سے محبت اور رأفت ورحمت کے جذبات موجزن تھے، اس نے جس طرح انسان پر ظلم کرنے سے منع کیا اسی طرح زمین پر پیر پٹخنے اور تکبّر کے ساتھ اکڑ کر چلنے سے روکا، اس نے جس طرح انسانوں کا ناحق خون بہانے سے منع کیا، اسی طرح دوسرے جانوروں کو بلا وجہ ستانے کو گناہ عظیم قرار دیا۔ اس نے جس طرح انسانی حقوق کے تحفظ کی تعلیم دی، اسی طرح دوسرے جانوروں بلکہ نباتات اور جمادات کے حقوق کو بھی پامال نہ ہونے دیا۔ ایسی شخصیت کے پردہ فرمانے پر اور ایسے عظیم المرتبت مشفق ومربی کے دیدار سے محرومی پر انس وجن ہی نہیں بلکہ دنیا کے ہر ہر ذرّہ کو غم ہونا ہی چاہئے تھا اور جن کو اپنے محبوب ومعشوق سے حقیقی محبت تھی، جن کا جینا اور مرنا آپ ہی کی ذات تھی جن کی زندگی آپ ہی کی نظر کرم پر موقوف تھی۔ انھوں نے غم منایا بھی اور ایسا منایا کہ چشم فلک نے کبھی ایسا نظارہ نہ دیکھا تھا، اُدھر وصال نبی کا اعلان ہوا، اِدھر پورے دارالاسلام میں غم واندوہ کے بادل چھا گئے، لوگوں کی دیوانگی حد سے تجاوز کرگئی، آہ وبکا کی آوازیں فضا میں گونجنے لگیں، ہر طرف اندھیرا چھا گیا، زمین سے لے کر آسمان تک تاریکی میں ڈوبتے نظر آنے لگے۔

اس تاریکی میں ابوبکرؓ کی صورت میں انھیں اپنے نبی کا پرتو ملا جس نے اپنے تدبّر سے ایک دم فضا کو پرنور بنا دیا، آواز بلند ہوئی مَنْ كَانَ يَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَاِنَّ مُحَمَّدًا قَدْمَاتَ، وَمَنْ كَانَ يَعْبُدُ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ حَيٌّ لَايَمُوْتُ. (ابن کثیر ا/ ۴۰۹، ابن ماجہ ۱۱۷) جو محمدؐ کی پرستش کرتا تھا وہ جان لے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس دنیا سے پردہ فرما چکے ہیں، اور جو اللہ کی پرستش کرتا تھا وہ سمجھ لے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے زندہ ہے۔ اور ہمیشہ زندہ رہے گا اس کو موت نہیں آسکتی۔ یہ آواز کیا تھی، ایک صدائے ہدایت تھی جو لوگوں کے رنجیدہ دلوں میں اترتی چلی گئی۔ تاریکی کے پردے ہٹتے چلے گئے۔ انھیں اپنے نبی اور محبوب کا وہ خطبہ یاد آیا جو انھوں نے حجۃ الوداع میں دیا تھا جس میں اشارہ تھا کہ اب آئندہ حج سے پہلے پہلے رحمت عالم، رحمٰن ورحیم کی بارگاہ میں حاضری کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اور پھر ذہن میں محفوظ محبوب کی یادداشتیں یکے بعد دیگرے سامنے آنے لگیں۔ کبھی میدان بدر کا نقشہ سامنے آیا تو کبھی احد اور حنین کے واقعات نے دلوں کے جذبات بھڑکا دیے۔ کبھی آپ کی دلنواز تقریروں کے مبارک الفاظ ذہن کے پردے پر آتے تو کبھی آپ کی مجلس کے روحانی نکات دماغوں کو جھنجھوڑ دیتے، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اس دنیا سے پردہ فرما کر اپنی آخری آرام گاہ کی طرف ضرور منتقل ہو چکے تھے مگر دنیا میں آپ کی مبارک زندگی کے تابندہ نقوش آپ کے جاں نثاروں کے دلوں پر نقش تھے۔ انھوں نے ان نقوش کو سینوں اور حافظہ کے خزانوں سے منتقل کر کے الفاظ کے جامہ میں رہتی دنیا تک کے لئے نقش کر کے اپنے محبوب کی جدائی کا غم صحیح طور پر منانے کی تعلیم دی۔ اور زندگی بھر آقا کی تعلیمات کو اپنا کر اور بعد والوں کے لئے اپنے تجربات ومشاہدات کو محفوظ کر کے یہ بتا دیا کہ محبوب سے محبت کا تقاضا اور اس کی جدائی پر سچا غم کرنے کا مقتضی یہ ہے کہ محبوب کے مشن کی تکمیل کی جائے۔ اس کی تعلیمات کو عام کیا جائے، اس کے اخلاق واوصاف کو اختیار کیا جائے اس کی سنتوں کا احیاء کیا جائے، بدعت سے اجتناب اور سنت کا التزام کیا جائے۔ ناموس رسالت کی حفاظت کے لئے جان وتن کی بازی لگا دی جائے۔ سچی محبت یہی ہے۔ اور اظہار محبت کا یہی طریقہ ہے۔ (ندائے شاہی، مئی ۱۹۹۹ء)

محبت کا معیار

ربیع الاول کا موسم بہار آتا ہے تو محبوب ایزدی، سرور دو جہاں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے عاشقوں کے دلوں میں مسرت کی کلیاں چٹکتی ہیں۔ عشق و محبت کے پھول دوبارہ سرسبز و شاداب ہوتے ہیں اور ذکر محبوب کے ولولہ خیز نغموں کے ساتھ محبت کے پیمانے چھلکنے لگتے ہیں۔ اس لئے کہ ربیع الاول نے اپنے دامن میں اسلامی تاریخ کے دو ایسے واقعات کو سمو رکھا ہے جن کا تصور آتے ہی اہل ایمان کے قلوب وفور مسرت سے جھوم اٹھتے ہیں۔ پہلا واقعہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت مبارکہ کا ہے اس سے بڑھ کر تو دنیا میں کوئی خوشی ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لئے کہ آپ ہی کے وجود باجود سے ضلالت و گمراہی کے بادل چھٹے ہیں اور حقیقی فلاح یعنی جنت تک پہنچنے کا راستہ آسان ہوا ہے۔ اور دوسرا عظیم خوشی اور مسرت کا سبب مدینہ منورہ کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسی مہینہ میں ہجرت فرمانے کا واقعہ ہے۔ (بخاری شریف ۱/ ۵۵۵) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ پہنچنے پر اہل مدینہ نے آپ کا ایسا پرتپاک استقبال کیا اور اتنی مسرت کا اظہار کیا کہ تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہے۔ لہٰذا حضورؐ کی ہجرت پر خوشی تو ہونی ہی چاہئے۔ اس لئے کہ یہی ہجرت، عالمِ اسباب میں اسلام کی فتح مندی اور چار دانگ عالم میں مختصر ترین مدت میں اس کے پھیلنے کا سبب بنی ہے، بلکہ میں تو آگے بڑھ کر یہ کہتا ہوں کہ جسے حضور کی پیدائش اور ہجرت مدینہ پر خوشی نہ ہو، اسے صحیح معنی میں اپنے کو مسلمان کہنے کا بھی حق نہیں ہے۔ مگر ذرا غور فرمائیں! یہاں معاملہ محض خوشی کا نہیں، بلکہ خوشی کے اظہار کے طریقوں کا ہے۔ یعنی اگر واقعتہً ہمارے دل میں خوشی اور مسرت کے جذبات ہیں تو اپنی حرکات و اعمال سے اس کا اظہار کس طرح کیا جائے؟ بظاہر اس اظہار کے دو طریقے ہیں۔

(الف) اول یہ کہ ہم خوشی کا اظہار کرتے وقت شریعت کے احکامات اور محبوب ایزدی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں اور ہدایتوں کا خیال رکھیں۔

(ب) اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ خوشی کے نشہ میں ہم شریعت اور محبوب کے احکامات کو پس پشت ڈال دیں اور من مانے طریقہ پر کچھ اعمال انجام دے کر انھیں ہی خوشی اور محبت کی علامت سمجھ لیں۔

ہر انصاف پسند سمجھ سکتا ہے کہ محبوب کی حکم عدولی کر کے اس سے محبت اور خوشی کا دعویٰ کرنا بالکل خلافِ عقل ہے یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص مسلسل والدین کی نافرمانی کرتا رہے اور زبانی طور پر تسبیح لے کر یہ رٹ لگاتا رہے کہ ''مجھے ان دونوں سے محبت ہے، مجھے ان دونوں سے محبت ہے۔'' ظاہر ہے کہ اسے محبت کا ڈھونگ تو کہہ سکتے ہیں۔ سچی محبت کا اس سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ یہی معاملہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کا ہے۔ ایک عربی شاعر کہتا ہے:

تَعْصِیْ الْاِلٰـہَ وَتُظْہِرُ حُبَّہٗ ✹ ھٰذا لَعُمْرِیْ فِی الْقِیَّاسِ بَدِیْعُ

لَوْ کَانَ حُبُّکَ صَادِقاً لَاَطَعْتَہٗ ✹ اِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ یُّحِبُّ یُطِیْعُ

(ترجمہ) تُو اللہ کی محبت کے دعویٰ کے ساتھ اس کی نافرمانی بھی کرتا ہے۔ میری جان کی قسم یہ بات عقل کی رو سے عجیب ہے۔ اگر تیری محبت واقعی سچی ہوتی تو اللہ کی اطاعت کرتا۔ اس لئے کہ عاشق اپنے محبوب کی اطاعت کیا کرتا ہے۔

اس لئے مذکورہ دو طریقوں میں سے دوسرا طریقہ قطعاً اس قابل نہیں ہے کہ اسے خوشی کی علامت اور محبت کی نشانی بنایا جائے۔ یہ محبت نہیں، محبت کا مذاق ہے۔ اگر خوشی منانی ہے تو پہلے طریقہ پر منائی جائے اور ربیع الاول میں زیادہ سے زیادہ کوشش کی جائے کہ ہمارے محبوب ہم سے خوش ہو جائیں۔ ہماری صورت وسیرت، ہمارے اخلاق وکردار، ہمارے طور طریقے، رہن سہن اور معاشرت، محبوب کی سنتوں کے رنگ میں رنگ جائیں۔ اگر ہمیں خوشی ہے تو آج سے ہم تہیہ کر لیں کہ کبھی نماز نہ چھوڑیں گے۔ داڑھی منڈا کر محبوب کو ناراض نہ کریں گے، کسی کی حق تلفی نہ کریں گے،

وغیرہ وغیرہ۔ یہ ہیں اصل خوشی کی علامتیں! یہ خوشی کی علامت ہرگز نہیں کہ رسول کے نام پر تماشے کئے جائیں، اچھل کود کریں، نمازیں چھوڑیں اور شور مچا کر طوفان بدتمیزی مچائیں۔ ان چیزوں سے محبوب کی خوشی ہمیں حاصل نہیں ہوسکتی۔ یہ وہ جھوٹے سوانگ ہیں جنھیں شیطان نے ملمع سازی کرکے ہمارے حوالے کر دیا ہے۔

معاشرہ کی خرابی اور غیر قوموں کے اثرات سے آج ہمارا مزاج یہ بن گیا ہے کہ خوشی اور محبت کا اظہار اس وقت تک صحیح مانا ہی نہیں جاتا جب تک کہ وہ غیروں کے غیر اسلامی طریقے کے مطابق نہ کیا جائے۔ مثلاً جب تک ربیع الاول میں ڈھول تاشوں کے ساتھ میلادی جلوس میں شرکت نہ کی جائے۔ قوالی اور گانوں کی دُھنوں اور تھاپوں پر جذب میں نہ آیا جائے۔ راتوں کا چراغاں اور مجالس میلاد کا اہتمام نہ ہو اس وقت تک کسی کو ''محبّ رسول'' کا لقب ہی نہیں دیا جاتا۔ یہ صورت حال اس وقت اور سنگین ہو جاتی ہے جب شریعت کے دائرے میں رہنے والے اور غیر شرعی رسم و رواج سے اپنے دامن کو محفوظ رکھنے والے متبعینِ سنت کو ہدفِ ملامت بنایا جاتا ہے ان پر فقرے کسے جاتے ہیں اور عوام کے ذہنوں میں ان کے متعلق غلط فہمیاں پھیلائی جاتی ہیں اور اس پر اگر مصلحۃً خاموش رہیں، تو اسے ان کی کمزوری پر محمول کیا جاتا ہے۔ یہ حالات ہمارے لئے اچھے مستقبل کی علامت نہیں ہیں۔ اس لئے ارباب حل وعقد آگے آکر اپنے حلقے کے بدزبانوں کا لگام دیں۔ اور اس تقریباً یکطرفہ فتنہ انگیزی کا سلسلہ بند کرائیں۔ خیر اور امن کا راستہ یہی ہے۔

(ندائے شاہی، اگست ۱۹۹۵ء)

❍❖❍

سچی محبت کی نشانیاں

دربار نبوت سجا ہوا ہے۔ پیغمبر دو جہاں، سرورکائنات فخر دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جاں نثار صحابہ کے جھرمٹ میں اس طرح تشریف فرما ہیں جیسے ستاروں کے جھرمٹ میں دمکتا ہوا چاند ہوتا ہے۔ صحابہ کی نظریں آقا علیہ السلام کے دیدار پُر انور سے چکا چوند ہو رہی ہیں۔ ایک صحابی عبدالرحمٰن بن ابی قراد سلمیؓ روایت کرتے ہیں کہ ایسے میں ایک مرتبہ آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو فرمانے کا ارادہ کیا۔ پانی پیش کیا گیا۔ اب حضرتؐ وضو فرمانے کے لئے تشریف فرما ہو گئے۔ اور جاں نثاروں نے آپ کے گرد حلقہ بنانا شروع کر دیا۔ مجمع لگنا شروع ہو گیا۔ ہر ایک کے دل میں ایک ہی خواہش تھی کہ کاش آقا کے وضو کا پانی زمین پر گرنے کے بجائے اس کے ہاتھوں پر گرے اور وہ اس پانی کو تبرک کے بطور چہرے اور بدن پر لگا کے سینے کی دھڑکن بنا لے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جسد اطہر سے مس کر کے گرنے والے پانی کا قطرہ ان حقیقی عاشقوں کی نظر میں محض پانی کا قطرہ نہیں بلکہ اس گوہر نایاب کی جگہ میں تھا، جس کی قیمت ساری دنیا کی دولتوں سے بھی نہیں لگائی جا سکتی اور ان جاں نثاروں کا آپ علیہ السلام کے وضو کے پانی اور لعاب دہن وغیرہ کے متعلق یہ سچے جذبات کوئی ایک دو دن کے واقعات نہیں تھے۔ بلکہ انھوں نے پوری زندگی اسی عشق و محبت کا ثبوت دیا ہے۔ عروہ بن مسعود ثقفیؓ جو حدیبیہ کے موقع پر مشرکین اور مسلمانوں کے مابین ثالثی کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ انھوں نے اس وقت آقا کی مجلس کا جو نظارہ دیکھا وہ جا کر مشرکوں کے سامنے بیان کیا۔ خود انھیں کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے:

اَیْ قَوْمِ! وَاللّٰہِ لَقَدْ وَفَدْتُ عَلَی الْمُلُوْکِ وَوَفَدْتُ عَلٰی قَیْصَرَ وَ کِسْرٰی وَ النَّجَاشِیِّ وَاللّٰہِ اِنّ رَأَیْتُ مَلِکاً قَطُّ یُعَظِّمُہٗ اَصْحَابُہٗ کَمَا یُعَظِّمُ اَصْحَابُ مُحَمَّدٍ

مُحَمَّداً وَاللّٰهِ اِنْ تَنَخَّمَ نُخَامَةً اِلَّا وَقَعَتْ فِیْ کَفِّ رَجُلٍ مِّنْهُمْ فَدَلَكَ بِهَا وَجْهَهٗ وَجِلْدَهٗ وَاِذَا اَمَرَهُمْ اِبْتَدَرُوْا اَمْرَهٗ وَاِذَا تَوَضَّا کَادُوْا یَقْتَتِلُوْنَ عَلٰی وَضُوْئِهٖ وَاِذَا تَکَلَّمَ خَفَضُوْا اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَهٗ وَمَایُحِدُّوْنَ اِلَیْهِ النَّظَرَ تَعْظِیْمًا لَهٗ. (بخاری شریف ۱/۳۷۹)

''اے لوگو ! اللہ کی قسم میں بادشاہوں کے دربار میں گیا ہوں ۔ میں قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے دربار میں بھی گیا ہوں (مگر) بخدا میں نے کبھی کہیں کسی بھی بادشاہ کو ایسا نہیں دیکھا کہ اس کے درباری اس کی اتنی قدر اور عزت کرتے ہیں۔ جتنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عظمت کرتے ہیں۔ قسم بخدا ! محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا تھوک ان میں سے کسی آدمی کے ہاتھ پر ہی گرتا ہے جسے وہ اپنے چہرہ اور بدن پر لگا لیتا ہے۔ اور جب آپ ان کو کوئی حکم کرتے ہیں تو وہ اس کو بجالانے میں جلدی کرتے ہیں اور جب آپ وضو فرماتے ہیں تو آپ کے وضو کے مستعمل پانی کو لینے کے لئے ان میں جھگڑا سا ہونے لگتا ہے اور جب آپ گفتگو فرماتے ہیں تو وہ آپ کے دربار میں اپنی آوازیں پست کر لیتے ہیں اور حد تو یہ ہے کہ آپ کی انتہائی عظمت کی بنا پر وہ آپ کی طرف نظر بھر کر بھی نہیں دیکھتے''۔

الغرض عبدالرحمٰن بن ابی قرادؓ فرماتے ہیں کہ آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے وضو فرمانا شروع کر دیا اور حضرات صحابہؓ وضو کے پانی کے قطرات کو ہاتھوں میں لینے لگے۔ اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ تَوَضَّا یَوْمًا فَجَعَلَ اَصْحَابُهٗ یَتَمَسَّحُوْنَ بِوَضُوْئِهٖ. یہ منظر دیکھ کر کسی کچے پکے آدمی کے دل میں عجب پیدا ہوسکتا تھا کہ ہمارے مرید ہمارے کتنے عقیدت مند ہیں۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سرچشمۂ ہدایت تھی۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے مربی امت بنا کر بھیجا تھا۔ آپ نے محض صحابہؓ کے اس عمل پر نہ تو زیادہ مسرت کا اظہار کیا اور نہ ہی اس پر اکتفا فرمانے کی تلقین کی۔ بلکہ سوال کیا مَایَحْمِلُکُمْ عَلٰی هٰذَا ؟ یعنی تمھیں اس عمل پر کسی چیز نے آمادہ کیا۔ حضرات صحابہؓ نے جو سچی بات تھی وہ عرض کر دی کہ حبُّ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ، یعنی ہمارے اس عمل کا منشا محبت خدا اور رسولؐ کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ گویا کہ یہ عمل ہماری اس دلی محبت کا آئینہ دار ہے جس سے

ہمارے بدن کا رواں رواں سرشار ہے اور ہمارے پاس اپنی زندگی کا یہی سب سے بڑا سرمایہ ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات صحابہؓ کے اس جواب پر سکوت نہیں فرمایا بلکہ ان کے توسط سے امت مرحومہ کو ایسی عظیم نصیحتیں فرمائیں جو ابد تک کے لئے واقعی مشعل راہ بن گئیں۔ آپ کی زبان مبارک سے ارشاد ہوا۔

مَنْ سَرَّهُ اَنْ يُّحِبَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهُ اَوْ يُحِبُّهُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ فَلْيَصْدُقْ فِيْ حَدِيْثِهٖ اِذَا حَدَّثَ وَلْيُؤَدِّ اَمَانَتَهُ اِذَا اُؤْتُمِنَ وَلْيُحْسِنْ جِوَارَ مَنْ جَاوَرَهُ. (مشکوٰۃ ۲/۴۲۴)

جسے یہ پسند خاطر ہو کہ وہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرے یا وہ خدا اور اس کے رسول کا محبوب بن جائے تو وہ (۱) جب بولے سچ بولے۔ (۲) اور جب اسے امین بنایا جائے تو اپنی امانت ادا کرے۔ (۳) اور اپنے پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کرے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بتا دیا کہ محبت میں صرف زبانی جمع خرچ اور دنیا کی رسموں کا دراصل اعتبار نہیں بلکہ حقیقی محبت اور محبوبیت کا مقام حاصل کرنے کے لئے تین کام کرنے ضروری ہیں:

(۱) سچ بولنا یعنی زبان کو جھوٹ اور اس کے شائبہ سے محفوظ رکھنا۔ اسی طرح زبان سے صادر ہونے والے تمام گناہوں، غیبت، چغلی گالم گلوچ وغیرہ سے بچتے رہنا، قرآن کریم اور احادیث طیبہ میں زبان کی حفاظت کی نہایت تاکید فرمائی گئی ہے۔ اس لئے محبت خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اولین تقاضا یہ ہے کہ آدمی اپنی زبان کو قابو میں رکھے۔ سچائی اختیار کئے بغیر محبت کا حق ادا ہی نہیں ہوسکتا۔ جس شخص کو آپ دیکھیں کہ وہ محبت کا دعویٰ تو خوب کرتا ہے مگر اس کی زبان جھوٹ بولنے اور دیگر زبان کے معاصی سے محفوظ نہیں ہے تو سمجھ لینا چاہئے کہ وہ محبت کے دعوے میں سچا نہیں ہے۔

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے محبت کی دوسری نشانی یہ بیان فرمائی کہ آدمی اپنی امانت کو پوری طرح ادا کرے۔ یہ امانت خواہ کسی شخص نے محسوس طور پر رکھوائی ہو اس کی بھی پوری

طرح ادائیگی ضروری ہے۔ اسی طرح جو ذمہ داریاں انسان پر اللہ ربّ العزت یا بندوں کی طرف سے عائد کی جاتی ہیں۔ وہ سب بھی امانت ہیں۔ ان کی بھی مکمل ادائیگی محبت خدا و رسول کا اہم تقاضا ہے۔ نمازوں کی ادائیگی، زکوٰۃ کا اہتمام، روزوں کی پابندی اور استطاعت کے وقت حج کے فریضہ سے سبکدوش یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ ذمہ داریوں کی ادائیگی کی مثالیں ہیں۔ جبکہ زوجین کا ایک دوسرے کے حقوق کو ادا کرنا والدین اور اولاد کے باہمی حقوق کی رعایت مالک و ملازم کے باہمی حقوق، عوامی ذمہ داریاں، انجمنوں دینی اداروں، مساجد و مدارس وغیرہ کے انتظامی امور، یہ سب بندوں کی امانتوں کے قبیل سے ہیں جن کی ادائیگی کامل طور پر لازم اور ضروری ہے۔ اور ان ذمہ داریوں کی ادائیگی کے بغیر محبت میں کمال حاصل ہو ہی نہیں سکتا۔

آج جو لوگ جلسوں اور عام مجلسوں میں محبت رسولؐ اور محبت خدا کا دعویٰ کرتے نہیں تھکتے۔ انھی کی زندگی کتنے حقوق کے بوجھ میں دبی ہوئی ہے۔ اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ آج ہر شخص عموماً صرف اپنا مفاد پیش نظر رکھتا ہے۔ مالک یہ سوچتا ہے کہ ملازم کا جتنا استحصال کرلیا جائے اچھا ہے۔ ملازم اس فکر میں رہتا ہے کہ ڈیوٹی پوری ہو یا نہ ہو مجھے پوری سہولیات ملنی چاہئیں۔ الغرض ہر طرف مفاد پرستی کا رجحان غالب ہے۔ یہ صورتحال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ارشاد کے مطابق محبت کے تقاضے کے منافی ہے۔ اگر ہم سچے محبّ رسول ہیں اور محبّ خدا بننا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کی حتی الامکان کوشش کرنی چاہیے۔

(۳) پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا۔ یہ حکم بھی اگرچہ امانت کی ادائیگی کے ضمن میں معلوم ہورہا تھا۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اہتمام کی بنیاد پر الگ سے ذکر فرمایا۔ اس معاملہ میں بھی آج ہمارے معاشرہ میں کوتاہی عام ہے۔ کچھ مزاج اس طرح کا ہوگیا ہے کہ سارے شہر والوں سے دوستی ہوجائے گی لیکن اپنے پڑوسی سے کچھ نہ کچھ تنازعہ ہر

جگہ کھڑا رہتا ہے۔ اور پڑوسی ہی پڑوسی کی بدخواہی میں لگے رہتے ہیں۔ محلّہ میں کسی کو کوئی نعمت نصیب ہو جائے تو آس پاس کے لوگ خواہ مخواہ اس سے حسد کرنے لگتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کی شکایت کا بازار گرم رہتا ہے۔ اچھے اچھے دیندار لوگ بھی اس معاملہ میں لاپرواہی کرتے نظر آتے ہیں۔ محض پرنالے اور نالی نکالنے کے معاملے پر سالہا سال مقدمہ بازی ہوتی رہتی ہے۔ یہ چیزیں انتہائی تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے کی ضرورت کا خیال رکھنا۔ دکھ درد میں شریک رہنا شریف لوگوں کا شیوہ ہے۔ اور محبت رسول و خدا کی عظیم نشانی ہے۔ اس لئے ہمیں اپنے اندر عفو درگذر کا جذبہ پیدا کرکے سچے عشق و محبت کے مقام تک پہنچنے کی سعی کرنی چاہئے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہدایت پر استقامت عطا فرمائے اور بدعات و رسومات اور بے اصل اور من گھڑت خرافات سے پوری طرح بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

(ندائے شاہی، مئی ۱۹۹۹ء)

سنّت کا اہتمام

امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے کون واقف نہیں؟ اسلامی ہی نہیں بلکہ انسانی تاریخ میں ان کا دور حکومت سنہرے حروف سے منقوش ہے، تصلب فی الدین، اتباع سنت میں شدت، نواہی اور منکرات سے نفرت، حق کی حمایت اور باطل سے بغض آپ کی خاص صفات ہیں۔ وفات سے دو تین دن قبل آپ فجر کی نماز پڑھانے کے لئے مسجد میں تشریف لائے ابھی نماز شروع ہی فرمائی تھی کہ ایک مجوسی غلام ابولولو نے زہر میں بجھے ہوئے خنجر سے آپ پر قاتلانہ حملہ کیا۔ آپ گر پڑے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے نماز پوری کرائی۔ نماز کے بعد آپ کو گھر لایا گیا۔ پیٹ میں شدید زخم تھے، خون برابر جاری تھا کچھ غذا دی جاتی تو وہ معدہ میں جانے کے بجائے پیٹ سے باہر نکل آتی۔ سارے مدینہ میں کہرام تھا، لوگوں میں ایک عجیب اضطراب تھا، ناامیدی اور مایوسی کے بادل چھائے ہوئے تھے، لوگ آخری ملاقات کی غرض سے امیر المومنین کی خدمت میں آتے اور ان کے سامنے ہی ان کو خراج عقیدت اور ان کی شاندار اسلامی اور ملکی خدمات پر ہدیۂ تحسین پیش کرتے تھے۔ انہی میں ایک جوان شخص بھی سامنے آیا اور اس نے ان الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا: ”امیر المومنین! بشارت قبول فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کے شرف سے نوازا، پھر آپ کو اسلام میں قدامت نصیب ہوئی، اسی طرح آپ خلیفہ بنائے گئے اور آپ نے عدل و انصاف کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں کو پورا کیا، اس کے بعد اب آپ کو شہادت نصیب ہو رہی ہے۔ حضرت عمرؓ نے یہ سن کر نہایت جذباتی انداز میں جواب دیا کہ: ”میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ یہ سب شرافتیں میرے لئے برابر سرابر ہو جائیں، نہ مجھے کچھ نقصان ہو نہ

فائدہ'' اس کے بعد وہ جوان شخص واپس ہوا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ اس کا تہبند ٹخنوں سے نیچے ہے فرمایا کہ اس شخص کو واپس بلاؤ جب وہ آ گیا تو آپ نے فرمایا **اِبْنَ اَخِیْ اِرْفَعْ ثَوْبَكَ فَاِنَّهُ اَنْقَی لِثَوْبِكَ وَاَتْقیٰ لِرَبِّكَ**، میاں بھتیجے! اپنا کپڑا (ٹخنوں سے) اوپر رکھا کرو کہ اس سے تمھارا کپڑا بھی پاک صاف رہے گا اور تمھارے رب کے لئے تقویٰ کا بھی ذریعہ ہوگا۔ (بخاری شریف ۱/۵۲۴)

ذرا غور کیجیے! انتہائی شدتِ تکلیف کا موقع جبکہ انسان کو اپنی خبر بھی نہیں رہتی، پیٹ سے خون جاری ہے، ضعف و نقاہت اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے، اس کے باوجود نہی عن المنکر اور ایک سنت کی پامالی پر انکار کا یہ جذبہ، قربان جایئے اس جذبہ پر، قربان جایئے اس نصیحت پر! اور پھر اپنی حالت پر غور کیجیے کہ اس سنت کی پامالی آج ہم کس طرح اپنے ہاتھوں سے کر رہے ہیں اور تعجب یہ ہے کہ ہمیں قطعاً پامالی کا احساس نہیں، مغربی لباس، مغربی ذہنیت اور مغربی تہذیب نے ہمارے ذہنوں کو مغلوب کر دیا ہے۔ ہمارا فکر اپنے دشمنوں کے تابع ہو گیا ہے حالاں کہ **الاسلام یعلو ولَا یُعْلیٰ** کے قاعدے سے اور دینی حمیت و محبت کے تقاضہ کی بنیاد پر پہلے ہمارے سامنے اسلام اور اسلامی تعلیمات رہنی چاہئیں اور اسی کو بنیاد بنا کر اسی کسوٹی پر پورا اترنے والی تہذیب کو قبول کرنا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اتباع سنت کی توفیق سے نوازیں۔ آمین۔

(ندائے شاہی، جولائی ۱۹۹۳ء)

○❖○

قوتِ عمل کی ضرورت

دمشق کے ایک معروف اشاعتی ادارہ ''دارابن کثیر'' نے دنیا کے بلند پایہ علماء کے تعارف پر کتابیں شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔اس کے پانچویں جز کی اشاعت ۱۹۹۸ء میں ہوئی جس میں ۳۷۵ صفحات میں سید عبدالماجد غوری کی ترتیب دادہ حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح شائع کی گئی ہے۔اس کتاب کے مقدمہ میں دمشق یونیورسٹی کے شعبہ دینیات کے سابق سربراہ ڈاکٹر مصطفیٰ سعید الحق نے مولانا علی میاں کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ مولانا موصوف جب ۱۹۵۶ء میں دمشق یونیورسٹی کی دعوت پر ''رجال الفکر والدعوۃ'' کے موضوع پر محاضرات پیش کرنے کے لئے دمشق تشریف لائے تو یونیورسٹی کی طرف سے ایک نہایت شاندار ہوٹل میں آپ کے قیام کا نظم کیا گیا۔مگر آپ نے یونیورسٹی کی اس پیشکش کو قبول نہیں کیا بلکہ سادگی اور تواضع کے ساتھ ایک مسجد کے حجرہ میں قیام پسند فرمایا۔تاکہ عبادت والا ماحول میسر رہے۔اور پھر اس شان سے محاضرات پیش کئے کہ پورے ملک میں دھوم مچ گئی۔ان محاضرات کی کامیابی میں مولانا مرحوم کی انابت الی اللہ کو بڑا دخل تھا۔

ڈاکٹر مصطفیٰ سعید نے اسی ضمن میں شام کے مشہور ترین داعی اور مصلحِ قوم شیخ علی الدقر رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ لکھا ہے کہ شیخ موصوف روزانہ صبح کو نماز فجر کے بعد ایک مسجد میں درس دیتے تھے۔یہ مسجد اگرچہ زیادہ بڑی نہیں تھی لیکن حاضرین سے کھچا کھچ بھر جاتی تھی۔لوگ صبح صبح دور دراز سے آپ کا درس سننے آتے تھے اور جب مسجد تنگ پڑ جاتی تو سڑکوں پر چٹائیاں بچھا کر درس سنا کرتے تھے اور اگرچہ دور تک شیخ کی آواز نہ پہنچ پاتی پھر بھی لوگ صرف شیخ کی زیارت کرنے ہی کو باعث

سعادت سمجھتے تھے۔ اور درس کی تاثیر کا عالم یہ ہوتا کہ شرکاء مجلس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب شدت تاثر سے رواں رہتا۔

ڈاکٹر مصطفیٰ سعید کہتے ہیں کہ میں نے اپنی زندگی میں کسی کی مجلس میں ایسی تاثیر نہیں دیکھی، ایک مرتبہ شیخ علی الدقر رحمۃ اللہ علیہ کے ایک شاگرد نے شیخ سے سوال کیا کہ ہم لوگوں کے سامنے طرح طرح کے علوم بیان کرتے ہیں اور بدل بدل کر مختلف مضامین انھیں سناتے رہتے ہیں۔ مگر نہ تو ہم سامعین میں وہ تاثیر پاتے ہیں جو آپ کے درس میں نظر آتی ہے اور نہ ہی ہماری طرف لوگوں کا وہ رجوع ہوتا ہے جو آپ کے درس کی طرف ہے۔ حالانکہ ہم بھی قرآن حدیث اور تفسیر ہی کی باتیں کرتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ اس پر شیخ نے جو جواب دیا وہ واعظین کے لئے ایک عظیم درسِ عبرت اور لمحۂ فکریہ ہے۔ شیخ نے فرمایا:

> ''پیارے بیٹے! آج ضرورت نہ ہوتی تو میں کبھی اس راز کو نہ کھولتا۔ بات یہ ہے کہ یہ درس جو تم روز سنتے ہو اس کی پشت پر قرآن کریم کے ان دس پاروں کی طاقت ہے جو روزانہ فجر کی نماز سے پہلے میں اس ارادہ اور نیت سے تلاوت کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل وکرم سے اس درس کو مسلمانوں کے لئے نفع بخش بنادے اور میری زبان میں اثر پیدا کردے''۔ (ابوالحسن علی الحسنی الندوی ۱۱-۱۳)

اس واقعہ سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ اصلاح امت کے لئے مصلح کے اندر عمل کی بھرپور طاقت اور خلق خدا کی خدمت کا سچا جذبہ ہونا ضروری ہے۔ تاریخ وسیر اور مصلحینِ امت کی سوانح پڑھنے سے یہ بات بخوبی عیاں ہوتی ہے کہ جو داعی بھی عمومی دعوت لے کر اٹھا ہے۔ اور اس کی دعوت میں ہمہ گیری آئی ہے وہ عمل اور ذوق عبادت اور جذبۂ خدمت کے اعتبار سے امتیازی مقام پر فائز تھا۔ اسی کثرت عبادت نے اس کے زبان وقلم میں وہ تاثیر پیدا کی کہ نہ صرف زندگی میں بلکہ وفات کے بعد بھی اس کا فیض محسوس طور پر جاری رہا۔ ایسے مصلحین کی زبان سے نکلنے والے چند سادے اور بے ربط کلمات بھی ایسا اثر رکھتے ہیں کہ بڑے بڑے فصحاء اور بلغاء کی لمبی لمبی لچھے دار تقریروں میں بھی وہ تاثیر نہیں ہوتی۔ امام ربانی قطبِ عالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا واقعہ مشہور ہے کہ دیوبند کی جامع مسجد میں ایک معمولی سی کتاب لے کر تقریر شروع کردی اور درمیان

میں کسی مناسبت سے ''اللہ'' ایسے سوز و گداز سے کہا کہ پورا مجمع بے قابو ہو گیا اور درو دیوار ذکر خداوندی سے گونج گئے۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے درس حدیث کے شرکاء بتاتے ہیں کہ جس وقت آپ مسند حدیث پر تشریف فرما ہوتے تو روحانیت کا ایک سیلاب ہوتا تھا کہ الفاظ اس کیفیت کو بیان کرنے سے قاصر ہیں اور قریبی دور کے بزرگوں میں راقم الحروف نے عارف باللہ حضرت اقدس مولانا قاری سید صدیق احمد باندوی رحمۃ اللہ علیہ کے سادہ الفاظ میں یہ تاثیر خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کی۔ آپ کی تقریر میں سادگی کے باوجود بلا کی تاثیر ہوتی تھی۔ اور بہت سے سامعین کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو رواں رہتے تھے۔ یہ تاثیر ان اکابر کے قوت عمل اور مجاہدہ کی تھی۔

یاد رکھنا چاہئے کہ محض مضامین بیان کرنا، نادر و نایاب علوم اور نوادرات کی بارش کر دینا، یا لطائف و قصص کے ذریعہ سامعین کے دلوں کو موہ لینا اور انھیں واہ واہ پر مجبور کر دینا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ قوت عمل اور ذوق عبادت کی بنا پر ہی تعلق اللہ تعالیٰ سے اتنا قوی اور مضبوط ہو کہ اس کی طرف سے تاثیر اور حکمت کے دروازے کھل جائیں اور ہماری ذات سے اللہ تعالیٰ دین کی اشاعت و حفاظت کا کام لے لے۔ اس لئے اس ضروری اور اہم نکتہ کی طرف پوری توجہ اور سنجیدگی کے ساتھ دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ آج ہمارے پاس علوم اور معلومات کا تو انبار ہے لیکن علم کی روح کا فقدان ہے۔ اسی بنا پر تاثیر عنقاء ہے۔ اصلاح کی تحریکات انفرادی اور اجتماعی طور پر جاری ضرور ہیں لیکن ان تحریکوں کی کامیابی کے لئے جو شرائط ناگزیر ہیں، ان کی طرف سے بے توجہی عام ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ خدام دین، علماء کرام اور داعیان قوم و ملت کا رابطہ اللہ ربّ العزت کے ساتھ مضبوط ہو۔ عمل اور عبادت کی قوت سے پوری طرح لیس ہو کر وہ میدان عمل میں آئیں تو امید ہے کہ اس پُرفتن اور شر انگیز دور میں ان کی کوششیں رنگ لائیں گی۔ اور ہدایت کے لئے فضا ساز گار ہو گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ، اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی رضاء کامل سے نواز دے اور اپنے دین کی خدمت کے لئے قبول فرمائے۔ آمین۔

(ندائے شاہی، مارچ ۲۰۰۰ء)

❍❖❍

مایوسی کفر ہے

آج ہر طرف یہی سوال ہے کہ آخر ساری دنیا میں ذلت ورسوائی مسلمانوں کا مقدر کیوں بن گئی ہے؟ اس سوال پر اگر دشمنان اسلام بغلیں بجاتے ہیں تو سچے پکے مسلمان بھی شکوک وشبہات میں مبتلا ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ ایک تہائی دنیا پر مسلم حکومتیں قائم ہونے کے باوجود عالمی برادری میں ان کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز بن کر رہ جاتی ہے۔ اور جدھر نظر اٹھایئے اسلام اور اس کے پیروکاروں کے خلاف ظلم وتشدد کا بازار گرم دکھائی دیتا ہے۔ بوسنیا ہو یا فلسطین، صومالیہ ہو یا برما، اسی طرح ہندوستان ہو یا سری لنکا ہر جگہ اسلام دشمنی کی تحریکیں پنجے گاڑتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اور اگر یہ مسلمانوں کی بداعمالی کی سزا ہے تو کفار اس مصیبت میں کیوں گرفتار نہیں؟ کیا وہ مسلمانوں سے کم گنہگار ہیں؟ اور کیا وہ اپنے کفر وشرک کے باوجود مستحق عذاب نہیں ہیں؟

یہ عبارت دراصل ایک عام مسلمان کے جذبات کی ترجمانی کرتی ہے جو انہی خیالات میں الجھ کر اپنا سکون واطمینان کھو بیٹھتا ہے اور بالآخر فکر کی ایسی کھائی میں پہنچ جاتا ہے جہاں سے نکلنے کے لئے وہ کوئی راستہ نہیں پاتا۔ تو آیئے ہم اس کھائی سے نکلنے کے لئے اس نور ہدایت، پیغمبر آخرالزماں، سرور کائنات فخر دوعالم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات عالیہ سے روشنی حاصل کریں جس کی روشنی امت مسلمہ کے لئے ہر جگہ اور ہر زمانہ میں مشعل راہ اور کامیابی کی ضمانت ہے۔ حدیث کی کتابوں کو پلٹئے۔ اور تعلیمات محمدیہ کی ورق گردانی کیجیے۔ ایک جگہ آپ دیکھیں گے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کچھ اسی طرح کے پُر آشوب اور پر خطر موقع پر اپنی امت کو ڈھارس بندھانے کے لئے ارشاد فرمارہے ہیں:

أُمَّتِيْ هٰذِهٖ أُمَّةٌ مَرْحُوْمَةٌ لَيْسَ عَلَيْهَا عَذَابٌ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابُهَا فِي الدُّنْيَا الزَّلَازِلُ وَ الْفِتَنُ وَالْقَتْلُ. (رواہ ابوداؤد ۲/ ۵۸، حدیث ۴۲۷۸، مظاہر حق ص ۳۰۵)

یعنی یہ میری (پیروی کرنے والی) امت رحمت خداوندی کی (سب سے زیادہ) مستحق ہے۔ اس پر آخرت میں (سخت) عذاب نہیں۔ (ہاں) دنیا میں اس کے برے اعمال کی سزا (طرح طرح کے) فتنوں، زلزلوں اور قتل وقتال کی صورت میں دی جائے گی۔

یہ حدیث صحیح معنی میں ایک مسلمان کے لئے اطمینان قلب اور روحانی سکون کا ذریعہ ہے۔ کیونکہ اس میں بشارت دی گئی ہے کہ مسلمانوں کو جن مصائب میں دنیا میں مبتلا کیا جاتا ہے۔ یہ بھی دراصل مقتضائے رحمت خداوندی ہے اس لئے کہ یہ دنیوی عارضی تکلیفیں آخرت کے عذاب کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اور حدیث یہ بھی بتاتی ہے کہ کفار کے لئے عیش وعشرت کی جگہ بس یہ دنیا ہے اس کے بعد انھیں کوئی چیز عذاب خداوندی سے نہیں بچا سکتی جو ان کے لئے ہمیشہ ہمیش کے لئے مقدر کر دیا گیا ہے۔ نیز حدیث سے یہ تنبیہ بھی مستفاد ہوتی ہے کہ اگر امت مرحومہ دنیوی عذاب سے بچنا چاہتی ہے تو اسے ان گناہوں اور جرائم سے بچنا ہوگا جن کی ممانعت قرآن و حدیث میں مذکور ہے۔

لہٰذا اگر موجودہ مایوس کن صورتحال کو مسلمانوں کے لئے اللہ ربّ العزت کی جانب سے تنبیہ و تذکیر کا عنوان قرار دیا جائے تو یہ اس موقع پر اسلامی تعلیم کی صحیح عکاسی کہلائے گی۔

اس شرعی تناظر کی روشنی میں گذشتہ ۶؍دسمبر ۱۹۹۲ء اجودھیا میں بابری مسجد کی بے دردی کے ساتھ شہادت کا سانحہ اگر ایک طرف مسلمانانِ ہند کے لئے آزادی کے بعد سے اب تک کا سب سے بڑا صدمہ اور المناک حادثہ ہے تو دوسری طرف اسے دینی بیداری، دفاعی تیاری اور قومی اتحاد کی ضرورت اجاگر کرنے کا پیغام بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح مسجد کی شہادت کے بعد پورے ملک میں اسلام کے نام لیواؤں کی منظّم نسل کشی کا جو وحشیانہ منصوبہ بروئے کار لایا گیا ہے اس نے جہاں ہمارے دشمنوں کو دنیا کے سامنے ننگا کر دیا ہے۔ وہیں خود ہمیں غور وفکر کی دعوت بھی دی ہے کہ اب اس ملک میں باعزت زندگی گذارنے اور اسلامی تشخص برقرار رکھنے کے لئے پھر ہمیں قرآن و

حدیث سے روشنی حاصل کرنی ہوگی، ذاتی مفادات کو بالائے طاق رکھ کر قوم وملت کی بقا کے لئے مخلصانہ جدوجہد کی ضرورت ہوگی، اور ایسا اسلامی معاشرہ تشکیل دینا ہوگا جو سخت سے سخت حالات میں بھی کسی طرح مذہب اور دین کا دامن چھوڑنے پر تیار نہ ہو۔

اگر ہم آج ہوش سے کام لے کر موجودہ واقعات کے دیئے ہوئے پیغام اور دعوت عمل پر لبیک کہیں تو واقعہ یہ ہے کہ اجودھیا میں جنونی تنگ نظر اور متعصب ہندوؤں کے ہاتھوں پانچ سو سالہ بابری مسجد کا انہدام اور اس کی جگہ پر مندر کے قیام کا واقعہ نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے ایشیا میں احیاء اسلام کا مؤثر ذریعہ بن سکتا ہے۔

آج اگر امن وامان کا قیام وقت کی اولین ضرورت ہے تو دوسری طرف اپنے اندر سے مایوسی مٹا کر جذبۂ عمل پیدا کرنا بھی دینی حمیت کا تقاضا ہے۔ اس لئے کہ اسلام کے ساتھ مایوسی کا کوئی جوڑ نہیں۔ حالات سے دل برداشتہ ہوکر عمل چھوڑ دینا عقلمندوں کا شیوہ نہیں۔ اسی طرح غیروں کے خوف سے متاثر ہوکر اپنے جائز حقوق سے دستبرداری بھی کسی طرح مناسب نہیں۔ اس لئے کہ آج اگر ہم خوشی سے اپنا کوئی آئینی حق چھوڑتے ہیں تو آئندہ ہمیں دسیوں حقوق سے دستبرداری پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔ بریں بنا موجودہ صورت حال میں جو حضرات بابری مسجد کی جگہ سے مسلمانوں کو دستبردار ہونے اور اپنا حق چھوڑ دینے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ وہ غالباً اس حقیقت سے غافل ہیں کہ ہمارا ''ایثار'' کل بیشمار مساجد اور دینی شعائر سے دستبرداری کے لئے نظیر بن سکتا ہے۔ اس لئے ہمارا یہ مطالبہ برقرار رہنا چاہئے کہ:

> ''مسجد ہمارا حق ہے ہم اس سے ہٹ کر کوئی صلح نہیں کر سکتے اور نہ ہمیں شرعی طور پر مسجد کے بارے میں اپنی جانب سے صلح کا اختیار ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ حکومت عدل و انصاف کے تقاضے بالائے طاق رکھ کر ہمیں اپنے جائز حق سے محروم رکھے۔''

یہ وقت ہمارے لئے نہایت ہوشمندی سے کام لینے کا ہے۔ نہ تو ہمیں مایوسی کا شکار ہوکر اپنا حق چھوڑنا چاہئے اور نہ ہی ضرورت سے زیادہ جذبات میں آکر امن وامان کے بگاڑنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اسلامی تعلیمات کا تقاضا یہی ہے۔

اس موقع پر علماء ملت اور مذہبی قائدین کا بھی یہ فرض بنتا ہے کہ وہ اس نازک وقت میں سامنے آئیں اور اپنی پوری توجہ قوم کی دینی بیداری میں لگادیں۔ اس وقت لوگوں کے دل نرم ہیں۔ نصیحت کی باتیں ان پر نسبتاً زیادہ اثر انداز ہوسکتی ہیں۔ ضرورت ہے کہ حضرات علماء مساجد اور دینی مراکز میں جا کر عوام سے ربط قائم کریں اور اسلامی تعلیمات سے انھیں روشناس کرائیں ساتھ میں انھیں امن و امان اور بھائی چارگی کی تلقین اور قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے خود حفاظتی تیاریوں کی جانب بھی متوجہ کریں۔ علماء کی تھوڑی سی توجہ اس زمانہ میں بڑی کامیابی کا سبب بن سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اخلاص کے ساتھ دینی خدمات کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین۔

(ندائے شاہی، جنوری ۱۹۹۳ء)

یہ تضاد کیوں؟

''مسلمان اپنے دین کے بارے میں بہت جذباتی ہوتے ہیں'' یہ بات کسی حد تک شاید درست ہو،لیکن واقعاتی اور عملی زندگی میں آج ہمارا ۹۵ فیصدی معاشرہ اس تبصرہ کے خلافِ واقعہ ہونے کے دلائل مہیا کرتا ہے۔دین کے متعلق ہماری جذباتی زندگی محض زبانی جمع خرچ اور وقتی شور شرابے تک محدود ہوکر رہ جاتی ہے جب عمل کا وقت آتا ہے اور دنیوی مفادات دینی جذبہ سے ٹکراتے ہیں تو اکثر ہمارا مذہبی جذبہ مغلوب اور دنیوی منافع غالب آجاتے ہیں۔اس افسوسناک صورتحال کی نشاندہی کے لئے زیادہ مثالیں پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہر آدمی خود اپنی زندگی میں اس جذباتی تضاد کا مشاہدہ کرسکتا ہے۔تاہم یہ تضاد بالفاظ دیگر نفاق، خاص کر درج ذیل مواقع پر دیکھنے میں آتا ہے۔

(الف) رشتہ داری،قرابت داری یا کسی بھی قسم کا دوسرے سے تعلق غیر کے مقابلہ میں جذباتی فرق پیدا کردیتا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی اجنبی شخص دین کے خلاف کوئی حرکت کرے تو ہمارے جذبات کچھ اور قسم کے ہوتے ہیں اور وہی خلاف شرع کام اگر اپنا کوئی عزیز اور قریب کرتا ہے تو ہمارے جذبات کا انداز کچھ اور ہوجاتا ہے۔

(ب) وقتی افتاد اور مصیبت ہمارے جذبات میں تلاطم خیزی کا موجب بنتی ہے مگر مصیبت ٹل جانے کے بعد ہمارے دینی جذبات سرد پڑجاتے ہیں اور ان میں سرگرمی اور پُر جوشی برقرار نہیں رہتی اس کا مشاہدہ عموماً ہماری زندگی میں ہوتا رہتا ہے مثلاً جب فرقہ وارانہ فسادات ہوتے ہیں یا کوئی اور آسمانی آفت یا عذاب نازل ہوتا ہے تو مذہب کی دُہائیاں

دی جاتی ہیں، مساجد آباد ہو جاتی ہیں، دین کے نعرے بلند ہونے لگتے ہیں۔ مگر جہاں امن و امان قائم ہوا پھر وہی غفلت کوشی اور کوتاہی کی ریت لوٹ آتی ہے۔

(ج) حکومت اگر کسی دینی مسئلہ میں ناحق خلل اندازی کرے یا ہمارے کسی شرعی حق پر پابندی لگائے تو ہمارے مذہبی جذبات بجا طور اس قدر برانگیختہ ہو جاتے ہیں کہ ہم جان کی پروا کئے بغیر شریعت کے تحفظ کے لئے سربکف میدان میں نکل آتے ہیں اور ایسا ہونا بھی چاہئے، لیکن آج ہمارے گھروں میں برسر عام شریعت کے احکام سے روگردانی ہوتی ہے، تقریبات میں کھلم کھلا شریعت کی خلاف ورزیاں کی جاتی ہیں، اسی طرح بہت سے لوگ مساجد و اوقاف کی جائدادیں اور املاک خرد برد کرنے کے مرتکب ہوتے ہیں لیکن ان باتوں کو دیکھ کر ہمیں احساس تک نہیں ہوتا۔

(د) پیغمبر اسلام سرور کائنات فخر دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہماری جذباتی وابستگی کا حال یہ ہے کہ آپ کی شان اقدس میں ادنیٰ سی گستاخی کرنے والا تو ہماری نظر میں بجا طور پر واجب القتل قرار پاتا ہے لیکن ہم جب خود ہی اپنے ہاتھوں سے آپ کی شان والا صفات میں گستاخیاں اور دل آزاریاں کرتے ہیں تو آپ سے ہماری جذباتی وابستگی محض ڈھونگ بن کر رہ جاتی ہے اس کی واضح مثالیں سر سے پیر تک آج ہم میں پائی جاتی ہیں۔ محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بلند و بالا دعوؤں کے باوجود پوری ڈھٹائی کے ساتھ داڑھی منڈوانا، انگریزی بال رکھنا، ننگے سر رہنا، کھڑے کھڑے یا چلتے پھرتے کھانا پینا کھڑے ہو کر پیشاب کرنا اور غیر مسنون وضع قطع اختیار کرنا جیسے اعمال اسی جذباتی تضاد کی نشاندہی کرتے ہیں۔

اور یہ تو چند مثالیں ہیں ورنہ دیکھا جائے تو زندگی کے ہر موڑ پر ہم اس تضاد دردی کے شکار ہیں اور قوم کے ہر طبقہ میں یہ مرض پایا جاتا ہے اور یہی تضاد آج ہماری قومی ذلت و نکبت کا باعث بنا ہوا

ہے۔ جب تک اسلامی معاشرہ اس تضاد سے محفوظ رہا کامیابی اس کے قدم چومتی رہی اور جب سے یہ تضاد ہمارے معاشرہ کا ناسور بنا ہے اسی وقت سے پے درپے زوال کے اسباب مہیا ہوتے جارہے ہیں حتی کہ اس زمانہ میں دنیا کی بہت سی جگہوں میں اسلامی حریت پسند تحریکات صرف اس وجہ سے ناکام ہیں کہ ان کے ارکان اپنی سیاسی و مادی اغراض کی تکمیل کے لئے اسلام کا نام تو لیتے ہیں لیکن اپنے اور اپنے معاشرہ پر اسلامی احکام نافذ کرنے میں وہ مخلص نہیں ہیں۔ جس کا نتیجہ اللہ تعالیٰ کی نصرت سے دوری کی شکل میں ظاہر ہو رہا ہے۔

اسلام نے ابتدائی دور میں جو زبردست فتوحات اور کامیابیاں حاصل کیں ان کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت کے مسلمانوں میں عملی تضاد اور دورُخی کا مادہ نہیں تھا۔ ان کا ظاہر و باطن یکساں طور پر اسلامی جذبات سے معمور اور ان کی زندگی کا ہر شعبہ قول و عملی نفاق سے پوری طرح بَری تھا اور ایسا کیوں نہ ہوتا جبکہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات طیبہ میں اس جذباتی تطابق و توافق کا بہترین اسوہ پیش کیا تھا۔ چنانچہ:

اگر ایک طرف آپ اپنے چچا خواجہ ابوطالب کو دعوت و تبلیغ چھوڑنے کا مشورہ دینے پر جذبات سے مغلوب ہو کر یہ جواب دیتے ہیں:

يَاعَمِّ وَاللّٰهِ لَوْ وَضَعُوْا الشَّمْسَ فِيْ يَمِيْنِيْ وَالْقَمَرَ فِيْ يَسَارِيْ عَلٰى اَنْ اَتْرُكَ هٰذَا الْاَمْرَحَتّٰى يُظْهِرَهُ اللّٰهُ اَوْ اُهْلَكَ فِيْهِ مَا تَرَكْتُهٗ. (سیرت ابن ہشام ۱/ ۲۵۷)

چچا جان! قسم بخدا اگر یہ (لوگ) میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند رکھ دیں کہ میں اس کام (تبلیغ اسلام) کو چھوڑ دوں تا آنکہ اللہ تعالیٰ اس کو غالب کر دے یا میں ہلاک ہو جاؤں (پھر بھی) میں اسے نہ چھوڑوں گا۔

تو دوسری طرف جب احکام شریعت کے نفاذ کا یا آخرت کے متعلق انذار و تبشیر کا موقع آتا ہے تو آپ خاندانی قرابت اور رشتہ داری کو پس پشت ڈال کر بے لاگ طریقہ پر اپنا فریضۂ منصبی ادا کرتے ہیں اور فرماتے ہیں:

يَـا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ اَوْ كَلِمَةً نَحْوَهَا اِشْتَرُوْا اَنْفُسَكُمْ لَا اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا وَيَـا فَـاطِـمَةَ بِـنْتَ مُحَمَّدٍ (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) سَلِيْنِي مَاشِئْتِ مِنْ مَالِيْ لَا اُغْنِيْ عَنْكِ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا. (بخاری شریف۲/۷۰۲)

اے خاندان قریش! اپنی جانوں کو تم (خود) خریدو (آگ سے بچنے کا انتظام کرو) صرف میں تمھاری طرف سے اللہ کے یہاں کوئی فائدہ نہ دوں گا اور اے فاطمہ بنت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو مجھ سے جتنا چاہے مال مانگ لے لیکن تیری طرف سے اللہ کے یہاں میں کوئی فائدہ نہ دوں گا۔ (یعنی ایمان کے بغیر محض نسب کام نہ آئے گا)

اسی طرح ایک موقع پر ایک عورت نے جو قبیلۂ مخزوم سے تعلق رکھتی تھی چوری کر لی آپ نے اس پر حد جاری کرنے کا حکم دیا تو بعض لوگوں نے اس بارے میں سفارش کرنی چاہی تو آپ نے صاف جواب دے دیا:

وَايْمُ اللّٰهِ لَوْ اَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعَ مُحَمَّدٌ يَدَهَا.

(بخاری شریف۲/۱۰۰۳)

اللہ کی قسم! اگر محمد کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو محمد اس کا بھی ہاتھ کاٹتا۔

یعنی رشتہ داری یا اور کوئی بھی تعلق شریعت کے کسی حکم کے نفاذ میں آپ کے لئے آڑے نہ آتا تھا۔ معاملہ اپنا ہو یا غیر کا آپ کے سامنے بہر صورت عدل وانصاف کا پیمانہ رہتا تھا۔

جب تک آدمی کا ظاہر و باطن یکساں نہ ہو اس وقت تک ایمان مکمل نہیں ہوسکتا۔ احکامِ شریعت کو ہر حال میں خوش دلی کے ساتھ مان لینا اور اپنی خواہش نفس کو دین کے تابع کر دینا سچے مومن کی نشانی ہے۔ بعض اہل کتاب ایمان لانے کے بعد چاہتے تھے کہ وہ قرآن وسنت کے ساتھ ساتھ توریت پر بھی عمل کرتے رہیں مثلاً ہفتہ کے دن کی تعظیم کریں اور اونٹوں کے گوشت اور دودھ کو حسبِ سابق ناپسند کرتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ دورنگی پسند نہ آئی اور ان سے خطاب کرتے ہوئے یہ آیت نازل ہوئی۔ (روح المعانی ۲/ ۹۷)

يٰـاَيُّهَا الَّـذِيْـنَ اٰمَنُوْا ادْخُلُوْا فِيْ السِّلْمِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ. (سورہ بقرہ آیت ۲۸)

اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو۔ اور شیطان کے قدم بقدم مت چلو۔ واقعی وہ تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے

یعنی مسلمان کے قول وعمل میں تضاد نہ ہو بلکہ توافق ہوتا، کہ وہ صحیح معنی میں اسلامی رنگ میں رنگ جائے اور اس کے دل میں کسی بھی حکم شریعت کے متعلق کوئی تنگی ذہن میں نہ آئے۔ اسی لئے قرآن میں ارشاد فرمایا گیا:

فَلَا وَرَبِّكَ لَايُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَايَجِدُوْا فِيْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجاً مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْماً. (سورہ نساء آیت ۶۵)

پھر قسم ہے آپ کے ربّ کی یہ لوگ ایمان دار نہ ہوں گے جب تک یہ بات نہ ہو کہ ان کے آپس میں جو جھگڑا واقع ہو اس میں یہ لوگ آپ سے فیصلہ کراویں پھر اس آپ کے تصفیہ سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پاویں اور پورا پورا تسلیم کرلیں۔

اس آیت پر بحث کرتے ہوئے علامہ آلوسیؒ نے روح المعانی میں لکھا ہے کہ آیت کا حکم صرف آپ کے زمانہ تک خاص نہیں تھا بلکہ قیامت تک باقی ہے اس لئے کہ شریعت نبوی کا فیصلہ بھی خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ ہے۔ اور حضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اگر کوئی قوم اللہ کی عبادت کرے۔ نماز پڑھے، روزہ رکھے، حج ادا کرے پھر وہ لوگ کسی امر مسنون کے بارے میں یہ رائے زنی کریں کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کام نہیں کیا جاسکتا؟ اور نبوی فیصلہ پر اپنے دل میں تنگی محسوس کریں تو ایسے لوگ دائرہ شریعت سے باہر ہیں۔ (روح المعانی ۵/۷۱)

اور اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔

لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبْعاً لِمَا جِئْتُ بِهٖ. (مشکوٰۃ شریف ۳۰)

کوئی شخص اس وقت تک مومن (کامل) نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی (اپنی) خواہش میرے لائے ہوئے طریقہ کے تابع نہ ہوجائے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بے مثال تربیت سے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا مزاج بھی جذباتی توافق کا عدیم النظیر مظہر بن گیا تھا۔قرن اول کا ہر لمحہ اسی توافق کا آئینہ دار ہے۔حضرات صحابہؓ نے اپنے ہر جذبہ کو شریعت پر نچھاور کردیا تھا۔اور کسی بھی موقع پر ان کی زندگی تضاد روی کا شکار نہ ہوسکی تھی۔حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ان حضرات صحابہؓ کا اس طرح تعارف کراتے ہیں:

''جو شخص کسی کی پیروی کرنی چاہے تو اسے چاہئے کہ وہ گذرے ہوئے لوگوں کی پیروی کرے اس لئے کہ زندہ شخص فتنہ سے محفوظ نہیں ہیں۔وہ (گذرے ہوئے لوگ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ ہیں وہ اس امت کے سب سے افضل، دلوں میں سب سے نیک، علم میں سب سے گہرے اور تکلف میں سب سے کم تھے۔اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنے نبی کی صحبت اور دین کی اقامت کے لئے منتخب فرمالیا تھا لہٰذا ان کی فضیلت کو پہچانو اور ان کے نقش قدم پر چلو اور حتی الامکان ان کے اخلاق اور سیرت کا اتباع کرو کیونکہ وہ سیدھے راستے پر تھے۔(مشکوٰۃ شریف ۱/۳۲)

حضرت صحابہؓ کا مکمل اتباع اور ظاہری و باطنی تضاد کو ختم کرنا ہمارے معاشرہ کی اولین ضرورت ہے اور معاشرہ اس وقت تک سدھر نہیں سکتا جب تک کہ اس یکسانیت کو رواج نہ دیا جائے اور یہ یکسانیت ہر طبقہ کو ہر سطح پر اپنانی ہوگی اور دوسروں سے پہلے قوم کے علماء اور باثر افراد کو اس پر عمل پیرا ہونا ہوگا۔''دیگراں را نصیحت وخود را فضیحت'' کے بجائے اپنی اصلاح اور اپنے عیوب پر نظر رکھنے کا جذبہ پیدا کرنا ہوگا۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو خیر کی اور طاعات کی توفیق سے نوازے اور اخلاص مرحمت فرمائے۔آمین۔

(ندائے شاہی، مئی ۱۹۹۳ء)

عزت کا راستہ

جالوت ایک ظالم و جابر بادشاہ تھا۔ حضرت طالوت نے اس سے مقابلہ کا ارادہ کیا۔ جہاد کا اعلانِ عام کر دیا گیا۔ اسّی ہزار کا لشکر جرار مقابلہ کے لئے تیار ہو گیا۔ مادی اسباب کے اعتبار سے دشمن کی فوجوں سے مقابلہ کے لئے زیادہ سے زیادہ لشکر کی ضرورت تھی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے لشکر کی تعداد پر توجہ دینے کے بجائے کام کے افراد یعنی معاصی سے پاک اور احکام شریعت کا پاس و لحاظ رکھنے والے منتخب لوگوں کو ہی ساتھ رکھنے کا حکم دیا۔ چنانچہ حضرت طالوت نے اعلان فرمایا:

اِنَّ اللّٰـهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّىْ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّىْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهٖ. (سورۃ بقرہ آیت ۲۴۹)

''اللہ تعالیٰ تمھاری آزمائش کرتا ہے ایک نہر سے سو جس نے پانی پیا اس نہر کا تو وہ میرا نہیں اور جس نے اس کو نہ چکھا تو وہ بیشک میرا ہے مگر جو کوئی بھرے ایک چلو اپنے ہاتھ سے۔''

یہ اسی ہزار کا لشکر جب نہر پر پہنچا تو گرمی شدید تھی۔ اور ہر شخص پیاس سے بے حال تھا۔ عام طور پر لوگ پانی دیکھ کر صبر نہ کر سکے اور چھیتّر ہزار افراد نے جی بھر کر پانی پی لیا۔ صرف چار ہزار ایسے لوگ تھے جنھوں نے اپنے نفس پر قابو رکھا۔ یہ لشکر آگے بڑھا تو سامنے جالوت کا لشکر تھا جو ایک لاکھ مسلح فوجیوں پر مشتمل تھا۔ اتنی بڑی تعداد میں دشمن کی فوج دیکھ کر یہ چار ہزار بھی گھبرا گئے اور یہ کہتے ہوئے واپس لوٹ گئے کہ:

لَاطَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ. (سورہ بقرہ آیت ۲۴۹)

''طاقت نہیں ہم کو آج جالوت اور اس کے لشکروں سے لڑنے کی۔''

لیکن ان میں اصحابِ بدر کی تعداد کے مطابق ۳۱۳ ایسے اصحاب استقامت لوگ بھی تھے جو کمالِ ایمان اور ثبات قدمی سے نوازے گئے تھے۔ انھوں نے جواب دیا کہ گھبرانے کی ہرگز ضرورت نہیں۔ اللہ کی مرضی اگر شامل حال ہو تو چھوٹی سے چھوٹی جماعت بڑی سے بڑی فوج پر غالب آسکتی ہے۔ چنانچہ ان ۳۱۳ نے اللہ پر کامل اعتماد کرتے ہوئے جی جان سے جہاد کیا۔ اور بے مثال استقامت اور جرأت کا ثبوت دیا تو اللہ تعالیٰ نے اسی مٹھی بھر جماعت کے ذریعہ ایک لاکھ کی مسلح فوج کو شکست دے دی، اور جالوت جیسا کرّوفر والا بادشاہ حضرت داؤد علیہ السلام (جو حضرت طالوت کی فوج کے ایک کمانڈر تھے) کے ہاتھوں ذلت کے ساتھ مارا گیا۔ (قرطبی ۲/۲۲۲- ابن کثیر ۲۰۲)

اس واقعہ کی ضروری تفصیلات قرآن کریم (البقرہ ع ۳۲) میں بیان کی گئی ہیں، اور اس کے ایک ایک جز سے یہ بات آشکارا ہو رہی ہے کہ جہاں بھی اللہ کی معصیت اور نافرمانی پائی جائے گی وہاں خدا کی مدد کا ظہور نہیں ہوگا۔ اگر معصیت کے ساتھ بھی مدد خداوندی آنے کا دستور ہوتا تو حضرت طالوت کے فوجیوں کے نہر کے پانی پینے یا نہ پینے کے ذریعہ آزمائش نہ کی جاتی بلکہ اس لشکر کو آگے بڑھنے دیا جاتا اور سوچ لیا جاتا کہ ان میں کچھ نہ کچھ تو بہرحال مخلص اور مطیع وفرمانبردار ہیں۔ لیکن واقعہ بتا رہا ہے کہ جب تک ایک ایک بدعقیدہ اور بدعمل الگ نہیں ہوگیا کامیابی نہیں ملی۔ اس آزمائش سے عددی طاقت یقیناً کم ہوگئی۔ ۸۰ ہزار سے گھٹ کر کل ۳۱۳ رہ گئے لیکن اس قلیل تعداد کے ساتھ جب اللہ تعالیٰ کی طاقت ملی تو اس نے دشمن کو تہہ وبالا کر ڈالا۔

افسوس ہے کہ قرآن کا پڑھا ہوا یہ حقیقت آگیں سبق آج ہم بھلا چکے ہیں۔ ہم نے ناعاقبت اندیشی میں یہ سمجھ رکھا ہے کہ آج دنیا کے لوگوں نے جن ذرائع کو کامیابی کا مدار بنا رکھا ہے انہی میں ہماری کامیابی مضمر ہے چنانچہ ان ذرائع کے حصول کے لئے ہر ممکن کوششیں کی جاتی ہیں۔ تعلیم میں سیکولر اقدار کی پذیرائی، لباس، تراش وخراش اور رہن سہن میں غیروں کی ہمنوائی، معاش میں سودی لین دین میں ابتلاء، یا سیاست میں غیروں کی خوشامد، چاپلوسی اور حصول اقتدار یا معمولی ممبری تک پہنچنے کے لئے سب کچھ کر گزرنا، آخر کون سا کام ہے جو مسلمان انجام نہیں دیتے؟ مگر سوچنے کا مقام

ہے کہ ان کوششوں کا نتیجہ کیا نکلا؟ کیا ان راستوں کے اپنانے سے ملت کا وقار بلند ہوگیا؟ کیا دوسروں کی نگاہ میں اس کا وزن بڑھ گیا؟ کیا ملت کے مسائل حل ہوگئے؟ کچھ افراد کا فائدہ تو ہوسکتا ہے لیکن ان کوششوں سے قوم وملت کا اجتماعی نفع دکھائی نہیں دیتا بلکہ ملت کی بے قدری بڑھتی ہی جارہی ہے۔ قرآن وسنت کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ اس ناکامی کی وجہ صرف اور صرف ایک ہے کہ ہم نے اپنے لئے کامیابی کے متعین راستہ کو چھوڑ کر دوسروں کے مقرر کردہ راستوں سے کامیابی ڈھونڈنے کا ناکام تجربہ کیا ہے۔ اگر ہم اپنے لئے متعین کردہ کامیابی کے راستہ پر محنت کرتے تو ہمیں یہ ذلت کے دن دیکھنے نہ پڑتے۔ ہمارے لئے کامیابی اور عزت کا راستہ وہ ہے جو ہمیں قرآن کریم نے ان الفاظ میں بتایا ہے۔

وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَایَضُرُّکُمْ کَیْدُھُمْ شَیْئًا وَاللّٰہُ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطٌ.

(آل عمران ۱۲۰)

''اور اگر تم صبر کرو اور بچتے رہو تو کچھ نہ بگڑے گا تمھارا ان کے فریب سے، بے شک جو کچھ وہ کرتے ہیں سب اللہ کے بس میں ہے''۔

اس آیت میں نقصان سے بچنے کے لئے اور غیروں کی سازشوں سے محفوظ رہنے کے دو مجرب نسخے تجویز کئے گئے ہیں۔ اوّل صبر جس کے ذیل میں استقامت ہوشمندی، عاقبت اندیشی، اور جذبات سے بالاتر ہوکر فیصلہ کرنے کی صفات آتی ہیں۔ اور دوسرے تقویٰ جو تمام ہی کامیابیوں کی اصل اور بنیاد ہے۔ مگر افسوس ہے کہ آج ملت کی اکثریت انہی دونوں صفات سے عاری ہے۔ ہماری بے صبری اور جذباتیت تو شہرۂ آفاق ہے ہی جس کا خمیازہ ہمیں بار بار بھگتنا پڑا ہے۔ اور تقویٰ کا عالم یہ ہے کہ ہم معمولی دنیوی مقاصد کے حصول کے لئے برسرعام معصیت اور گناہوں کے ارتکاب میں بھی کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔ مثلاً سیاست کے میدان میں جو شخص قدم رکھتا ہے تو پہلے ہی سمجھ لیتا ہے کہ ''ضرورت'' کے پیش نظر آج کی مروّجہ سیاست کا ہر کام اس کے لئے حلال ہوگیا ہے۔ خواہ شریعت اس کی اجازت دے یا نہ دے۔ خوشامد، چاپلوسی، وعدہ خلافی، ضمیر فروشی اور

دیگر منکرات میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کی جاتی ہے۔حتی کہ کہیں مسلمان اپنے پارٹی لیڈر کے سامنے ہاتھ جوڑ کر ''نمستے'' کہتا نظر آتا ہے تو کہیں ووٹ مانگنے کے لئے مجسموں پر پھول مالائیں چڑھاتا دکھائی دیتا ہے۔آج نظر اٹھا کر دیکھیں تو صاف نظر آئے گا کہ میدان سیاست میں ملت کی نمائندگی کرنے والے اکثر لوگ وہی ہیں، جن کی سرگرمیوں میں دور دور تک بھی کہیں اسلامیت یا خوف خدا کا رنگ دکھائی نہیں دیتا۔ایسے بے عمل قائدین کے ذریعہ کامیابی کا حصول قرآنی اصول کے مطابق ممکن نہیں ہے۔

مسلمانوں کو اگر ترقی کرنی ہے تو اپنی ذاتی اور اجتماعی زندگی کو معاصی سے پاک کرنا ہوگا۔دیانت وامانت اور ایثار وقربانی کی صفات کو اپنانا ہوگا۔دین وشریعت کی پابندی ہر مسلمان پر ہر وقت ضروری ہے۔بعض موہوم فوائد کے حصول کے لئے شرعی احکامات کو پس پشت ڈالنے کی ہرگز اجازت نہیں ہے۔اور شریعت کی پابندی کے بغیر مسلمانوں کی دینی اور دنیوی ترقی کا خیال محض خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔اس لئے ملّی قائدین اور اربابِ حل وعقد کی یہ منصبی ذمہ داری ہے کہ وہ زمانہ کی رو میں بہنے کے بجائے اپنے ہر قول وفعل اور ظاہر وباطن میں شریعت کا پاس ولحاظ رکھیں۔خواہ اس میں ظاہری نقصان ہی کیوں نہ اٹھانا پڑے۔اس کے بغیر حقیقی کامیابی نہیں مل سکتی۔اللہ تعالیٰ پوری امت مسلمہ کو کامیابی والا راستہ اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین۔

(ندائے شاہی، ستمبر ۱۹۹۹ء)

ملّی قیادت اور علماء

قرآن وسنت کی نظر میں امت کی اصلاح، رہنمائی اور دینی وملّی قیادت کا حق اسی شخص کو حاصل ہوتا ہے جو صحیح معنی میں دعوت الی الخیر اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دے سکے جس کی انجام دہی کے لئے ورع وتقویٰ، علم دین، اخلاص وللّہیت اور ایثار وقربانی جیسے لوازم کا ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ جب تک انسان کو اچھے بُرے کا علم نہ ہو، عمل کا جذبہ نہ ہو، اسی طرح بے نفسی اور خالقِ حقیقی کی خوشنودی پیش نظر نہ ہو اس کی کوئی بھی اصلاحی کوشش بار آور نہیں ہوسکتی۔ قرآن کریم میں مخلص مسلمانوں کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ. (سورۃ الحج آیت ۴۱)

وہ لوگ کہ اگر ہم ان کو قدرت دیں ملک میں تو وہ قائم رکھیں نماز اور دیں زکوٰۃ اور حکم کریں بھلے کام کا اور منع کریں بُرائی سے (ترجمہ شیخ الہندؒ)

اسی طرح ایک مصلح قوم اور رہنمائے امت کے لئے حلم و بردباری اور تدبر وفراست سے متصف ہونا بھی لازم ہے۔ قرآن کریم داعیان قوم کو تلقین کرتے ہوئے کہتا ہے۔

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَ بَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ کَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ.

(سورہ حٰم السجدہ آیت ۳۴)

جواب میں وہ کہہ جو اس (برائی) سے بہتر ہو پھر تو دیکھ لے کہ تجھ میں اور جس میں دشمنی تھی گویا دوست دار ہے قرابت والا۔

نیز ایک قائد کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ تعریف وتوصیف اور طعنِ وتشنیع دونوں سے بے نیاز رہے۔ نہ کسی کی تعریف اسے جادۂ حق سے ہٹا سکے اور نہ ہی ملامت کا اندیشہ اسے حق کے اعلان اور اس پر عمل درآمد سے باز رکھ سکے ایسے ہی لوگوں کی صفت قرآن میں بڑے اہتمام سے بیان کی گئی ہے۔

وَلَایَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ. اور ڈرتے نہیں ہیں کسی کے الزام سے۔

حاصل یہ ہے کہ ملی قیادت شریعت کی نظر میں وہی ہے جو دنیوی اغراض ومقاصد کے لئے نہ ہو بلکہ دینی احکام کی بجاآوری اور شریعت کی بقا اور حفاظت کے لئے ہو۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ ملت کی قیادت دراصل علمائے امت کی ذمہ داری ہے اور قوم کی فلاح و بہبودی، شعائر اسلام اور دینی اقدار کی حفاظت علمائے دین کے منصبی فرائض میں شامل ہے۔ قیادت انہی کو زیب دیتی ہے اور انہی کی باوقار دینی وملی قیادت ملت کی بھنور زدہ کشتی کو پار لگا سکتی ہے۔

لیکن اس کے برعکس نئے زمانہ کی لغت میں قومی قیادت کا مفہوم صحیح رہنمائی نہیں بلکہ نرا جوش اور شعلہ نوائی بن گیا ہے۔ اب ملت کی قیادت کے لئے تقویٰ طہارت، دینی تعلیم یا بزرگی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ قیادت کی اولین شرط یہ ہے کہ قائد اپنی شعلہ بار تقریر سے عوام کے جذبات بھڑکا دے، چٹ پٹی مسالے دار تحریر لکھ کر خون میں حرارت پیدا کر دے۔ اپنے نت نئے حربوں سے فضا کو کشیدہ اور ماحول کو پراگندہ کر دے۔ اور بے قصور عوام کو پولیس کی گولیوں کے سامنے کر کے خود اپنے عشرت کدے میں محو خواب ہو جائے۔ ایسا شخص ہی آج ملت کا مخلص اور واقعی دردمند شمار ہوتا ہے۔ اگر چہ اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی دینی مزاج یا اسلامی علامات سے یکسر خالی ہو۔ اور جو قائد مذکورہ صفات کا حامل نہ ہو اسے ملت کی جانب سے بزدل غدار اور چاپلوس جیسے القاب سے نوازا جاتا ہے۔ گویا کہ اب قائدین، قوم کی قیادت نہیں کرتے بلکہ قوم خود قائد کی قیادت کرتی ہے۔ اب قوم کا قائد صرف وہ ہوتا ہے جو شریعت اور عقل کو پس پشت ڈال کر قوم کے جذبات

اس کی منشاء کے مطابق بھڑکا تا رہے۔ اور اسی بنیاد پر اپنی قیادت کا سکّہ چلاتا رہے، ظاہر ہے کہ ایسی قیادت سے خیر کی امید کیسے رکھی جاسکتی ہے جسے عوام کی خوشی اور ناخوشی کا فکر دامنگیر رہتا ہے اور جس کا مطمحِ نظر اور منتہائے جدوجہد عوامی مقبولیت، مالی نفع اندوزی اور نعرہ ہائے تحسین کے علاوہ کچھ بھی نہ ہو؟ اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی فرمائی ہے کہ جب امت کی قیادت فاسقوں کے ہاتھوں میں چلی جائے گی تو پے درپے اس طرح مصائب اور آفتوں کا نزول شروع ہوجائے گا جس طرح تسبیح اور ہار کے دانے دھاگا ٹوٹنے کی وجہ سے بکھرنے شروع ہوجاتے ہیں۔ (مشکوٰۃ ج ۲ ص ۴۷۰)

تاہم زمانے کی بگڑی ہوئی اس روش کی وجہ سے علماء امت کا فریضۂ قیادت ساقط نہیں ہوجاتا۔ یہ درست ہے کہ ملت خود اپنے مشتعل جذبات اور ناعاقبت اندیشانہ فیصلوں کی بدولت مبتلائے مصیبت ہوتی ہے لیکن ایسے وقت میں علماء اس سے بے تعلق نہیں ہوسکتے۔ اور یہ کہہ کر اپنا دامن نہیں بچاسکتے کہ ملت کو اس کی غلطیوں کی سزا ملنی ہی چاہیے۔ اس لئے کہ علماء کا کام تو ہر حالت میں دعوت الی الخیر ہے۔ انھیں ملامت اور طعن و تشنیع کے خوف سے بے پرواہ ہوکر اپنا کام سرانجام دینا چاہیے۔ اور ملت کی غلط راہ روی پر پورے شدومد کے ساتھ نکیر کرنی چاہیے۔ قائد کا کام صرف نیکیوں کا حکم کردینا نہیں بلکہ اس پر اپنی طاقت کے بقدر برائیوں سے روکنا بھی لازم ہے۔ آج کسی نہ کسی درجہ میں اوامر کی طرف ہر جماعت توجہ دیتی ہے۔ لیکن برائیوں سے منع کرنے کی کوشش منظّم طور پر نہیں کی جاتی۔ عموماً اس کی وجہ یہ خوف ہوتا ہے کہ لوگ دشمن بن جائیں گے یا بُرا بھلا کہیں گے اور نقصان پہنچائیں گے۔ حالانکہ اس ڈر سے علماء کا اپنے فریضۂ منصبی کو چھوڑ دینا ہرگز مناسب نہیں، جس طرح بھلائیوں کی اشاعت کے لئے جماعتیں ہیں، دینی مدارس ہیں اور اصلاحی تحریکات ہیں اسی طرح منکرات اور معاصی کی فضا ختم کرنے کے لئے بھی باقاعدہ اجتماعی اور منظّم طور پر پوری جدوجہد ہونی چاہیے۔ کیونکہ عذاب خداوندی اور مصائب سے بچانے کے لئے نہی عن المنکر سے

زیادہ کوئی نسخہ کارگر نہیں ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''اللہ تعالیٰ عام لوگوں کو خاص شخص کی بد عملی کی وجہ سے عذاب میں مبتلا نہیں کرتا۔ البتہ اگر قوم کے کچھ لوگ معصیت کا ارتکاب کریں اور دوسرے لوگ قدرت کے باوجود انھیں معصیت سے نہ روکیں تو اس وقت بعض لوگوں کی نافرمانی سے پوری قوم مبتلائے عذاب کردی جاتی ہے۔'' (مشکوٰۃ شریف) **اللهم احفظنا منه**'۔

دینی قیادت اور بے دین قیادت میں فرق یہ ہے کہ بے دین قیادت کی بنیاد وقتی جوش اور علامتی جذبات پر ہوتی ہے اور دینی قیادت کی اساس قرآن وسنت کے محکم اصولوں پر ہوتی ہے۔ چونکہ وقتی اشتعال وقت گزرنے کے ساتھ ہی ختم ہوجاتا ہے اس لئے بے دین قیادت اپنی بقا کے لئے کوئی نہ کوئی جوشیلا عنوان تلاش کرتی رہتی ہے۔ جبکہ دینی قیادت اپنے آفاقی اصولوں کے بدولت ہر زمانے میں یکساں طور پر جاری رہتی ہے لیکن اسے موثر بنانے اور جذباتی مسائل کے مقابلہ کے قابل بنانے کے لئے مسلسل جدوجہد کی ضرورت ہے۔ مثل مشہور ہے کہ ''حرکت میں برکت ہے'' اگر دینی قیادت مسلسل کچھ نہ کچھ حرکت کرتی رہے اور کسی نہ کسی عنوان سے منظّم طور پر عوام سے رابطہ بنائے رہے تو بے دین قیادت چند دنوں میں خود بخود بے اثر ہوکر راستہ سے ہٹ جائے گی۔ اور عوام پورے طور پر صرف دینی قیادت سے وابستہ ہوجائیں گے۔ چنانچہ آزاد ہندوستان کی تاریخ شاہد ہے کہ جب تک علماء کی جماعتیں استقلال اور نظم ونسق کے ساتھ قومی اصلاحی پروگرام چلاتی رہیں ان کے مقابلہ میں کسی بھی جماعت کو عوام میں کوئی وقعت حاصل نہ ہوسکی۔ اب بھی اگر علماء امت میدان میں آئیں اور اپنی تنظیم کے پلیٹ فارم سے عوام سے رابطہ بنائے رہیں تو نہ صرف یہ کہ ان کی تنظیم مضبوط ہوگی بلکہ ملت کے حلقوں میں ان کا دائرہ وسیع ہوگا۔ ان کی ہدایت میں وزن ہوگا اور نازک لمحات میں امت کی رہنمائی کے بہترین مواقع ہاتھ آئیں گے۔ اس وقت کی سب سے اہم ضرورت اسلامی تشخص اور امتیاز برقرار رکھنا اور مسلمانوں کو دین کی طرف لوٹانا ہے کیونکہ مسلمانوں کے مقابلہ میں جو بھی سازشیں اور حرکتیں دشمنان اسلام کی طرف سے کی جاتی ہیں ان کا

واحد مقصد یہی ہوتا ہے کہ مسلمان کا رشتہ اپنے دین سے کٹ جائے اور وہ بھی غیر قوموں کی طرح الحاد و دہریت میں جا پھنسے۔ لہٰذا اس وقت قیادت کا سب سے بڑا فریضہ اصلاح قوم ہے۔ اسی کو پیش نظر رکھ کر جمعیۃ علماء ہند کی جانب سے ''اصلاح معاشرہ'' کا پروگرام شروع کیا گیا۔ ملک میں جگہ جگہ بڑے بڑے جلسے اور کانفرنسیں ہوئیں علماء کی یہ تحریک عموماً بنظرِ تحسین دیکھی گئی۔ لیکن محض چند مخصوص دنوں یا ہفتوں تک یہ تحریک محدود نہ رہنی چاہئے بلکہ ایسا نظام بننا چاہئے کہ مسلسل یہ پروگرام جاری رہے۔ تاکہ واقعی اس کے دور رس اثرات ظاہر ہوں اور دینی قیادت کا جو حقیقی مفہوم ہے وہ پوری طرح انجام پاسکے۔

(ندائے شاہی دسمبر ۱۹۹۱ء)

علماء اور اہل افتاء کی ذمہ داری

حلال وحرام کی تعیین اور عوام کو حلت وحرمت سے متعلق صحیح رہنمائی کرنے کیلئے امت کے علماء اور مفتیان دین سب سے بڑے ذمہ دار ہیں، یہ رہنمائی کس طرح اور کس دائرہ میں رہ کر کی جائے اس سلسلہ میں نبی کریم ﷺ نے ایک حدیث شریف میں انتہائی جامعیت کے ساتھ بنیادی اصولوں کو متعین فرما دیا ہے، حضرت نعمان ابن بشیرؓ کی روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

إِنَّ الْحَلَالَ بَيِّنٌ وَاِنَّ الْحَرَامَ بَيِّنٌ وَبَيْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ لَا يَعْلَمُهُنَّ كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ فَمَنِ اتَّقٰى الشُّبْهَاتِ إِسْتَبْرَأَ لِدِيْنِهٖ وَعِرْضِهٖ وَمَنْ وَقَعَ فِي الشُّبْهَاتِ وَقَعَ فِي الْحَرَامِ.

بے شک حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی ظاہر ہے اور ان دونوں کے درمیان مشتبہ امور ہیں جنہیں بہت سے لوگ نہیں جانتے، پس جو شخص مشتبہ چیزوں سے بچ گیا اس نے اپنا دین اور اپنی عزت بچالی اور جو شخص شبہ کی چیزوں میں پڑ گیا وہ حرام میں (بھی) پڑ جائے گا۔

كَالرَّاعِي يَرْعٰى حَوْلَ الْحِمٰى يُوْشِكُ أَنْ يَّرْتَعَ فِيْهِ، اَلَا وَإِنَّ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمًى اَلَا وَإِنَّ حِمَى اللّٰهِ مُحَارِمُهٗ.

جیسے کوئی چرواہا، اگر بادشاہ کی ممنوعہ چراگاہ کے قریب جانور چرائے تو عنقریب اس کے جانور ممنوعہ علاقہ میں بھی چرنے چلے جائیں گے، خبردار رہو ہر بادشاہ کا ممنوعہ علاقہ (حمی) ہوتا ہے، اللہ کا ممنوعہ علاقہ اس کی حرام کردہ چیزیں ہیں۔

اَلَا وَإِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا

خبردار انسان کے بدن میں گوشت کا ایک لوتھڑا

صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ اَلاَ وَهِيَ الْقَلْبُ. (مسلم شریف ۲/۲۸)

ہے وہ اگر درست ہے تو پورا بدن درست رہتا ہے اور وہ اگر بگڑ جائے تو پھر پورا بدن بگڑ جاتا ہے یہ ٹکڑا انسان کا دل ہے۔

یہ حدیث شریف دین کی بنیادی اور اصولی حدیثوں میں شمار ہوتی ہے اس کے مضامین اتنے جامع ہیں کہ بہت سے علماء نے اس کو ایک تہائی دین، اور بعض نے ایک چوتھائی دین حتی کہ بعض علماء نے اسکو تمام دینی احکامات کا جامع قرار دیا ہے۔

(تکملہ فتح الملہم ۱/۶۲۱ فیض القدیر ۳/ ۵۱۹، اکمال المعلم ۵/۲۸۴ تا ص ۲۸۵)

اس حدیث شریف کے تین اجزاء ہیں، پہلے جزء میں حلال وحرام اور مشتبہ اشیاء کا تذکرہ ہے، دوسرے جزء میں مشتبہ چیزوں سے بچنے کی اہمیت ایک مثال کے ذریعہ بیان کی گئی ہے، اور تیسرے جز میں دل کے تزکیہ پر زور دیا گیا ہے، مناسب ہے کہ ان تینوں اجزاء کی الگ الگ کچھ تشریح کر دی جائے۔

مشتبہ امور کون سے ہیں ؟

حلال اور حرام کا واضح ہونا تو ظاہر ہے یعنی وہ امور کہ جنکی حلت وحرمت پر صراحتاً نصوص موجود ہیں جیسے اشیاء طیبہ کا حلال ہونا اور اشیاء خبیثہ کا حرام ہونا، اب ان دونوں کے درمیان میں ایک درجہ مشتبہ ہونے کا ہے یہ کون سا درجہ ہے اس سلسلہ میں حضرات محدثین نے طویل بحثیں فرمائیں ہیں جنکا خلاصہ ذیل میں درج ہے:

(۱) مسلم شریف کے اولین شارح صاحب معلم علامہ مازریؒ نے ارشاد فرمایا کہ مشتبہ کا مطلب یہ ہے کہ کوئی ایسا جزئیہ پایا جائے جو ایک اعتبار سے حلت کی دلیل کے مشابہ ہو اور دوسری طرف اسکا حرمت کی دلیل کے دائرہ میں آنے کا بھی امکان ہو اور مبتلا بہ شخص کسی ایک جانب کو ترجیح دینے پر قادر نہ ہو۔

گویا کہ مشتبہ اس حکم کو کہیں گے جس میں حلت وحرمت کے دلائل متعارض ہوجائیں اور متعلقہ شخص کسی ایک جانب کو ترجیح دینے سے عاجز رہ جائے.(اکمال المعلم ۵/ ۲۸۵تا۲۸۶) مثلاً دارالحرب میں رہ کر حربیوں سے سودی معاملات کرنا کہ اس بارے میں نصوص وادلہ متعارض ہیں۔(امدادالفتاوی ۵/۹۴) تو مشتبہ سے بچنے کا تقاضا یہ ہوگا کہ عدم جواز کا فتوی دیا جائے۔

(۲) اسی سلسلہ میں علامہ موصوف آگے فرماتے ہیں کہ اگر اصلی حکم تو معلوم ہو لیکن کسی چیز کے بارے میں شرط حلت یا شرط حرمت پائے جانے میں اشتباہ پیدا ہوجائے مثلاً یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ انسان اپنی ملکیت کی چیز کو استعمال کرسکتا ہے اور دوسرے کی چیز اس کی اجازت کے بغیر استعمال نہیں کرسکتا مگر بسا اوقات کسی شئی کے بارے میں یہ تعیین دشوار ہوجاتی ہے کہ آیا یہ اس کی مملوکہ ہے بھی یا نہیں؟ مثال کے طور پر ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بستر پر ایک کھجور پڑی پائی تو آپ ﷺ نے اس خطرہ سے اس کو نوش نہیں فرمایا کہ کہیں یہ صدقہ نہ ہو جس کا استعمال آپ کے لئے حلال نہیں تو اس طرح کی مشتبہ چیزوں سے اجتناب ہی ورع وتقویٰ کی دلیل ہے۔

لیکن یہاں یہ واضح رہے کہ یہ اشتباہ واقعی اور مبنی بر قرائن ہونا چاہئے محض وہم اور ضعیف شبہ کا شریعت میں کوئی اعتبار نہیں مثال کے طور پر کوئی شخص دنیا میں کسی عورت کو پیغام نکاح ہی نہ دے اس خطرہ سے کہ کہیں وہ میری رضاعی بہن نہ ہو تو قرینہ کے بغیر اس طرح کے شبہ کا اعتبار نہیں۔(اکمال المعلم ۵/ ۲۸۶)

(۳) علامہ خطابیؒ نے مشتبہ امور کے بارے میں فرمایا کہ وہ ایسے احکامات ہیں جن کا علم ہر ایک کو نہیں ہے بعض لوگ اسے جانتے ہیں اور بعض نہیں جانتے یہ مطلب نہیں کہ وہ خود اپنی ذات ہی سے مشتبہ ہیں اس لئے کہ شریعت میں ہر حکم کسی نہ کسی دائرہ میں ضرور بیان کردیا گیا ہے البتہ یہ بیان دوطرح کا ہے ایک بیان جلی جس کو ہر ایک سمجھ سکتا ہے اور دوسرا بیان خفی جسے بعض مخصوص علماء ہی سمجھ سکتے ہیں اور اس کے ذریعہ اصل حکم تک پہونچ سکتے ہیں

اس رائے کا حاصل یہ ہے کہ جب تک ناواقف شخص کسی مسئلہ کا شرعی حکم خود اپنی صلاحیت سے (جبکہ خود مجتہد ہو) یا دوسرے علماء سے پوچھ کر (جبکہ خود مجتہد نہ ہو) معلوم نہ کرے اس وقت تک اس کیلئے اس مسئلہ پر عمل کرنا جائز نہیں بلکہ اس سے اجتناب کرنا ضروری ہے جب تک مسئلہ کے حکم پر شرح صدر نہ ہو جائے اس پر عمل کرنے اور فتوی دینے کی اجازت نہیں حدیث کے الفاظ "**لایعلمھن کثیر من الناس**" سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ (تکملہ فتح الملہم ۱/۶۲۲)

(۴) امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ شبہات سے مراد وہ تمام مجتہد فیہ اختلافی مسائل ہیں جن میں ائمہ کے درمیان حلت وحرمت کا اختلاف ہوا ہے ایسے مسائل میں مطلقاً ورع واحتیاط اور اس سے اجتناب اولیٰ ہے یعنی اگرچہ کسی مجتہد یا مقلد کے نزدیک کوئی جانب راجح ہو پھر بھی اختلاف کی وجہ سے حلت پر عمل نہ کرنا اس کیلئے اولی ہے۔ اس رائے کا حاصل یہ ہے کہ مشتبہ سے بچنے کا حکم بطور فتوی نہیں بلکہ بطور تقوی ہے۔ (تکملہ فتح الملہم ۱/۶۲۳ فیض القدیر ۳/۵۱۷)

مشتبہ امور سے بچنا کب واجب ہوتا ہے اور کب مستحب ہے؟

مشہور محقق اور شارح حدیث حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم نے مشتبہ امور سے بچنے کی شرعی حیثیت کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ اس حکم سے متعلق معلومات حاصل کرنے والا یا تو خود مجتہد ہوگا یا عامی شخص اگر عامی شخص کیلئے اشتباہ کی صورت پیش آئے تو اس کی دو شکلیں ہیں :

(۱) یا تو اس وجہ سے اشتباہ ہو رہا ہے کہ اس نے اس سلسلہ میں کسی معتبر عالم سے تحقیق نہیں کی تو ایسی صورت میں جب تک وہ تحقیق نہ کرلے اس مشتبہ معاملہ سے بچتے رہنا اس پر لازم ہے۔

(۲) یا اشتباہ کی وجہ یہ ہے کہ اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے اور فتاویٰ الگ الگ ہیں تو ایسی صورت میں مشتبہ سے اجتناب اس عامی کیلئے واجب تو نہیں البتہ مستحب ضرور ہے۔

اور اگر اشتباہ کسی مجتہد کو پیش آئے تو اس کی تین شکلیں ہیں (۱) یا تو اشتباہ اس لئے پیش آیا کہ اس خاص مسئلہ میں اس نے خود ابھی کوئی اجتہاد نہیں کیا تو ایسی صورت میں اس مجتہد کا اور عامی کا حکم برابر ہے یعنی شرح صدر کے بغیر اس پر عمل جائز نہیں (۲) یا اس اشتباہ کی وجہ یہ ہے کہ دلائل متعارض ہیں اور ترجیح دینے پر قادر نہیں تو ایسی صورت میں اس پر مشتبہ سے بچنا لازم اور واجب ہے (۳) دلائل میں تعارض تو ہے لیکن اس کی نظر میں اباحت کو ترجیح حاصل ہے تو ایسی صورت میں اگر چہ وہ راجح مسئلہ پر عمل کرسکتا ہے لیکن اولیٰ یہ ہے کہ وہ اس سے بھی اجتناب کرے۔ (تکملہ فتح الملہم ۱/۶۲۳)

مفتیان کرام کیلئے رہنمائی

مذکورہ بالا تفصیل سے موجودہ زمانہ کے علماء و مفتیان کرام مسائل اور فتاویٰ کی اشاعت کے سلسلہ میں اصولی رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں یعنی اس وقت تک ان کے لئے فتویٰ دینا ہرگز جائز نہیں ہے جب تک وہ مسئلہ انہیں حتمی اور قطعی طور پر معلوم نہ ہو اور مسئلہ پر انہیں کامل شرح صدر نہ ہو جائے خاص طور پر دور حاضر کے جدید مسائل میں اس اصول کو پیش نظر رکھنا نہایت ضروری ہے کھینچ تان کر اور مقدمہ سے مقدمہ ملا کر مروجہ معاملات کو جواز کے دائرے میں لانے کی پرزور اور پرجوش کوشش منصب افتاء کے خلاف ہے جو معاملہ واقعۃً باسانی دائرہ جواز میں آسکتا ہو اس کو ہی جائز کہنے کی ہمت کرنی چاہیئے اور جن معاملات میں کئی جہتیں پائی جائیں ان میں احتیاط اور ورع و تقویٰ کا پہلو اختیار کرنا چاہئے اس میں نہ صرف دین کا تحفظ ہے بلکہ ہر مفتی کی عزت و حرمت کا تعلق بھی اسی سے وابستہ ہے چنانچہ اسی حدیث میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''فمن اتقی الشبهات استبرأ لدینه وعرضه ومن وقع فی الشبهات وقع فی الحرام''. (مسلم شریف ۲/۲۸)

(۲) مثال کی وضاحت

مشتبہ چیزوں میں احتیاط نہ کرنا انسان کو حرام کے ارتکاب تک بآسانی پہونچا دیتا ہے اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے جناب رسول اللہ ﷺ نے ایک آسان مثال پیش فرمائی عرب میں

یہ دستور تھا کہ بادشاہ اور شہر کے با اثر امراء اپنے جانوروں کی چراگاہ اپنے لئے الاٹ کر کے مخصوص کر لیتے تھے ان کے مخصوص علاقہ میں کسی دوسرے شخص کو اپنا جانور چرانے کی قطعاً اجازت نہ ہوتی تھی اور اگر کوئی اس کی ہمت کر لیتا تو اس کو سخت سزا سے دوچار ہونا پڑتا تھا اس لئے دانشمند اور عقلمند لوگ اس علاقہ سے اپنے جانوروں کو بہت دور رکھا کرتے تھے کہ کہیں بے خیالی میں یہ جانور ممنوعہ علاقہ میں نہ چلے جائیں اور جو شخص یہ احتیاط نہیں کرتا تھا اس کے جانور ممنوعہ علاقہ میں داخلہ سے محفوظ نہیں رہ پاتے تھے اور اسے سزا بھگتنی پڑتی تھی اس مثال کو نبی کریم ﷺ نے بیان فرما کر حلال اور حرام و مشتبہ چیزوں پر انطباق اس طرح کیا کہ تمام ہی معاصی اور منکرات اور حرام معاملات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ممنوعہ علاقہ کے درجہ میں ہیں اب جو شخص ان کے قریب جائیگا یعنی مشتبہ چیزوں کو اختیار کرے گا تو وہ رفتہ رفتہ حرام کا مرتکب بھی ہو جائیگا مثلاً چوری کرنے والا پہلے چھوٹی چھوٹی چیزوں کی چوری کی عادت بناتا ہے پھر آگے چل کر خطرناک ڈاکو بن جاتا ہے اگر شروع ہی سے احتیاط کر لی جاتی تو اگلے مرحلے کی نوبت نہ آتی۔

(۳) دل کی پاکیزگی کا اہتمام

حدیث کے تیسرے اور آخری جز میں آنحضرت ﷺ نے انسان کے دل کی اہمیت اور اس کے تزکیہ کی طرف توجہ دلائی ہے انسان کے تمام اعضاء اور جوارح دل کے تابع دار ہوتے ہیں جب دل ارادہ کر لیتا ہے تو کوئی عضو اس کے حکم کی تابعداری سے ہرگز انکار نہیں کرتا لہذا دل کو ایسے سانچے میں ڈھالنے کی ضرورت ہے کہ وہ اعضاء و جوارح کو جو بھی حکم دے وہ رضائے خداوندی کے مطابق ہو اگر دل میں صلاح پیدا ہو جائیگی تو انسان کی پوری زندگی دائرہ صلاح میں آجائیگی اور اگر دل میں صلاح کا رجحان نہ ہو بلکہ بے احتیاطی، لااُبالی پن حتی کہ بددیانتی کے جذبات ہوں تو پھر دیگر اعضاء کا سیدھے راستہ پر گامزن رہنا ممکن نہیں۔ دل کی بے راہ روی انسان کی پوری زندگی کو بے راہ روی پر مجبور کر دیتی ہے اور ویسے تو ہر مسلمان کا دل پاکیزہ ہونا لازم ہے لیکن ایک مفتی اور

عالم کے دل کی پاکیزگی مزید اہمیت رکھتی ہے جب تک دل میں خوف خدا وخشیت خداوندی نہ ہو اور ورع اور تقویٰ کے اثرات نہ ہوں تو ایک عالم امت کی صحیح رہنمائی نہیں کرسکتا۔

اسی لئے ہمارے اکابر علماء نے تزکیۂ قلب کی بھرپور تاکید فرمائی ہے اور سلوک ومعرفت کی راہ سے محنتیں کرکے خلق خدا کے قلوب کو مجلّٰی اور مزکّٰی بنانے کی کوششیں فرمائی ہیں۔ دل سے متعلق اس وضاحت کا حلال وحرام کے بیان سے جوڑ یہ ہے کہ دل کے صلاح وفساد کا مدار حلال وحرام غذا کے استعمال پر ہے اگر حلال غذائیں اور آمدنی استعمال کرنے کا اہتمام کیا جائیگا تو یقینی طور پر دل میں صلاح آئیگی اور اگر مالی معاملات میں بداحتیاطی کی جائیگی تو دل میں فساد آنا لازم ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ پوری امت کو بالخصوص رہنمایان دین کو قلب کی پاکیزگی سے سرفراز فرمائے۔ (آمین)

(ندائے شاہی اگست ۲۰۰۱ء)

ملی اتحاد

اس دور میں ''ملی اتحاد'' کا نعرہ ایک فیشن بن کر رہ گیا ہے، جسے دیکھئے یہی سبق پڑھاتا ملے گا کہ مسلمانوں (یا جو بھی اپنے کو مسلمان کہتے ہیں) کو ایک پلیٹ فارم پر آنا چاہئے اور آپسی اختلافات ختم کردینے چاہئیں۔ یہ نعرہ دیکھنے میں بڑا خوبصورت اور دیدہ زیب ہے اور جو لوگ اس نعرہ پر عملی اقدام کرتے ہیں اور اپنی تنظیموں میں سبھی فرقوں کا خمیر شامل کرتے ہیں وہی آج کے جدید طبقہ کی نظر میں ملت کے مسیحا اور حقیقی قائد متصور کئے جاتے ہیں اور اس کے برخلاف جو حضراتِ اہلِ حق عقائد و اعمال اور بدعات کی بیخ کنی میں اپنی جان کھپاتے ہیں اور اسلام کے دفاع کا علم اٹھاتے ہیں آج کی دنیا میں انھیں شرانگیز، شدت پسند اور قدامت پسند جیسے القاب و آداب سے نوازا جاتا ہے۔ اس اشتباہ کے ماحول میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ملی اتحاد کی اصل بنیاد کی وضاحت کردی جائے، تاکہ اندازہ ہو سکے کہ شریعت کی نظر میں کون سا اتحاد مطلوب ہے اور کون سا اتحاد ممنوع ہے۔

وہ فرقے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں ان کی بنیادی طور پر تین قسمیں ہیں:

(الف) وہ فرقے جن کے عقائد و اعمال پوری طرح سنت کے مطابق اور حضرات صحابہؓ کے اسوہ کے موافق ہیں۔

(ب) وہ فرقے جن کے عقائد و اعمال سنت سے ہٹے ہوئے ہیں مگر ان میں تاویل کی گنجائش ہے اس لئے ان پر کفر کا حکم نہیں لگایا جاتا مگر بدعت و ضلالت سے وہ بہر حال متصف ہیں۔

(ج) وہ فرقے جن کے عقائد و اعمال قرآن و حدیث اور اجماع امت سے بالکل متصادم اور اصول شریعت کے برخلاف ہیں۔

ان تین طبقات میں سے کون سا طبقہ لائق تقلید اور قابل اتباع ہے اس کو درجِ ذیل تین احادیث طیبہ کے مطالعہ سے جانا جا سکتا ہے۔

(۱) اِنَّ اللّٰه لَا یَجْمَعُ اُمَّتِیْ اَوْقَالَ اُمَّةَ مُحَمَّدٍ (صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ) عَلٰی ضَلَالَةٍ ۔

(مظاہر حق ۱/۸۸، مشکوٰۃ شریف ۱/۳۰، ترمذی شریف ۲/۳۹)

''اللہ تعالیٰ میری امت یا امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو گمراہی پر جمع نہیں فرمائے گا۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ساری امت کبھی گمراہی پر مجتمع نہیں ہوسکتی۔ اب یہ کیسے پتہ چلے کہ گمراہی کیا ہے اور ہدایت کس میں ہے؟ تو اس بارے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو نشانیاں بیان فرمائی ہیں۔ اول یہ کہ خیر القرون میں اکثریت جس موقف پر رہی ہے اسی کی پیروی کی جائے چنانچہ فرمایا۔

(۲) اِتَّبِعُوْا السَّوَادَ الْاَعْظَمَ فَاِنَّهٗ مَنْ شَذَّ شُذَّ فِی النَّارِ. (مظاہر حق ۱/۸۸، مشکوٰۃ شریف ۱/۳۰)

''بڑی جماعت کی پیروی کرو اس لئے کہ جو جماعت سے الگ ہوا وہ جہنم میں الگ کر کے ڈالا جائے گا۔''

اور دوسری نشانی یہ ہے کہ وہ جماعت حضورؐ اور آپ کے صحابہؓ کے طریقہ پر قائم ہو چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔

(۳) اِنَّ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ تفرقَّتْ عَلٰی ثِنْتَیْنِ وَ سَبْعِیْنَ مِلَّةً وَ تَفْتَرِقُ اُمَّتِیْ عَلٰی ثَلٰثٍ وَّ سَبْعِیْنَ مِلَّةً كُلُّهُمْ فِی النَّارِ اِلَّامِلَّةً وَّاحِدَةً قَالُوْا مَنْ هِیَ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ مَااَنَا عَلَیْهِ وَ اَصْحَابِیْ. (مظاہر حق ۱/۸۷، مشکوٰۃ شریف ۱/۳۰، ترمذی شریف ۲/۳۰)

بنی اسرائیل ۷۲ فرقوں میں بٹ گئے اور میری امت تہتّر فرقوں میں تقسیم ہوگی وہ سب جہنمی ہوں گے سوائے ایک جماعت کے، صحابہؓ نے عرض کیا کہ وہ کون سی جماعت ہوگی آپ نے فرمایا کہ جو میرے اور میرے صحابہ کے طریقہ پر ہو۔

ان دونشانیوں کی روشنی میں واضح ہوا کہ فکری طور پر اسلامی اتحاد کا بنیادی عنصر اتباعِ سنت اور حضرات صحابہؓ کی پیروی ہے۔ اس کے بغیر اتحاد اتحاد نہیں بلکہ مداہنت فی الدین ہے اس لئے خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔

مَنْ وَقَّرَ صَاحِبَ بِدْعَةٍ فَقَدْ اَعَانَ عَلٰى هَدْمِ الْاِسْلَامِ ۔

(مظاہر ۱/۹۲، مشکوٰۃ شریف ۱/۳۱، شعب الایمان ۷/۶۱ حدیث نمبر۹۴۶۴)

جس شخص نے کسی بدعتی کی عزت وتوقیر کی اس نے اسلام کی عمارت گرانے میں مدد کی۔

تو بدعت وسنت کا یہ اختلاف مٹ نہیں سکتا جب تک کہ بدعت کو ترک کر کے سنت کے دامن میں جگہ نہ حاصل کر لی جائے اور جب محض بدعت کا یہ حال ہے تو مذکورہ تیسرے طبقے کے فرقے جو اپنے عقائد کی بنیاد پر صراحۃً کفر کے مرتکب ہیں ان کے ساتھ تو اہلِ حق کے ملی اتحاد کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ اہلِ حق کے لئے ہرگز یہ روا نہیں ہے کہ وہ ان کے حربوں کے جواب میں خاموش بیٹھیں یا مصلحت کوش بنے رہیں، اہل حق کی یہ منصبی اور اصولی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ احقاقِ حق اور ابطال باطل کے لئے ہر ممکن جدوجہد کریں اور بلاخوف لومۃ لائم اپنے کام میں لگے رہیں۔

دراصل ملی اتحاد کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن وسنت پر اجتماع کی دعوت دی جائے۔ نہ یہ کہ اہلِ باطل کی رعایت کرتے ہوئے سنت کی ترویج وحفاظت کا کام چھوڑ دیا جائے۔ اسی جانب قرآن کریم کی اس آیت میں توجہ دلائی گئی ہے۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعاً (سورۂ آل عمران آیت نمبر۱۰۳)

اور مضبوط پکڑو اللہ کی رسی سب مل کر اور پھوٹ نہ ڈالو۔

اس لئے حق کی وضاحت بہر حال ضروری ہے چاہے وہ کسی کو اچھی لگے یا بری محسوس ہو، محض مصالح کی بنیاد پر حق کو چھپایا نہیں جاسکتا۔ اور اہل باطل کے ساتھ کسی دنیوی مقصد کے حصول کے لئے گو کہ اشتراک جائز اور ضروری ہو مگر ان کے ساتھ ایسی عزت وتوقیر کا معاملہ کرنا جس سے عوام کی نظر میں ان کے عقیدہ کی برائی ختم ہو کر رہ جائے اس کی ہرگز اجازت نہیں دی جاسکتی۔

(ندائے شاہی، جون ۱۹۹۵ء)

تشخص کی حفاظت

مسلمان جہاں اور جس حال میں بھی رہیں ان کے لئے سب سے زیادہ قیمتی چیز ان کا مذہب اور دینی تشخص ہوتا ہے۔ دین سے ہٹ کر ان کی کوئی بھی ترقی واقعۃً ترقی نہیں بلکہ تنزل قرار پاتی ہے۔ مسلمانوں کا وقار مال و دولت سطوت و ثروت اور سلطنت و بادشاہت پر موقوف نہیں بلکہ ان کی عظمت کا راز اپنے دین سے وابستہ رہنے میں ہے اگر دین ہے تو ان میں زندگی ہے۔ اور جب دین ہی نہ رہے، دینی تشخص ہی نہ بچے اور شریعت سے تعلق ہی باقی نہ ہو تو ان میں ظاہری زندگی کے باوجود معنوی حیات کے آثار معدوم ہو جاتے ہیں۔ تاریخ اس حقیقت کو بار بار سچ کر کے دکھا چکی ہے اور عبرت انگیز تاریخی واقعات چیخ چیخ کر بتا رہے ہیں کہ دین ہی مسلمانوں کی زندگی ہے، شریعت اسلامیہ ہی مسلمانوں کا وقار ہے اور اسلامی تشخص ہی مسلم قوم کا سرمایۂ حیات ہے۔ آخر کیا چیز تھی جس نے حضرات صحابہؓ کو بڑے بڑے ظالم و جابر اور شان و شوکت رکھنے والے بادشاہوں سے ٹکر لے کر انھیں زیر کرنے کا حوصلہ بخشا اور وہ کون سی طاقت تھی جس نے چند ہی سالوں میں ''اللہ اکبر'' کا پھریرا عرب و عجم میں لہرایا۔ اور بتکدوں سے فرضی معبودوں کے بجائے ''اللہ وحدہ' کا شریک لہ'' کے نام کا غلغلہ بلند ہونے پر مجبور کر دیا؟ یہ وہی دینی قوت تھی جو ضمانت ہے مسلمانوں کی حفاظت کی، جو گارنٹی ہے اسلام کے نام لیواؤں کی ترقی کی اور جو علامت ہے اہل اسلام کی زندگی کی۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام دشمن طاقتیں ابتدا ہی سے اس کوشش میں لگی رہی ہیں کہ مسلمانوں کا رابطہ ان کے دین سے کاٹ دیا جائے، ان کا رشتہ اسلامی شریعت سے منقطع کر دیا جائے یا ان کے

دین میں اتنی ملاوٹ کردی جائے جس کی وجہ سے اصل دین کی روح نکل جائے۔ اس مقصد کے لئے کبھی فرض اور جعلی نبیوں کا سہارا لیا گیا تو کبھی عقائد فاسدہ رائج کر کے مسلمانوں کی صفوں میں دراڑ ڈالی گئی۔ پھر منصوبہ بند طریقہ پر اسلاف کرام خاص کر صحابہ کرامؓ پر طعن و تشنیع کا دہانہ کھولا گیا تاکہ دین کی عمارت ہی منہدم کردی جائے اور امت کا سارا سرمایہ شریعت میں ناقابل اعتبار ہوجائے۔ اس کے علاوہ کہیں موقع ہوا تو مسلمانوں کو لالچ دلا کر انھیں دین سے برگشتہ کرنے کی سازشیں رچی گئیں۔ یا انھیں دنیوی عیش وعشرت کا عادی بنا کر ان کا جذبۂ حمیت مردہ کردیا گیا۔

ہندوستان میں انگریزی دور اقتدار کے بنیادی مقاصد میں یہ شق بھی شامل تھی کہ مسلمانوں کو ان کے علماء سے اور ان کے دین سے الگ تھلگ کر کے ایسے ماڈرن مسلمانوں کو وجود میں لایا جائے جو نام کے مسلمان اور کام کے انگریز ہوں تاکہ حکومت کو آئندہ کسی خطرہ کا اندیشہ نہ رہے۔ اس لئے کہ انگریز سمجھتا تھا کہ جو چیز مسلمانوں کو انگریز کے خلاف کھڑے ہونے پر مجبور کرسکتی ہے وہ صرف اور صرف ان کی دینی حمیت ہے جسے ختم کرنا ضروری ہے۔ اسی مقصد سے عیسائیوں کے تبلیغی مشن ہندوستان کے طول وعرض میں بھیجے گئے اور اسلامی احکامات پر اعتراضات کر کے عوام کو بہکانے اور مذہب کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کی منظّم اور مربوط کوششیں کی گئیں۔ دوسری طرف عدالتوں میں رائج اسلامی قوانین رفتہ رفتہ منسوخ کئے جانے لگے۔ مسلم قضاۃ کا تقرر بند کردیا گیا۔ مسلمانوں کے نجی عائلی قوانین میں بے جا ترمیم و تنسیخ کر کے ان میں عدم تحفظ کا احساس پیدا کیا گیا۔ ان کارروائیوں میں انگریز نے جنھیں آلۂ کار بنایا وہ وہی ملحد اور دہریہ قسم کے ''برائے نام مسلمان'' جن تھے کن کی ذہنی تربیت خالص انگریزی ماحول میں ہوئی تھی اور جن کا ذہن الحاد ودہریت کی غلاظتوں سے پُر تھا۔ مگر اللہ کا فضل رہا کہ ہزار کوششوں، سازشوں اور نام نہاد ترقی پسندوں کی تنقیدوں کے باوجود اس ملک میں مسلمان اپنے تشخص کے ساتھ باقی رہے۔ اور اس راہ میں مخلص علماء امت کی بے لوث کوششیں بار آور ہوئیں۔ مدارس و مکاتب کا جال پھیلا۔ اسلامی تنظیموں اور اداروں کا قیام ہوا۔ تبلیغی تحریکات شروع ہوئیں اور اسلام کا وہ تناور درخت جسے

آگ لگانے کے لئے ہر ممکن حربہ استعمال کیا گیا تھا وہ مزید سرسبزی وشادابی کے ساتھ پھولتا پھلتا رہا۔ **فالحمد لله علىٰ ذٰلك۔**

پھر جب ہندوستان آزاد ہوا تو انہی قوم پرست علماء کی کوششوں سے دستور ہند میں مذہبی آزادی کے سلسلے میں یہ قانون منظور کیا گیا۔

''تمام اشخاص کو آزادئ ضمیر اور آزادی سے مذہب قبول کرنے، اس کی پیروی اور اس کی تبلیغ کرنے کا حق حاصل ہے''۔ (بھارت کا آئین دفعہ ۳۵/۴۶)

اس دستور کی رو سے آج مسلمانوں کو ہندوستان میں پوری طرح آزاد رہ کر اپنے مذہبی امور بجالانے کا مساوی حق حاصل ہے۔ اسی بنا پر دیوانی عدالت کے ایسے مقدمات جن کا تعلق مسلم پرسنل لا سے ہے ان میں عدالتیں شریعت کی تشریح کے مطابق ہی فیصلے کرتی ہیں۔ گویا کہ اب بھی مسلمانوں کا ایک دینی تشخص موجود ہے اور حکومت دستور کے مطابق اس تشخص میں کسی دخل اندازی کی مجاز نہیں ہے مگر یہ بات اسلام دشمن فرقہ پرست طاقتوں اور دین بیزار نام نہاد مسلم دانشور وں کے لئے شروع ہی سے سوہان روح بنی ہوئی ہے۔ چنانچہ آزادی کے بعد سے مسلسل یہ نعرہ لگایا جاتا رہا ہے کہ ملک میں یکساں شہری قانون نافذ کر دیا جائے اور بار بار حکومت کی طرف سے اس قسم کی آوازیں اٹھتی رہی ہیں۔ حتی کہ مارچ ۱۹۷۳ء میں لا کمیشن کے چیئرمین مسٹر گجندر گڈ گر نے بنگلور میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

''مسلمانوں کو یونیفارم سول کوڈ کو قبول کرنے کے لئے اپنے آپ کو آمادہ کر لینا چاہئے اگر انھوں نے خوش دلی کے ساتھ یہ تجویز منظور نہیں کی تو قوت کے ذریعہ یہ قانون نافذ کیا جائے گا۔'' (شریعت اسلامیہ کی بقا و تحفظ الخ ص ۳۰)

ظاہر ہے کہ مسلم قوم کی دینی حمیت اپنے مخصوص اور خالص مذہبی عائلی قوانین میں کسی بھی قسم کی مداخلت کو برداشت نہیں کر سکتی۔ اسی بنا پر جب بھی یہ بحث اٹھائی گئی اسے مسلمانوں کے پرزور

احتجاج کا سامنا کرنا پڑا اور معاملہ معرض التواء میں پڑتا رہا۔ ۱۹۸۵ء میں شاہ بانو کیس میں یہ بحث سنگین نوعیت اختیار کر گئی اور ملک میں مسلمانوں کے دینی تشخص کی بقا کو شدید خطرہ لاحق ہو گیا۔ مگر مسلمانوں نے جس اتفاق واتحاد اور عزم بالجزم کے ساتھ اس شر انگیز تحریک کا مقابلہ کیا وہ تاریخ کا روشن باب ہے جس کی بنا پر پارلیمنٹ مجبور ہوئی کہ وہ مسلم مطلقہ کے بارے میں نیا ترمیمی بل پیش کر کے منظور کر لے۔ یہ مسلمانوں کی ایک اہم کامیابی تھی۔ جو برابر اپنے اور پرائے دشمنوں کے دلوں میں کھٹک رہی تھی اور وہ ایسے موقع کے متلاشی تھے جس کے ذریعہ ''اسلامی نظام زندگی'' کو ہدف ملامت بنایا جا سکے۔ بدقسمتی سے چند مہینہ قبل اہل حدیث کی طرف سے طلاق سہ گانہ کے ایک ہونے سے متعلق ایک فتویٰ نے ان کو یہ موقع فراہم کر دیا کہ وہ اس کی آڑ میں اسلام اور مسلم علماء پر کیچڑ اُچھالیں۔ چنانچہ ایسا لگا کہ پورے ملک میں بھونچال آ گیا ہو، مسلم عورتوں پر ظلم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہوں اور اسلام کے دامن میں کسی مظلوم بیوہ اور مطلقہ کی دادرسی کا کوئی انتظام نہ ہو۔ غیر مسلم اور فرقہ پرست تو بولے ہی، مسلمان کہے جانے والے نام نہاد دانشوروں نے بھی اس خاص علمی دینی اور مذہبی مسئلہ میں خوب خوب عامیانہ اجتہادات کے نظارے دکھائے، اور اپنی باطنی سرشت کا برملا اظہار کیا۔ ایک صاحب نے تو آگے بڑھ کر یہ کفریہ تجویز پیش کر دی کہ:

''حلالہ کرنے والے کو زنا بالجبر قرار دینے کا قانون پارلیمنٹ سے منظور کرایا جائے۔'' (العیاذ باللہ) (دیکھئے قومی آواز ۹/اگست ۱۹۹۳ء مضمون دانیال لطیفی) الغرض ایسی اوچھی تجاویز اور لچر باتیں بحث میں لائی گئیں جن کا دین سے کسی قسم کا بھی تعلق نہیں تھا۔ ان تحریرات اور بحثوں کا مقصد صرف اور صرف یہ تھا کہ مسلمانوں کا رابطہ اسلاف سے کاٹا جائے اور ملک میں یکساں سول کوڈ کے لئے راستہ صاف کیا جائے۔ یہ بحث صرف مقلدین کے درمیان نہیں رہی بلکہ پوری طرح آزاد خیالوں اور دینی طبقہ کے درمیان کی جاتی رہی۔ صحیح معنی میں یہ آزاد خیال نہ مقلدین کے ہمنوا تھے اور نہ ہی اہل حدیث کے ہمدرد انھیں تو محض اسلام کو بدنام کرنے سے دلچسپی تھی۔

ایسے وقت میں ہونا یہ چاہئے تھا کہ ''مسلم پرسنل لا بورڈ'' اپنا منصبی فرض ادا کرتے ہوئے خاص اس پروپیگنڈے کا جواب دینے کے لئے خصوصی اجلاس بلاتا اور مسئلہ طلاق سے صرف نظر

کرتے ہوئے اس سازش پر اجماعی موقف اپنانے کا مشورہ دیتا اور ڈنکے کی چوٹ پر یہ اعلان کیا جاتا کہ مسلمان اپنی شریعت میں کسی غیر اور عامی شخص کی مداخلت برداشت نہیں کر سکتے، اس سے بورڈ کا نہ صرف وقار بلند ہوتا بلکہ مسلمانوں کے دلوں میں اس پر اعتماد پیدا ہوتا۔ مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہوسکا اور اس موقعہ پر بھی کافی انتظار کے بعد اپنی تاریخی شاندار روایتوں کا پاس ولحاظ کرتے ہوئے علماء کی باوقار جماعت ''جمعیۃ علماء ہند'' میدان میں آئی اور اس نے ۳/۴ اکتوبر ۱۹۹۳ء کو تحفظ شریعت کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ کر کے واقعۃً فرض کفایہ ادا کیا۔ یہ کانفرنس فروعی اختلافات کو ہوا دینے کا پلیٹ فارم نہیں بلکہ اس طبقہ کا منہ توڑ جواب دینے کا موقع ہے جو ہمارے مسلکی اختلافات کی آڑ میں شریعت کو ہدف ملامت بنا تا رہا ہے۔ اس لئے کہ جمعیۃ علماء کا کام اہل حدیث یا دیگر مسلم طبقوں سے لڑنے کا نہیں ہے (کیونکہ اس کے دروازے ایسے سبھی مکاتب فکر کے لئے کھلے رہے ہیں) جمعیۃ کا کام تو شریعت کی بقا اور حفاظت کی جدوجہد کرنا اور پرسنل لا کی حفاظت رہا ہے۔ چنانچہ جمعیۃ کی تاریخ میں ایسے بہت سے روشن ابواب ہیں جن میں اس کی سنہری جدوجہد کا نقش دیکھا جاسکتا ہے۔ ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ کی مخالفت، ۱۹۳۰ء میں لندن کی گول میز کانفرنس میں مذہبی قوانین کے تحفظ کی تجاویز قانون فسخ نکاح ایکٹ ۱۹۲۰/۸ء کی منظوری، ۱۹۳۱ء میں شاردا ایکٹ کی مخالفت جو پرسنل لا کے خلاف تھا، شریعت ایکٹ ترمیمی بل ۱۹۴۲ء کی پیشکش متبنّیٰ بل ۱۹۷۲ء، تعداد ازدواج بل ۱۹۷۹ء کی پُر زور مخالفت، علماء کانفرنس ۱۹۸۶ء کا انعقاد، نکاح رجسٹریشن بل ۱۹۹۰ء پر احتجاج، امارت شرعیہ ہند کا قیام اور صدر محترم جمعیۃ علماء ہند کے ذریعہ پارلیمنٹ میں پرائیویٹ مسلم قاضی بل ترمیمی بل ۱۹۷۹ء پیش کرنا وغیرہ ایسی ہی جہد مسلسل کے عنوانات ہیں۔ ہم اس وقت جمعیۃ کے اکابر کو ''کانفرنس'' کے انعقاد پر پُر خلوص مبارکباد پیش کرنا چاہتے ہیں اور بارگاہ ایزدی میں دست بدعا ہیں کہ ہماری یہ اجتماعی جدوجہد رنگ لائے اور ہم برابر مذہبی تشخص کے ساتھ اس ملک میں پھلتے پھولتے اور پروان چڑھتے رہیں۔ آمین یا ربّ العالمین)

(ندائے شاہی، اکتوبر ۱۹۹۳ء)

❍❖❍

ائمہ مساجد کی خدمت میں

امامت کا منصب ایک خالص دینی اور مذہبی منصب ہے۔ خاص مذہبی صلاحیت اور علمی استعداد کا حامل شخص ہی امامت کا مستحق ہوتا ہے۔ اماموں کے عزل و نصب کا حق غیر اسلامی حکومتوں میں صرف اور صرف عامۃ المسلمین کو حاصل ہے۔ ان کے تقرر میں غیر مسلم حکومت یا غیر اسلامی اداروں کی مداخلت کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اس اعتبار سے ''موجودہ حکومت ہند'' سے اماموں کو اپنی امامت کا معاوضہ طلب کرنے کا کوئی مطلب نہیں ہے۔ یہ معاوضہ ان کے مقتدیوں یا مسجد کے ذمہ داروں کے ذمہ ہے نہ کہ حکومت یا عام مسلم اوقاف کے ذمہ۔

آج کل ہمارے علاقہ میں ائمہ مساجد کی ایک ''آل انڈیا تنظیم'' سرگرم ہے جس کا خاص مقصد یہ ہے کہ اماموں کی ''حالت زار'' پر خصوصی توجہ کرتے ہوئے حکومت ''وقف بورڈوں'' یا اپنے ''خاص خزانہ'' سے اماموں کی تنخواہ جاری کرے۔ اس تنظیم کے زیر اہتمام گذشتہ ۷/اگست ۱۹۹۳ء کو وزیر اعظم کی کوٹھی پر ایک عدد ''اماموں کی ریلی'' بھی ہو چکی ہے۔ جس میں وزیر اعظم نے نہایت مہربانی فرماتے ہوئے اماموں کو ان کا جائز حق ملنے کی پوری یقین دہانی کرائی ہے۔

اب یہ تنظیم شہر در شہر مساجد کا سروے کر کے اماموں سے مخصوص فارموں کی خانہ پری کرا رہی ہے۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ اماموں کو اپنا ہمنوا بنا سکے۔ بہت سے ناواقف اور خالی الذہن ائمہ محض تنخواہوں کے لالچ میں اس تحریک کی سُر میں سُر ملا رہے ہیں۔ یہ صورتحال مستقبل کے لئے شدید فتنہ کا پیش خیمہ اور حکومت کی طرف سے ہمارے دینی معاملات میں دخیل بننے کا دروازہ ہے۔ اگر خدانخواستہ یہ تحریک کامیاب ہوگئی اور اماموں کو تنخواہوں کے دام فریب میں پھنسا لیا گیا تو آئندہ مساجد کی خیر نہ ہوگی۔ اس لئے کہ:

(۱) جو امام باقاعدہ حکومت کا تنخواہ دار ہو جائے گا وہ ہزار خرابیوں کے باوجود ہٹایا نہ جا سکے گا۔

(۳) حکومت کی طرف سے تنخواہ بند ہو جانے کے خوف سے کوئی امام موقع پر حق بات زبان سے نہ نکالے گا۔

(۳) منصب امامت بھی دنیوی ملازمتوں کی طرح ہو جائے گا اور جو چاہے گا رشوت وغیرہ دے کر حکومت سے اپنی امامت رجسٹرڈ کرالے گا۔

(۴) مسجدیں سیاست اور بدعنوانی کا اڈہ بن جائیں گی۔

(۵) اور سب سے بڑی خرابی یہ کہ امامت میں للّٰہیت فنا ہو کر مادی منفعت اصل مقصود بن جائے گی۔

ان ہی مذموم مقاصد کی تکمیل کے لئے حکومت آج کل ''اماموں'' پر مہربان ہو رہی ہے۔ دراصل حکومت نے بہت سے ''بورڈ سے ملحق'' عربی مدارس کی روح نکالنے میں کامیابی حاصل کر کے اب اماموں پر ہاتھ ڈالنے کا منصوبہ بنایا ہے جو ''بورڈ کی سازش'' سے زیادہ خطرناک ہے۔ ائمہ کرام کے لئے یہ غور کا مقام ہے کہ وہ چند روپیوں کی خاطر اپنی دینی آزادی بیچ دینا چاہتے ہیں یا اس حکومتی چارہ کو ٹھکرا کر دینی حمیت وغیرت کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ اس نازک موڑ پر اماموں کا غلط فیصلہ ملّت اسلامیہ ہند کو سخت آزمائش میں مبتلا کر سکتا ہے۔ اور اس موقع کی ذرا سی غلطی:

''لمحوں نے خطا کی تھی، صدیوں نے سزا پائی''

کا مصداق بن سکتی ہیں۔ اس لئے ائمہ کرام کو خوب سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہئے۔

ہم ائمہ مساجد کی نفس تنظیم کے مخالف نہیں ہیں بلکہ ہمیں اس کی ضرورت کا ایک گونہ احساس ہے لیکن اماموں کی تنظیم نے صرف تنخواہوں کو جو مدعا بنالیا ہے وہ اس کی حیثیت عرفی سے نہایت فروتر ہے۔ اس تنظیم کا کام تو اماموں کی تربیت ہونا چاہئے تھا، تاکہ اماموں میں شرعی مسائل کی حتی المقدور واقفیت کے ساتھ ساتھ صحیح اسلامی فکر عام ہو اور وہ ایسے بلند اخلاق اور امتیازی کردار کے مالک بن سکیں جس کی بنا پر قوم کا اعتماد ان پر بدستور قائم رہ سکے۔ اور بوقت ضرورت ان کے جذبۂ حق نوازی سے ملت فائدہ اٹھا سکے۔ اب بھی وقت ہے، ائمہ کی تنظیم کو اپنی سرگرمیوں کا رُخ تنخواہوں سے ہٹا کر اصلاحی اقدامات کی طرف کر لینا چاہئے۔ اور مادی منفعت کے مقابلہ میں ائمہ کی اخروی منفعت کے حصول کی سعی کرنی چاہئے۔ اسی طرح مسلم اوقاف کی زبوں حالی اور انھیں

بدعنوان ''افسران'' سے آزاد کرانے کے لئے ضرور کوشش ہونی چاہئے۔ مگر اماموں کی تنخواہوں کے مسئلے سے جوڑ کر نہیں بلکہ مستقل اس موضوع کو آگے بڑھانا چاہئے۔ امید ہے کہ ائمہ کرام اور ذمہ داران تنظیم ان معروضات کو لائق اعتناء سمجھیں گے۔

ذمہ دارانِ مساجد متوجہ ہوں

مساجد کے امام کا مذہبی مقام یہ ہے کہ وہ نمازیوں اور اللہ رب العزت کے درمیان نمائندگی کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ اس لئے امام ایسا شخص ہونا چاہئے جو قوم میں تقویٰ و پرہیزگاری اور علم و عمل میں اعلیٰ مقام پر فائز ہو۔ امام کا دینی مرتبہ بہت بلند ہے اور اس کی قدر کرنا ہر مسلمان پر ضروری ہے۔

لیکن افسوس کا مقام ہے کہ آج ہمارے مادی معاشرہ میں مسجد کے ذمہ دارانِ اور نمازی امام کو اپنا ملازم اور غلام سمجھتے ہیں۔ امام سے اگر کوئی خلاف مرضی کام صادر ہو جائے تو اس کی جان مصیبت میں پڑ جاتی ہے۔ اور عموماً ایسے امام کو پسند کیا جاتا ہے جو اپنی ''انا'' کو ختم کر کے اور حق نوازی کے جذبہ کو مردہ کر کے کمیٹی اور نمازیوں کا غلام بن کر رہے۔ اسی طرح مسجد میں آمدنی موجود ہونے اور نمازیوں میں استطاعت رہنے کے باوجود اماموں کو ان کی محنت اور ضروریات کے مقابلہ میں بہت کم حق الخدمت دیا جاتا ہے اور کہیں کہیں تو محض اس وجہ سے غلط خواں اور نااہل امام کو برداشت کیا جاتا ہے کہ اچھے امام کو لانے کے لئے اچھی تنخواہ دینی پڑے گی۔ یہ باتیں اس امر کی دلیل ہیں کہ ہماری نظر میں امامت کے منصب کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اور ہم محض بیگار ٹالنے اور ضرورت پوری کرنے کی حد تک ہی اس مسئلہ سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

ہماری اسی بے اعتنائی نے آج بعض ''سیاسی لوگوں'' کو ائمہ سے ہمدردی کے بھیس میں مساجد کی آزادی سلب کرنے کا موقع فراہم کر دیا ہے۔ اس لئے ذمہ دارانِ مساجد کو اپنی ذاتی ضرورتوں پر قیاس کرتے ہوئے ائمہ کی خبر گیری کرنی چاہئے تاکہ معاشی طور پر مطمئن ہونے کی وجہ سے ائمہ کسی غلط تحریک کے آلۂ کار نہ بنائے جاسکیں۔ اور ہماری مسجدیں اور دینی ادارے حکومت کے تسلط اور اثرات سے محفوظ رہ سکیں۔

(ندائے شاہی، نومبر ۱۹۹۳ء)

❍❖❍

بچّوں کی تربیت

قوم کے بچّے مستقبل کے ستارے اور آنے والے وقت کا سرمایہ ہوتے ہیں آئندہ کے قومی حالات کا اندازہ اس قوم کے بچوں سے لگایا جاسکتا ہے۔ بچوں کی تربیت جس انداز کی ہوگی، مستقبل کا معاشرہ بھی اسی انداز کا بنے گا۔ اگر قوم کے بچے دینی ماحول میں پروان چڑھ رہے ہیں تو سمجھ لیجیے کہ آئندہ کا قومی معاشرہ مذہبی رجحان کا حامل ہوگا اور اگر بچوں کی تربیت غیر اسلامی طریقے پر ہورہی ہے تو یقین کیجیے کہ آنے والا زمانہ مذہبی اقدار کی پامالی اور دینی تشخصات توہین کا ہوگا اور جب تک بچوں کی تربیت میں اصلاح نہ کی جائے گی اس وقت تک قومی اصلاح کی کوئی بھی تحریک کارگر ثابت نہیں ہوسکتی۔ اس بنا پر اسلامی تعلیمات میں بچوں کی تربیت اور ذہن سازی کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ جب بچہ بولنے کے قابل ہوجائے تو سب سے پہلے اسے کلمۂ توحید لا الہ الا اللہ سکھایا جائے اس کے بعد یہ آیت یاد کرائی جائے۔

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَلَمْ یَکُنْ لَّه‘ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَلَمْ یَکُنْ لَّه‘ وَلِیٌّ مِنَ الذُّلِّ وَکَبِّرْهُ تَکْبِیْرًا. (سورہ بنی اسرائیل)

”اور کہہ دو سب تعریف اللہ جل شانہٗ کے لئے ہے جس نے نہ کسی کو اپنا بیٹا بنایا اور نہ ہی (دونوں جہان کی) بادشاہت میں اس کا کوئی شریک ہے اور نہ ہی وہ کمزور ہے کہ اس کا کوئی مددگار ہو اور اس کی خوب خوب بڑا بیان کیا کرو“۔

اس حکم کی بنیاد یہ ہے کہ بچے کے صاف ذہن پر اولین نقش عقیدۂ توحید کا ہونا چاہئے وہ آئندہ کسی بھی قسم کے شائبہ شرک کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہو اسی طرح یہ ہدایت دی گئی کہ بچہ جب سات سال کا ہوجائے تو اسے نماز پڑھنے کا حکم کرو اور جب دس سال کا ہوجائے اور نماز نہ پڑھے تو

اس کو سزا دو تا کہ شروع ہی سے بچہ دین کی باتوں سے واقف اور کسی نہ کسی حد تک دین اسلام اور قرآن سے وابستہ رہے۔ نیز معاشرہ کی خرابیوں کی بنیاد مٹانے کے لئے شریعت نے بچوں کے متعلق دو اہم ہدایات دیں، کہ جب بچہ کی عمر نو سال کو پہنچے تو اس کا بستر الگ کر دیا جائے اور جب سترہ سال کا ہو جائے تو اس کی شادی کر دی جائے۔ (حصن حصین ص ۱۶۷)

والدین اگر شروع سے ان چیزوں کا خیال رکھیں تو بچہ بعد میں کسی غیر اسلامی ماحول سے متاثر نہ ہوگا۔ معاشرہ کی اصلاح ہوگی، دین کی طرف نہ صرف عام رغبت پیدا ہوگی بلکہ معاشرہ سے جرائم اور افعام خبیثہ کا خاتمہ بھی ہو سکے گا۔

آج کل ہمارے معاشرہ میں بچوں کی صحیح تربیت میں جس قدر کوتاہی ہو رہی ہے، اتنی شاید ہی کسی اور کام میں ہو، جس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ دین بیزاری اور مغرب پرستی تو الگ رہی والدین کے ساتھ بے رحمانہ سلوک، نافرمانی وغیرہ کے جو افسوسناک حادثات سامنے آتے رہتے ہیں وہ سب اسی کوتاہی کا ثمرہ ہیں۔ اور اب عیسائی مشنریوں کے زیر انتظام چلنے والے نرسری اور کانوینٹ اسکولوں میں مسلم معصوم بچوں کی ''برین واشنگ'' نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی ہے پہلے تو مسلم بچے گھر میں والدین کے کچھ دینی اثرات قبول کر لیا کرتے تھے اب ان اسکولوں میں داخلہ نے یہ موقع بھی ختم کر دیا ہے، عموماً بڑے اور مالدار مسلم گھرانے کے ذہین بچے ایسے ہی اسکولوں میں تعلیم پاتے ہیں۔ اور شروع ہی سے دین سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ پھر گھر گھر میں موجود ٹیلی ویژن کی لعنت ماحول بگاڑنے میں اور اخلاقی قدریں پامال کرنے میں جلتی پر تیل کا کام کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو بچہ آنکھ کھولتے ہیں ٹی وی کے پردے پر تھرکتی ہوئی تصویریں دیکھے گا اور فلمی نغمے سنے گا اور یاد کرے گا تو اس سے بڑے ہو کر ان حرکتوں کے سوا کسی اور چیز کی کیا توقع رکھی جا سکتی ہے۔

یہ صورتِ حال ہم سب کے لئے لمحہ فکریہ ہے، اور اس کے تدارک کی فکر کرنا بشمول علماء امت سب کے لئے ضروری اور لازم ہے۔ آج اگرچہ جگہ جگہ ایسے نرسری اور پبلک اسکول موجود ہیں

جس کے منتظم مسلمان ہیں، وہ چاہیں تو اس کے اندر مناسب تبدیلی کر کے کافی حد تک اس صورت حال کو بدلنے میں مدد دے سکتے ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ عام طور پر اس طرح کے ادارے صرف تجارتی مقصد سے قائم کئے جاتے ہیں اور ان میں قومی و ملی ضرورتوں کا قطعاً خیال نہیں رکھا جاتا۔ خود شہر مراد آباد میں بعض معیاری انگلش میڈیم پبلک اسکول ہیں جو مسلمانوں کی ملکیت ہیں۔ مگر ان کی کسی بھی چیز سے یہ اندازہ نہیں لگایا جاسکتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے ادارے ہیں۔ ادارہ کے مالکان اسے کاروبار سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے۔

اسی طرح بعض دینی مدارس میں بھی چھوٹے بچوں کی تعلیم و تربیت کا کما حقہٗ نظم نہیں ہے پھر مدارس میں پڑھنے والے بچے چونکہ اکثر غریب گھرانے کے ہوتے ہیں جن کا لباس وغیرہ دنیا داروں کی نظروں میں زیادہ اعلیٰ نہیں ہوتا، اس لئے یہ دیکھا جاتا ہے کہ مالدار گھرانے کے لوگ مدارس میں اپنے بچوں کو نہیں بھیجتے اور یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ وہاں جا کر ہمارے بچے کا رہن سہن خراب ہو جائے گا۔ اور بعض لوگ ان باتوں سے قطع نظر اپنے بچوں کی مفت تعلیم پسند نہیں کرتے بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ تعلیم ایسے اسکولوں میں دلائی جائے جہاں فیس سب سے زیادہ ہو اور اسی کو اپنے لئے باعث فخر سمجھتے ہیں۔ ان سب حالات کے پیش نظر آج وقت کی اوّلین ضرورت ایسے اسلامی نرسری اسکولوں کا قیام ہے جن میں:

(الف) فیس لے کر تعلیم کا نظم ہو۔

(ب) اسکول کا ڈریس اسلامی ہو۔ (کرتا پاجامہ اور ٹوپی وغیرہ)

(ج) مروجہ علوم کے ساتھ ساتھ باقاعدہ دینی عقائد اور اعمال سکھانے کا نظم ہو۔

(د) قرآن کریم کی صحیح تعلیم داخل نصاب ہو۔

(ہ) تعلیمی معیار ان اسکولوں سے اعلیٰ ہو جو عیسائی مشنریوں کی طرف سے چلائے جارہے ہیں۔

(و) اسکول میں صبح کو پڑھا جانے والے ترانے وغیرہ ایسی نظموں پر مشتمل ہو، جو عقائد کے علاوہ اسلامی تاریخی معلومات کو شامل ہوں تاکہ بچے کے ذہن میں دین کی ضروری باتیں نقش ہو سکیں۔

یہ بات باعث اطمینان ہے کہ بعض خیر خواہانِ ملّت نے ضرورت محسوس کر کے ایسے ادارے مختلف شہروں میں قائم کئے ہیں جن کے ابتدائی مرحلہ میں ہی مفید نتائج برآمد ہو رہے ہیں۔ اتنا ہی کافی نہیں بلکہ ہر بڑے شہر میں ایسے اسکول قائم ہونے چاہئیں اور خاص کر پُرفضا مقامات پر ایسے اداروں کا قیام ان کی افادیت کا دائرہ اور بڑھا سکتا ہے۔ مثلاً نینی تال، مسوری اور شملہ وغیرہ جہاں اور بھی عالمی اسٹینڈرڈ کے اسکول موجود ہیں، جن میں سے بعض تو صرف کسی خاص مذہبی فرقہ کے لئے مخصوص ہیں۔ مسوری (دہرہ دون) میں ایک انٹرنیشنل اسکول ہے جس میں صرف سکھوں کے بچے پڑھتے ہیں۔ اور ابتداء ہی سے انھیں ''سکھ ازم'' کی نہ صرف تعلیم دی جاتی ہے بلکہ لباس بھی وہی پہنایا جاتا ہے۔ اس اسکول کا چھوٹے سے چھوٹا بچہ بھی آپ کو پگڑی باندھے ملے گا۔ اس اسکول میں سکھوں کے اعلیٰ اور مالدار طبقہ کے بچے پڑھتے ہیں اور غیر ممالک میں بسے ہوئے سکھ بھی ابتدائی تعلیم کے لئے اپنے بچوں کو اسی اسکول بھیجتے ہیں۔ ایک بچہ کی تعلیمی فیس کے نام پر ماہانہ ۵/سے ۱۰، ہزار روپے لئے جاتے ہیں اس طرح کے اسکول ہمیں ہماری ملی ذمہ داریوں کا احساس دلاتے ہیں۔ ہمیں اگر اپنی انفرادیت اور تشخص کی حفاظت کرتے ہوئے دنیوی ترقی کرنی ہے تو ہمارے ارباب حل وعقد کو بھی یہی راستہ اختیار کرنا چاہئے۔ یہ راستہ اگرچہ شور شرابے، نعروں کی آوازوں اور صدائے تحسین سے دور ہے لیکن اس راہ میں جدوجہد، آنے والی نسلوں کے لئے روشنی کا مینار اور ملّت کے مستقبل کی تابناکی کی ضمانت بن سکتی ہے۔ دینی جماعتوں، کونسلوں اور بورڈوں کو اس طرف خاص توجہ کرنی چاہئے۔

اس کے ساتھ ساتھ ایسے دینی اداروں کی بھی شدید ضرورت ہے جہاں نئے زمانہ کے معیار کے مطابق تربیت اور تعلیم کی پوری سہولیات میسر ہوں تاکہ اونچے اور مرفہ الحال مسلم طبقے کے بچوں کو بھی دینی تربیت کی طرف راغب کیا جا سکے۔ چند سال قبل جب دارالعلوم دیوبند کی طرف سے دارالتربیت للاطفال (بچوں کے تربیتی مدرسہ) کے قیام وتاسیس کا اعلان کیا گیا تھا۔ تو بہت سے مالدار ملنے والوں نے اس تجویز پر بے انتہا خوشی اور اطمینان کا اظہار کیا تھا اور وہ منتظر تھے کہ کب یہ

ادارہ اپنا کام شروع کرے اور وہ اپنے بچوں کو اس میں داخلہ کے لئے بھیجیں۔ آج بھی قوم کی نگاہیں دارالعلوم کی طرف لگی ہوئی ہیں اور کتنے ہی لوگ اس مبارک ومسعود گھڑی کے منتظر ہیں جب دارالعلوم جیسی عظیم اسلامی یونیورسٹی کے زیر انتظام مسلم بچوں کی دینی تربیت کا منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچ کر ملی خدمات کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کرے۔ دُعا ہے کہ یہ خواب جلد از جلد شرمندۂ تعبیر ہو۔ اس راہ میں پیش آمدہ رکاوٹیں دور ہوں اور ملت اسلامیہ ایک بار پھر اپنے چھوڑے ہوئے راستہ پر چل پڑے۔ آمین۔

(ندائے شاہی، فروری ۱۹۹۲ء)

کامیابی کی تلاش

صحیح حدیث میں وارد ہے کہ ایک مرتبہ حضور اکرم ﷺ نے حضرات صحابہؓ سے ارشاد فرمایا : کہ عنقریب وہ زمانہ آنے ولا ہے کہ تم پر دنیوی خزانوں کے دروازے کھول دئے جائیں گے۔ یہاں تک کہ تم اپنے گھروں کو اس طرح سجانے لگو گے جیسے بیت اللہ شریف کو سجایا جاتا ہے (یعنی گھروں کی زیب وزینت اور نقش ونگار کے مشغلوں میں لگ جاؤ گے) حضرات صحابہؓ نے عرض کیا کہ اس وقت ہم اپنے دین پر قائم رہیں گے؟ آپ نے فرمایا: کہ ہاں تم مسلمان ہی ہوگے۔ اس پر حضرات صحابہؓ نے فرمایا کہ پھر ہم اس دن آج سے زیادہ اچھی حالت میں ہونگے، آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ نہیں! بلکہ تم لوگ آج اس دن کے مقابلہ میں زیادہ بہتر حال میں ہو۔ (طبرانی مجمع الزوائد۹/۲۹۱)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نظر میں امت کی بہتری مال ودولت، اور آرام وآسائش کی بہتات میں نہیں بلکہ امت کی فلاح اور کامیابی کی اصل علامت دینداری اور فکر آخرت ہے۔ جسکا سب سے اعلی نمونہ زمانۂ نبوت اور حضرات صحابہؓ کی پاک زندگیوں میں پایا جاتا تھا۔ آپکے ارشاد کا صاف مطلب یہ ہے کہ دنیا کتنی ہی ترقی کرلے، اور مادی اسباب ووسائل کی جتنی بھی فراوانی ہوجائے یہ چیزیں امت محمدیہ کا اصل سرمایہ نہیں بلکہ اس کا سب سے قیمتی ورثہ دین وایمان اور شریعت سے لگاؤ اور وابستگی ہے۔ اگر اس جذبہ کی پختگی کے ساتھ دنیوی ترقی حاصل ہے تو بے شک مبارکبادی کے قابل ہے، لیکن اگر دین سے وابستگی کے بغیر دنیا میں اشتغال ہو تو یہ کوئی فخر یا فلاح کی چیز نہیں۔

افسوس ہے کہ آج اس ارشاد نبوی کے برعکس ہم نے تمام تر ترقیوں کا مدار دنیوی اسباب تعیش کے حصول کو سمجھ لیا ہے، جس مجلس میں جائیے بس یہی تذکرہ ملے گا کہ مسلمان ترقی میں پیچھے ہیں، مسلمان زمانہ کی دوڑ میں سست رفتار ہیں وغیرہ وغیرہ۔ پھر مشورے دئے جاتے ہیں کہ مسلمانوں کو قدامت پسندی چھوڑ کر ''ماڈرن ازم'' کو اپنانا چاہئے۔ اور انہیں رفتار زمانہ سے ہم آہنگ ہونا چاہئے۔ اور انہیں ہر میدان میں دنیا کی امامت وقیادت کے لئے سامنے آنا چاہئے۔ اسی ضمن میں انکا روئے سخن علماء کی طرف بھی ہو جاتا ہے کہ یہی قدامت پسند علماء مسلمانوں کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ اور نعوذ باللہ ان لوگوں نے ہی قوم کو پسماندگی کے غار میں ڈھکیل رکھا ہے۔ الغرض جتنے منہ اتنی باتیں، مگر یہ سب تبصرے اور مشورے درحقیقت مشورہ نوازوں کی کم فہمی، ناواقفیت بلکہ کج فہمی کی دلیل ہیں۔ علماء کے اور ان جدت پسندوں کے نظریہ میں بنیادی فرق یہ ہے کہ علماء کی نظر دینی اور اخروی کامیابی پر ہے جبکہ جدید طبقہ کو صرف دنیوی زندگی کی فکر ہے۔ علماء کا کہنا یہ ہے کہ جدید علوم ومعارف کا حصول اسلامی ماحول اور تہذیب کے دائرہ میں رہ کر ہونا چاہئے۔ جبکہ جدت پسندوں کا عمل یہ ہے کہ مسلمان سچا مسلمان بنے نہ بنے مگر علوم جدیدہ کا ماہر ضرور ہو جائے۔ انہیں اسکے دین وایمان اور عقیدہ کی بربادی پر ذرہ برابر بھی غم نہیں ہوتا۔ اور علماء کی نظر میں سب سے بڑا المیہ علوم جدیدہ سے محرومی نہیں بلکہ دین وایمان اور اسلامی اخلاق کا دیوالیہ پن ہے جو مسلم معاشرہ میں تیزی سے نفوذ کر رہا ہے۔

علماء اسلام سائنس، ٹکنالوجی اور جدید علوم کے حصول کے ہرگز مخالف نہیں بلکہ ان علوم وحکم پر بجا طور پر مسلمانوں کا حق سمجھتے ہیں مگر انکا موقف یہ ہے کہ یہ سب علوم دین کی بنیادی تعلیمات سے آراستہ ہونے کے ساتھ حاصل کئے جائیں تاکہ اخروی کامیابی کی اصل منزل تک پہنچنے میں دشواری نہ ہو۔ گذشتہ سالوں میں تیزی کے ساتھ مسلمانوں میں عصری تعلیم کا رجحان بڑھا ہے۔ بڑے شہروں اور آبادیوں میں جابجا نرسری سے لیکر متوسط درجات تک کے انگلش میڈیم اسکولوں کی بہتات ہوگئی ہے۔ مگر نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان اسکولوں اور عیسائیوں کے اسکولوں

کے ماحول میں ظاہری طور پر کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا، نظام تعلیم، ڈریس، انداز گفتگو، کسی چیز میں بھی اسلامی شناخت کا کوئی عنصر نظر نہیں آتا۔ اگر کسی اسکول میں دینیات کا کوئی خانہ ہے تو وہ محض رسم کی حد تک ہے۔ اس پر ایک فیصد بھی توجہ نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ان اسکولوں میں پڑھنے والے مسلمان بچے وہاں سے دینداری اور اسلامی اخلاق سے آراستہ ہوکر نہیں نکل سکتے، بلکہ وہ اپنے اساتذہ اور ذمہ داران کی طرح پوری زندگی مغربی تہذیب کی مرعوبیت اور اسکے طور طریقوں سے انسیت کی راہ پر گامزن رہیں گے۔

اس لئے موجودہ دور میں اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ مسلمانوں کے زیر انتظام چلنے والے عصری تعلیمی اداروں کے ماحول کو اسلامی رنگ میں ڈھالنے پر محنت کی جائے۔ اور ان اداروں کو محض کاروباری کمپنی کا درجہ دینے کے بجائے اسلامی اخلاق کے فروغ اور اسلامی شناخت کے تحفظ کی آماجگاہ بنا دیا جائے۔ اور یہ یاد رکھیں کہ مسلمان طالب علم کے دیندار بن کر علوم جدیدہ حاصل کرنے سے اسکے معاش میں کوئی کمی ہرگز نہیں آئے گی، بلکہ ممکن ہے کہ اسکی دیانت وامانت اور ظاہری وجاہت کی بنیاد پر اوروں سے زیادہ اسکے لئے فراہمیٔ معاش کے دروازے کھل جائیں۔ جیسا کہ تجربہ اور مشاہدہ سے واضح ہے۔

گذشتہ مہینہ جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام دہلی میں ''اسلامی ماحول میں عصری تعلیم'' کے عنوان پر ایک انتہائی اہم کانفرنس منعقد ہوئی جسمیں عصری علوم کے ماہرین اور دانشوروں کو خصوصیت کے ساتھ مدعو کیا گیا۔ لیکن اسمیں شرکت کرنے والے مسلم ماہرین تعلیم، پروفیسر، دانشور اور وائس چانسلر حضرات کی وضع قطع ہی اولاً غیر اسلامی تھی، انہیں اتنا بھی احساس نہ ہوا کہ ایک دینی جماعت کے پروگرام میں اسلامی ماحول کی ترویج پر بحث کرنے کے لئے جا رہے ہیں تو کم از کم اپنے ظاہر ہی سے اسلامی اقدار کا ثبوت دیدیں مگر احساس تو جب ہوتا جب اسلامی تہذیب سے انہیں کوئی دلچسپی ہوتی، وہاں تو سرے سے اس کا فقدان ہے، اور انکا یہی رویہ ہمیشہ علماء کے لئے خلش کا باعث بنتا رہا ہے، دین پر عمل اور اسکی بقا کی ذمہ داری تو ہر مسلمان کی ہے، صرف علماء ہی اسکے ذمہ

دار نہیں ہیں، پھر دین سے یہ بے زاری کیوں؟ کم از کم ہمیں اپنے برادران وطن سکھ قوم سے سبق حاصل کرنا چاہیئے جو زندگی کی ہر دوڑ میں امتیاز رکھتی ہے مگر اسنے آج تک اپنے مذہبی شعائر اور تشخصات کو سینے سے لگا رکھا ہے اور وہ انکو کسی قیمت پر ترک کرنے کے لئے تیار نہیں ہے، تو کیا اگر سکھ اپنی مذہبی شناخت کے ساتھ دنیوی ترقی کرسکتا ہے تو مسلمان اسلامی تہذیب اختیار کرتے ہوئے ترقی نہیں کرسکتا؟ کیا اسلامی لباس پہننے سے کسی وائس چانسلر یا پروفیسر یا دانشور کی عزت یا علم میں فرق آجائے گا؟ دراصل بات صرف ذہنی غلامی اور مرعوبیت کی ہے، مغرب کی غلامی کا زہر جدت پسندوں میں اس قدر سرایت کرچکا ہے کہ وہ اپنا ہی لباس اور طور طریقہ اختیار کر کے خواہ مخواہ اپنے کو بے عزت محسوس کرتے ہیں۔ **نعوذ باللہ من ذلک.**

بہرحال ان مدعو حضرات نے اسلامی ماحول کی کانفرنس میں غیر اسلامی خط وخال کے ساتھ شرکت کی اور پھر طرہ یہ کہ جب مائک پر آئے تو موضوع پر زور دینے کے بجائے مدارس اسلامیہ میں عصری تعلیم لازمی طور پر داخل کرنے کی وکالت شروع کردی، حالانکہ یہ بات اصل موضوع ہی کے خلاف تھی، مدارس اسلامیہ جو دینی خدمت انجام دے رہے ہیں انکے نصاب میں عصری علوم کی بڑی مقدار میں شمولیت سے تحریک مدارس کا حلیہ ہی بگڑ جائے گا۔ اور جب تحریک اپنے نصب العین ہی سے ہٹ جائے گی تو بے مقصد جدوجہد کے علاوہ اسکا کوئی نتیجہ نہ نکل پائے گا۔ آج ضرورت مدارس کے نصاب میں تبدیلی کی نہیں بلکہ مسلم اسکولوں کے ماحول میں تبدیلی کی ہے، اسکولوں کا ماحول اسلامی بنے، بچوں کا لباس، اور بالوں کی تراش خراش اسلامی انداز میں ہو، تاکہ معلوم ہوسکے کہ یہ کسی مسلم اسکول کا طالب علم ہے، شرعی تعلیمات کی روشنی میں یہی راستہ کامیابی اور بہتری ہے۔

مگر آج کے دانشور اس جوکھم کو اٹھانے کے لئے شاید تیار نہیں ہیں، بلکہ جس ملحدانہ ماحول میں انہوں نے خود پرورش پائی ہے اسی بد دینی کے ماحول میں ملت کے ہونہاروں کو پروان چڑھتے دیکھنا چاہتے ہیں، حالانکہ ملکی اور بین الاقوامی حالات سے سبق لیتے ہوئے اور واقعی دانشمندی کا ثبوت

دیتے ہوئے انہیں سب سے زیادہ اپنی شناخت اور تشخص کی حفاظت پر زور دینا چاہئے، اسکے بغیر مسلمانوں کی ترقی کا خواب دیکھنا محض افسانہ ہے جسکا حقیقت کی دنیا میں کوئی وجود نہیں ہے۔ کاش کہ مسلمان اس حقیقت کو سمجھ لیں۔ اور دین کی بقا اور اسکی اشاعت اور اپنی نسلوں کے ایمان کے تحفظ کے اسباب مہیا کرنے سے دریغ نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو فہم سلیم عطا کرے، اور آخرت کی اصل کامیابی کے حصول کا بھرپور شوق عطا فرمائے۔ آمین.

(ندائے شاہی ستمبر ۲۰۰۰ء)

ذہنی ارتداد

آج کل جیسے جیسے مسلمانوں میں مال و دولت کی کثرت ہوتی جارہی ہے اسی رفتار سے معیاری کانوینٹ نرسری اسکولوں میں بچوں کو داخل کرنے کا رجحان بھی بڑھتا جارہا ہے۔ یہ نرسری اسکول ہر شہر اور قصبہ میں قائم ہیں اور انھیں مکمل پلاننگ کے تحت چلایا جارہا ہے۔ ان میں زیادہ تر تعداد ایسے اسکولوں کی ہے جن کا تعلق عیسائی مشنریوں سے ہے۔ دوسرے نمبر پر ہندوؤں کے سناتن دھرمی اسکول (ایس ڈی اسکولز) اور تیسرے نمبر پر آریہ سماج تنظیموں کی طرف سے چلائے جانے والے ڈی، اے، وی، پبلک اسکولوں کا درجہ ہے۔ ان اسکولوں کا ماحول پورے طور پر اپنی انتظامیہ کے مذہبی نظریات کی عکاسی کرتا ہے۔ اور خاص طور پر ایس ڈی اور ڈی اے وی پبلک اسکولوں کا قیام ہندوؤں کی شدت پسند تنظیم آر ایس ایس کے منصوبہ کا اہم حصہ ہے جب کہ عیسائی مشنریوں کے اسکول جابجا عیسائیت کی تبلیغ کے مرکز بنے ہوئے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کی ذہنیت کی تبدیلی اور برین واشنگ (دماغ کی صفائی) کا کام ان اسکولوں میں نہایت خوبصورت انداز میں کیا جارہا ہے اور غیر محسوس طریقے پر معصوم بچوں کے ذہنوں میں عیسائیت کا زہر سرایت ہورہا ہے۔ ابھی چند روز قبل مخدوم گرمی امیر الہند حضرت مولانا سیّد اسعد صاحب مدنی صدر جمعیۃ علماء ہند نے بنگلور کے ایک صاحب کا واقعہ سنایا کہ ان کا بچہ مشن اسکول میں پڑھتا تھا۔ ایک دن بچہ کے سامنے کسی بات پر باپ کے منہ سے یہ کلمہ نکل گیا ''سب کچھ کرنے والا ایک اللہ ہے'' تو یہ سن کر بچہ برجستہ بولا ''نو! گاڈ اِس تھری'' (نہیں خدا تو تین ہیں، ایک نہیں) ظاہر ہے کہ مسلم گھرانے میں پیدا ہونے والے بچہ کو ابتدا ہی سے جب یہ باور کرایا جائے گا کہ خدا تین ہیں تو بڑے ہوکر کیسے اس کا ایمان سلامت رہے گا؟ آج عیسائی اسکولوں میں پڑھنے والا بچہ اپنے

پیغمبر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتنا احترام نہیں کرتا جتنا حضرت عیسیٰ کا احترام کرتا ہے اس لئے کہ اس کے سامنے اس کی استانیاں صرف حضرت عیسیٰؑ ہی کی اچھائیاں بیان کرتی ہیں۔ اور بچہ اسی رنگ میں رنگتا چلا جاتا ہے یہ صورتحال نہایت خطرناک ہے اور دردمندان ملّت کے لئے سوہانِ روح بنی ہوئی ہے۔ عیسائیت کی یہ تحریک اب برصغیر میں ایک تناور درخت میں تبدیل ہوچکی ہے۔ بنگلہ دیش جیسے خالص اکثریتی مسلم ملک میں ساٹھ ہزار سے زیادہ عیسائیت کے تبلیغی مراکز قائم ہیں جو تمام مادی وسائل کے ساتھ مسلم بچوں کو مرتد بنانے میں مصروف ہیں اور عیسائیوں کی عالمی مشنریاں ان کا مکمل تعاون کررہی ہیں حتی کہ نوبل انعام یافتہ عیسائیت کی مبلّغہ ''مدرٹریسا'' نے اعلان کیا ہے کہ آئندہ پچاس سالوں میں (خدانخواستہ) بنگلہ دیش ایک عیسائی ملک بن جائے گا۔ خود ہندوستان کے مغربی بنگال میں ''بھانگڑ'' نامی مقام پر عیسائی مشن نے ۸۰۰ مسلم بچوں کو ان کے ماں باپ سے عہد نامہ لکھوا کر اپنی تحویل میں لے لیا ہے تاکہ انھیں اپنی مرضی سے تعلیم دلاسکیں۔ الغرض یہ کانوینٹ مشن اسکول پورے ملک میں عیسائیت کی ترویج اور اشاعت میں لگے ہوئے ہیں اور مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ محض اپنے فیشن اور اسٹینڈرڈ کو برقرار رکھنے کے لئے اپنی اولاد کو یہ میٹھا زہر پلانے میں مصروف ہے۔

اس ذہنی ارتداد میں ایس، ڈی اور ڈی، اے، وی اسکولوں کا حال بھی مشن اسکولوں سے مختلف نہیں ہے جہاں کے نصاب میں رام اور رامائن اور آریہ سماجی مذہبی رہنماؤں کی سوانح حیات اس انداز میں پڑھائی جاتی ہے کہ بچہ کے ذہن میں ان شخصیات کی عظمت راسخ ہوجاتی ہے اور شرک و بت پرستی کی نفرت اس کے دل سے محو ہوجاتی ہے۔ پھر ماحول، لباس اور طرز زندگی وہی سکھایا جاتا ہے جو ان کا مذہبی خاصہ ہے اور خدا شناسی اور اسلامی رہن سہن سے دوری ہوتی چلی جاتی ہے۔ ایسے ماحول میں پڑھنے والا بچہ جب بڑا ہوتا ہے تو اس کے دل میں اسلام سے متعلق سخت قسم کے شکوک وشبہات پیدا ہوتے ہیں۔ شریعت کی پابندی اس کے لئے نہایت مشکل ہوتی ہے اور بسا اوقات وہ ایمان سے ہی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ العیاذ باللہ۔

مسلمانوں کے اسکول

مسلمانوں نے گو کہ اب بہت سے نرسری اور پبلک اسکول قائم کر لئے ہیں لیکن بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان میں کم از کم ۷۵ فیصدی ایسے اسکول ہیں جن کے قیام کے پیچھے صرف اور صرف کمائی کا مقصد کارفرما ہے انھیں تعلیم یا تربیت سے کوئی سروکار نہیں۔ بس کمائی عمدہ ہونی چاہئے۔ یہی ان کا مطمح نظر ہے۔ اور جہاں کچھ معیاری اسکول قائم ہیں ان میں اکثریت ایسے اسکولوں کی ہے جن کی انتظامیہ عیسائیوں اور ہندوؤں سے ضرورت سے زیادہ مرعوبیت کا شکار رہتی ہے۔ وہ ہر وقت اس ادھیڑ بن میں رہتے ہیں کہ کیا ایسی شکل اختیار کی جائے جس سے ہمارے اسکولوں میں پڑھنے والے مسلم بچہ کی اسلامی نشانی مٹ سکے۔ چنانچہ ان کے ڈریس میں انگریزی بال، ٹائی، نیکر قمیص، اور بچیوں کے لئے اسکرٹ وغیرہ لازمی ہوتے ہیں۔ صبح کو پڑھی جانے والی دعا میں ایسی چیزیں شامل کی جاتی ہیں جس سے سراسر سیکولرازم کا ثبوت ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور اگر آپ ان اسکولوں کے احاطہ میں چلے جائیں تو کسی بھی چیز سے یہ اندازہ نہیں لگایا جاسکتا ہے کہ یہ کسی مسلمان اسکول کی عمارت ہے۔ مرادآباد کے ایک مشہور مسلم پبلک اسکول کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہاں کے ایک دیندار ماسٹر نے جب پرنسپل سے درخواست کی کہ اسکول کے نمازی طلبہ اور ملازمین کے لئے کوئی کمرہ مخصوص کر دیا جائے تاکہ وہ وہاں نماز ادا کرلیا کریں۔ تو پرنسپل نے صاف جواب دے دیا کہ ''ہم ایسا نہیں کریں گے، کیونکہ اس عمل سے دیگر مذہب سے متعلق بچوں کو اذیت ہوگی'' یہ ہمارا خود اپنے اداروں میں دوسروں سے مرعوبیت کا حال ہے کہ بچوں کو نماز کی تلقین تو کجا، وہ پڑھنا بھی چاہیں تو ان کے لئے نماز کی جگہ کا انتظام کرتے ہوئے بھی دم نکلتا ہے۔ عجیب معاملہ ہے! دوسرے باطل مذہب کے لوگ تو اپنے اسکول کے ذریعہ بےخوف وخطر ہوکر اپنے مذہب کی اشاعت کررہے ہیں۔ اور ہم حق پر ہونے کے باوجود اپنے اختیاری اداروں میں بھی اسلامی نشانیاں برقرار رکھتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ دراصل یہ بھی انہی نرسری اسکولوں کے مضر اثرات میں سے ایک ہے۔ اس لئے کہ آج مسلمانوں کے کانوینٹ چلانے والے بھی وہی لوگ ہیں جو پہلے

غیروں کے نرسری اسکولوں میں پڑھ چکے ہیں تو جو غیروں سے مرعوبیت کا مزاج ان کا بچپن میں بن چکا ہے وہ اب کیسے تبدیل ہوسکتا ہے؟ آج یہ شور مچانے والے تو بے شمار ہیں کہ دینی مدارس میں عصری علوم داخل ہوں اور ٹیکنیکل تعلیم ہو وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ان مسلم اسکولوں میں اسلام کی بنیادی تعلیمات سے بھی دانستہ چشم پوشی کی جاتی ہے اس پر کسی نام نہاد دانشور کا خیال نہیں جاتا۔ اور ذہنی ارتداد کی جو وبا خوبصورت انداز میں پھیلتی جارہی ہے اس پر کسی کی پیشانی پر شکن نہیں آتی۔ حالانکہ ایک مسلمان کو تو سب سے زیادہ اپنے مذہب کی بقا کی فکر ہونی چاہئے۔ ایمانی حمیت کا تقاضا یہی ہے۔

اوّلین ضرورت

بہرحال اب بھی ہمیں ہوش میں آجانا چاہئے اور غیر مسلموں کے کانوینٹ اسکولوں سے جو ذہنی ارتداد پھیل رہا ہے اس کا مؤثر طور پر مقابلہ کرنے کا منصوبہ بنانا چاہئے۔ مگر پہلے یہ اچھی طرح سمجھ لیا جائے کہ اس فتنہ کا مقابلہ محض جذباتیت سے اور شور مچانے سے ہرگز نہیں کیا جاسکتا، بلکہ نہایت صبر وتحمل اور طویل المدتی منصوبہ کے ذریعہ ہی اس سیلاب پر بند لگایا جاسکتا ہے۔ جس طرح یہ اسکول پچاس سال کی متواتر جدوجہد کے بعد موجودہ ترقی کے مقام پر پہنچے ہیں۔ اسی طرح اگر آج ہم کام شروع کریں گے تو پچاس سال کے بعد کہیں جا کر اس کا ثمرہ اور نفع ظاہر ہوگا۔ آج ضرورت ہے کہ ہر بستی اور قریہ میں اعلیٰ معیاری نرسری اسکول قائم کئے جائیں جن میں خاص طور پر درج ذیل امور کا لحاظ رکھا جائے۔

(الف) اسکول کا ڈریس ایسا طے کیا جائے جس سے صاف معلوم ہو کہ یہ کسی اسلامی اسکول کا طالب علم ہے۔ مثلاً بچوں کے لئے ٹوپی اور بچیوں کے لئے ساتر دوپٹہ وغیرہ۔

(ب) اسکول کی دعائیہ پریڈ میں قرآن کریم، اسلامی دُعائیں اور نظمیں شامل کی جائیں۔

(ج) مسلم بچوں اور بچیوں کے لئے دینیات کا ایک درجہ لازمی رکھا جائے۔

(د) نصاب کے مضامین میں بھی اسلامی تہذیب کا خاص خیال رکھا جائے۔

(ہ) اگر سرکاری نصاب کی کتابیں اسکول میں داخل کرنا کسی وجہ سے ضروری ہو اور ان میں غیر اسلامی تہذیب کی باتیں مذکور ہوں تو استاد انھیں اس طرح پڑھائیں جس سے بچے کے دل میں اس غیر اسلامی تہذیب کی وقعت نہ پیدا ہو سکے۔

(و) اسکول میں نماز باجماعت کا نظم کیا جائے۔

(ز) اسکولوں میں اللہ کے مقبول بندوں اور اکابر علماء کی آمدورفت کا ماحول بنایا جائے۔ تاکہ بچوں کے دل میں اہل دین کی عظمت قائم ہو سکے۔

(ح) ان تمام امور کے ساتھ ساتھ اسکولوں کا تعلیمی معیار دنیوی اعتبار سے اتنا بلند ہو کہ وہ بڑے سے بڑے مشن اسکول کا مقابلہ کر سکے۔

(ط) اسکولوں کا مقصد صرف روپیہ کمانا نہ ہو جبکہ قومی مفادات اور تعلیمی ترقی اصل مقصود ہو۔

امید ہے کہ اگر ان مذکورہ بالا امور کی رعایت کر کے مسلم اسکول جا بجا قائم کئے جائیں گے تو نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کی دنیوی تعلیم میں ترقی ہوگی بلکہ دینداری کے اعتبار سے بھی اچھے اور مثبت نتائج سامنے آئیں گے۔ اور ذہنی ارتداد کا مقابلہ ہو سکے گا۔ اللہ تعالیٰ شرور وفتن سے تمام مسلمانوں کو محفوظ رکھے۔ اور سیدھے راستہ پر استقامت سے مالا مال فرمائے۔ آمین۔

(ندائے شاہی، مئی ۱۹۹۷ء)

مادّی ترقی کی لازمی صفات

عام طور پر یہ سوال ذہنوں میں گردش کرتا رہتا ہے کہ آج پوری دنیا میں مادّی اعتبار سے عیسائیوں اور اہل یوروپ کا غلبہ کیوں ہے؟ اور امریکہ کو ظلم وتعدّی کے باوجود اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتنی چھوٹ کیوں ملی ہوئی ہے؟ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ یہ لوگ اپنی نافرمانیوں اور سرکشیوں کی بنا پر دنیا سے نیست ونابود کر دیئے جاتے۔ مگر دنیا کے اعتبار سے آج یہی قومیں ترقی یافتہ ہیں۔ اور طاقت وقوت اور تعداد کے لحاظ سے ساری دنیا پر غلبہ حاصل کر رہی ہیں، معاشی اور اقتصادی میدان میں آج تمام ممالک مغرب کی شاطرانہ پالیسیوں کے دست نگر ہو چکے ہیں۔ انجمن اقوام متحدہ صرف نام کی بین الاقوامی مجلس ہے۔ ورنہ اب اس کا کام صرف اور صرف مغرب کے مفادات کا تحفظ ہی رہ گیا ہے۔

اس کے برخلاف مسلمان آج ہر جگہ مغلوب ہیں اور مخالف طاقتوں سے حد درجہ مرعوب ہیں۔ حتی کہ بہت سے ممالک میں حکمراں خود اپنے ملک میں بھی اپنی مرضی کے احکامات نافذ کرنے میں بے بس نظر آتے ہیں۔ اور انھیں اپنی ملکی پالیسی میں بھی چاروناچار یوروپ اور امریکہ کے پالیسی سازاداروں کی تابعداری کرنی پڑتی ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ آخر وہ کون سی خوبیاں ہیں جن کو اختیار کرنے کی وجہ سے آج مغرب ترقی پذیر ہے۔ اور جن سے محرومی کی وجہ سے آج مسلمان مغلوب اور مرعوب ہیں۔

آج سے چودہ سو سال پہلے حضرات صحابہؓ ایک مجلس میں احادیث طیبّہ کا مذاکرہ کر رہے تھے۔ ایک صحابی حضرت مستورد قرشیؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی نقل فرمایا کہ:

تَقُوْمُ السَّاعَةُ وَالرَّوْمُ اَكْثَرُ النَّاسِ.

''قیامت کے قریب رومی لوگ (عیسائی) سب سے زیادہ تعداد میں ہوں گے۔''

اس مجلس میں اپنے وقت کے جہاندیدہ اور سیاست کے ماہر صحابی حضرت عمرو بن العاصؓ بھی تشریف فرما تھے۔ وہ اس حدیث کو سن کر چونک گئے اور حضرت مستوردؓ سے مخاطب ہوکر کہنے لگے ابصر ماتقول؟ (ذرا سوچ سمجھ کر کہو کیا کہہ رہے ہو؟) حضرت مستوردؓ نے جواب دیا کہ میں تو وہی کہہ رہا ہوں جو میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ اس پر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد کی تائید اپنے وسیع تجربہ کی روشنی میں ان الفاظ سے فرمائی:

لَئِنْ قُلْتَ ذَاكَ اِنَّ فِيْهِمْ لَخِصَالاً اَرْبَعاً (١) اِنَّهُمْ لَاَحْلَمُ النَّاسِ عِنْدَ مُصِيْبَةٍ (٢) وَاَسْرَعُهُمْ اِفَاقَةً بَعْدَ مُصِيْبَةٍ (٣) وَ اَوْشَكُهُمْ كَرَّةً بَعْدَ فَرَّةٍ (٤) وَ خَيْرُهُمْ لِمِسْكِيْنٍ وَ يَتِيْمٍ وَ ضَعِيْفٍ (٥) وَ خَامِسَةٌ خَاصَّةٌ حَسَنَةٌ جَلِيْلَةٌ وَ اَمْنَعُهُمْ مِنْ ظُلْمِ الْمُلُوْكِ. (مسلم شریف ۲/۲۹۲)

''اگر تم جو کہہ رہے ہو وہ صحیح ہے تو واقعی رومیوں میں چار (قابل قدر) خصلتیں پائی جاتی ہیں۔ (۱) وہ فتنہ وفساد کے وقت ہوش سے کام لیتے ہیں جوش میں نہیں آتے۔ (۲) وہ مصیبت اور حادثہ میں مبتلا ہوکر جلد ہی سنبھل جاتے ہیں۔ (۳) انھیں اگر میدان سے بھاگنا پڑ جائے تو بہت جلد تیاری کر کے دوبارہ حملہ آور ہوتے ہیں (مایوس ہوکر بیٹھ نہیں جاتے) (۴) مسکین یتیم اور کمزوروں کے حق میں وہ بہت اچھے (مددگار) ثابت ہوتے ہیں اور پانچویں ایک اچھی صفت ان میں یہ ہے کہ وہ اپنے بادشاہوں کو مظالم سے روکنے والے ہیں۔ (یعنی عام طور پر ان کے حاکم اپنی رعایا پر ظلم نہیں کرتے)

واقعہ یہ ہے کہ یہی پانچ صفات دنیاوی ترقی کا ذریعہ ہیں اور آج بھی یہ پانچوں باتیں مجموعی طور پر عیسائیوں میں پائی جاتی ہیں۔ وہ سخت سے سخت حالات میں بھی حواس باختہ نہیں ہوتے بلکہ نہایت سوجھ بوجھ اور منصوبہ بندی کے ساتھ اپنے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں، اگر وقتی طور پر انھیں کہیں شکست کا بھی منہ دیکھنا پڑ جائے تو وہ بہت جلد پینترا بدل کر مقابلہ کے لئے میدان میں

آ جاتے ہیں۔ اس حکمت عملی کو اپنا کر انھوں نے اسپین سے اسلامی حکومت کا خاتمہ کیا۔ اور انہی صفات کی بدولت انھیں ترکی کی خلافت عثمانیہ کو تاخت وتاراج کرنے کا موقع ملا۔ اسی طرح آج پوری دنیا میں جہاں کہیں بھی کوئی قدرتی مصیبت آتی ہے۔ سیلاب ہو یا زلزلہ یا کوئی اور حادثہ، تو امداد کے لئے سب سے پہلے امریکہ اور یوروپ کے ہوائی جہاز پہنچتے ہیں۔ اور ریلیف کے کاموں میں دنیا کی اور کوئی قوم ان کا مقابلہ نہیں کر پاتی۔ بارہا اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔ نیز ان کے ممالک میں حاکموں کی طرف سے اپنی رعایا پر ظلم وجور اور ناانصافیوں کی شرح دیگر ممالک کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ مقدمہ چلائے بغیر عام طور پر حکومت کی طرف سے کسی کو سزا نہیں دی جاتی، خواہ وہ حکومت کا کتنا ہی بڑا دشمن کیوں نہ ہو۔ اسی طرح رشوت خوری اور کرپشن بھی دیگر ملکوں کے مقابلہ میں مغربی ممالک میں بہت کم ہے۔

مسلمانوں میں بھی جب تک یہ صفات نمایاں رہیں وہ ہر مرحلہ پر کامیابی اور سرخروئی سے سرفراز ہوتے رہے اور مغرب کی سازشیں ان پر زیادہ اثر انداز نہ ہو سکیں۔ لیکن جوں جوں ان صفات میں اضمحلال ہوتا گیا اسی رفتار سے ہم دوسروں سے مرعوب ہوتے چلے گئے۔ آج ہماری زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم ہر مسئلہ کو خالص جذباتی انداز میں سوچنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ اور جلد بازی ہماری فطرت بن چکی ہے۔ ہماری زندگی میں منصوبہ بندی اور پلاننگ کا فقدان ہے۔ ہماری حالت یہ ہے کہ جب جوش میں آتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ زمین آسمان ایک کر دیں گے۔ اور جب مایوسی چھاتی ہے تو ایسا لگتا ہے کہ جان ہی نہ رہی ہو۔ جہد مسلسل کا لفظ ہی زندگی سے نکل چکا ہے۔ اسی طرح آج خود مسلم ممالک میں وہاں کے باشندوں پر جیسے بھیانک مظالم ہوتے ہیں اور وہاں کس قدر امتیاز برتا جاتا ہے وہ اہلِ نظر سے مخفی نہیں ہے۔ اس لئے آپ اگر مسلمان مادی ترقی اور حکمرانی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انھیں بھی حلم و بردباری، سوجھ سوجھ منصوبہ بندی اور عدل و انصاف کے ساتھ مسلسل جدوجہد کی راہ پر گامزن ہونا چاہیئے ان صفات کو اختیار کئے بغیر مادّی ترقی کی تمنا فضول ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں عقل سلیم عطا فرمائے۔ آمین۔

(ندائے شاہی، جنوری ۱۹۹۷ء)

یہ بھی دین ہے!

دینی خدمت کے مختلف شعبے اور طریقے ہیں اور ان میں سے ہر شعبہ اپنی ذات کے اعتبار سے اہم ہے۔ کسی کی بھی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ یہ ہماری کوتاہ نظری ہے کہ ہم نے روایتی طریقہ پر دین کو چند شعبوں میں محدود کر دیا ہے۔ اور یہ سمجھنے لگے ہیں کہ فلاں فلاں کام کیا جائے تو ہی دین کا کام ہے ورنہ نہیں، اس طرز فکر کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہمارے دل میں دیگر شعبوں کے خدامِ دین کے متعلق بدگمانیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور ان کی خدمات کو ہم حقیر خیال کرنے لگتے ہیں۔ جب یہ جذبہ ذرا اور آگے بڑھتا ہے تو پھر شعبوں کے اعتبار سے امت باقاعدہ گروپوں میں بٹ جاتی ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ فلاں آدمی حلقہ سے متعلق ہے اور فلاں شخص کا تعلق فلاں جماعت اور طبقہ سے ہے۔ اور ہر طبقہ دوسرے طبقہ کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ حالانکہ بظاہر سب لوگ دین ہی کے نام پر کام کرنے والے ہوتے ہیں۔ اس گروپ بندی سے افراد کو چاہے فائدہ پہنچ جائے مگر مجموعی اعتبار سے دین کا نقصان ہوتا ہے۔ جو کام سب طبقوں کے اتفاق واتحاد سے انجام دیا جاسکتا تھا جب وہ خاص طبقہ تک محدود ہو جاتا ہے تو اس کی افادیت گھٹ جاتی ہے اور اس کے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہو پاتے۔

ہندوستان میں بظاہر اسباب اسلام اور مسلمانوں کی بقاء حفاظت اور اسلامی آثار و شعائر کے تحفظ کے لئے اس صدی میں تین تحریکات وقفہ وقفہ سے شروع ہوئیں۔ جو ابھی تک جاری ہیں اور انشاء اللہ جاری رہیں گی۔ پہلی تحریک دینی مکاتب و مدارس کے قیام کی شکل میں رونما ہوئی جس کا نقش اول دارالعلوم دیوبند تھا۔ اس تحریک نے پورے برصغیر۔ میں بستی بستی اور قریہ قریہ علوم دینیہ کے گہوارے قائم کئے۔ اور قرآن وحدیث کی مبارک مجلسیں آراستہ کیں اور ایسے عظیم خدام قوم کو

عطا کئے جنھوں نے اپنی بے لوث خدمات سے قوم کی کایا پلٹ ڈالی۔ اور دشمنوں کی آرزوؤں کا خون کر دیا۔ اسلام دوبارہ ہندوستان میں پھلنے پھولنے لگا۔ اور عوام میں وہ دینی اثرات رونما ہوئے کہ آج بہت سے مسلم ملک بھی اس طرح کے دینی ماحول سے بے بہرہ ہیں۔

اس کے بعد ۱۹۱۹ء میں ''جمعیۃ علماء ہند'' کے نام سے ایک ستارہ ملّی خدمت کے افق پر رونما ہوا۔ اس تنظیم کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں سیاسی اور قومی سطح پر مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ کیا جائے۔ یعنی ایک ایسا پلیٹ فارم بنایا جائے جہاں سے مسلمان اپنے حقوق کے تحفظ اور دینی و دنیوی آزادی کی بقا کے لئے آواز اٹھا سکیں۔ یہ بھی خدمت اسلام کا ایک نہایت اہم شعبہ ہے۔ اگر اس ملک میں ہمیں مذہبی آزادی نہ ملے گی تو پھر کوئی بھی دینی سرگرمی کسی بھی شکل میں جاری رکھنا سخت دشوار ہے۔ اس شعبہ سے متعلق لوگوں نے ماضی میں اور حال میں حقوق کے تحفظ اور شعائر اسلامی کی حفاظت کے لئے جو عظیم ترین مخلصانہ کارنامے انجام دیئے ہیں وہ آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ پارلیمنٹ اور اسمبلی کے ایوانوں میں ظلم کے خلاف آواز اٹھانا اور اخلاص کے ساتھ ''کلمۂ حق'' کہنے کا فریضہ ادا کرنا ہندوستان جیسے ملک میں بہت بڑی دینی خدمت ہے۔

ایک تیسری تحریک مسلمانوں کی مذہبی اصلاح کے مقصد سے ''تبلیغی جماعت'' کی شکل میں شروع ہوئی جو کام کرنے والوں کے بے پناہ اخلاص کی بدولت حیرت انگیز طور پر بہت جلد میوات کے پسماندہ علاقہ سے نکل کر نہ صرف برصغیر بلکہ عالم کے کونے کونے تک پہنچ گئی۔ لاکھوں بلکہ کروڑوں بندگان خدا اس تحریک سے وابستہ ہوکر جادۂ حق پر گامزن ہوگئے، مسجدیں آباد ہوگئیں، جگہ جگہ مسلمانوں جیسی صورتیں نظر آنے لگیں، زندگی کے نقشے بدل گئے، نہ جانے کتنے بدکار اور فاسق وفاجر تائب ہوکر متقی اور پرہیزگار بن گئے۔ بلاشبہ آج دنیا میں افراد اور تنظیم کے اعتبار سے ''تبلیغی جماعت'' سے زیادہ وسیع جماعت کوئی اور نہیں ہے۔

الغرض آج ہمارے سامنے خدمت کے تین میدان ہیں۔ (۱) مدارس (۲) ملی خدمات (۳) تبلیغ دین۔ ہمارے مشفق بزرگ اور مربی حضرت مولانا نسیم احمد صاحب فریدی امروہوی

رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ میرے نزدیک دارالعلوم دیو بند، تبلیغی جماعت اور جمعیۃ علماء ہند الگ الگ چیزیں نہیں بلکہ ایک جان کے تین قالب ہیں۔یعنی ان میں سے ہر کام ایک دوسرے سے انتہائی مربوط ہے اور یہ تینوں شعبے اپنی ترقی کے لئے ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ ذرا غور فرمایئے مدرسے نہ ہوتے تو علمی وراثت کی حفاظت کیسے ہوتی ؟ جمعیۃ علماء یا اس کے مقصد سے ہم آہنگ جماعتیں نہ ہوتیں تو اس غیر مسلم ملک میں مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ کیسے ہوتا؟ اور تبلیغی جماعت نہ ہوتی تو عوام میں دینی رجحان کیسے پیدا ہوتا۔ آج اگر تبلیغی جماعت مدارس سے علوم نبوت کی چاشنی اور رہنمائی حاصل کرتی ہے تو مدارس بھی تبلیغ کی محنت سے بھر پور فائدہ اٹھاتے ہیں مدرسہ میں آنے والے بہت سے بلکہ اکثر بچے وہ ہوتے ہیں جن کے والدین تبلیغ سے متاثر ہو کر ہی اپنے بچوں کو دینی تعلیم دلانے کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ گویا مدارس کو بھرنے اور دینی تعلیم گاہوں کو آباد کرنے میں تبلیغی محنت کا بھی کافی بڑا دخل ہے۔تو جس طرح تبلیغی جماعت مدارس سے مستغنی نہیں اسی طرح اہل مدارس بھی جماعت تبلیغ سے مستغنی ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ یہی حال ملی خدمات کے میدان میں ہے، تبلیغی جماعت اور مدارس دونوں کو اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کے لئے حکومت کی طرف سے آزادی کی ضرورت ہے۔ موقع بموقع مسلمانوں کے خلاف غیروں کی طرف سے آوازیں اُٹھتی رہتی ہیں ان کا دفاع کرنے کی ضرورت ہے تا کہ یکسوئی کے ساتھ تبلیغی اور تعلیمی فریضہ انجام دیا جائے اس ضرورت بلکہ لازمی ضرورت کی تکمیل جمعیۃ علماء ہند اور اس جیسی تنظیموں سے ہوتی ہے۔اس دینی خدمت پر اگر چہ ہماری اصطلاح میں سیاسی پردہ پڑا رہتا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ اس دور میں یہ خدمت ہندوستان جیسے ملک میں نہایت ضروری ہے اور باعث اجر بھی ہے۔ یہ میدان کانٹوں سے بھرا ہے۔ اس میدان میں نکل کر غیر تو دور رہے خود اپنوں کے لعن طعن سننے پڑتے ہیں، الزاموں سے پالا پڑتا ہے، عزتیں نیلام کی جاتی ہیں، پگڑیاں اچھالی جاتی ہیں، مگر جو مخلص خدام ہیں وہ ہنسی خوشی ان کانٹوں کے درمیان زندگی گزارتے ہیں۔

اس تحریر کا منشا یہ ہے کہ ہمیں اپنا رویہ بدلنا چاہیئے۔ ہم سے اللہ تعالیٰ جس میدان میں دین کی خدمت لے رہا ہے ہم اپنی وسعت کے بقدر اس میں لگے رہیں دوسروں پر انگلیاں نہ اٹھائیں، ان کو حقیر نہ جانیں، ان پر تبصرہ نہ کریں۔ نہ جانے کون اللہ کے نزدیک کتنا مقبول ہو اور نہ معلوم کس کا کون سا عمل بارگاہ ایزدی میں شرف قبولیت حاصل کر لے، اور ہم آخرت میں حسرت ہی کرتے رہ جائیں۔ خاص کر دین کو کسی خاص جماعت یا تحریک کے طریقوں میں محدود کر دینا تو بہت ہی خطرناک بات ہے۔ ہر طبقہ کو اس سے احتراز کرنا چاہیئے۔ چند افراد کی بدعملی کی وجہ سے پورے کام کو بدنام نہ کیا جائے۔ ہر جگہ اچھے اور بُرے لوگ ہو سکتے ہیں اور پائے جاتے ہیں۔ جب کام کی وسعت ہوتی ہے تو ہر طرح کے لوگ اس میں شامل ہو جاتے ہیں ان سے بنانے کی بات کرنی چاہیئے، بگاڑنے کی نہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کو اپنی مرضیات پر چلنے والا بنائے۔ آمین۔

(ندائے شاہی، نومبر ۱۹۹۵ء)

دین کے مختلف شعبے

دین کے کام بہت ہیں، اسی اعتبار سے دینی خدمت کے شعبے بھی بے شمار ہیں، ہر شعبہ اپنی اہمیت کے اعتبار سے ناگزیر بھی ہے اور لائق توجہ بھی ہے۔ ضروری ہے کہ ہر جگہ اور ہر زمانہ میں یہ سب لازمی شعبے زندہ رہیں۔ اور ان پر محنتیں کی جاتی رہیں۔ مثلاً چند شعبوں کے عنوانات یہ ہیں:

الف : اصلِ دین کا تحفظ

یہ عنوان بہت عام اور جامع ہے۔ اسکے تحت میں وہ تمام ضروری خدمات آئیں گی جو دین کی تعلیم سے متعلق ہیں اور اس عنوان کا مرکزی محور یہ ہوگا کہ جو دین آنحضرت ﷺ دنیا میں لیکر تشریف لائے اور جو ہم تک آپکے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اکابر علماء و صلحاء کے مستند واسطہ سے پہنچا اسکو بلا کم و کاست محفوظ رکھا جائے۔ یہ وہ بنیادی خدمت ہے جسکے ذریعہ یہ دین آج تک عالم اسباب میں محفوظ رہا ہے۔ پھر اس خدمت کے شعبے در شعبے ہوتے چلے جائیں گے۔ ایک شعبہ الفاظ قرآنی کی حفاظت کا ہوگا۔ ایک شعبہ تجوید اور حسن صوت سے متعلق ہوگا، پھر کچھ افراد معانی قرآن کے تحفظ کے لئے علم تفسیر کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیں گے، کچھ حضرات حدیث کے الفاظ و معانی پر محنت کرنے والے ہونگے، اور ایک جماعت تفقہ فی الدین کی خدمت سنبھالے گی، اور کچھ لوگ قرآن وسنت کی فہم کے لئے عربی زبان وادب اور نحو وصرف اور بلاغت میں مہارت پیدا کریں گے وغیرہ وغیرہ، الحمدللہ چودہ سو سال سے برابر امت میں ایسے باتوفیق رجال کار ہر زمانہ میں موجود رہے ہیں جنہوں نے ان سب شعبوں میں بفضل خداوندی کارہائے نمایاں انجام دیکر دین محمدی اور شریعت مصطفوی کو اپنی اصلی شکل وصورت میں باقی رکھا ہے۔ اور بحمدہ تعالیٰ آج بھی ایسے افراد کی کمی نہیں ہے۔

ب : راستہ کی رکاوٹوں کو دور کرنا

دین کا ایک بہت بڑا شعبہ یہ ہے کہ اگر کسی جگہ دین پر عمل کرنے میں کوئی رکاوٹ آرہی ہو تو ایک جماعت ان رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے سر ہتھیلی پر رکھکر مردانہ وار میدان میں آجائے۔ اور اسلام کی سربلندی کے لئے کسی بھی قربانی سے دریغ نہ کرے۔ اس شعبہ کا نام ''جہاد'' ہے جسکو حضور اکرم ﷺ نے ''اسلام کا سب سے چوٹی کا عمل'' قرار دیا ہے ذِرْوَۃُ سِنَامِہِ الْجِہَادُ. (مشکوۃ شریف ۱/۱۴) اور اس خدمت پر قرآن وسنت میں جس قدر عظیم الشان ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے اسمیں کوئی اور عمل اسکا ہم پلہ اور شریک نہیں ہے۔ محض جذبات میں آکر جہاد کے متعلق وعدوں کو کسی اور عمل پر منطبق نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم شرعی جہاد کے کچھ شرائط وآداب ہیں۔ اسکا حکم کب جاری ہوتا ہے؟ اور کہاں کس طرح کا جہاد مفید ہے اس بارے میں معتبر علماء سے معلومات حاصل کرنی چاہئیں۔ یہاں تو اس طرف توجہ دلانی ہیکہ دین پر عمل میں پیش آمدہ رکاوٹوں کو دور کرنے پر بھی ہر زمانہ میں متواتر محنتیں ہوتی رہنا ضروری ہیں۔ ورنہ ہم مغلوب ہوتے چلے جائیں گے۔ اور دشمن اس طرح حاوی ہوتا چلا جائے گا کہ ہم بعد میں ہاتھ پیر ہلانے کے قابل بھی نہ رہیں گے، لہذا مستقل بیدار اور تیار رہنے کی ضرورت ہے۔ ہندوستان جیسے غیر مسلم ملک میں جمعیۃ علماء جیسی ملی تنظیموں کا مقصد قیام بھی یہی ہے کہ دین و مذہب پر عمل کرنے میں جو رکاوٹیں آئیں انہیں دور کیا جائے۔ بلاشبہ یہ بھی ایک بڑی دینی خدمت ہے۔ تاکہ مسلمان عافیت کے ساتھ اپنے مذہبی امور انجام دے سکیں۔

ج : باطل عقائد ونظریات کی تردید

اسی طرح ایک بہت ہی ضروری شعبہ یہ ہے کہ دین کے نام پر جب دین کی جڑیں کھوکھلی کرنے کی سازشیں سامنے آئیں تو ایک جماعت ان سے سینہ سپر ہوکر احقاق حق اور ابطال باطل کا کام انجام دے۔ بفضلہ تعالیٰ آنحضرت ﷺ کی پیش گوئی کے مطابق قیامت تک ایسی مستعد جماعت امت میں برابر موجود رہے گی۔ ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ

:''میری امت میں برابر ایک جماعت امرِ حق پر مضبوطی سے ثابت قدم رہے گی اسکو کسی کی مخالفت نقصان نہ پہنچا سکے گی۔ **لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ اُمَّتِیْ قَوَّامَةً عَلٰی اَمْرِ اللّٰهِ لَا یَضُرُّهُمْ مَنْ خَالَفَهُمْ**. (فیض القدیر ۶/۴۸۷) اور ایک اور روایت میں ہے: کہ اس امت کے بعد میں آنے والے معتبر لوگ ہی علم کتاب وسنت کے حامل ہونگے۔ جو دین سے (۱) غلو پسندوں کی تحریفات (۲) باطل پسندوں کی فریب کاریوں (۳) اور جاہلوں کی فاسد تاویلات کا قلع قمع کر دیں گے۔ **یَحْمِلُ هٰذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلْفٍ عَدُوْلُهٗ یَنْفُوْنَ عَنْهُ تَحْرِیْفَ الْغَالِیْنَ، وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِیْنَ وَتَاوِیْلَ الْجَاهِلِیْنَ**. (رواہ البیهقی فی کتابه المدخل، مشکوٰۃ شریف)

معلوم ہوا کہ اس طرح کے مستقل شعبہ کا وجود بھی امت میں لازم ہے ورنہ یہ امتیاز ہی نہ رہے گا کہ کیا حق ہے اور کیا باطل؟ اور طاغوتی قوتیں محنتیں کر کے اصلی دین ہی کا حلیہ بگاڑ کر رکھدیں گی، اس لئے دین کے تحفظ اور اسکی ترقی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ان تمام باطل فتنوں سے ٹکر لیجائے جنہوں نے جاہلانہ تحریفات اور واہیات اور رکیک تاویلات کے ذریعہ گمراہی کا جال بچھا رکھا ہے۔ جو لوگ اس کام میں مشغول ہیں وہ بھی دین کی ایک عظیم الشان خدمت انجام دے رہے ہیں نئے زمانہ کے ''صلح کل'' لوگ اپنی مریض ذہنیت کی بنا پر اس طرح کی محنتوں کو فضول بلکہ مضر سمجھتے ہیں، مگر یہ انکی محض کج فہمی ہے۔ اگر حق و باطل کا فرق نہ رہے تو دین مسخ ہو جائے گا اور سنت و بدعت کا کچھ پتہ نہ چل سکے گا، ذرا غور فرمایئے اور تاریخ کے اوراق پلٹ کر دیکھئے! اگر تاریخ کے ہر دور میں علماء اسلام نت نئے فتنوں کے خلاف سینہ سپر نہ ہوتے اور احقاق حق اور ابطال باطل کا فریضہ انجام نہ دیتے تو کیا دین کی اصلی صورت باقی رہ جاتی؟ انہی علماء حق نے اللہ کی توفیق سے شیعیت اور باطنیت کے غرور کو خاک میں ملا دیا، انہوں نے ہی فتنہ اعتزال کو نیست نابود کیا، انہی کی جرأت و استقامت نے اکبر اعظم کے ''معجون مرکب دین الٰہی'' کو ہمیشہ کے لئے دفن کیا، انہی سر بکف محبان رسول ﷺ نے قادیانیت کی پرفریب سازشوں کو طشت از بام کیا اور آج تک اس مہم میں سرگرم ہیں، اور جب بدعات وخرافات نے نئے چولی دامن کے ساتھ رضا خانیت کے نام سے جنم

لیا تو یہی علماء، حق کو حق اور بدعت کو بدعت بتانے کے لئے میدان میں آ گئے، اور جب حضرات صحابہؓ اور اکابر اولیاء اللہ پر تنقید و تبرا کا دروازہ کھولنے کے لئے مولانا مودودی کا قلم حرکت میں آیا تو یہی وارثین انبیاء جانثاران نبوت حضرات صحابہؓ کی عزت و ناموس کے تحفظ کے لئے سرگرم عمل ہو گئے۔ اور آج مادی دولت کے زعم پر کچھ شرارت پسند غیر مقلد سلفیوں نے ائمہ اربعہ اور امت کی انتہائی محترم شخصیات کے خلاف جو زہر افشانی پھیلا رکھی ہے، اور عوام کو سخت انتشار میں مبتلا کر رکھا ہے۔ انشاء اللہ یہ جماعت حقہ ان بدزبانوں کو بھی لگام دیکر اپنے منصبی فریضہ کو پورا کرے گی۔ الغرض دین کے نام پر جب بھی بد دینی پھیلانے کی کوشش ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے بد دینی کو مٹانے کے لئے ایک مستقل جماعت کھڑی کر دی جسکی وجہ سے ہزار کوششوں کے باوجود باطل کو اصل دین میں خلل اندازی کا موقع نہ مل سکا۔ یہ جماعت اس پر فریب نعرے سے متاثر نہیں ہوئی جسے آج فیشن میں ''اتحاد ملت'' کا نام دیا جاتا ہے۔ اتحاد ملت کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ ہر ناحق کو اپنے اوپر چھوڑ دیا جائے اور اسکی بدعقیدگی اور بدعملی پر کوئی نکیر نہ کیجائے۔ یہ اتحاد نہیں بلکہ مداہنت ہے۔ اگر واقعی اتحاد چاہئے تو وہ صرف اس طرح ہوگا کہ ہر فرقہ اور ہر جماعت قرآن وسنت کو ''معیار اتباع'' بنالے، اور پھر آنحضرت ﷺ کی تربیت کاملہ سے پوری طرح فیضاب ہونے والی عظیم ترین شخصیات جو امت میں نبی کے بعد سب سے افضل ہیں یعنی حضرات صحابہؓ کو ''معیار حق'' تسلیم کرے۔ اور جو عقیدہ اور عمل قرآن وسنت اور حضرات صحابہؓ کے موافق ہو اسے اختیار کیا جائے اور جو خلاف ہو اسے ترک کر دیا جائے۔ اگر یہ طریقہ اختیار کر لیا گیا تو امت میں تفرقہ بندی کی تمام حدیں توڑی جا سکتی ہیں، یہ تفرقے پیدا ہی اسی لئے ہوئے ہیں کہ قرآن وسنت اور صحابہؓ کا طریقہ چھوڑ کر الگ نظریات واعمال کو فروغ دیدیا گیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ایسی جماعت کا وجود ناگزیر ہے جو غلط عقائد ونظریات اور بدعات ختم کرنے کے لئے سرگرم عمل رہے۔

د : دعوت الی الخیر

یہ بھی دین کا نہایت اہم شعبہ ہے۔ لوگوں کو خیر کی طرف دعوت دینا اور دنیا میں اچھی باتوں کو فروغ دیکر برائیوں کو مٹانا امت محمدیہ کی امتیازی صفت ہے۔ اور امت کے ہر فرد کی ذمہ داری

ہے۔اور بالخصوص جب بگاڑ حد سے تجاوز کر جائے اور عبادات سے لیکر معاشرت تک ہر شعبہ دین سے بے بہرہ ہونے لگے تو امت کو تباہی سے بچانے کے لئے انفرادی اور اجتماعی ہر طرح کی کوششوں کا تسلسل زیادہ ضروری اور لازم ہوجاتا ہے۔الحمدللہ ہر زمانہ میں دین کا یہ شعبہ زندہ اور متحرک رہا ہے۔علماء نے وعظ ونصیحت کے ذریعہ اور صوفیاء نے بیعت وارشاد کے ذریعہ برابر دین کی آبیاری کی،اور لاکھوں لاکھ لوگ انکی محنتوں کی بدولت راہ حق پر گامزن ہوگئے،اوراخیر زمانہ میں ''دعوت الی الخیر'' کا یہ مہتم بالشان کام حضرت مولانا شاہ محمد الیاس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کے بے پایاں خلوص کے ساتھ ''تبلیغی جماعت'' کے نام سے سامنے آیا جو دیکھتے ہی دیکھتے دہلی اور میوات سے نکل کر عالم کے چپہ چپہ پر پھیل گئی،اور جگہ جگہ دین کے عنوان پر حرکت میں برکت کے مناظر سامنے آنے لگے،اس تحریک کی عمومیت نے رنگ ونسل،علاقہ اور زبان اور امیر غریب کا فرق مٹادیا،اور امت کا ہر طبقہ دعوت الی الخیر سیکھنے اور سکھانے کے لئے ایک ہی نظام سے مربوط ہوگیا۔اس تحریک کا بنیادی مقصد ہی یہ ہے کہ دین زندگی کے ہر گوشہ میں سماجائے،عبادات بھی شریعت کے مطابق ہوں اور معاشرت اور معاملات بھی اسلامی رنگ میں رنگین ہوجائیں۔اور غیر اسلامی عقائد واعمال سے مسلم معاشرہ پاک ہوجائے۔اس جماعت تبلیغ کی نماز روزہ پر محنت صرف اس لئے نہیں ہے کہ دین کو بس عبادات کے دائرہ میں محدود کردیا جائے بلکہ دین پوری زندگی میں آنا چاہئے۔اوراسکے لئے جہاں اچھائیوں کو پھیلانے کی ضرورت ہوگی وہیں برائیوں پر حکمت عملی سے نکیر کرنے کی بھی ضرورت ہوگی۔اس لئے کہ جس طرح کھیتی اس وقت تک برگ وبار نہیں لاسکتی جبتک کہ اسکے جھاڑ جھنکاڑ کی صفائی نہ کیجائے اسی طرح اسلامی معاشرہ کا تصور بھی اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک کہ گناہوں اور نافرمانیوں کو جڑ سے نہ اکھیڑ دیا جائے۔جو حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ ''جماعت'' کا کام تو بس نماز کی دعوت دینا ہے اور برائیاں کتنی ہی آنکھوں کے سامنے گھر میں یا باہر ہوتی رہیں ان پر نکیر کرنا ہمارا کام نہیں یہ بڑی بھول ہے۔قرآن کریم نے دعوت کی تفسیر میں دونوں ذمہ داریوں کو بتایا ہے۔(۱) امر بالمعروف (اچھی باتوں کی تلقین) (۲) نہی عن المنکر (بری باتوں پر تنبیہ) انہی دونوں ذمہ داریوں کو ادا کرکے دعوت کا مفہوم پورا ہوتا ہے،یہ انصاف کی بات

نہیں ہے کہ ہم اچھائیوں کی دعوت میں سب کچھ کھپا دیں اور جب برائیوں پر متنبہ کرنے کا وقت آئے تو دامن بچا کر لیجائیں کہ کہیں کوئی ناراض یا درپئے آزار نہ ہوجائے۔ بہرکیف امت میں ایسے افراد کا موجود رہنا ضروری ہے جو دنیا میں خیر کو پھیلاتے رہیں اور منکرات پر قوت کے ساتھ نکیر کرتے رہیں، یہ دین کا نہایت مفید اور وسیع ترین شعبہ ہے۔

مسجد نبوی کا مرکز

دین کے ان تمام شعبوں کا مرکز دور نبوت میں آنحضرت ﷺ کی مسجد مبارکہ تھی، وہیں تعلیم کے حلقے لگتے تھے، وہیں تربیت اور تزکیہ کا کام ہوتا تھا، وہیں سے مجاہدین کے لشکر منظّم کرکے بھیجے جاتے تھے، اور وہیں سے تبلیغی وفود روانہ ہوتے تھے۔ پھر کام کرنے والے بھی ایسے تھے جو بیک وقت معلم بھی تھے، مجاہد بھی تھے، اور مبلغ بھی تھے، الغرض ہر شخص اپنی وسعت کے مطابق دین کی ہر خدمت انجام دینے کو تیار رہتا تھا، دور صحابہ و تابعین میں بھی یہی منظر دیکھنے کو ملتا رہا، بڑے بڑے اکابر محدثین اور علماء حصول ثواب کے لئے مسند درس کو چھوڑ کر تلوار اٹھاتے اور دشمنان اسلام کے مقابلہ میں اپنی دلیری اور بہادری کے جوہر دکھاتے تھے، اس وقت چونکہ خلوص عام تھا اس لئے یہ بات نہ تھی کہ یہ کام ہمارا ہے، اور وہ کام ان کا ہے، یا اس کام کے تو ہم ہی ٹھیکیدار ہیں اسمیں دوسرے کو شامل ہونے کی اجازت نہیں، بلکہ دین کے ہر کام کو ہر شخص اپنا ہی کام سمجھتا تھا، اور ایک دوسرے کے تعاون کی امکانی کوشش کی جاتی تھی، جسکا ثمرہ یہ ظاہر ہوتا تھا کہ دین کا ہر شعبہ پوری قوت سے زندہ اور متحرک تھا اس لئے کہ ہر چہار جانب سے مسلم معاشرہ میں اسکی تقویت اور پشت پناہی میسر آتی تھی۔

موجودہ دور کا المیہ

مگر آج نفسانیت اور جہالت نے یہ دن دکھائے ہیں کہ دین کے شعبے الگ الگ طبقات میں بٹ کر رہ گئے ہیں۔ ہر شعبہ سے وابستہ شخص نہ صرف یہ کہ دوسرے سے وابستہ نہیں ہونا چاہتا بلکہ اپنے شعبہ سے تعلق کے زعم میں دوسرے شعبوں کی تحقیر اور اس پر لعن طعن پر آمادہ ہوجاتا ہے اور

سمجھتا ہے کہ دین تو بس وہی ہے جس کو اس نے دین سمجھ رکھا ہے اور بقیہ ساری محنتیں جو دین کے نام پر کیجا رہی ہیں وہ سب فضول ہیں، ایک طرف بعض اہل مدارس دعوت کی محنت کو خاطر میں نہیں لاتے۔ یا ردفرق باطلہ میں اپنی ذمہ داری نہیں نبھاتے اور انکے اردگرد مسلم آبادیوں میں بدعقیدگی اور بدعملی کا طوفان رواں دواں رہتا ہے اور انہیں کچھ بھی احساس نہیں ہوتا، دوسری طرف دعوت کے کام میں لگے ہوئے بہت سے پرجوش لوگ اتنا حد سے تجاوز کرتے ہیں کہ اپنی خصوصی اور عمومی مجلسوں میں اہل مدارس، اور علماء ربانین کے خلاف بدکلامی اور بدزبانی پر اتر آتے ہیں، اور غیبت و بہتان جیسے بدترین گناہوں میں مبتلا ہو کر اپنے لئے خطرناک قسم کی محرومی مول لیتے ہیں، کسی کو تو العیاذ باللہ اتنا جوش آتا ہے کہ چند چلّے لگا کر یہ سمجھتا ہے کہ مجھ سے بڑا دنیا میں کوئی دیندار ہی نہیں ہے۔ اور اس عجب و تکبر کے نتیجہ میں بڑے بڑے علماء کو خاطر میں نہیں لاتا، اور دین کے تحفظ کے لئے یا قادیانیت وغیرہ فرق باطلہ کی تردید کے لئے اگر کوئی تحریک چلتی ہے تو اسکا ساتھ دینے میں اس طرح اعراض کیا جاتا ہے گویا وہ دین کا کام ہی نہ ہو، ہمیں معلوم ہے کہ یہ حرکتیں جماعت تبلیغ کے لازمی اصولوں کے خلاف ہیں، اس جماعت کے بنیادی چھ نمبروں میں ''اکرام مسلم'' ایک اہم نمبر ہے جسکا سب سے اولین تقاضا عالم دین کا احترام ہے۔ ان ناواقف پرجوش لوگوں کی وجہ سے جماعت بدنام ہو رہی ہے اور اسکی آفاقیت میں کمی آنے اور رفتہ رفتہ اسکے سمٹ جانے کا خطرہ پیدا ہونے لگا ہے۔ ہماری یہ مخلصانہ دعا اور دلی خواہش ہے کہ دعوت و تبلیغ کی یہ مبارک جماعت اپنے بانی مبانی کے اصولوں پر قائم رہ کر پورے عالم میں پھلے اور پھولے اور اسکے ذریعہ دنیا کے چپہ چپہ میں ہدایت کے برگ و بار آئیں اور روحانیت اور وحدانیت کے نور سے پوری دنیا منور ہو جائے۔

مگر ہمیں اسکا بھی احساس ہے کہ کچھ خودغرض مفاد پرست لوگ اس جماعت میں در آئے ہیں جو اپنے انفرادی عمل سے جماعت کی بدنامی کا باعث بن رہے ہیں، اور بہت سی جگہ اسنے بڑے فتنہ کا روپ اپنا لیا ہے۔ قبل اسکے کہ بات اور آگے بڑھے ایسے بدزبانوں اور ناعاقبت اندیشوں کو لگام دینے کی ضرورت ہے، جماعت کے ہر فرد کو دین کے دوسرے خدام دین کا بھی اتنا ہی احترام کرنا

چاہئے جتنا اپنی جماعت میں لگے ہوئے فرد کا کیا جاتا ہے۔اور محض اس وجہ سے ان سے ناگواری نہ ہونی چاہئے کہ وہ ہمارے مقررہ اصول کے مطابق کام نہیں کررہے ہیں۔دین کی خدمت کا میدان بہت وسیع ہے۔دوسرے پر تبرابازی کے بغیر بھی دین کی خدمت ہوسکتی ہے۔پھر اس ''نیکی برباد گناہ لازم'' میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر کسی کے پاس اپنے شعبہ کے علاوہ کسی دوسرے دینی شعبہ میں کام کرنے کا موقع نہیں ہے تو کم از کم اسکی بیخ کنی اور مخالفت تو نہ کرے، یہ بھی ایک طرح کا تعاون کہلائے گا، اللہ تعالیٰ ہم میں سے ہر فرد کو اپنا محاسبہ کرنے اور ہر معاملہ میں راہ اعتدال پر استقامت کی توفیق عطا فرمائے۔اور ہم سے دین کے جس شعبہ کی خدمت میں بھی جو کوتاہیاں ہورہی ہیں انہیں معاف فرمائے اور ان سے پوری طرح محفوظ رہنے کی سعادت سے نوازے۔آمین۔

(ندائے شاہی، نومبر ۲۰۰۰ء)

نفع بخش تجارت

دنیا میں ہر شخص نفع کے حصول میں سرگرداں نظر آتا ہے۔ بلکہ بالفاظ دیگر یہ کہنا بھی بجا ہے کہ آج تمام عالم کی محنتیں ہی نفع کے اردگرد گھوم رہی ہیں۔کوئی کاروباری نفع کے لئے بے چین ہے تو کوئی منصب کے حصول کے لئے دن رات ایک کئے دے رہا ہے۔آجکل کسی کام میں جان ہی نہیں پڑتی جب تک کہ آئندہ کے نفع کا لالچ سامنے نہ ہو، جب آنکھوں سے نفع نظر آتا ہے تو پھر کوئی رکاوٹ انسان کے لئے رکاوٹ نہیں رہتی اور انسان اس نفع تک رسائی پانے کے لئے ہر ممکن قربانی دینے کو تیار ہو جاتا ہے۔لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منافع جنکے لئے آج انسان سرگرداں اور پریشان ہے وہ سب موہوم اور عارضی ہیں، اوران میں سے ہر نفع کے ساتھ کچھ نہ کچھ خطرات ضرور لگے ہوئے ہیں۔مثلاً

(۱) مال تجارت تیاری کے بعد ضائع ہو جائے۔

(۲) راستہ سے ڈاکو لوٹ کر لیجائیں۔

(۳) مال بردار جہاز غرق ہو جائے۔

(۴) بازار میں مال کی قیمت گھٹ جائے اور نفع تو کیا لاگت بھی ہاتھ نہ آسکے۔

(۵) آرڈر دینے والا خریدار خود مر جائے۔

(۶) یا اسکا دیوالیہ نکل جائے۔

(۷) خریدار بے ایمانی پر اتر آئے۔

(۸) خریدار آرڈر دینے کے بعد لینے سے انکار کردے۔

(۹) خریدار آرڈر کی قیمت زبردستی کم کرنے پر مجبور کردے۔

یہ سب خطرات محض فرضی نہیں، بلکہ حقیقی اور واقعی ہیں اور کثرت سے پیش آتے رہتے ہیں، اور اسی طرح کا حال منصب اور عہدہ کا ہے کہ ہر وقت اسکے چھن جانے کا خوف دامن گیر رہتا ہے، اور اپنی کرسی بچانے کے لئے نہ جانے کن کن لوگوں کی خوشامد کرنی پڑتی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ آج پوری انسانیت انہی وقتی اور عارضی منافع اور دھوکے کی ٹٹی کہلائے جانے والی دنیا کے حصول میں ایسی ہمہ تن مشغول ہے کہ اسے اب مادیت کے علاوہ کچھ نظر ہی نہیں آتا۔

دوسری طرف اللہ رب العالمین اپنے بندوں کو خود اپنی ذات والا صفات سے ایسی تجارت کرنے کی پیش کش فرماتا ہے جس میں کسی طرح کے بھی نقصان کا ذرہ برابر بھی شائبہ نہیں ہے۔ گویا کہ اللہ تعالیٰ خریدار ہے اور اسکے بندے مطلوبہ اشیاء کو سپلائی کرنے والے ہیں، اور اس تجارت کا تعلق روپیہ یا دنیوی ساز وسامان اور اسباب راحت وغیرہ سے نہیں، بلکہ ایک طرف اعمال صالحہ ہیں، اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے انکی قیمت جنت کی صورت میں مقرر فرمائی ہے۔ یہی وہ تجارت ہے جس میں نقصان کا اندیشہ نہیں بلکہ وہم وتصور سے بھی زیادہ نفع ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ كِتَابَ اللّٰهِ وَاَقَامُوْا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ لِيُوَفِّيَهُمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ اِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ.
(الفاطر ۲۹-۳۰)

جو لوگ کتاب اللہ کی تلاوت کرتے ہیں، اور نماز کی پابندی رکھتے ہیں، اور جو کچھ ہم نے انکو عطا فرمایا ہے اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں وہ ایسی تجارت کے امیدوار ہیں جو کبھی ماند نہ ہوگی۔ تاکہ انکو انکی اجرتیں پوری دیں۔ اور انکو اپنے فضل سے اور زیادہ بھی دیں۔ بیشک وہ بڑا بخشنے والا قدرداں ہے۔

ایک دوسری آیت میں ارشاد فرمایا

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ. (التوبۃ ۱۱۱)

بلا شبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے انکی جانوں کو اور انکے مالوں کو اس بات کے عوض میں خرید لیا ہے کہ انکو جنت ملے گی۔

اس تجارت میں ایسا کوئی بھی خطرہ نہیں جو دنیوی تجارتوں میں پایا جاسکتا ہے۔ نہ عمل کے کسی طرح ضائع ہونے کا احتمال ہے نہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کٹوتی کا امکان ہے بلکہ وہاں تو اضافہ ہی اضافہ ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا. (النساء ۱۲٤)

اور جو شخص کوئی نیک کام کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ مؤمن ہو سوایسے لوگ جنت میں داخل ہونگے، اوران پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا۔

پھر اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہ معاملہ محض اختیاری نہ سمجھا جائے بلکہ ایسا لازم ہے کہ اسکے بغیر انسان دائمی عذاب سے بچ ہی نہیں سکتا۔ عذاب سے بچنے اور رحمت خداوندی کا مستحق بننے کے لئے ایمان اوراعمال صالحہ کی دولتوں کا حصول ضروری ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا گیا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ، يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ. (الصف ۱۰-۱۱-۱۲)

اے ایمان والو کیا میں تم کو ایسی سوداگری بتلاؤں جو تم کو ایک دردناک عذاب سے بچائے تم لوگ اللہ پر اور اسکے رسول پر ایمان لاؤ۔ اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اسباب سے جہاد کرو یہ تمہارے لئے بہت ہی بہتر ہے اگر تم کچھ سمجھ رکھتے ہو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ معاف کرے گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا کہ جنکے نیچے نہریں جاری ہونگی، اور عمدہ مکانوں میں داخل کرے گا جو ہمیشہ رہنے کے باغوں میں ہونگے، یہ بڑی کامیابی ہے۔

اس لئے ضرورت ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی ہر ممکن اطاعت وعبادت کر کے اپنا سرمایہ اللہ کے دربار میں پیش کریں تا کہ اسکے عظیم الشان بدلہ کے ہم مستحق بن سکیں اور ہماری آخرت کی دائمی زندگی آرام وراحت سے گذر سکے۔

لیکن افسوس ہے کہ ہماری اکثریت اس معاملہ میں سخت کوتاہی اور سستی میں مبتلا ہے جتنا وقت اور جتنی صلاحیت ہم دنیوی منافع کے حصول میں لگاتے ہیں اسکا دسواں حصہ بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ تجارت میں نہیں لگاتے، اسی لئے حضور انور علیہ الصلوۃ والسلام نے ارشاد فرمایا:

نِعْمَتَانِ مَغْبُوْنَ فِيْهِمَا كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ: الصِّحَّةُ وَالْفَرَاغُ.	اللہ کی دو نعمتیں ایسی ہیں جنمیں اکثر لوگ ٹوٹے اور نقصان میں ہیں (۱) تندرستی (۲) فرصت
(بخاری شریف ٦٤١٢)	(کے لمحات)

یعنی یہ دو نعمتیں گویا کہ انسان کا اصل سرمایہ ہیں جنکے ذریعہ سے وہ اعمال صالحہ انجام دے کر اپنی عاقبت سنوار سکتا ہے۔ لیکن اکثر لوگ اسکی طرف دھیان نہیں دیتے۔ اور تندرستی اور وقت خالی ہونے کے باوجود اپنے اوقات اور صلاحیتیں خواہ مخواہ فضول مصروفیات میں ضائع کر دیتے ہیں۔ (طیبی بحوالہ فتح الباری ۱۱/ ۲۷۷) بریں بنا ضروری ہے کہ دینی اور اخروی نقصان سے بچنے کے لئے اپنے وقت کو ضائع ہونے سے بچائیں، آج تو وقت کے گذرنے کا بالکل احساس نہیں ہوتا، لیکن میدان محشر میں جب انسان اعمال صالحہ کے ثواب کا مشاہدہ کرے گا تو بے اختیار اپنی پوری زندگی کے اعمال کی حقارت سامنے آجائے گی اور ہر شخص اپنے اعمال کو حقیر سمجھ کر زیادتی اعمال کی تمنا کرنے لگے گا۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے:

لَوْ اَنَّ رَجُلاً خَرَّ عَلٰى وَجْهِهٖ مِنْ يَوْمِ وُلِدَ اِلٰى يَوْمَ يَمُوْتُ هَرِماً فِى طَاعَةِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ لَحَقَّرَهُ ذٰلِكَ الْيَوْمَ وَلَوَدَّ انه رُدَّ اِلَى الدُّنْيَا كَيْ	اگر کوئی شخص پیدائش سے بڑھاپے کی حالت میں موت آنے تک برابر اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں چہرہ کے بل پڑا بھی رہا ہو پھر بھی قیامت کے روز اپنی اس عبادت کو کمتر سمجھے گا، اور تمنا کرے گا کہ کاش

مَــایَــزْدَادُ مِـنَ الْاَجْـرِ وَالثَّوَابِ. (الترغیب والترهیب ٤/٢١٤) اسے دنیا میں لوٹا دیا جائے تاکہ اسکے اجر وثواب میں مزید اضافہ ہوسکے۔

مگر اس دن کی تمنا کام نہ آئے گی، موقع تو بس اسوقت تک ہے جب تک جسم وجان کا رشتہ برقرار ہے۔ اسی میں ہم آخرت کے لئے جتنا چاہیں انتظام کرلیں، موت کے بعد اس کا موقع ختم ہوجائے گا، اور پھر سوائے حسرت ویاس کے کچھ نہ بچے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں آخرت کی فکر عطا فرمائے اور اپنے ساتھ بہتر معاملہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین.

(ندائے شاہی، مارچ ۲۰۰۱ء)

دعاؤں کا اہتمام

مؤمن کا آسرا صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات ہے، جب بھی کوئی مصیبت آئے یا حادثات رونما ہوں، تو دنیوی اسباب ووسائل کی طرف توجہ بعد میں ہونی چاہئے پہلے مرحلہ میں ہمیں اللہ رب العزت کی طرف رجوع کرنا چاہئے، اور اس بات پر کامل ایمان ویقین رکھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے بڑھکر کسی کی قدرت نہیں، وہ کسی سبب کا سہارا لئے بغیر بھی بڑے سے بڑے وقت کے فرعونوں کو پلک جھپکتے ہی نیست ونابود کرنے پر قادر ہے، اور تمام عالم کی مادی قوتیں اس رب العزت والجلال کے سامنے مچھر کے پر کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتیں، اس لئے دعا سے کبھی غافل نہ رہنا چاہئے اور خاص طور پر جب امت پر مشکل وقت آپڑے جیسا کہ آج کل دشمنان اسلام کی طرف سے خوف ودہشت کا ماحول بنایا جارہا ہے تو ایسے وقت میں زیادہ سے زیادہ دعا اور استغفار کا اہتمام لازم ہے آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

اَلاَ اَدُلُّکُمْ عَلٰی مَا یُنْجِیْکُمْ مِّنْ عَدُوِّکُمْ وَیُدِرُّلَکُمْ اَرْزَاقَکُمْ تَدْعُوْنَ اللّٰہَ فِیْ لَیْلِکُمْ وَنَهَارِکُمْ فَاِنَّ الدُّعَاءَ سِلَاحُ الْمُؤْمِنِ.

(مجمع الزوائد ۱۰/۱۴۷، عن جابر بن عبد اللّٰہ)

کیا تمہیں ایسا نسخہ نہ بتاؤں جو تمہیں تمہارے دشمن سے نجات دے اور تم پر تمہاری روزیوں کے دروازے کھول دے (وہ یہ ہے کہ) تم دن رات اللہ تعالیٰ سے دعا کرو، اس لئے کہ دعا مومن کا ہتھیار ہے، (اسی کے ذریعہ وہ اپنا بچاؤ کرسکتا ہے)

غزوۂ بدر کے موقع پر جبکہ مسلمان کفار کے مقابلہ میں نہایت کمزور تھے، نہ کوئی مادی قوت تھی اور نہ قابل ذکر ہتھیار تھے، مقابلہ بڑا سخت اور اندیشہ ناک تھا، اس نازک وقت پر جناب رسول اللہ ﷺ

پوری طرح متوجہ الی اللہ رہے، رات بھر الحاح وزاری کے ساتھ دعاؤں میں گذاری، اور جنگ کے دوران بھی مسلسل سجدہ ریز رہ کر دعاؤں میں مشغول رہے، سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ جنگ کے دوران میں کئی مرتبہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آیا کہ دیکھوں آپ کیا کر رہے ہیں تو ہر مرتبہ آپ کو سجدہ میں پڑے ہوئے ''یا حی یا قیوم'' پڑھتے ہوئے پایا تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے فتح ونصرت سے سرفراز فرمایا۔ (مجمع الزوائد عن البزار باسناد حسن ۱/۱۴۷) آپ نے اس عمل سے امت کو یہ تعلیم دی کہ نازک سے نازک وقت بھی دعاؤں کا دامن نہیں چھوڑنا چاہئے، مومن کیلئے اس سے بڑھ کر نفع کی کوئی چیز نہیں ہے، ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ نے دعا کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

اِنَّ اَعْجَزَ النَّاسِ مَنْ عَجَزَ فِیْ الدُّعَاءِ وَاَبْخَلَ النَّاسِ مَنْ بَخِلَ بِالسَّلَامِ.

(کتاب الدعاء للطبرانی ۳۹)

لوگوں میں سب سے عاجز شخص وہ ہے جو دعا کرنے سے بھی عاجز ہو، اور سب سے بڑا بخیل وہ ہے جو سلام کرنے (تک) میں بخل کرے۔

اور ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے امت کو ۱۳ اہم اور قیمتی ہدایات ارشاد فرمائیں:

(۱) مَاتَلْفَ مَالٌ فِیْ بَرٍّ وَلَابَحْرٍ اِلَّا بِمَنْعِ الزَّکوٰۃِ فَحَرِّزُوْا اَمْوَالَکُمْ بِالزَّکوٰۃِ (۲) وَدَاوُوْا مَرْضَاکُمْ بِالصَّدَقَۃِ (۳) وَادْفَعُوْا عَنْکُمْ طَوَارِقَ الْبَلَاءِ بِالدُّعَاءِ فَاِنَّ الدُّعَاءَ یَنْفَعُ مِمَّا نَزَلَ وَمِمَا لَمْ یَنْزِلُ وَمَانَزَلَ یَکْشِفُهٗ وَمَالَمْ یَنْزِلُ یَحْبِسُهٗ.

(کتاب الدعاء عن عبادۃ بن الصامت ۲۳)

(۱) خشکی یا تری میں جو مال جو بھی (کسی کا) تلف ہوتا ہے وہ زکوٰۃ نہ دینے کی بنا پر ہی ہوتا ہے لہٰذا زکوٰۃ دیکر اپنے مالوں کی حفاظت کا انتظام کرو (۲) اور صدقہ دیکر اپنے بیماروں کا علاج کرو (۳) اور دعا کے ذریعہ آنے والی مصیبتوں کا دفاع کرو کیونکہ دعا نازل شدہ اور غیر نازل شدہ دونوں طرح کی مصیبتوں میں نفع بخش ہے، جو مصیبت آچکی ہے اس کو دعا ہٹا دیتی ہے اور جو ابھی نہیں آئی اسے روک دیتی ہے۔

نیز ایک روایت میں ارشاد نبوی ہے:

اُدْعُوْا فَاِنَّ الدُّعَاءَ یَرُدُّ الْقَضَاءَ.

(کتاب الدعاء عن انس رضی اللہ عنہ ۳۰)

دعا کیا کرو، اس لئے کہ دعا تقدیر (معلق) ٹلا دیتی ہے۔

آج بے شک مسلمان مادی اسباب کے اعتبار سے دشمن کے مقابلہ میں کہیں کمزور ہیں، ان کے اکثر حکمراں محض اپنے اقتدار اور عیش وعشرت کی لذتوں میں بدمست ہو کر غیروں کے زرخرید غلام بن چکے ہیں، مسلمانوں کے پاس اپنی دولت، اپنے ممالک، اپنے افراد ہونے کے باوجود وہ غیروں سے برابر مرعوب ہوتے چلے جا رہے ہیں، لیکن ان مایوس کن حالات میں بھی ہمارے پاس اگر کوئی سہارا ہے تو وہ ہماری دعاؤں کا ہے۔

ہمیں انفرادی اور اجتماعی طور پر پوری امت مسلمہ کیلئے دعاؤں کا اہتمام کرنا چاہئے، اور ساتھ میں اپنی زندگی کا محاسبہ بھی کرنے کی ضرورت ہے، مصائب وآلام اور خوف ودہشت کے حالات پیش آنے کے کچھ تو ظاہری اسباب ہوتے ہیں جو آنکھوں سے نظر آتے ہیں کہ فلاں واقعہ مثلاً ردعمل کا سبب بن گیا لیکن ہر مصیبت کے پیچھے کچھ باطنی اور تکوینی عوامل بھی ہوتے ہیں، یہ عوامل امت کی بدعملیاں ہیں یہ بدعملیاں ہی دراصل مصائب کا سبب بنتی ہیں، اگر ہم دنیا میں امن وعافیت کے اور اسلام اور مسلمانوں کے واقعی غلبہ کے خواہاں ہیں تو ہمیں اپنا کردار اسلامی بلکہ خالص اسلامی بنانے پر محنت کرنی ہوگی، اور شاندار اسلامی غیرت وحمیت کا مظاہرہ کرنا ہوگا، یہی خود احتسابی اور اصلاح ہمارے لئے امن وعافیت اور ہمارے لئے دعاؤں کی قبولیت کا ذریعہ بن سکتی ہے اللہ تعالیٰ موجودہ حالات سے امت کو سبق لینے کی توفیق عطا فرمائے اور اسلام اور مسلمانوں کو ذلت ورسوائی سے بچا کر عزت وعافیت سے سرفراز فرمائے، اور اہل عزیمت بندگان خدا کی خدامات قبول فرما کر ان کے تحفظ کے اسباب فراہم فرمائے آمین۔

(ندائے شاہی، اکتوبر ۲۰۰۱ء)

آزمائش کی گھڑی

اللہ تعالیٰ کی طرف سے سچے اہل ایمان اور اہل نفاق میں امتیاز کے لئے اور جانثاروں کے درجات بلند کرنے کے لئے امتحان ابتلا اور آزمائش کا دستور مقرر ہے۔ بسا اوقات حق پرستوں پر ایسے سخت حالات آتے ہیں کہ ہر جانب سے ان پر راستے بظاہر مسدود ہو جاتے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ یہ ان کے وجود کا آخری وقت ہے۔ مگر پھر وقت کروٹ لیتا ہے اور منظر یکا یک بدل دیا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے ان حالات کے لئے اپنے ماننے والوں کو ذہنی طور پر تیار رہنے کا حکم دیا۔ ایک آیت میں ارشاد ہے:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوْا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَا اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ. (البقرہ آیت : ٢١٤)

کیا تم کو یہ خیال ہے کہ جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ تم پر نہیں گذرے حالات ان لوگوں کے جیسے، جو ہو چکے تم سے پہلے کہ پہنچی ان کو سختی اور تکلیف اور جھڑ جھڑائے گئے یہاں تک کہ کہنے لگا رسول اور جو اسکے ساتھ ایمان لائے کب آوے گی اللہ کی مدد؟ سن رکھ اللہ کی مدد قریب ہے.

نبیٔ اکرم ﷺ اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر ایسے خطرناک حالات پیش آئے جنکا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، ایک موقع پر مشرکین کی سختیوں اور دشمنوں کی ریشہ دوانیوں سے تنگ آ کر صحابیٔ رسول سیدنا حضرت خباب ابن الارت رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:

يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! اَلَا تَنْصُرُلَنَا اَلَا تَدْعُوْ اللّٰهَ لَنَا ؟

اے اللہ کے رسول کیا آپ ہمارے لئے اللہ سے مدد نہیں مانگتے اور ہمارے حق میں دعا نہیں فرماتے؟

تو آنحضرت ﷺ نے جواب دیا:

اِنَّ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ کَانَ اَحَدُھُمْ یُوْضَعُ الْمِئْشَارُ عَلٰی مَفْرَقِ رَأْسِہٖ فَیَخْلُصُ اِلٰی قَدَمَیْہِ لَایَصْرِفُہٗ ذٰلِكَ عَنْ دِیْنِہٖ وَیُمْشَطُ بِاَمْشَاطِ الْحَدِیْدِ مَابَیْنَ لَحْمِہٖ وَعَظْمِہٖ لَایَصْرِفُہٗ ذٰلِكَ عَنْ دِیْنِہٖ.

تم سے پہلے امتوں کا حال یہ تھا کہ ان میں سے کسی ایک شخص کے سر کے بیچوں بیچ آری رکھ کر پیروں تک چیر دیا جاتا تھا مگر یہ اذیت ناک حالت بھی اسکو اپنے دین سے نہیں ہٹا پاتی تھی، اور کبھی لوہے کی کنگھیاں اسکے گوشت اور ہڈیوں میں چلائی جاتی تھیں مگر یہ تکلیف بھی اسے اپنا دین چھوڑنے پر مجبور نہ کر پاتی تھی۔

وَاللّٰہِ یُتِمَّنَّ اللّٰہُ ھٰذَا الْاَمْرَ حَتّٰی یَسِیْرَ الرَّاکِبُ مِنْ صَنْعَاءَ اِلٰی حَضْرَمَوْتَ لَایَخَافُ اِلَّا اللّٰہَ وَالذِّئْبُ عَلٰی غَنَمِہٖ وَلٰکِنَّکُمْ قَوْمٌ تَسْتَعْجِلُوْنَ.

(ابن کثیر مکمل۱۱۹)

اور اللہ کی قسم اللہ تعالیٰ اس دین کو ضرور بالضرور مکمل غلبہ عطا فرمائے گا حتی کہ ایک سوار صنعاء سے حضر موت تک بے خوف وخطر سفر کرے گا کہ سوائے اللہ کے اور بکریوں پر بھیڑئے کے حملہ کے اسے کسی اور کا خوف نہ ہوگا۔ مگر تم لوگ جلد بازی کرنے والے ہو۔

اور غزوۂ خندق واحزاب میں مدینہ منورہ میں کس قدر خوفناک ماحول تھا اور اہل مدینہ کیسے سنگین حالات سے گذر رہے تھے اسکا منظر قرآن کریم میں ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

اِذْجَاؤُوْکُمْ مِّنْ فَوْقِکُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْکُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰہِ الظُّنُوْنَا، ھُنَالِكَ ابْتُلِیَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالاً شَدِیْدًا، وَاِذْ یَقُوْلُ الْمُنَافِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ فِی قُلُوْبِھِمْ

جب چڑھ آئے تم پر اوپر کی طرف سے اور نیچے سے اور جب بدلنے لگی آنکھیں، اور پہنچے دل گلوں تک، اور اٹکل کرنے لگے تم اللہ پر طرح طرح کی اٹکلیں، وہاں جانچے گئے ایمان والے اور جھڑجھڑائے گئے زور کا جھڑجھڑانا۔ اور جب کہنے لگے منافق اور جن کے دلوں میں روگ ہے

مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اِلَّا غُرُوْراً. (الاحزاب ۱۰-۱۲)

جو وعدہ کیا تھا ہم سے اللہ نے اور اسکے رسول نے وہ سب فریب تھا۔

مگر اللہ تعالیٰ کا دستور یہ بھی ہے کہ یہ حالات دیر پا نہیں رہتے بلکہ ہر تنگی کے بعد فراخی اور ہر خوف کے جلو سے امن و عافیت کی بہاریں نمودار ہوئی ہیں۔ اس لئے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں، سچے مؤمن اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہوتے۔ بلکہ وہ آزمائش کے وقت بھی اپنے موقف اور عقیدہ پر قائم رہتے ہیں اور حالات کو انگیز کر کے مستقبل کی کامیابی کے امیدوار رہتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے وعدہ کی حقانیت پر کامل بھروسہ رکھتے ہیں۔

اس لئے موجودہ صبر آزما حالات میں ہر مسلمان کو اللہ تعالیٰ کے فیصلوں پر راضی رہنا چاہئے، اور اللہ تعالیٰ سے عافیت کی درخواست کرتے رہنا چاہئے جس کی تعلیم ایسے وقت میں خود آنحضرت ﷺ نے دی ہے۔ طائف کے جاں گسل واقعہ کے بعد آپ ﷺ نے جو اثر انگیز دعا فرمائی تھی ایسے مواقع پر وہی دعا ہماری زبانوں پر بھی رہنی چاہئے۔ آپ کی دعا کے الفاظ یہ ہیں:

اَللّٰهُمَّ اِلَيْكَ اَشْكُوْ ضَعْفَ قُوَّتِيْ وَقِلَّةَ حِيْلَتِيْ وَهَوَانِيْ عَلَى النَّاسِ، يَا اَرْحَمَ الرَّحِمِيْنَ، اَنْتَ رَبُّ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ وَاَنْتَ رَبِّيْ، اِلٰى مَنْ تَكِلُنِيْ ؟ اِلٰى بَعِيْدٍ يَتَهَجَّمُنِيْ؟ اَمْ اِلٰى عَدُوٍّ مَلَّكْتَهٗ اَمْرِيْ ؟ اِنْ لَّمْ يَكُنْ بِكَ عَلَيَّ غَضَبٌ فَلَا اُبَالِيْ وَلٰكِنْ عَافِيَتُكَ هِيَ اَوْسَعُ لِيْ، اَعُوْذُ بِنُوْرِ وَجْهِكَ الَّذِيْ اَشْرَقَتْ لَهُ الظُّلُمَاتُ وَصَلُحَ عَلَيْهِ اَمْرُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ

اے اللہ ! میں اپنی کمزوری، کم تدبیری، اور لوگوں کے مقابلہ میں اپنی بے وقعتی کی تجھ سے شکایت کرتا ہوں اے ارحم الرحمین ! آپ ہی کمزوروں کے آقا ہیں، اور آپ ہی میرے رب ہیں، آپ مجھے کس کے حوالے فرما رہے ہیں ؟ کسی ایسے اجنبی کے جو مجھ پر غالب آجائے، یا ایسے دشمن کے جس کو آپ میرے فیصلے کا مالک بنا دیں؟ اگر آپ کی طرف سے مجھ پر غصہ نہیں ہے تو مجھے کچھ پرواہ نہیں مگر آپ کی عافیت ہی میرے لئے وسعت کا باعث ہے۔ میں آپ کے چہرۂ انور

مِنْ اَنْ تُنْزِلَ بِیْ غَضَبَکَ اَوْیَحُلُّ عَلَیَّ سَخَطُکَ لَکَ الْعُتْبٰی حَتّٰی تَرْضٰی وَلَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِکَ.

(الروض الانف ۲/۲۳۲)

کے اس نور کے ذریعہ جس سے اندھیریاں روشن ہو اٹھیں، اور جس سے دنیا اور آخرت کے معاملات درست ہوگئے اس بات سے پناہ چاہتا ہوں کہ آپ اپنا غضب مجھ پر نازل فرمائیں یا آپکا غصہ مجھ پر جائز ہو آپ کی رضا ہی کی تلاش ہے تا آنکہ آپ راضی ہوجائیں، آپ کے علاوہ کسی کے پاس طاقت وقوت نہیں۔

اللہ تعالیٰ امت مسلمہ اور سارے عالم کے لئے عافیت اور رحمت کے فیصلے فرمائے۔ اور ظالموں کے ظلم سے سب کو نجات مرحمت فرمائے۔ آمین.

(ندائے شاہی، دسمبر ۲۰۰۱ء)

بیدار رہنے کی ضرورت

کسی بھی فرد، قوم یا جماعت کی بقا اور وجود کے لئے ہوشمندی کے ساتھ بیدار رہنا ضروری ہے۔ جس قوم کے افراد اپنے مستقبل سے بے خبر ہو کر اور اپنے قومی وملی حالات سے آن دیکھی کر کے زندگی گذارتے ہیں وہ کبھی بھی عافیت سے نہیں رہ سکتے بالخصوص ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان سے اتنا گہرا رشتہ ہونا چاہیے کہ ہر شخص دوسرے کے دکھ درد میں ایسے ہی شریک ہو جیسے کے اپنے ذاتی معاملہ میں دلچسپی لیتا ہے، اس سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے آسان مثالوں کے ذریعہ امت کی رہنمائی فرمائی ہے ایک روایت میں آپ کا ارشاد گرامی ہے: اَلْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهُ بَعْضاً. (مسلم شریف ۲/ ۳۲۱) یعنی مسلمان دوسرے مسلمان کے لئے ایسا ہے جیسے ایک عمارت، جو ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہوتی ہے کہ ہر حصہ کو دوسرے حصہ سے تقویت ملتی ہے، اسی طرح تمام مسلمانوں کو آپس میں متحد اور مجتمع ہو کر ایک دوسرے کو قوت پہنچانے کا جذبہ اپنے دل میں رکھنا چاہیئے۔

اور ایک دوسری روایت میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مَثَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ فِيْ تَوَادِّهِمْ وَتَرَاحُمِهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ مَثَلُ الْجَسَدِ اِذَا اشْتَكٰى مِنْهُ عُضْوٌ تَدَاعٰى لَهٗ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهَرِ وَالْحُمّٰى. (مسلم شریف ۲/ ۳۲۱) یعنی ایک دوسرے سے محبت کرنے، رحم دلی کرنے اور میل جول رکھنے میں سب مسلمانوں کا حال ایک بدن کی طرح ہے کہ اگر بدن کے کسی حصہ کو تکلیف پہنچتی ہے تو پورا بدن بے چینی اور بخار میں مبتلا ہو کر اس تکلیف میں شریک ہو جاتا ہے (مثلاً آنکھ میں چبھن ہو تو پورا بدن بے چین ہوگا اور سر میں درد ہو تو پورے بدن کا سکون

جاتا رہیگا) یہی معاملہ ہر مسلمان کا دوسرے مسلمان کے ساتھ ہونا چاہیے کہ اگر دنیا کے کسی خطہ میں کسی مومن کو تکلیف پہنچے یا اس پر ظلم کیا جائے یا اسکی حق تلفی کی جائے تو جس مسلمان تک بھی اس کی خبر پہنچے اس کا دل بے چین ہو جانا چاہیے اور جس طرح بھی ہو سکے اپنے مظلوم اور مصیبت زدہ بھائیوں کے لئے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ آج نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان قیمتی ہدایات پر کما حقہ عمل نہیں کیا جارہا ہے مسلمانوں میں ہر سطح پر اختلاف اور انتشار کا دور دورہ ہے نسلی، قومی، لسانی اور مذہبی اختلافات نے پوری مسلم قوم کو بے وزن اور کھوکھلا بنا کر رکھ دیا ہے ہر جماعت سطحی مفادات کو اصل مقصود بنا کر دوسری جماعت کو زیر کرنے کے درپے ہے اور حد تو یہ ہے کہ مشترک اجتماعی مسائل میں بھی مل بیٹھ کر جدوجہد کرنے کا جذبہ مفقود ہے اس صورت حال میں عزت وسربلندی اور کامیابی کی امید رکھنے کو خود فریبی کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

اسی طرح آج تمام عالم میں مسلمانوں پر ظلم وستم کا بازار گرم ہے اور خود ہمارے ملک میں چند ماہ بیشتر گجرات میں جو وحشت وبربریت کا ناچ ناچا گیا اس پر ہم نے وقتی طور پر تو تکلیف واحتجاج کا اظہار کیا لیکن جوں جوں وقت گذر رہا ہے ہمارے اندر غفلت اور بے حسی بھی روز افزوں ہے جب کہ گجرات کے منصوبہ ساز قاتل پورے ملک میں گھوم گھوم کر مسلم قوم کے خلاف زہر اگل رہے ہیں اور گجرات کی انسانیت سوز حرکتوں پر سینہ پھلا کر فخر کرتے ہوئے پورے ملک میں اس تجربہ کو دھرانے کی دھمکیاں دے رہے ہیں، ایسی تشویشناک صورت حال میں قوم کی بے حسی مستقبل کے لئے سخت خطرہ کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔

حوصلہ بلند رکھیں

اس لئے آج ضرورت ہے کہ مستقبل کے خطرات کا اندازہ کر کے ان کے تدارک کی کوششیں برابر جاری رکھی جائیں۔ اور قوم کے حوصلوں کو زندگی اور تازگی بخشنے کے انتظامات کئے جائیں۔ کیونکہ اگر ہمتیں پست ہو گئیں، اور لوگ حوصلے ہار بیٹھے تو پھر انجام بخیر نہیں ہو سکے گا۔ لہذا

ملت کو پست ہمتی سے نکالنا اوراس میں اپنے تحفظ و بقا کے لئے قربانی دینے کے جذبات کوفروغ دینا لازم ہے، غزوہ احد میں عارضی شکست سے جب بعض حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم مایوس ہوئے اور ان کی ہمتیں جواب دینے لگیں تو اللہ رب العزت نے ان کو بلکہ تمام اہل ایمان کو اس اپنے ارشاد سے حوصلہ بخشا :

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ.	اور سست نہ ہو اورغم نہ کھاؤ اورتم ہی غالب رہو گے اگرتم ایمان رکھتے ہو۔

(ال عمران : ۱۳۹)

مومن کی شان یہ ہے کہ وہ سخت سے سخت حالات میں بھی ہمت نہ ہارے بلکہ پورے عزم وحوصلہ کے ساتھ حالات سے مقابلہ کرنے کا جذبہ رکھے، جوقوم حوصلہ بلند رکھتی ہے اس پر دشمن کی تدبیریں اثر انداز نہیں ہوسکتیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَايَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئاً. (آل عمران : ۱۲۰)	اور اگرتم صبر کرو اور بچتے رہو تو ان کے فریب سے تمہارا کچھ نہ بگڑے گا۔

اس آیت میں صبر سے مراد استقامت اور بیدار مغزی ہے جب ملت اس استقامت کے ساتھ تقویٰ اور خوف خدا کو شامل کرلے تو وہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں آجاتی ہے اور دنیا کی کوئی طاقت اسے زیر نہیں کرسکتی، آج ہمارے دشمنوں کی تمام تر کوششیں اسی نکتہ پر مرکوز ہیں کہ کس طرح مسلمانوں کو خواب غفلت میں مدہوش کیا جائے اور انہیں نفسانی لذتوں میں مبتلا کرکے تقویٰ سے محروم کیا جائے سارے عالم میں مدارس اور دینی محنتوں کے خلاف نام نہاد الزامات اور طعن و تشنیع کے پیچھے بھی یہی ذہن کارفرما ہے کیونکہ اس گئے گذرے دور میں یہی مکاتب و مدارس مسلم قوم میں بیداری اور انابت الی اللہ اور دینداری کے جذبات پیدا کرنے کی محنتیں انجام دے رہے ہیں اور جب تک یہ محنتیں ہوتی رہیں گی دشمنوں کی تمنائیں ہرگز رنگ نہ لائیں گی۔ اوران کے خواب انشاء اللہ شرمندہ تعبیر نہ ہوں گے۔

طاقتور مسلمان اللہ کو پسند ہیں

اللہ تعالیٰ کی نظر میں مسلمانوں کا دینی اور دنیوی دونوں اعتبار سے مضبوط اور طاقتور ہونا پسند ہے۔قرآن کریم میں دشمنوں کے مقابلہ کے لئے زمانہ کے اعتبار سے ہر ممکن اسباب ووسائل مہیا کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔(سورۂ انفال ۶۰) نیز ایک حدیث میں جناب رسول اللہ ﷺ نے اس بارے میں امت کونہایت اہم ہدایات دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

اَلْـمُؤْمِنُ الْقُوِیُّ خَیْرٌ، وَاَحَبُّ إِلٰی اللّٰـهِ مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِیْفِ، وَفِيْ كُـلِّ خَیْـرٍ اِحْرِصْ عَلٰی مَا یَنْفَعُكَ وَ اسْتَعِنْ بِـاللّٰـهِ وَلَا تَعجزْ وَاِنْ اَصَـابَكَ شِيْءٌ فَلَا تَـقُـلْ لَوْ اَنِّـی فَـعَلْتُ كَذَا وَكَذَا وَلٰكِنْ قُلْ: قَدَّرَ اللّٰـهُ مَا شَاءَ فَعَلَ، فَاِنَّ ''لَوْ'' تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّیْطٰنِ.

(مسلم شریف ۲/ ۳۳۸)

طاقتور مسلمان اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں کمزور مسلمان سے زیادہ بہتر اور پسندیدہ ہے۔ اور ہر خیر میں اپنے لئے نفع بخش پہلو حاصل کرنے کی کوشش کرو اور اللہ تعالیٰ سے مدد چاہو اور حوصلہ نہ ہارو، اور اگر تمہیں کوئی تکلیف پہنچے تو یہ مت کہو کہ کاش میں ایسا کرلیتا ویسا کرلیتا (تو یہ تکلیف نہ پہنچتی) بلکہ یہ کہو کہ اللہ نے یہی مقدر کررکھا تھا اور اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے، اس لئے کہ ''اگر'' کا کلمہ شیطان کے عمل (وسوسہ) کے دروازے کو کھول دیتا ہے۔

یہ حدیث شریف موجودہ حالات میں ہمارے لئے عظیم الشان ''رہنما چارٹ'' کی حیثیت رکھتی ہے۔اس میں خاص طور پر چار چیزوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے :

(۱) مسلمان کو ہمیشہ اپنی طاقت بڑھانے کی فکر کرنی چاہئے۔اور کسی طرح کی کمزوری پر راضی نہیں رہنا چاہیئے۔

(۲) اپنی ذات اور قوم وملت کے لیے نفع بخش ہر اچھی بات کو حاصل کرنے کا جذبہ دل میں رکھنا چاہئے جس میں دینی، دنیوی، اقتصادی اور سیاسی ہر طرح کی ترقیات شامل ہیں۔ ان ترقیات کے حصول کی سعی کرنا اور اس کے لیے حریص رہنا ارشاد نبوی کے عین مطابق ہے۔

(۳) بڑے سے بڑے منصوبے اور عمل کو دیکھ کر بھی ہمت نہیں ہارنی چاہئے بلکہ اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرتے ہوئے قدم آگے بڑھانے چاہئیں۔ (اگر اس عزم و حوصلہ سے عمل کیا جائے گا تو ایک نہ ایک دن کامیابی ضرور قدم چومے گی، اور مقصد ضرور حاصل ہو کر رہے گا)۔

(۴) جب ناسازگار حالات آئیں تو یہ کہہ کر وقت اور صلاحیت ضائع نہ کریں کہ ''اگر ایسا ہوتا تو یہ نہ ہوتا وغیرہ'' بلکہ اللہ کی تقدیر پر راضی برضا رہ کر آئندہ کے لیے حکمت عملی بنائیں اور منصوبہ سازی کریں۔ (ورنہ محض مرثیہ خوانی سے قوم کو کوئی نفع نہیں ہوسکتا۔ بلکہ یہ نوحہ خوانی مزید کم ہمتی اور پست حوصلگی کا سبب بنتی ہے اور قوم کی پرواز کی صلاحیت اس سے مفلوج ہو جاتی ہے)۔

الغرض یہ سنہری ہدایات ہمیں آج دعوت فکر و عمل دے رہی ہیں کہ ہم اپنی غفلت اور بے حسی کو دور کریں اور دنیا میں باعزت زندہ رہنے کے لیے اپنی زندگی کا ثبوت دیں اور اس عظیم مقصد کے لیے قربانی کا جذبہ پیدا کریں۔

یہ بات باعث اطمینان ہے کہ مسلمانان ہند کی باوقار تاریخی جماعت ''جمعیۃ علماء ہند'' قوم وملت کو بیدار رکھنے کے لیے مسلسل جدوجہد کر رہی ہے چناں چہ جب گجرات کے ہولناک فسادات اور ان پر فرقہ پرست طاقتوں کی طرف سے اظہار فخر کے ذریعہ مسلمانوں کے حوصلوں کو پست کرنے کی کوشش کی گئی تو جمعیۃ علماء کی قیادت میدان میں آئی اور اس نے جہاں گجرات کے مظلومین کے لیے زبردست ریلیف کا آغاز کیا اور ۵ ہزار مکانات تعمیر کر کے ان میں فساد زدگان کی باز آباد کاری کا عظیم انسانی فریضہ انجام دیا، وہیں دوسری جانب مسلمانوں کے حوصلوں کو بلند کرنے کے لیے سیاسی حکمت عملی کے تحت کچھ پسماندہ دلت لیڈروں کو ساتھ لے کر دہلی کے رام لیلا میدان میں تاریخ ساز ''بھارت بچاؤ ریلی'' کا انعقاد کیا جس سے قوم کے حوصلے بلند ہوئے اور اب اسی بیداری کے سلسلہ کو آگے بڑھاتے ہوئے جمعیۃ نے ۲/ اکتوبر ۲۰۰۲ء سے ''ملک وملت بچاؤ تحریک'' چلانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس تحریک سے مسلم مسائل سے متعلق مطالبات منظور ہوں یا نہ ہوں (کیوں کہ موجودہ فسطائی حکومت سے کسی مثبت اقدام کی کوئی امید نہیں ہے) لیکن قوم میں بیداری کی لہر ضرور

پیدا ہوگی اور بے حسی کا تسلسل دور کرنے میں مدد ملے گی۔ جمعیۃ علماء نے اس وقت جس کام کا بیڑا اٹھایا ہے وہ وقت کی اہم ضرورت ہے، امید ہے کہ اس اقدام سے ملت کو مستقبل میں فائدہ پہنچے گا اوراس سے پیدا شدہ بیداری سے ملت کے قدم تابناک مستقبل کی طرف بڑھیں گے، اور دشمنوں کی ریشہ دوانیوں کا مؤثر دفاع کرنے کی صلاحیت اس میں پیدا ہوگی۔ انشاءاللہ تعالیٰ۔

کیا اچھا ہو کہ دیگر ملّی تنظیمیں بھی قومی مفاد کی خاطر اس تحریک میں جمعیۃ کے شانہ بشانہ حصہ لیں، تاکہ روح پرور ملی اتحاد کے مظاہرہ سے ملت میں نئی روح پیدا ہوسکے اور غیروں کی نظر میں ہمارا وقار بحال ہوسکے، خدا کرے کہ یہ کوششیں بارآور ہوں اور ملت اسلامیہ کو دائمی عزت وعافیت نصیب ہوجائے۔ آمین۔

(ندائے شاہی، اکتوبر ۲۰۰۲ء)

اصلاحِ معاشرہ

معاشرہ کی اصلاح کیسے ہو؟

آج ملت کے ہر دردمند کو احساس ہے کہ مسلم معاشرہ تباہی کے راستہ پر جارہا ہے، دینی احکامات اور ہدایات سے روگردانی عام ہوگئی ہے۔ اور انفرادی و اجتماعی زندگی میں اسلامیت مفقود ہوتی جارہی ہے۔ عام طور پر اس کی اصلاح کی کوششیں بھی کی جارہی ہیں۔ تبلیغی جماعت کا عالمی مشن دراصل اسی اصلاح کے لئے ہے، جمعیۃ علماء ہند نے بھی اصلاح معاشرہ پروگرام کو اپنی محنتوں کا اہم جز بنارکھا ہے۔ اور سالانہ لاکھوں لاکھ روپے اصلاحی اور دعوتی مجالس اور اجتماعات پر خرچ ہورہے ہیں۔ ان محنتوں کی افادیت سے انکار نہیں لیکن انھیں مزید مؤثر بنانے کے لئے ضروری ہے کہ خاص طور پر درج ذیل بنیادی نکات پیش نظر رکھے جائیں۔

(۱) بُرائی کا احساس:

کسی بھی معصیت اور گناہ سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ اس معصیت کی بُرائی ہمارے ذہن میں راسخ ہو؛ کیوں کہ اگر گناہ کا گناہ ہونا ہی ذہنوں سے نکل جائے تو مرتے دم تک بھی اس سے توبہ کی توفیق نہیں ہوسکتی۔ اس لئے دعوت و اصلاح کے کاموں میں لگے ہوئے حضرات کو چاہئے کہ وہ اپنی پوری توجہ اس نکتہ پر صرف کریں کہ منکر اور معصیت کی بُرائی لوگوں کے دلوں میں راسخ کردیں اور گناہ پر ندامت اور شرمندگی کا احساس دلادیں۔ اگر اس میں کامیابی مل جائے تو انشاء اللہ دیر سویر اس گناہ سے بچنے کی توفیق ضرور حاصل ہوجائے گی۔

آج مسلم معاشرہ میں منکرات کے پھیلاؤ کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ گناہوں کی بُرائی ذہن سے نکل چکی ہے بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر بہت سے ناجائز اور ممنوع اعمال کو بُرا سمجھنے کے بجائے اچھی نظر سے دیکھا جانے لگا ہے۔ اور افسوس ہے کہ کچھ لوگ بُرائیوں کے فوائد اور منافع

بیان کرنے میں سرگرم نظر آنے لگے ہیں۔ جو مغالطہ آمیز دلائل کے ذریعہ منکرات کی حیثیت کو ہلکا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔اس صورتِ حال میں مصلحین امت کا فرض ہے کہ وہ ہر منکر کی خرابی اور دنیا وآخرت میں اس کے مفاسد ونقصانات لوگوں کے ذہنوں میں بٹھانے پر بھرپور محنت کریں۔

(۲) خود اپنی اصلاح :

اصلاح کا عمل جب بھی دوسروں سے شروع ہوا ہے کبھی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکا ہے۔ اس لئے اولاً اپنی اصلاح اور اپنے محاسبہ کی ضرورت ہے۔تاکہ بعد میں کسی کو انگلی اٹھانے کا موقع نہ رہے۔ ہمارے آقا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اہل مکہ کے سامنے دعوت پیش فرمائی تو دلیل کے طور پر اپنی چالیس سالہ نبوت سے قبل کی پاس وصاف زندگی کو بھی پیش کیا اور فرمایا۔ **فقد لبثت فيكم عمرا من قبله** (یونس ۱۶)(کیونکہ میں رہ چکا ہوں ایک عمر اس سے پہلے) تو معلوم ہوا مصلح کی اپنی عملی زندگی بھی اصلاحی محنت پر اثر انداز ہوتی ہے۔اس لئے دینی خدمات انجام دینے والوں پر لازم ہے کہ وہ دوسروں سے زیادہ خود اپنی اصلاح کے بارے میں متفکر رہیں۔دین سے نسبت رکھنے والوں کے حسن عمل سے دین کو عزت ملتی ہے جبکہ اس طبقہ کی بدعملی پورے دین کی بدنامی کا سبب بن جاتی ہے **اللهم احفظنا منه**۔

آج دوسروں کی اصلاح کے لئے ہر شخص متفکر ہے لیکن خود اپنے اندر کیا خرابیاں ہیں اور اپنے گھروں میں کیا کیا منکرات پائے جارہے ہیں۔ اس طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی جارہی ہے حالانکہ ضرورت ہے کہ اصلاح کا اولین مخاطب خود اپنے کو بنایا جائے بلکہ دوسروں سے خطاب کرتے وقت بھی اپنے کو شامل رکھا جائے۔اس لئے کہ اپنے عمل کی پختگی کے ساتھ جب اصلاحی کام کیا جاتا ہے۔تو اس میں ایسی برکتیں ظاہر ہوتی ہیں کہ عقلیں حیران رہ جاتی ہیں،اکابر علماءامت کے کارنامے اس پر شاہد ہیں۔

(۳) اصلاح کی دھن :

اصلاحی محنتوں کی کامیابی کے لئے استقلال اور استقامت بھی بنیادی شرط ہے۔ یہ نہ ہو کہ کسی وقت جوش آیا تو اصلاح کے لئے دن رات ایک کردیا اور جب جوش سرد پڑ گیا تو پھر اپنی حالت پر

آ گئے۔ بلکہ یہ محنت برابر جاری رہنی چاہئے۔ اور اس راہ میں جو بھی رکاوٹیں پیش آئیں ان کا پامردی سے مقابلہ کرنا چاہئے۔ اور کسی لعن طعن کرنے والے کی دل آزاری سے ہرگز افسردہ نہ ہونا چاہئے اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جبکہ ہم اللہ کے علاوہ کسی سے بھی اپنے عمل پر معاوضہ یا حوصلہ افزائی کے امیدوار نہ رہیں۔ جب نظر صرف اللہ پر ہوگی تو پھر دنیا کی کوئی رکاوٹ بھی داعی کے راستے میں خلل انداز نہیں ہو سکے گی۔ تجربہ یہ بتاتا ہے کہ بغیر دھن اور لگن کے نہ دنیا ملتی ہے اور نہ دین میں کامیابی حاصل ہو پاتی ہے۔ جس طرح دنیا کے حصول کے لئے محنت اور لگاتار دھن کی ضرورت ہے۔ اسی طرح دین کی کامیابی کے لئے بھی مستقل لگن اور جدوجہد کی ضرورت ہے۔ چنانچہ جس نے بھی اس دُھن کے ساتھ کام کیا ہے اس نے اپنی محنت کے حیرت انگیز نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھ لئے ہیں۔ آج ہمارے اندر اسی دھن کی کمی ہے۔ جس طرح آج ہمیں دنیاوی ترقی کی فکر ہے اگر اس کا دسواں حصہ بھی دینی ترقی کی فکر عام ہو جائے تو حالات یکسر بدل سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں دین کی فکر اور تڑپ پیدا فرمائے۔ آمین۔

(۴) حکمتِ عملی :

اصلاح کے طریقے بے شمار ہیں۔ اصلاح کا صرف یہی طریقہ نہیں ہے کہ جلسہ میں یا اجتماع میں ایک مؤثر تقریر کردی جائے۔ بلکہ حالات وضروریات اور زمانہ کے اعتبار سے اصلاح کے لئے الگ الگ صورتیں اپنانی پڑتی ہیں۔ کہیں انفرادی محنت مفید ہوتی ہے تو کہیں اجتماعی جدوجہد کارگر ہوتی ہے۔ کسی جگہ سختی مفید ہوتی ہے تو دوسری جگہ نرمی سے کام نکلتا ہے۔ نہ ہر جگہ سختی مفید ہے۔ اور نہ ہر جگہ نرمی نفع بخش ہے۔ اس لئے مصلحین امت کو صورت حال دیکھ کر پہلے یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ یہاں کون سا طریقہ مؤثر ہوسکتا ہے بہت سی جگہ اصلاح کے مؤثر نہ ہونے کی وجہ یہی بن جاتی ہے کہ وقت کے تقاضے اور صورتِ حال کی نزاکت کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ اسی وجہ سے قرآن کریم نے دعوت اسلامی کے اصول بیان کرتے ہوئے خاص طور پر حکمت اور موعظت حسنہ کو ذکر فرمایا...... (سورہ نحل) یعنی اصلاح کے لئے یہ لازم ہے کہ ہم مخاطب کے دل میں یہ بات بٹھادیں کہ ہم اس

کے سچے خیر خواہ ہیں اور ہمارا مقصد صرف ہدایت ہے کسی کی تحقیر وتذلیل یا رُسوائی مقصود نہیں۔
حضرت اسامہ بن زیدؓ سے ایک موقوف روایت میں مروی ہے کہ کسی شخص کو اس وقت تک امر بالمعروف کی اجازت نہیں جب تک اس میں ۴ صفات نہ پائی جائیں (۱) جس نیکی کی ترغیب دے اسے جانتا ہو (۲) جس برائی سے روکے اس سے واقف ہو۔ (۳) نیکی کی ترغیب میں نرمی سے کام لے۔ (۴) اور بُرائی سے روکنے میں بھی نرمی سے کام لے۔ (الآداب الشرعیہ ۱/۱۵۰)

بہرحال اصلاح کے لئے مخلصانہ اور پیہم جدوجہد کی ضرورت ہے۔ اگر محنت ہو تو راستے خود بخود کھلتے چلے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی اصلاح فرمائے اور دینی خدمات کے لئے قبول فرمائے۔ آمین۔

(ندائے شاہی، نومبر ۱۹۹۸ء)

معاشرتی بگاڑ کی دواہم بنیادیں

اس وقت مسلم معاشرہ اور بالخصوص نئی نسل میں منکرات، معاصی، فضولیات اور بے حیائیاں بڑھتی جارہی ہیں اورعبادات سے بے رغبتی برابر روز افزوں ہے۔اس صورت حال پر متنبہ کرنے کے لئے کوششیں بھی کی جاتی ہیں۔ جلسے، اجتماعات، تقریریں اور مواعظ اتنے ہورہے ہیں کہ شاید زمانہ سابق میں کبھی اتنے نہ ہوئے ہوں۔مگر جب ساری جدوجہد کا ظاہری نتیجہ دیکھا جاتا ہے تو بہت معمولی نظر آتا ہے۔آخراس بے تاثیری کی اصل وجہ کیا ہے؟ کچھ ماڈرن لوگ تو جل بھن کر یہ کہہ دیتے ہیں کہ ''بھائی اب کہنے والوں میں خلوص ہی نہیں ہے اسی وجہ سے اثر مفقود ہے'' لیکن یہ ظاہر ہے کہ ہر واعظ کے متعلق یہ دعویٰ صداقت سے خالی ہے اور اپنی بلا دوسرے کے سر ڈالنے کے مرادف ہے۔اس لئے کہ خلوص کا تعلق دل سے ہے، کسی کا دل چیر کر کس نے دیکھا ہے؟ کہ کون پُرخلوص ہے اور کون خلوص سے عاری ہے، پھر تاثیر کا مدار محض خلوص پر ہی نہیں ہے۔کیا انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے زیادہ پُرخلوص کوئی ہوسکتا ہے مگر ان کی قوموں کے حالات دیکھئے قوم نوح، قوم عاد وثمود، قوم لوط وغیرہ نے کس طرح اپنے انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کی اور ان کے پاک اور پُرخلوص پیغام کا اثر قبول نہ کیا۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ وعظ کرنے والوں میں خلوص کی ضرورت نہیں، خلوص تو بہرحال ضروری ہے۔لیکن خلوص کے باوجود اگر کوئی چیز ظاہری طور پر تاثیر میں رکاوٹ بن رہی ہوتو اسے بھی دور کرنا چاہئے تاکہ خلوص اپنا اصلی رنگ دکھا سکے۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ ظاہری رکاوٹیں کیا ہیں جنھیں دور کرنا ضروری ہے۔تو غور کرنے سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ تاثیر میں رکاوٹ اور مسلسل بگاڑ کی ترقی میں سب سے زیادہ دخل دوباتوں کو ہے۔(۱) حرام آمدنی (۲) بُری صحبت۔

حرام آمدنی:

حرام آمدنی جب پیٹ میں جاتی ہے تو اس کا خاصہ یہ ہے کہ طبیعت عبادت سے ہٹ جاتی ہے اور معصیت کی طرف راغب ہوجاتی ہے۔ اس آمدنی کے استعمال سے بڑی سے بڑی خوبصورت عبادتیں بارگاہ خداوندی میں نامقبول ہوجاتی ہیں۔ ایسے شخص کی دعائیں بالکل رد کردی جاتی ہیں، خواہ وہ کتنا ہی لجاجت اور تضرع سے مانگے۔ اور جو بدن کا حصہ مال حرام سے پروان چڑھتا ہے اسے جہنم کے عذاب کا مستحق بنا دیا جاتا ہے اب غور کریں کہ آج کے معاشرہ میں حرام آمدنی کی کس قدر کثرت ہے۔ ہر شخص بس ''ھل من مزید'' کے چکر میں نظر آتا ہے اور یہ نہیں دیکھتا کہ حلال سے آرہا ہے یا حرام سے۔ کتنے خاندان محض سود کے حرام پیسوں پر پل رہے ہیں۔ سرکاری ملازمتوں میں رشوت کا برسرعام چلن ہے، لاٹری اور جوئے کی کثرت ہے اور اس کے لئے طرح طرح کے عنوان تراش لئے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں غصب، چوری، قرض لے کر روپیہ ہڑپ کر جانا، زمین جائیداد دبا لینا اور اپنی بہنوں کا حق وراثت مار لینا، یہ سب عام ہے۔ بڑے بڑے نمازی اور پرہیزگار سمجھے جانے والے لوگ بھی مالی معاملات میں احتیاط کے اعتبار سے صفر نظر آتے ہیں۔

لہٰذا ایسی حرام آمدنیوں والے معاشرہ میں کیا جانے والا وعظ وقتی طور پر تو اثر انداز ہوسکتا ہے لیکن پائیدار اثر تو اسی وقت ہوگا جبکہ ان سوراخوں کو بند کیا جائے جن سے آنے والے گندے پانی سے پورا گھر بدبودار ہوگیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں شعور عطا فرمائے۔ آمین۔

بُری صحبت:

بگاڑ کی دوسری بڑی بنیاد اور تاثیر نصیحت میں سب سے بڑی رکاوٹ انسان کی بدکردار سوسائٹی ہے۔ جو شخص جس طرح کے لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے۔ ویسا ہی رنگ اس پر چڑھ جاتا ہے۔ اچھے اور باعزت لوگوں میں بیٹھے گا تو باعزت کہلائے گا اور آبرو باختہ اور بے عزت ساتھیوں کے ساتھ رہے گا تو ذلیل اور رسوا ہوجائے گا۔ اسی بناء پر قرآن کریم اور احادیث طیبہ میں اچھی صحبت اختیار کرنے پر زور دیا گیا ہے اور بُرے لوگوں کے ساتھ رہنے سے سختی کے ساتھ منع فرمایا گیا ہے۔

اس کے برخلاف ہمارا حال یہ ہے کہ ہم اچھی صحبتوں سے دور ہیں اور بُری صحبتوں سے قریب ہیں۔ پھر بُری صحبتوں میں مبتلا کچھ لوگ تو وہ ہیں جن کا واقعی بدکرداروں (شرابیوں، جواریوں، چوروں، قاتلوں وغیرہ) سے یارانہ ہے اوران کے اوقات ایسے ہی لوگوں کی مجلسوں میں گذرتے ہیں، ان کو تو سبھی لوگ بُری صحبت میں مبتلا سمجھتے ہیں اور ایسے شخص سے کچھ دلی تکدر بھی پایا جاتا ہے۔مگرایک ''مروجہ بُری صحبت'' ایسی ہے جس کا بُرا ہونا عوام تو کجا ہمارے دانشوروں کے حلق کے نیچے بھی نہیں اترتا۔ یہ ''بُری صحبت'' وہ ہے جو ٹیلی ویژن کے منحوس حیاسوز اور مخرب اخلاق پروگراموں کے ذریعہ گھر گھر پہنچادی گئی ہے۔ یہ ایک صحبت تمام تر بُرے لوگوں کی صحبتوں کا مجموعہ ہے۔ زناکار، بدکار، قاتل، چور، ڈکیت، شرابی، جواری، طوائف سے سے پوری آشنائی ٹیلی ویژن کے اسکرین پر ہوسکتی ہے۔ بلکہ ڈش انٹینا کے ذریعہ بین الاقوامی فاحشات اور دنیا کے چھٹے ہوئے بدکرداروں کی صحبتوں تک بھی رسائی ہوسکتی ہے۔

چند روز قبل دہلی میں ایک ایسے جلسہ میں سوئے اتفاق سے شرکت کا اتفاق ہوا جس میں مقررین کی فہرست میں بعض نام نہاد دانشوروں کا بھی نام تھا۔اناؤنسر صاحب نے اصلاح معاشرہ پر روشنی ڈالتے ہوئے ٹیلی ویژن کے حیاسوز پروگراموں پر کچھ تنقید کردی۔ بس پھر کیا تھا، ایک روشن خیال مقرر صاحب نے اپنی تقریر میں گل افشانی کی، کہ ''آج کے دور میں ٹی وی کو ناجائز کہنے کی نہیں بلکہ ٹیلی ویژن کو مسلمان بنانے کی ضرورت ہے۔اور ٹیلی ویژن پر چینل بنا کر اتنے دلچسپ پروگرام پیش کرنے چاہئیں کہ لوگ فحش پروگرام کو چھوڑ کر آپ کے پروگرام دیکھنے لگیں۔'' بات بڑی معقول لگ رہی تھی۔ لیکن اس خوبصورتی میں کیا زہر چھپا ہوا تھا اس کو بتانے سے قبل ہی موصوف جلسہ گاہ سے تشریف لے گئے۔ بعد میں احقر نے مجمع سے عرض کیا کہ دو باتیں ہیں۔اوّل یہ کہ ہم دین کی اشاعت کے اس حد تک ہی مکلّف ہیں کہ اس میں کسی خلافِ شریعت بات کا ارتکاب لازم نہ آئے، کسی ناجائز ذریعہ سے دین کی اشاعت کے نہ ہم مکلّف ہیں اور نہ اس طرح دین کی اشاعت ہوسکتی ہے۔ جب اسلامی نقطہ نظر سے تصاویر سازی حرام ہے تو اسے اشاعتِ دین کا ذریعہ کیسے بنایا جاسکتا ہے؟ دوسری بات یہ ہے کہ اگر آپ اپنا چینل کھول بھی دیں اور اس بہانے گھر گھر

ٹیلی ویژن رکھوا بھی دیں۔ تو آخر آپ کے پاس کون سی ایسی طاقت ہے جو اس پر پابندی لگائے کہ لوگ صرف آپ کا اسلامی چینل ہی دیکھیں اور فحش تصاویر والے چینل کو بالکل تالا لگا دیں۔ جب آپ کسی کو پابند بنا ہی نہیں سکتے تو پھر خود سوچیے کہ ٹیلی ویژن سے فحاشی پھیلے گی یا دین کی اشاعت ہوگی؟ آج بھی بعض مسلم ممالک کے اسلامی چینل ٹیلی ویژن پر چل رہے ہیں مگر فحش پروگراموں کے مقابلہ میں ان دینی پروگراموں کے دیکھنے، ان سے دلچسپی لینے والوں نیز ان کے ذریعہ زندگی سدھارنے والوں کی تعداد صفر کے برابر ہے، ہمارے یہ روشن خیال بھی یہ بات جانتے ہیں، مگر فکرِ آخرت اور بارگاہ رب العالمین میں حاضری کے ڈر سے بے نیاز ہو کر یہ لوگ قوم کو جہنم کا ایندھن بننے کا مشورہ دینے میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ٹیلی ویژن میں کوئی نہ کوئی فائدہ ضرور گنایا جاسکتا ہے۔ لیکن دوسری طرف یہ فطری اور قرآنی اصول بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ جب کسی چیز میں نفع اور نقصان دونوں پائے جائیں تو جو پہلو غالب ہو اس پر حکم لگایا جاتا ہے۔ اگر ذرا بھی انصاف اور شرم و حیا کی رمق اور ایمانی غیرت موجود ہو تو اس بات سے ہمارے یہ دانشور بھی اتفاق کریں گے کہ ٹیلی ویژن کے ذریعہ جو معاشرتی، اخلاقی اور فکری بگاڑ پیدا ہو رہا ہے وہ اس سے حاصل شدہ موہوم منافع کے مقابلہ میں صدہا درجہ بڑھا ہوا ہے۔ پھر یہ کیسی عقلمندی اور دانشوری ہے کہ بڑے اور بھیانک نقصان کو نظر انداز کر کے محض امکانی نفع ہی پر حکم کا مدار رکھ دیا جائے؟

بہرحال خلاصہ یہ ہے کہ مواعظ کی تاثیر میں ایک بہت بڑی رکاوٹ آج کے معاشرہ کا غلط صحبت میں گرفتار ہونا ہے۔ جب تک سوسائٹی نہیں بدلی جائے گی اور بدکرداروں کی مجالس سے اپنے کو الگ نہیں کیا جائے گا، اس وقت تک وعظ و تقریر خواہ کتنی ہی پُر خلوص ہو اپنا ظاہری اثر نہیں دکھا سکتی۔

لہٰذا جو لوگ علماء پر بے تاثیری کا طعنہ دیتے ہیں انھیں پہلے اپنے گریبان میں جھانک کر اپنی کوتاہیاں دور کرنی چاہئیں، مالی معاملات میں احتیاط کریں، بُرے لوگوں کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے سے بچیں، پھر دیکھئے۔ کیسا رنگ آئے گا۔ انشاء اللہ۔ اللہ تعالیٰ ہماری اصلاح فرمائے۔ اور اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

(ندائے شاہی، دسمبر ۱۹۹۹ء)

نو باتیں

سرورِ کائنات فخر دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ رب العزت نے خاص طور پر نو ایسی ہدایات عطا فرمائی ہیں جن کو رہنما بنا کر ہم اپنی زندگی پوری طرح اطاعت خداوندی میں گذار سکتے ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مجھ کو میرے پروردگار نے نو باتوں کا حکم دیا ہے:

(۱) یہ کہ ''میں ظاہر و پوشیدہ ہر حالت میں اللہ سے ڈرتا رہوں۔'' یعنی عقیدے اور عمل میں کسی قسم کی دورنگی نہ ہو۔ بلکہ ظاہر و باطن ہر اعتبار سے اللہ کا خوف اور خشیت ملحوظِ نظر رہے۔

(۲) ''یہ کہ میں خوشی اور غصہ دونوں حالتوں میں سچی اور مناسب بات ہی زبان سے نکالوں'' عموماً ایسا ہوتا ہے کہ غصہ کی حالت میں بُرائی کرتے ہوئے آدمی حد سے تجاوز کر جاتا ہے۔ اسی طرح خوشی کی حالت میں ضرورت سے زیادہ تعریف کر دیتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان دونوں بے اعتدالیوں سے ممانعت فرمائی گئی۔

(۳) ''یہ کہ فقر و فاقہ اور مالداری دونوں صورتوں میں درمیانی راہ اختیار کروں۔'' یعنی نہ بہت فقیر رہوں نہ بہت مالدار یا یہ کہ دونوں حالتوں میں صبر اور شکر کا دامن نہ چھوڑوں۔

(۴) ''یہ کہ جو مجھ سے رشتہ ناطہ توڑے میں اس کے ساتھ صلہ رحمی کروں۔'' توڑ کرنے والے کے ساتھ جوڑ کرنا واقعتاً نہایت اہم کام ہے جو بغیر ہمت اور جرأت کے نہیں ہوسکتا۔

(۵) ''یہ کہ جو مجھے محروم کرے میں اس کے ساتھ بھی عطا اور بخشش کا معاملہ کروں۔'' یہ صفت بھی اسی شخص میں ہوسکتی ہے جس کی نظر بندوں پر نہ ہو بلکہ اللہ ربّ العزت کے حکم و ارادہ پر ہو۔

(۶) ''یہ کہ جو میرے ساتھ ظلم روا رکھے میں اس کے ساتھ معافی اور درگذر کا رویّہ اپناؤں''۔

مظلوم ہونے کے باوجود ظالم کو دل سے معاف کردینا تقربِ خداوندی کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔

(۷) ''یہ کہ میرا خاموش رہنا تفکر پر مبنی ہو۔'' یعنی جب میں خاموش رہوں۔تو اللہ تعالیٰ کی صفات اسماءِ حسنیٰ اور مظاہر قدرت میں غور وخوض میں مشغول رہوں۔

(۸) ''یہ کہ میرا بولنا ذکر ہو'' یعنی جب بھی زبان سے کوئی کلمہ نکلے تو وہ ذکر خداوندی یا اس کے معنی پر مشتمل ہو مثلاً تلاوت، افکار، نصیحت وغیرہ۔

(۹) ''یہ کہ میرا دیکھنا عبرت وموعظت ہو'' مطلب یہ ہے کہ جو چیز بھی میں اپنی آنکھوں سے دیکھوں اس سے فوراً عبرت اور نصیحت حاصل کرنے کی کوشش کروں۔ بے پروا ہوکر وہاں سے نہ گذر جاؤں۔

اور خلاصہ یہ ہے'' کہ میں نیکیوں اور بھلائیوں کا حکم کرتا رہوں''۔ (مظاہر حق ۴/ ۲۹۶)

یہ آخری ہدایت اگر چہ نو سے زائد ہے مگر یہ سب کے خلاصہ کی حیثیت رکھتی ہے۔کیونکہ قوم میں ان نیکیوں کا فروغ اسی وقت ہوسکتا ہے جبکہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوں جن کا کام ہی نیکیوں کی طرف لوگوں کو توجہ دلانا اور بھلائیوں پر انھیں آمادہ کرنا ہو۔

آج ضرورت ہے کہ ہم ان ہدایات کو اپنے سامنے رکھیں اور خود اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں کہ ان پر ہم کہاں تک عمل کرتے ہیں۔آج خوف وخشیت خداوندی کا فقدان ہے۔ ہر چیز میں بے اعتدالی کا رجحان ہے۔صبر وشکر عنقاء ہیں۔صلہ رحمی کے بجائے قطع رحمی ہے اور رشتہ داروں کے حقوق میں کوتاہی کا دور دورہ ہے۔مظلوم ظالم کو معاف تو کیا کرتا خود ظالم بننے کی فکر میں رہتا ہے۔ ہمارا خاموش رہنا بھی عموماً کسی گناہ کی منصوبہ سازی کے لئے ہوتا ہے۔زبان سے جو بات نکلتی ہے وہ بھی اکثر حد سے متجاوز ہوتی ہے اور نگاہ کی بے احتیاطی تو پوچھنا ہی کیا؟ عبرت دلانے سے بھی آدمی آنکھوں سے عبرت حاصل نہیں کرتا۔حتی کہ اگر کہیں کوئی عذاب (سیلاب، زلزلہ وغیرہ) آجائے تو لوگ عبرت حاصل نہیں کرتے بلکہ محض تماشہ دیکھنے کی غرض سے دور دراز سے سفر

کر کے ایسی جگہوں پر پہنچتے ہیں اور عذاب کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں۔ یہ ہماری عمومی صورتحال ہے۔

آیئے نظر وفکر کریں۔ مذکورہ بالا ہدایتوں کو بار بار پڑھیں۔خود پڑھیں دوسروں کو پڑھوائیں۔ یہ ہدایات محض دینی اور اخروی فائدہ ہی کے لئے نہیں بلکہ پوری دنیا کے لئے امن وامان کے قیام کے لئے ''ایک رہنما چارٹ'' کی حیثیت رکھتی ہیں۔ان پر اگر عمل کیا جائے تو خاندانوں میں جھگڑے نہیں ہوسکتے۔ گناہوں کی بہتات نہیں ہوسکتی فتنہ وفساد کا رواج نہیں ہوسکتا۔ اوراس سے بڑھ کر آدمی کبھی پریشان نہیں رہ سکتا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو ان ہدایات پر عمل کرنے کی دولت سے سرفراز فرمائے۔ آمین۔

(ندائے شاہی، اپریل ۱۹۹۴ء)

وقت کی قدر و قیمت

دنیا میں سب سے زیادہ قیمتی چیز ''وقت'' ہے اس کو اگر کام میں لگا دیا جائے تو اس کے ذریعہ دنیا اور آخرت میں عظیم نفع حاصل کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً اس وقت کو قرآن کریم کی تلاوت میں استعمال کیا جائے۔ تو چند سکنڈوں میں سیکڑوں نیکیوں کا انبار جمع کیا جاسکتا ہے یہی حال ذکر واذکار اور دیگر عبادات کا ہے کہ ایک ایک مرتبہ سبحان اللہ اور الحمدللہ پر بے حد وحساب اجر وثواب کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح یہ وقت اگر دنیاوی مقاصد کے حصول میں لگایا جائے تو اس کے بھی مفید ثمرات یقیناً حاصل ہوتے ہیں۔ جو شخص اپنے اوقات کسی مقصد کے لئے استعمال کرتا ہے، دیر سویرا سے کامیابی ضرور ملتی ہے وقت کی قدر دانی کی وجہ سے ترقیات انسان کے قدم چومتی ہیں۔ اور اسے ایسے مراتب حاصل ہوتے ہیں کہ دیکھنے والے حیران رہ جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف انسان کی زندگی کا سب سے بڑا خسارہ اس کے اوقات کا ضیاع ہے۔ انسان گویا کہ نام ہی وقت کا ہے۔ ہر انسان ایک محدود وقت لے کر دنیا میں آیا ہے۔ اس کی زندگی کا جو وقت بھی گذر رہا ہے اس سے اس کا زمانۂ حیات گھٹتا جارہا ہے :

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی ایک اور گھٹادی

یہ ایسی دولت ہے جو ضائع ہونے کے بعد دوبارہ میسر نہیں آسکتی ''گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں'' اس لئے اگر زندگی کا کوئی بھی لمحہ بے کار گذر گیا یا فضول مصروفیت میں لگ گیا تو اس سے بڑی کوئی محرومی کی چیز نہیں ہوسکتی۔ جتنا غم انسان کو بڑی سے بڑی دولت کے ختم ہونے پر ہونا

چاہئے اس سے کہیں زیادہ غم وقت کے بیکار ضائع ہونے پر ہونا چاہئے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

نِعْمَتَانِ مَغْبُوْنٌ فِيْهِمَا كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ الصِّحَّةُ وَالْفَرَاغُ. (بخاری شریف۲/۹۴۹)

''تندرستی اور فرصت کے لمحات دو ایسی نعمتیں ہیں جن میں اکثر لوگ ٹوٹے میں مبتلا ہیں''۔

یعنی یہ دو نعمتیں ایسی ہیں جن سے لوگ جکما حقہ فائدہ نہیں اٹھاتے۔ صحت ہوتی ہے تو اس کے استعمال میں احتیاط نہیں ہوتی اور فرصت ملتی ہے تو اسے ضائع کر دیا جاتا ہے۔ اب دنیا میں اسباب راحت زیادہ ہوگئے ہیں تو وقت کا ضیاع بھی عام ہوگیا ہے۔ تقریباً معاشرہ کا ہر فرد تضیعِ اوقات میں مبتلا ہے۔ الا ماشاء اللہ۔ کوئی ٹیلی ویژن کا رسیا ہے، تو کسی کو کرکٹ اور فٹ بال کا ''خولیا'' ہے اور ہماری آزاد جمہوریت میں تو سیاست ہر ''گھر کی لونڈی'' ہے۔ جسے دیکھئے مسائل سیاست پر ایسی بحثیں کرتا نظر آتا ہے گویا یہی وزیر اعظم یا پارٹی کا ذمہ دار ہو۔ فضول مجلسیں، بے فائدہ بحثیں اور لغو اجتماعات عام ہیں اور یہ مرض صرف دنیا داروں ہی میں نہیں بلکہ دیندار ماحول میں بھی رچ اور بس گیا ہے دینی طبقوں میں بھی محنت، جدوجہد اور وقت کی قدر ومنزلت کا رجحان کم سے کم تر ہوتا جارہا ہے۔ اسی بنا پر بہت سے باصلاحیت اور ذہین افراد کی محنتوں اور افادات سے آج امت محروم ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر ایسے باصلاحیت لوگ اپنے اوقات کی قدر کریں تو نہ صرف یہ کہ ان کے علم میں جلا اور ان کا نام روشن ہوگا۔ بلکہ امت بھی ان کی صلاحیتوں سے بھرپور استفادہ کرسکے گی۔ جیسا کہ سلف صالحین کی محنتیں اور ان کی خدمات ہمارے سامنے ہیں۔ مثلاً:

(۱) مشہور محدث اور امام جرح وتعدیل یحییٰ بن معین کے بارے میں آتا ہے کہ انھوں نے دس لاکھ حدیثیں خود اپنے دست مبارک سے تحریر کیں۔ اور جب ان کا انتقال ہوا تو کتابوں کے ۱۱۴/ کارٹون اور چار بڑے بڑے مٹکے چھوڑے (جن میں اس زمانہ میں حفاظت کی نیت سے کتابیں رکھی جاتی تھیں)

(۲) علامہ ابن جریر طبریؒ جنھوں نے تین ہزار صفحات پر مشتمل تفسیر اور تاریخ لکھی ہے۔ ان کی وفات کے بعد جب یومیہ تالیف کا حساب لگایا گیا تو بچپن کی عمر کو چھوڑ کر روزانہ ۱۴ صفحے لکھنے کا

پتہ چلا۔ اس حساب سے انھوں نے ۲۷ سال میں تین لاکھ اٹھاون ہزار صفحات تصنیف فرمائے۔ خطیب بغدادی لکھتے ہیں کہ ابن جریر طبریؒ نے ۴۰؍سال تک روزانہ ۴۰؍صفحات تالیف کرنے کا التزام کیا۔

(۳) محدث شہیر ابن عساکرؒ نے ۸۰ جلدوں میں تاریخ دمشق لکھی ہیں جو اسلامی تاریخ وسیر کا بے نظیر مجموعہ ہے۔ موصوف ہر وقت افادہ واستفادہ میں مشغول رہنے کے ساتھ عبادات میں بھی کثرت سے وقت لگاتے۔ ہر ہفتہ ایک ختم قرآن اور رمضان المبارک میں یومیہ ایک ختم قرآن کا معمول تھا۔

(۴) محدث ابن شاہین فرماتے ہیں کہ میں نے ۳۳۰ تصنیفات لکھی ہیں جن میں تفسیر کبیر ایک ہزار جز (تقریباً تیس ہزار صفحات) مسند ۱۳؍سو جز (تقریباً ۳۹ ہزار صفحات) اور تاریخ کا ۱۵۰ جز (تقریباً ۴۵۰۰ صفحات) اور ''زہد'' سو جز (تین ہزار صفحات) پر مشتمل ہے۔

(۵) ابن عقیل جلیل القدر مؤلف ہیں۔ انھوں نے ایک کتاب ''الفنون'' کے نام سے لکھی جو آٹھ سو جلدوں پر مشتمل تھی۔ اس کتاب کے بارے میں حافظ ذہبی کا خیال یہ ہے کہ روئے زمین پر اس سے بڑی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔

(۶) امام ابوالفرج بن الجوزی نے اپنے پیچھے ۵۰۰ کتابوں کا ذخیرہ چھوڑا۔ اور خود فرماتے ہیں کہ میں نے مختلف کتب خانوں کی تقریباً بیس ہزار کتابوں کا مطالعہ کیا ہے۔ اور اپنے ہاتھوں سے دو ہزار کتابیں لکھی ہیں۔ اور آپ کے انتقال کے بعد جب آپ کے تحریر کردہ مسودے اکٹھے کیئے گئے اور انھیں عمر کے ایام پر تقسیم کیا گیا تو یومیہ ۹؍کاپیوں کا اوسط بیٹھا۔ اور یہ بھی مشہور ہے کہ آپ نرسل کے قلم کا چھلا ہوا حصہ جمع کرتے تھے۔ جب وہ زیادہ لکھنے کی وجہ سے وافر مقدار میں جمع ہوگیا تو وصیت فرمائی کہ میرے انتقال کے بعد انہی قلموں کی چھیلن سے میرے غسل کا پانی گرم کیا جائے۔ چنانچہ آپ کی وصیت پوری کرنے کے باوجود ایندھن بچ رہا۔

(۷) صاحب تفسیر کبیر امام فخر الدین رازیؒ نے ۲۰۰ قیمتی کتابوں کا ذخیرہ امت کو دیا۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ کھانا کھاتے وقت میرا جو وقت علمی مشغلہ کے بغیر گذر جاتا ہے اس پر مجھے افسوس ہوتا ہے۔

(۸) حافظ عبدالعظیم منذریؒ فرماتے ہیں کہ میں نے علم حدیث میں دوسروں کی جمع کردہ ۹۰ جلدیں اور ۷۰۰ اجزاء اپنے ہاتھ سے نقل کئے ہیں۔ اپنی عظیم تصنیفات ان کے علاوہ ہیں۔ ان کے ایک پڑوسی کہتے ہیں کہ میں بارہ سال ان کے مکان کے قریب رہا مگر کسی رات ان کے کمرے کی روشنی بند نہیں پائی، وہ پوری پوری رات چراغ جلا کر مطالعہ اور تصنیف میں مشغول رہتے تھے۔

(۹) علامہ ابن تیمیہؒ کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے ۵۰۰ کے قریب تصنیفات تحریر کیں اور دیگر مشغولیات اور خدمات اس کے علاوہ ہیں۔

(۱۰) صاحب روح المعانی علاّمہ آلوسی بغدادیؒ روزانہ ۱۳ کتابوں کا درس دیتے۔ اور رات کے وقت تفسیر روح المعانی لکھتے۔ اور روزانہ کا مسودہ کاتبوں کے حوالے کرتے تو وہ اتنا ہوتا کہ کئی کاتب مل کر بھی اسے دس گھنٹے میں پورا نہ کر پاتے تھے۔

(۱۱) قاضی ابوبکر الباقلانیؒ رات کو اس وقت تک سوتے نہ تھے جب تک کہ ۸۰ رکعت نماز اور ۳۵ صفحات تصنیف کے نہ لکھ لیتے۔

(۱۲) صاحب مستدرک علامہ حاکمؒ کی تالیفات کی مقدار ایک ہزار پانچ سو جز یعنی تقریباً ۴۵ ہزار صفحات تک پہنچتی ہے۔

(۱۳) شارح مسلم امام نوویؒ نے کل ۴۵ سال کی عمر پائی اور زیادہ تر وقت تالیف وتصنیف میں گذارا۔ آپ کے انتقال کے وقت جب آپ کی تصنیفات کا حساب لگایا گیا تو یومیہ چار کاپیوں کا حساب نکلا۔

(۱۴) ہمارے قریبی دور میں علامہ عبدالحئ لکھنویؒ نے صرف ۳۹ سال کی عمر پائی، مگر ایسی لازوال کتابیں اور حاشیے تالیف فرمائے کہ حیرت ہوتی ہے۔

(۱۵) حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علیؒ تھانوی نے ایک ہزار کتب ورسائل کا عظیم ذخیرہ امت کو عطا فرمایا جن میں سے اکثر کتابیں انقلابی شان رکھتی ہیں۔ جن کا فیض کھلے آنکھوں نظر آتا ہے۔ (انتخاب از کتاب ''قیمۃ الزمن عند العلماء''، مؤلف شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ طبع بیروت)

اور شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ مدینہ منورہ کے زمانۂ قیام میں روزانہ ۱۵؍۱۶ اسباق، مسجد نبوی میں حسبۃً للہ پڑھاتے تھے۔ اس مصروفیت کی وجہ سے روزانہ بقدرِ ضرورت سونا بھی نصیب نہ ہوتا۔ چنانچہ چھٹی والے دن ہفتہ بھر کی نیند پوری کیا کرتے تھے۔ (نفش حیات)

مذکورہ اکابر علماء کی پر افادہ زندگیوں کی یہ محیر العقول جھلکیاں آج ہمارے لئے ناقابل یقین معلوم ہوتی ہیں۔ کیونکہ ہمارے نزدیک وقت کی قدر ومنزلت کسی بھی درجہ میں نہیں ہے۔ وقت کا ضیاع ہمارے لئے اتنا آسان ہو چکا ہے کہ اس پر افسوس کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم آئندہ کی ندامت سے بچنے کے لئے حتی الامکان عمر عزیز کے قیمتی اوقات مفید کام میں لگائیں وقت کو کوئی آمد بنانے کے لئے درج ذیل باتوں کا لحاظ رکھنا تجربہ سے مفید ثابت ہوا ہے۔

الف : غیر ضروری مجلسوں میں شرکت سے ہر ممکن احتراز کیا جائے۔

ب : شب وروز کا نظام الاوقات بنا کر سختی سے اس کی پابندی کی جائے۔

ج : جب کئی کام سامنے ہوں تو انجام کے اعتبار سے مفید اور اہم کام میں وقت لگانے کو ترجیح دی جائے۔ غیر اہم کام میں وقت اور صلاحیت کو ضائع نہ کیا جائے۔

د : سستی اور تساہل کے اسباب اور آرام طلبی کے ذرائع کے استعمال میں احتیاط برتی جائے۔

ہ : عام لوگوں سے زیادہ اختلاط نہ ہو۔ صرف بقدرِ ضرورت واسطہ رکھا جائے۔

و : روزانہ رات کو سونے سے قبل پورے دن کی مصروفیات کا جائزہ لیا جائے۔ اچھی مصروفیات پر اللہ کا شکر بجالایا جائے اور فضول وقت گذاری پر ندامت اور آئندہ اس سے احتراز کا عزم مصمم کیا جائے۔

ز : علماء ومشائخ کی پر عزم زندگیوں کا مطالعہ کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ قارئین کے طفیل میں راقم الحروف کا ناکارہ کو بھی اپنے عزیز اوقات کو مرتے دم تک خیر کے کاموں میں لگائے رکھنے کی توفیق ارزاں فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

(ندائے شاہی، جون ۱۹۹۹ء)

اسلامی معاشرہ کی ایک جھلک

مالک بن دینارؒ کہتے ہیں کہ ان سے دورِ اوّل دیکھنے والے ایک شخص نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ امیر المومنین سیّدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے ان کے قبیلہ سے زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے ایک شخص کو بھیجا اور اسے ہدایت کی کہ جب تک میرا دوسرا حکم نہ پہنچے تم اسی قبیلہ میں قیام کرکے وہاں کی امارت کی ذمہ داری ادا کرنا۔ وہ صاحب اپنے ایک حبشی غلام کو لے کر روانہ ہوئے۔ سواری ایک ہی تھی اس لئے باری باری دونوں اس پر سوار ہوتے تھے۔ جب قبیلہ کے قریب پہنچے تو اتفاق یہ کہ غلام کے سوار ہونے کی باری چل رہی تھی۔ اس لئے غلام نے عرض کیا کہ ''مجھے اس بات سے شرم آتی ہے کہ میں تو سوار ہوں اور آپ پیدل چلیں'' ان صاحب نے کہا کہ پھر کیا کریں؟ غلام نے درخواست کی کہ میں اپنی باری آپ کے لئے چھوڑتا ہوں۔ آپ سوار ہو جائیں۔ انھوں نے فرمایا کیا بالکل خوش دلی سے کہتے ہو۔ غلام نے کہا جی ہاں! چنانچہ وہ سوار ہو گئے اور غلام پیدل چلنے لگا۔ اسی حالت میں وہ قبیلہ میں داخل ہوئے۔ ساری بستی میں شور مچ گیا۔ جاء الامیر، جاء الامیر (امیر صاحب آگئے، امیر صاحب آگئے) اور ایک بھیڑ جمع ہو گئی اور سب اپنے دستور کے مطابق استقبال میں ان امیر صاحب کے سامنے سجدے میں گر گئے۔ یہ منظر دیکھ کر ان صاحب نے اپنا اونٹ بٹھایا اور خود بھی سجدے میں گر گئے۔ اب بستی کے لوگوں نے پہلے سر اُٹھالیا، امیر صاحب سجدے ہی میں سو رہے۔ جب انھوں نے سجدہ پورا کیا تو لوگوں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے کس کو سجدہ کیا؟ انھوں نے جواب دیا کہ میں نے لوگوں کو سجدہ کرتے دیکھا اس لئے میں نے بھی سجدہ کرلیا۔ (اسے سجدۂ شکر سمجھا ہوگا) لوگوں نے کہا کہ حضرت! ہم نے تو آپ کو سجدہ کیا ہے۔ امیر صاحب نے کہا اچھا؟ تم لوگوں نے مجھے سجدہ کیا ہے؟ لوگوں نے تصدیق کی۔ تو انھوں نے فوراً غلام

سے کہا۔ کیا حضرت عمرؓ نے مجھے اللہ کے علاوہ معبود بنانے کے لئے یہاں بھیجا ہے؟ توبہ توبہ! چلو یہاں سے! چنانچہ اونٹ پر سوار ہو کر مدینہ منورہ واپس آ گئے۔ اور سارا قصّہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بیان فرمایا۔ حضرت عمرؓ اس واقعہ کو سن کر بہت ہنسے۔ اور ان صاحب کے بجائے دو انصاری صحابہ کو اس علاقہ میں بھیجا۔ جب وہ دونوں اس قبیلہ میں پہنچے تو لوگوں نے آپس میں کہا کہ انھیں سجدہ نہ کرنا، ورنہ یہ بھی پہلے والے امیر کی طرف واپس چلے جائیں گے۔ بہرحال ان کے لئے دسترخوان چنا گیا۔ ایک پیالے میں انھوں نے بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع کر دیا۔ ابھی پیالہ میں کچھ کھانا باقی تھا کہ بستی والوں نے وہ پیالہ اٹھانا چاہا۔ تو انھوں نے کہا کہ اسے کہاں لے جا رہے ہو۔ اس میں تو بہت عمدہ کھانا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ ہمارے پاس اس سے بھی عمدہ اور لذیذ کھانا موجود ہے۔ اور دوسرا پیالہ سامنے پیش کیا۔ اسے دیکھ کر ان دونوں صحابیوں میں سے ایک نے دوسرے سے کہا کہ کیا امیر المومنین نے ہمیں اسی لئے یہاں بھیجا ہے کہ ہم دنیا ہی میں عمدہ عمدہ غذائیں کھالیں؟ (اور آخرت کے لئے کچھ نہ بچے) توبہ توبہ! چلو یہاں سے! چنانچہ دونوں حضرات مدینہ منورہ واپس آ گئے۔ اور ساری باتیں حضرت عمرؓ سے بیان کر دیں۔ سیدنا حضرت عمرؓ کو جلال آ گیا۔ اور فرمایا۔ آخر میں کیا کروں؟ کس کو امیر بناؤں؟ کس سے مدد حاصل کروں؟ پھر ایک مہاجر صحابی ابوالیسار مزنی کو امیر بنا کر بھیجا۔ وہ وہاں تشریف لے گئے۔ اور انھوں نے لگان وغیرہ کی وصولیابی کا کام شروع کیا۔ تو بستی والوں نے آ کر اپنا خراج ادا کیا اور ساتھ میں کچھ ہدیہ لائے اور کہا کہ یہ خاص طور پر آپ کی ذات کے لئے ہے۔ ان صاحب نے فرمایا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ لوگوں نے کہا کہ یہ تو ہم اپنی خوشی سے آپ کو دے رہے ہیں۔ انھوں نے پھر یہی جواب دیا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ امیر المومنینؓ نے مجھے اس کو وصول کرنیکا حکم نہیں دیا۔ اور خراج لے کر اور ہدیہ چھوڑ کر واپس آ گئے۔ (شعب الایمان ۵/ ۳۷)

اس واقعہ کی سطر سطر سے دور صحابہ خیر القرون کے معاشرہ کی شاندار جھلک نظر آتی ہے۔ اس وقت دنیا سے بے رغبتی، اپنی تعظیم سے اجتناب، آخرت کی فکر اور کمال احتیاط کے جذبات پورے

اسلامی معاشرے میں رچے اور بسے نظر آتے تھے۔اور ہر طرف دیانت اور صدق ووفا کا دور دورہ تھا۔اس کے برخلاف آج کا مسلم معاشرہ ان صفات سے دور نکل چکا ہے آج ہر طرح خودنمائی، تعیش، آرام طلبی اور بے احتیاطی کا دور دورہ ہے۔عوام تو کجا،خواص کے طبقہ میں بھی اس معاملہ میں بے اعتنائی پائی جاتی ہے۔ بالخصوص دینی اداروں، جماعتوں اور مدارس سے وابستہ حضرات کو مالی معاملات میں انتہائی احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے۔تا کہ امت کا اعتماد ان پر برقرار رہ سکے۔ اور وہ آخرت کے مواخذہ سے پوری طرح محفوظ رہ سکیں۔وھو الموفق۔

(ندائے شاہی،اکتوبر ۱۹۹۸ء)

قیامت قریب ہے

قیامت کا حتمی وقت تو اللہ ہی کو معلوم ہے لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت پر شفقت فرماتے ہوئے قیامت کی مختلف علامتیں تفصیل کے ساتھ احادیث طیبہ میں بیان فرمائی ہیں۔ تا کہ امت ان پر دھیان دے کر اپنی آخرت بنانے کی فکر کرے اور ہر اس عمل سے اجتناب کرے جو اللہ تعالیٰ کے عذاب کو دعوت دینے والا ہے۔

سیدنا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے ایک روایت میں قیامت کے قریبی زمانہ میں امت کی معاشرتی حالت پر روشنی ڈالی ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ امت کے افراد اپنی دینی ذمہ داری سمجھتے ہوئے ان خطرناک روحانی امراض سے حتی الامکان اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کریں۔ ورنہ اگر ان امراض کو پنپنے دیا گیا تو دنیا ہی میں سخت ترین عذاب کے نمونے سامنے آئیں گے جن سے کوئی محفوظ نہ رہ سکے گا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

(۱) اِذَا اتُّخِذَ الْفَيْئُ دُوَلاً.

’’جب مالِ غنیمت کو سرمایہ داری کا ذریعہ بنالیا جائے۔‘‘

مالِ فــئــی اس مال کو کہتے ہیں جس میں سب مسلمانوں کا حق ہوتا ہے اور وہ حسبِ ضرورت مستحقین پر صرف کیا جاتا ہے آج کل مدارس ومساجد اور دینی اداروں کا فنڈ بھی اسی حکم میں ہے کہ ان کا اپنے مصارف کے علاوہ کہیں اور صرف کرنا درست نہیں ہے۔ مگر دیانت وامانت کے فقدان کی وجہ سے اربابِ اختیار اگر اس مشترکہ مال کو مستحقین پر خرچ کرنے کے بجائے اپنے ذاتی

مفادات میں خرچ کرنے لگیں۔ اور اس کو اپنی سرمایہ داری کا ذریعہ بنالیں تو پھر اللہ تعالیٰ کے عذاب کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

(۲) وَالْاَمَانَةُ مَغْنَماً.

''اور امانت کو مال غنیمت سمجھا جائے۔''

یعنی اگر کسی کے پاس امانت کے طور پر مال رکھ دیا جائے تو وہ اس میں خیانت کرنا اپنا حق سمجھنے لگے۔ اور خیانت کا احساس ہی اس کے دل سے نکل جائے۔

(۳) وَالزَّکٰوۃُ مَغْرَماً. ''اور زکوٰۃ کی ادائیگی کو ٹیکس سمجھا جائے۔''

یعنی مالداروں کے لئے زکوٰۃ کی ادائیگی ایسا بوجھ بن جائے جیسے سرکاری ٹیکس ادا کرنے میں وہ بوجھ محسوس کرتے ہیں۔ جیسا کہ آج کل اکثر مالداروں کا حال ہے کہ اپنی کسی تقریب میں خرچ کرنا ہو تو لاکھوں لاکھ روپے لٹا دیتے ہیں۔ اور جب زکوٰۃ ادا کرنے کا موقع آتا ہے تو چہرے پر تیور چڑھ جاتے ہیں۔ اور دیتے بھی ہیں تو گویا فقیر پر بڑا احسان رکھتے ہیں۔ العیاذ باللہ۔

(۴) وَتُعُلِّمَ لِغَیْرِ الدِّیْنِ.

''اور علم دین دینی مقاصد کے علاوہ کے حصول کے لئے سیکھا جانے لگے۔''

یعنی علماء کے دلوں سے اخلاص ختم ہو جائے وہ نام کے عالم ضرور ہوں مگر اس علم سے ان کا مقصد محض دنیوی مفادات حاصل کرنا رہ جائے۔ اور علم کو خدمت دین کے طور پر نہیں بلکہ کسبِ معاش کے طور پر پڑھا جانے لگے۔

(۵) وَاَطَاعَ الرَّجُلُ زَوْجَتَهٗ.

''اور آدمی اپنی بیوی کا فرمانبردار بن جائے۔''

یعنی ہر حق ناحق بات میں اپنی بیوی کے حکم کی تابعداری کرنے لگے۔ اور مرد ہونے کے باوجود عورت کے اشاروں پر ناچنے لگے۔ جیسا کہ آج کل اکثر نوجوانوں کا حال ہے کہ وہ بیوی کی اس حد تک طرفداری کرتے ہیں کہ دیگر رشتہ داروں کے حقوق تلف ہونے لگتے ہیں۔ اس جملہ کا یہ

مطلب نہیں ہے کہ بیوی کی کوئی بات مانی ہی نہ جائے۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ بیوی کا ایسا مشورہ ماننا جو خلاف شریعت ہو یا جس سے دیگر قریبی اعزہ کی حق تلفی ہوتی ہو، قابل مذمت اور موجبِ فتنہ ہے۔

(۶) وَعَقَّ اُمَّهٗ .

''اور آدمی ماں کی نافرمانی کرے۔''

ماں کو ستانا انتہائی بدبختی کی بات ہے اور یہ ایسا جرم ہے جس کی سزا انسان کو دنیا ہی میں مل کے رہتی ہے۔ یہ جملہ بیوی کی اطاعت گذاری کے ساتھ لایا گیا اس میں اس جانب اشارہ ہے کہ اس وقت ماحول الٹ جائے گا جو ہستی قابل اطاعت ہوگی۔ اس کی تو نافرمانی کی جائے گی۔ اور اس کے مقابلہ میں بیوی کو مطاع بنالیا جائے گا۔ (مرقاۃ ۵/۱۷۷)

(۷) وَاَدْنیٰ صَدِیْقَهٗ وَ اَقْصیٰ اَبَاهٗ.

''اور آدمی اپنے دوست سے تو قریب ہو مگر اپنے باپ سے دوری اختیار کرے''۔

یعنی یار دوستوں سے دوستی کا پورا حق نبھائے اور ان کے مشوروں پر پوری طرح عمل پیرا ہو۔ اور ان کے مقابلہ میں اپنے باپ سے جو انسان کے لئے دنیا میں سب سے مشفق ترین شخصیت ہے دوری اختیار کرے، نہ اس کا حق ادا کرے اور نہ اس کی اطاعت کرے۔ یہ مرض بھی آج کل کے آزاد پسند نوجوانوں میں عام ہے کہ اپنا اکثر وقت آوارہ دوستوں کے ساتھ گذارتے ہیں اور باپ کو خاطر میں نہیں لاتے۔

(۸) وَظَهَرَتِ الْاَصْوَاتُ فِی الْمَسَاجِدِ.

''اور مسجد میں شور مچایا جانے لگے''۔

یعنی مسجدوں کو چوپال بنالیا جائے۔ دنیا جہان کی باتیں لوگ مسجدوں میں بیٹھ کر کرنے لگیں۔ یا مسجدوں میں بات بات پر تکرار ہونے لگے اور مسجد جو عبادت کا مقام ہے وہاں بھی یکسوئی اور سکون رخصت ہوجائے۔

(۹) وَسَادَ الْقَبِیْلَةَ فَاسِقُهُمْ.

''اور قبیلہ کی قیادت فاسق کے ہاتھ میں آجائے۔''

یعنی خاندان کے چودھری اور سرپنچ اکثر ایسے لوگ بن جائیں جن کا دامن خود بدکرداری سے داغدار ہو اور ان میں دینداری مفقود ہو۔

(۱۰) وَكَانَ زَعِيمَ الْقَوْمِ اَرْذَلُهُمْ.

"اور قوم کا لیڈر ان میں کا گھٹیا ترین شخص بن جائے"۔

یعنی ایسے لوگ لیڈر اور قائد بن جائیں جن کا کردار انتہائی گھٹیا ہو، مروت اور شرافت کا نام و نشان بھی ان میں نہ ہو۔ اخلاق فاضلہ کی ہَوا بھی انھیں نہ لگی ہو۔ مگر قوم کے افراد محض اپنے گھٹیا مفادات کے خاطر ایسے ذلیل اور رذیل لوگوں کو اپنا رہبر اور رہنما بنانے لگیں، جیسا کہ آج کل کے اکثر لیڈروں کا حال ہے۔

(۱۱) وَاُكْرِمَ الرَّجُلُ مَخَافَةَ شَرِّهٖ. "اور آدمی کا اعزاز اس کے شر کے اندیشہ سے کیا جائے۔"

یعنی انسان کی شرافت و اخلاق اس کی عزت کی بنیاد نہ ہو بلکہ لوگ محض اس خطرہ سے کہ اگر اعزاز نہ کیا تو یہ ہمیں نقصان پہنچائے گا، اس کی عزت کرنے لگیں، جیسا کہ آج کل بہت سے دادا گیر قسم کے لوگوں کو ظاہری عزت بخشی جاتی ہے۔

(۱۲) وَظَهَرَتِ الْقَيْنَاتُ. "اور گانے والیاں عام ہو جائیں۔"

یعنی گانے کی شوقین عورتوں کی کثرت ہو جائے۔ آج کل تو فن اور ثقافت کے نام پر دنیا میں ناچنے گانے کے باقاعدہ ٹریننگ اسکول قائم کردیئے گئے ہیں۔ اور برسرِ عام ایسی عورتیں ناچتی گاتی نظر آتی ہیں۔

(۱۳) وَالْمَعَازِفُ. "اور گانے بجانے کے آلات عام ہو جائیں گے۔"

یہ بھی آج کل بالکل مشاہد ہے۔ رہی سہی کسر ٹیلی ویژن اور وی سی آر، نے پوری کردی ہے یہ ایک ہی آلہ تمام شیطانی آلات کا مرکب مجموعہ ہے، جو گھر گھر عام ہے۔

(۱۴) وَشُرِبَتِ الْخُمُوْرُ. "اور شرابیں پی جانے لگیں۔"

یعنی امت کے افراد برسرِ عام بغیر کسی خوف و خطر کے شراب پینے لگیں، اور شراب کی حرمت دل سے جاتی رہے، جس کا مشاہدہ آج کے آزاد نوجوان معاشرہ میں بآسانی کیا جاسکتا ہے۔

(۱۵) وَلَعَنَ اٰخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اَوَّلَهَا.

''اورامت کے بعد میں آنے والے لوگ اپنے اسلاف پر لعن طعن کرنے لگیں۔''

جیسا کہ آج کے بہت سے بے توفیق لوگوں کا حال ہے کہ حضرات صحابہؓ اور ائمہ اربعہ اور دیگر اکابر امت پر زبان درازی کرتے رہتے ہیں اور بس اسی کو دینی خدمت سمجھتے ہیں جس سے امت سخت انتشار میں مبتلا ہو رہی ہے۔

آگے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب امت میں یہ بدعملیاں ظاہر ہو جائیں تو اس وقت انتظار کرنا سرخ آندھیوں، زلزلوں، زمین میں دھنس جانے، صورتیں مسخ ہو جانے، آسمان سے پتھروں کی بارش ہونے اور ایسی قیامت کی نشانیوں کا جو اس طرح لگاتار آئیں گی جیسے کسی ہار کا تاگا ٹوٹ جائے تو اس کے دانے تیزی سے بکھر جاتے ہیں۔

(مشکوٰۃ شریف، ترمذی شریف ۲/ ۴۵ بروایت ترمذی ۲/ ۴۷۰) اللهم احفظنا منه۔ مشکوٰۃ شریف ۲/ ۴۷۰

آج غور فرمایئے! کیا یہ حقیقت نہیں کہ مذکورہ بالا بدعملیاں آج ہمارے معاشرہ میں ظاہر ہی نہیں بلکہ جڑ پکڑ چکی ہیں۔ دیانت وامانت ناپید ہے۔ شرم وحیا سر پیٹ رہی ہے۔ اخلاق حسنہ کا فقدان ہے۔ بدکردار لوگوں کی بہتات ہے۔ عبادات سے بے رغبتی، اور منکرات سے دلچسپی روز افزوں ہے۔

اس صورت حال میں ہم سوچیں کہ ہماری دینی ذمہ داری کیا ہے؟ کیا ان بدعملیوں کو محض اپنے مصالح کی خاطر یونہی برداشت کر لینا اور ان پر خاموش تماشائی بنے رہنا ہی قرین انصاف ہے؟ یا ان کے خلاف میدان میں آنے کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ان پر نکیر نہیں کی جائے گی تو ایک دن وہ بھی آ سکتا ہے کہ پوری قوم ہی اس ناسور کی گرفت میں آ کر مستحقِ عذاب بن جائے۔

اس لئے ہر مسلمان کو سنجیدگی سے اپنے اِرد گرد کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ اور حتی الوسع ان برائیوں کو معاشرہ سے ختم کرنے پر محنت کرنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ کل میدان حشر میں اللہ تعالیٰ کے دربار میں ہم جواب دہی سے محفوظ رہ سکیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں فکر صحیح سے نوازے اور ہر بُرائی اور بدعملی سے بچا کر راہ حق پر استقامت سے سرفراز فرمائے۔ آمین۔

(ندائے شاہی، نومبر ۱۹۹۹ء)

مسنون طریقہ

حضرت سلمان فارسیؓ (م۳۶ھ) کا شمار اکابر علماء اور زناد صحابہ میں ہوتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جنت خاص تین آدمیوں کی مشتاق ہے جن میں ایک حضرت سلمان فارسیؓ بھی ہیں۔ (ترمذی شریف ص۲۲۰) آپ کے کمال زہد اور دنیا سے بے رغبتی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ نے قبیلۂ کندہ کی ایک عورت سے نکاح کیا۔ عورت کی رخصتی کا اسی کے گھر میں انتظام کیا گیا تھا آپ اپنے چند احباب کے ساتھ سسرال پہنچے۔ ساتھیوں کو باہر ہی سے واپس کردیا۔ پھر گھر میں داخل ہونے کا ارادہ کیا۔ دیکھا کہ گھر بہت سجایا گیا ہے۔ جگہ جگہ پردے لگے ہیں۔ اور روشنی ہو رہی ہے۔ آپ نے گھر والوں سے پوچھا کہ کیا تمھارے گھر میں آسیب کا اثر ہے یا کعبہ یہاں اُٹھ کر آ گیا ہے کہ اسے اتنا مزین کیا گیا ہے؟ گھر والوں نے دونوں باتوں سے انکار کیا۔ بالآخر حضرت سلمانؓ اس وقت تک گھر میں داخل نہ ہوئے، جب تک کہ گھر کی ساری سجاوٹ اتار نہ دی گئی۔ گھر میں داخل ہونے کے بعد آپ نے دیکھا کہ بہت سا سامان مختلف اقسام کا رکھا ہوا ہے۔ آپ نے پوچھا، یہ کس کا سامان ہے؟ لوگوں نے جواب دیا کہ یہ آپ کا اور آپ کی اہلیہ کا ہے۔ اسی طرح آپ نے دیکھا کہ بہت سے غلام باندیاں دست بستہ کھڑے ہیں۔ آپ نے دریافت کیا کہ یہ کس کے ہیں؟ جواب ملا؟ آپ کے اور آپ کی اہلیہ کے خدام ہیں۔ یہ جواب سن کر آپ کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ اور انتہائی حسرت انگیز لہجہ میں ارشاد فرمایا کہ میرے خلیل صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ وصیت نہیں کی تھی، انھوں نے تو یہ حکم دیا تھا کہ دنیا میں میرا سامان مسافر کے توشہ سے زیادہ نہ ہونا چاہئے۔ پھر آپ اپنی اہلیہ کے پاس تشریف لے گئے اولاً دونوں نے نماز

پڑھی، اس کے بعد خلوت کی۔ صبح کو دوستوں نے رات کا قصہ دریافت کرنا چاہا۔ تو آپ نے سختی سے منع فرمایا۔ اور کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کی مستور باتوں کو بیان کرنے سے ممانعت فرمائی ہے۔ (حیاۃ الصحابہ ۲/ ۱۶۷)

یہ ہے نکاح کا وہ مسنون طریقہ جو آج کل ہمارے معاشرہ میں ایک قصۂ پارینہ بن گیا ہے۔ آج ہمارے دیندار سمجھے جانے والے گھرانوں میں بھی سب سے زیادہ مہنگی اور فضول خرچی کی چیز نکاح ہے اس زمانہ میں نکاح کو عام طور پر محض ایک سنت نہیں بلکہ لغو، بیہودہ اور انتہائی نامعقول رسومات کا مجموعہ بنا دیا گیا ہے۔ احوال کیسے ہی بگڑ جائیں۔ کیسی ہی مصیبتوں اور پریشانیوں کی یلغار ہو۔ اور ملک وقوم کتنے ہی مسائل میں گھرے ہوئے ہوں۔ لیکن مجال ہے کہ ہمارے یہاں شادی کی تقریب ہو اور اس میں کوئی چھوٹی سے چھوٹی رسم چھوٹ جائے۔ اضافہ تو ہوسکتا ہے، لیکن کمی ہونے کا کوئی سوال نہیں، خواہ قرض لینا پڑے۔ اور جائیداد گروی رکھوانے کی نوبت آجائے لیکن اسراف بیجا سے احتراز کا تصور تک نہیں کیا جاتا۔

غور کرنے کا مقام ہے کہ اسی فضول خرچی اور اسراف نے ہمیں آج تک کتنا نقصان پہنچایا ہے اور آئندہ کتنا نقصان پہنچے گا۔ اس وقت پوری ملت اسلامیہ کو دینی اور دنیوی دونوں طرح کی قوتوں کی ضرورت ہے۔ کاش کہ یہ بیکار صرف ہونے والی رقومات مسلمانوں کے کسی رفاہی ادارے میں خرچ ہوتیں۔ یا دفاعی تیاریوں میں معاون و مددگار ہوتیں۔ اب بھی وقت ہے۔ ہر برادری کے ارباب حل وعقد کو چاہئے کہ وہ انتہائی جاں فشانی، خلوص اور لگن کے ساتھ سراف وفضول خرچی کی اس لعنت کو قوم سے مٹائیں۔ ورنہ قیامت کے دن وہ بھی بارگاہ ایزدی میں جواب دہی سے نہ بچ سکیں گے۔ اور دنیا میں جو ذلت ورسوائی ہوگی۔ اس کا تو کوئی شمار ہی نہیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی مرضیات پر چلنے اور اسوۂ حسنہ پر عمل کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ (آمین)

(ندائے شاہی، فروری ۱۹۹۹ء)

رشتہ داری میں دین کا خیال

حضرت سعید بن المسیبؒ (المتوفی ۹۴ھ) بڑے جلیل القدر تابعی ہیں۔ اکابر صحابہؓ سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ علم وعمل اور ورع وتقویٰ کے اعتبار سے اپنے دور کے ممتاز ترین علماء میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ آپ کے شوق عبادت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۵۰ سال تک کسی نماز کی تکبیر اولیٰ فوت نہیں ہوئی۔ اور خود فرماتے ہیں کہ میں نے پچاس سال سے کسی نمازی کی پیٹھ نہیں دیکھی یعنی نماز پڑھتے ہوئے، پہلی صف کے علاوہ کہیں نہیں کھڑا ہوا۔ ۴۰ مرتبہ اللہ تعالیٰ نے حج کی دولت سے سرفراز فرمایا۔ مدینہ منورہ (زادہا اللہ شرفا وکرامۃً) میں مستقل قیام فرمایا۔ اور یہاں آپ کو مرجعیت حاصل تھی۔

موصوف کی ایک صاحبزادی تھی۔ جن سے نکاح کے لئے بنی امیہ کے کسی بادشاہ نے پیغام بھیجا۔ آپ نے یہ شاہی پیغام رد فرمادیا اور اپنے پاس پڑھنے والے ایک غریب طالب علم سے بچی کا نکاح کردیا۔ وہ طالب علم گھر گیا اور اپنی والدہ سے قصہ سنایا۔ والدہ نے تعجب سے کہا کہ ''دیوانہ ہوا ہے! بھلا سعید ابن المسیب کی بیٹی جسے بادشاہوں نے پیغام دے رکھا ہے وہ تیرے جیسے غریب کے نکاح میں آسکتی ہے۔'' طالب علم ماں کی بات سن کر خاموش ہو رہا۔ جب رات ہوئی تو دروازے پر دستک ہوئی۔ پوچھا کون ہے جواب ملا کہ سعید بن الحسیب۔ طالب علم جلدی سے باہر آئے۔ تو کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت سعید بن المسیبؒ اپنی بچی کو لے کر تشریف فرما ہیں۔ اور فرمارہے ہیں کہ ''لو میاں اپنی اہلیہ کو رکھو۔ میں نے نکاح کرنے کے بعد یہ مناسب نہیں سمجھا کہ تم ایک رات بھی اہلیہ کے بغیر رہو!'' یہ حیرتناک منظر دیکھ کر طالب علم کی والدہ نے جلدی جلدی محلّہ کی عورتوں کو جمع کیا اور جو کچھ بھی بروقت میسر آسکا اس کے ذریعہ نئی مبارک دلہن کا استقبال کیا۔ (مرأۃ الجنان ۱/۱۸۶)

آج کے دور میں اس طرح کا واقعہ ایک عجوبہ سے کم نہیں ہے۔ اس لئے کہ اب رشتہ نامہ میں ناموری حسن و جمال، دولت و منصب ہی کا خیال رکھا جاتا ہے۔ دین اور حقیقی شرافت کو معیار بنانے والے لوگ عنقا ہوتے چلے جارہے ہیں۔ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح میں دینداری کو خیال رکھنے کی تاکید فرمائی ہے۔ فَاظْفَرَ بِذَاتِ الدِّیْنِ. (بخاری شریف ۲/۷۶۲) اور تجربہ بھی یہی ہے کہ دیندار رشتہ داری میں جو واقعی سکون حاصل ہوسکتا ہے، وہ بے دین لوگوں میں ہرگز حاصل نہیں ہوسکتا۔ حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا کہ دنیا سب کا سب فنا ہونے والا سامان ہے اور اس میں سب سے بہتر سامان نیک بیوی ہے۔ وَخَیْرُ مَتَاعِ الدُّنْیَا الْمَرْأَۃُ الصَّالِحَۃُ. (الترغیب والترہیب ۳/۲۷)

ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو ہدایت فرمائی ہے کہ محض حسن و جمال کی بنیاد پر عورتوں سے نکاح نہ کرو۔ اس لئے کہ ہوسکتا ہے کہ ان کا حسن انھیں مغرور اور متکبر بنادے۔ اسی طرح مال و دولت کی بنیاد پر ان سے شادی نہ رچاؤ، اس لئے کہ ممکن ہے کہ ان کا مال و دولت انھیں سرکش اور نافرمان بنادے۔ بلکہ دینداری کو ملحوظ رکھ کر ان کو نکاح میں لاؤ۔ اور کن کٹی، کالی کلوٹی، دیندار باندی (بے دین عورت سے) بہتر ہے۔ (ابن ماجہ شریف، از الترغیب ۲/۳۰) نیز لڑکی والوں کو بھی ایسے رشتے قبول کرنے چاہئیں جہاں دینداری کا رجحان ہو۔

نکاح کے بعد سب سے بڑا مسئلہ اولاد کی صحیح تربیت کا ہے جو والدین کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ اور بے دین رشتہ داری میں سب سے بڑی رکاوٹ اسی ذمہ داری کی ادائیگی میں پیدا ہوتی ہے۔ رشتہ کرتے وقت محض یہ نہ دیکھا جائے کہ سسرال میں آرام و راحت کا کتنا انتظام ہوگا بلکہ بنیادی طور پر یہ دیکھنا چاہئے کہ ہماری نسلوں پر اس رشتہ کا کیا اثر پڑے گا۔ بسا اوقات دیندار خاندان سے تعلق قائم ہونے ہی کو اللہ تعالیٰ لوگوں کے لئے ہدایت کا ذریعہ بنادیتے ہیں۔ واقعی خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اپنے ہر معاملہ میں دین کو ترجیح دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کے دلوں میں دین کی عظمت و اہمیت راسخ فرمائے۔ (آمین)

(ندائے شاہی، اپریل ۱۹۹۸ء)

❍❖❍

عہدہ کی حرص

آج جدھر دیکھئے عہدوں کی حرص اور مناصب کے حصول کے لئے نزاع وجدال کا بازار گرم نظر آتا ہے چھوٹی چھوٹی مقامی جماعتوں سے لے کر بڑی بڑی تنظیموں میں یہ شکایت عام ہے کہ عہدوں کے طلب گار سیکڑوں ہیں اور مخلصانہ خدمت انجام دینے والوں کی تعداد کم سے کم تر ہے۔ یہ بات ملک کی سیاسی جماعتوں اور قومی تنظیموں میں ہو تو ذرا سمجھ میں بھی آتی ہے کیونکہ وہاں تو مقصود اور نصب العین صرف عہدہ اور منصب ہی ہوتا ہے۔ لیکن وہ دینی جماعتیں جن کی ساری جدوجہد کا محور سوائے مذہب اور فلاحِ اخروی کے کچھ نہیں، ان میں محض منصبوں سے دلچسپی فہم سے بالاتر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دو چیزیں انسان کے دین کو نقصان پہنچانے میں بھوکے بھیڑیوں سے زیادہ خطرناک ہیں۔ (۱) مال کی محبت (۲) جاہ کی محبت۔ ظاہر ہے کہ حبِ جاہ کی وجہ سے جب دین ہی خطرہ میں پڑ جاتا ہے تو ایسے شخص سے دین کی خدمت کی کیا امید رکھی جاسکتی ہے؟ اسی طرح ایک دوسری حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ انسان کو جو عہدہ اور ذمہ داری اس کی طلب اور چاہت کے بغیر عطا کی جاتی ہے تو منجانب خداوندی اس کی مدد کا انتظام کیا جاتا ہے اور اس کے متعلقہ امور اچھی طرح انجام پاتے ہیں۔ اور اس کے برخلاف جو شخص کسی عہدہ کا بذاتِ خود امیدوار رہتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اس کے معاملات اسی کے حوالہ کر دیتا ہے اور مدد کا سلسلہ بند ہو جاتا ہے۔ اس لئے جماعتوں کی ترقی کا راز اس میں مضمر ہے کہ اس کے کارپردازان حبِ جاہ کے جراثیم سے پاک اور خدمت کے جذبات سے معمور

رہوں۔ جب دین کی خدمت کرنی ہے تو ’’آمر‘‘ بن کر ہو یا ’’مامور‘‘ بن کر ہر حال میں کرنی چاہیئے۔ یہ بات ہرگز نہ ہو کہ ہم اگر ’’آمر‘‘ نہ بن پائیں تو خدمت ہی سے کنارہ کش ہو جائیں۔

تلبیس ابلیس میں لکھا ہے کہ انسان کے مخلص ہونے کی نشانی یہ ہے کہ اگر اس کے سامنے کوئی اس سے بہتر دینی خدمات انجام دینے والا آ جائے تو اسے طبعی مسرت حاصل ہو نہ یہ کہ محض اپنی مقبولیت میں کمی آنے کے خطرہ سے دوسرے سے حسد کرنے لگے۔ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ اصلی عزت ووقعت کا مدار آدمی کی خدمت پر ہے۔ اگر دینی خدمات مسلسل انجام دیتا ہے تو بلا منصب کے بھی آدمی باعزت بن سکتا ہے اور اگر کام ہی نہ کرے تو کوئی بھی منصب انسان کو عزت سے نہیں نواز سکتا۔ بہرحال ہمیں اپنی صفوں سے یہ کوتاہی دور کرنی ضروری ہے۔ ذاتی مفاد کو ملی منفعت پر قربان کرنے کا جذبہ رکھا جائے پھر دیکھئے ہماری تنظیمیں کیا رنگ دکھاتی ہیں اور کتنی ترقیات سے سرفراز ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں خیر کی توفیق سے نوازے۔ (آمین)

(ندائے شاہی، نومبر ۱۹۹۷ء)

کانٹوں کا تاج

عہدہ، کرسی، اور منصب دور سے دیکھنے میں بڑے خوش نما معلوم ہوتے ہیں، اور لوگ انکے حصول میں جنون کی حد تک سرگرداں نظر آتے ہیں، مگر یہ ذمہ داریاں درحقیقت پھولوں کی سیج نہیں بلکہ ''کانٹوں کا تاج'' کہلائے جانے کے لائق ہیں محض اللہ رب العزت کی خاص توفیق ہی سے انسان ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوسکتا ہے۔ اسی لئے عہدہ کی طلب شریعت میں کوئی پسندیدہ چیز نہیں، بلکہ جہاں تک ہوسکے اپنے کو ذمہ داری سے بچانے کی تلقین کی گئی ہے۔ ایک حدیث میں ارشاد نبوی ہے:

اِنَّكُمْ سَتَحْرِصُوْنَ عَلَى الْاَمَارَةِ وَسَتَكُوْنُ نَدَامَةٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ نِعْمَتِ الْمُرْضِعَةُ وَبِئْسَتِ الْفَاطِمَةُ. (بخاری شریف ۲/۱۰۵۸)

تم امارت (عہدہ) کی حرص کروگے اور یہ امارت قیامت کے روز ندامت کا باعث ہوگی (جیسے) دودھ پلانے والی ماں اچھی لگتی اور وہی جب دودھ چھڑاتی ہے تو بری لگتی ہے۔

معلوم ہوا کہ عہدہ کا انجام زیادہ اچھا نہیں ہے۔ اور ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہے:

لَا تَسْأَلِ الْاَمَارَةَ فَاِنَّكَ اِنْ اُعْطِيْتُهَا عَنْ مَسْئَلَةٍ وُّكِلْتَ اِلَيْهَا وَاِنْ اُعْطِيْتَهَا عَنْ غَيْرِ مَسْئَلَةٍ اُعِنْتَ عَلَيْهَا. (مسلم شریف)

امارت (عہدہ) کو طلب مت کرو، اسلئے کہ اگر وہ تمہیں مانگنے پر دیا جائے تو اسے تمہارے حوالہ کردیا جائیگا، اور اگر بلا طلب مل جائے تو تمہاری (من جانب خدا) مدد کی جائے گی۔

جو شخص عہدہ کا حریص رہتا ہے اور عہدے تک پہنچنے کیلئے ذرائع اور سفارشی تلاش کرتا ہے

جیسا کہ آج کل ہمارے یہاں قومی یا جماعتی انتخابات اور الیکشنوں میں دیکھنے میں آتا ہے کہ امید وار خود اپنی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتا ہے اور اسکے حوالی موالی اسکی ہدایت پر اسکے لئے کنویسنگ کرتے نظر آتے ہیں، تو ایسا حریص شخص اللہ کی مدد سے محروم رہتا ہے اور اسکے برخلاف جسے طبعی رجحان کے بغیر منصب قبول کرنے پر مجبور کر دیا جائے یا حالات ایسے بن جائیں کہ قبول کئے بغیر چارہ نہ رہے تو پھر اسکی عاجزی اور کمزوری کو دیکھتے ہوئے پروردگار عالم اسے اپنی خاص مدد سے نوازتا ہے۔ کہ ایک فرشتہ اسکے ساتھ لگا دیا جاتا ہے جو اسکو فیصلوں کی رہنمائی کرتا رہے۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

مَنِ ابْتَغَى الْقَضَاءَ وَسَأَلَ فِيْهِ شُفَعَاءَ وَكِّلَ اِلٰى نَفْسِهٖ وَمَنْ اُكْرِهَ عَلَيْهِ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْهِ مَلَكاً يُّسَدِّدُهٗ .

(ابو داؤد شریف، ترمذی شریف، الترغیب والترہیب ۳/۱۱۵)

جو شخص عہدۂ قضا کا طالب ہو اور اسکے لئے سفارشی لوگ مہیا کرے تو اسے اپنے حال پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ (یعنی اسکی کوئی مدد نہیں ہوتی) اور جسے اسکے لئے مجبور کر دیا جائے تو اللہ تعالی اس پر ایک فرشتہ نازل فرماتا ہے جو اسکو سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔

اسلئے دانشمندی کا تقاضا اولاً یہ ہے کہ حتی الامکان دل کو عہدہ کی طلب کے جذبہ سے محفوظ رکھا جائے۔ اور اگر بالفرض عہدہ خواہی نخواہی سر پر آہی جائے تو پھر عہدہ کی لاج رکھنا بھی ضروری ہے ۔یعنی پھر ذمہ دار کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اس عظیم امانت کی کامل ادائیگی کی کوشش کرے اور ذمہ داری کو نبھانے میں ایسا کردار پیش کرے کہ وہ عہدہ اسکے لئے دنیا و آخرت میں زحمت اور وبال نہ ہو بلکہ عین رحمت بن جائے۔ کیونکہ اگر اسکا خیال نہ رکھا جائے گا تو پھر یہی خوش نما عہدہ اسکے گلے کا ذلت ناک طوق بن جائے گا (العیاذ باللہ) ایک حدیث میں وارد ہوا ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے حضرات صحابہ سے فرمایا کہ کیا میں تمہیں امارت اور اسکی حقیقت کے بارے میں باخبر نہ کروں؟ مجلس میں حضرت عوف بن مالک ؓ بھی موجود تھے انہوں نے باآواز بلند تین مرتبہ فرمایا کہ ''اے اللہ

کے رسول! فرمایئے کہ امارت کی حقیقت کیا ہے؟'' تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اَوَّلُهَا مَلَامَةٌ، وَثَانِيْهَا نَدَامَةٌ، وَثَالِثُهَا عَذَابٌ يَّوْمَ الْقِيَامَةِ اِلَّا مَنْ عَدَلَ وَكَيْفَ يَعْدِلُ مَعَ قَرَابَتِهٖ. (رواه البزار والطبرانی، مجمع الزوائد ۵/۳۶۳، الترغیب ۳/۱۱۳، منتخب احادیث ۷۶۲)

امارت کا پہلا مرحلہ ملامت ہے، دوسرا مرحلہ شرمندگی ہے، اور تیسرے نمبر پر آخرت کا عذاب ہے، الا یہ کہ وہ شخص جو عدل وانصاف سے کام لے، (مگر سوچ لے کہ) وہ اپنے عزیز واقارب کے معاملہ میں عدل وانصاف کیسے کر سکے گا؟

یعنی ابتداء میں جب کوئی منصب پر فائز ہوتا ہے تو کچھ لوگ اس پر خوامخواہ لعن طعن کرتے ہیں ۔طرح طرح کے فقرے اور تبصرے سننے کو ملتے ہیں ۔اور ذرا ذرا سی باتوں پر لوگ روٹھ کے بیٹھ جاتے ہیں، الغرض جتنے منہ اتنی باتیں، اور جب یہ صورت حال زیادہ ہوتی ہے اور بسا اوقات ذمہ دار کے مخلصانہ اور منصفانہ فیصلوں پر بھی انگلیاں اٹھائی جانے لگتی ہیں تو یہی عہدے دار اپنے عہدہ سے دل برداشتہ ہوکر ندامت اور شرمندگی میں مبتلا ہوجاتا ہے کہ خوامخواہ اس مصیبت سے دوچار ہوگیا۔اور پھر تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ اگر وہ انصاف سے کام نہ لے تو پھر آخرت کی سخت گرفت سے بھی بچ نہیں سکتا۔تو گویا عہدہ کیا ہوا دنیا اور آخرت میں وبال جان بن گیا۔

مذکورہ حدیث یہ بتاتی ہے کہ عہدہ خواہ کوئی ہو دنیا میں اسکے ساتھ ملامت اور ندامت بہر حال لازم ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انتظامیہ کتنا ہی اچھا کام کرلے اسکو تنقید کا نشانہ ضرور بنایا جاتا ہے ۔نیز کتنا ہی اچھا حکمراں کیوں نہ ہو اسے کبھی کبھی حالات سے مجبور ہوکر ندامت ضرور اٹھانی پڑتی ہے ۔سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے بڑھکر عادل اور متقی حکمراں کون ہوگا مگر وہ بھی کبھی کبھی زمین پر پڑے ہوئے تنکے کو اٹھا کر فرماتے کہ'' کاش عمر بھی یہی تنکا ہوتا'' ''اسکی ماں نے اسے جنا ہی نہ ہوتا''۔

اس لئے عہدہ کے ساتھ ملامت اور ندامت نہ ہو یہ بہت مشکل ہے۔اب رہ گئی بات آخرت کے عذاب کی تو یہ حاکم کے اپنے کردار پر منحصر ہے، اگر وہ عدل وانصاف سے کام لے اور

احقاق حق اور ابطال باطل کو پیش نظر رکھے اور قدم قدم پر اللہ تعالی سے ڈرتا رہے اور اپنے آپ کو تہمت کی جگہوں سے بچانے کا اہتمام کرے تو امید ہے کہ وہ آخرت میں نہ صرف یہ کہ اپنی عزت وآبرو بچالے جائے گا بلکہ آنحضرت ﷺ کی بشارت کے مطابق وہ ان خوش نصیبوں میں شامل ہوگا جو میدان محشر میں اعزاز واکرام کے ساتھ عرش خداوندی کے سایہ میں تشریف فرما ہونگے (مسلم شریف) اللہ تعالی امت کے سبھی حکمرانوں، عہدے داروں اور ذمہ داروں کو ایسے کردار کی توفیق مرحمت فرمائے جس سے وہ مذکورہ بشارت کے مستحق قرار پاسکیں۔ آمین

حدیث بالا کے آخر میں آنحضرت ﷺ نے ایک فکر انگیز سوال کر کے مضمون ختم کر دیا کہ **کیف یعدل مع قرابته؟** (یعنی اپنے رشتہ داروں کے ساتھ آدمی کیسے عدل وانصاف کرسکتا ہے؟) بات اصل میں یہ ہے کہ جب آدمی کسی حکومت، ادارہ یا جماعت میں عہدے دار بن جاتا ہے تو فطری اور طبعی طور سے اپنے اعزاء واقارب کو بھی عہدے سے استفادہ کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ اور پھر اپنے طبعی جذبات سے مغلوب ہوکر ان رشتہ داروں کی کوتاہیوں پر وہ ویسی گرفت نہیں کرتا جیسی غیروں کی کرتا ہے۔ یا نااہلی کے باوجود اپنے عزیزوں کو دوسرے پر فوقیت دیتا ہے۔ بس اسی امتیاز سے بات بگڑ جاتی ہے اور سارا عدل وانصاف خاک میں مل جاتا ہے۔ اس طرح کی اقربا پروری حکومتوں اور اداروں کے لئے بدترین مصیبت ہے اس لئے آنحضرت ﷺ نے یہ بامعنی سوال کر کے امت کے سبھی حاکموں کو محتاط رہنے پر متنبہ فرمایا ہے۔

حدیث کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اہلیت کے باوجود اپنے عزیزوں سے کوئی کام نہ لیا جائے۔ اور انھیں کوئی ذمہ داری نہ دیجائے یا انکو کار حکومت سے بالکل دور رکھا جائے۔ یہ بات عقل ونقل دونوں کے خلاف ہے۔ عقلاً اسلئے کہ انسان اپنے عزیزوں سے جس اعتماد اور قوت سے کام لے سکتا ہے بسا اوقات دوسروں سے اس طرح کام نکالنا مشکل ہوتا ہے۔ اور نقلاً اس لئے کہ خود جناب رسول اللہ ﷺ نے بہت سے معاملات میں اپنے قریب ترین عزیز سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ذمہ دارانہ حیثیت سے کام لیا، اور سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کمال عدل وتقوی کے باوجود

عمل حکومت میں اپنے صاحبزادے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے کام لیا، تو عزیزوں سے تعاون لینا گناہ نہیں بلکہ اصل خرابی یہ ہے کہ نا اہلیت کے باوجود انھیں ترجیح دیجائے اور انکو اصول سے بالا تر سمجھا جائے۔ لہذا اگر ان سے کام لینے کی ضرورت ہو تو اہلیت بنیادی طور پر ملحوظ رکھی جائے۔ اور اصولی اعتبار سے ان پر برابر درجہ کی گرفت کی جائے۔ اور غلطیوں پر ان کی سرزنش میں کسی قسم کی رو رعایت نہ رکھی جائے۔ اور قانون کی کارروائی میں قرابت کو رکاوٹ نہ بنایا جائے۔ ایک مرتبہ قبیلۂ بنی مخزوم کی ایک عورت چوری میں پکڑی گئی، نبیٔ اکرم ﷺ نے سزا میں اسکا ہاتھ کاٹنے کا حکم جاری فرمایا تو عورت کے رشتہ داروں میں کھلبلی مچ گئی اور انھوں نے مشورہ کرکے آنحضرت ﷺ کے پسندیدہ خادم حضرت زیدؓ کو عورت کی سفارش کرنے پر آمادہ کرلیا چنانچہ حضرت زید سفارش کیلئے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرتؐ ان کی بات سنکر جلال میں آگئے اور فرمایا: کہ ''کیا اللہ کی مقررہ حد میں سفارش کی جسارت کی جارہی ہے؟ قسم بخدا! اگر محمد (ﷺ) کی بیٹی فاطمہ بھی (بالفرض) چوری کرلے تو میں اسکا ہاتھ بھی کاٹ ڈالونگا'' (مسلم شریف ۶۴/۲) بالکل یہی جذبہ ایک حکومت اور ادارہ کے حاکم کا بھی ہونا چاہئے کہ وہ قانون کی بالا دستی میں کوئی بھید بھاؤ نہ کرے اصول میں سب کے ساتھ برابری سے کام لے، اور کسی شخص کے دباؤ میں رہ کر کام نہ کرے بلکہ اصول اور ضوابط کی پابندی ہی کو اولیت دے۔

خلاصہ یہ ہے کہ عہدہ اور ذمہ داری بڑے خطرہ کی چیز ہے، جو اس میں مبتلا کر دیا جائے اسے بہت پھونک کر قدم رکھنا چاہئے مناسب ہے کہ خاص طور پر درج ذیل امور کا خیال رکھا جائے:

(۱) اپنے ماتحتوں کے ساتھ ان کے مقام اور مرتبہ کے مطابق معاملہ کریں۔

(۲) مالی معاملات میں مکمل احتیاط کا پہلو اختیار کریں، اور اس سلسلہ میں کسی کو انگلی اٹھانے کا موقع نہ دیں، کیونکہ بددیانتی سے بڑھ کر کوئی رسوائی کی چیز نہیں۔

(۳) اہم معاملات میں اپنے معتمد ساتھیوں سے مشورہ ضرور لیں۔

(۴) قانون کے نفاذ میں اپنے پرائے میں امتیاز نہ کریں، بالخصوص اخلاقی اور بددیانتی کے معاملہ میں کوئی چشم پوشی نہ کریں۔

(۵) ناگوار باتوں پر تحمل مزاجی اور بردباری کا مظاہرہ کریں۔

(٦) ماتحت اگر کسی کوتاہی پر معافی کے طالب ہوں تو عفودرگذر سے کام لیں۔

(۷) ادارہ اور حکومت کے مفاد کے خلاف کسی بھی فرد کی ہرگز طرفداری نہ کریں۔

(۸) اگر ماتحتوں میں کوئی اختلاف ہو تو اپنے کو حتی الامکان غیر جانب دار رکھیں۔

(۹) ذاتی رنجش کی بنا پر کسی سے انتقام نہ لیں۔

(۱۰) محض اختلاف رائے کی وجہ سے کسی کو اپنا مخالف نہ سمجھیں۔

(۱۱) اور ہر وقت اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے خیر وصلاح کیلئے دل سے دعا کرتے رہیں اور دعائے نیم شبی میسر آجائے پھر تو کہنا ہی کیا ہے؟

امید ہے کہ ان نکات کا خیال کرنے والا ذمہ دار دنیا اور آخرت دونوں جگہ عافیت سے رہے گا، اور اللہ تعالیٰ کی خاص مدد اس کے شامل حال ہوگی، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے توفیق ارزانی فرمائے۔آمین،

(ندائے شاہی، ستمبر ۲۰۰۱ء)

دل کی صفائی

حضرت انس بن مالکؓ (م۹۰ھ) ایک جلیل القدر صحابی ہیں۔ ان کی والدہ حضرت ام سلیمؓ نے انھیں ۹، ۱۰ سال کی عمر میں ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گذاری پر مامور کردیا تھا۔ چنانچہ آپ کو تقریباً دس سال حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شبانہ روز خدمت کا زریں موقع میسر آیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی حضرت انسؓ پر خاص نظر عنایت تھی۔ آپ انھیں پیار میں یــا ذالاذنین (اے دو کان والے) کہہ کر پکارتے تھے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ اس دس سالہ خدمت کے عرصہ میں کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے کسی بات پر ڈانٹا یا پھٹکارا نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت انسؓ کے مال واولاد میں برکت کی دعا دی تھی جس کا ثمرہ یہ ظاہر ہوا کہ خود فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے سگے بیٹوں میں سے ۱۲۵ر افراد کو اپنے ہاتھ سے دفن کیا ہے۔ (اور جو زندہ رہے وہ الگ ہیں) اور میرے باغات اور زمینوں میں سال میں ایک کے بجائے دو بار فصل آتی ہے۔ (الاصابۃ ۱/۲۷۶) یہی صحابیٔ جلیل فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میرے مشفق اور مہربان آقا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے بڑے پیار بھرے لہجہ میں ارشاد فرمایا:

یَابُنَیَّ اِنْ قَدَرْتَ اَنْ تُصْبِحَ وَ تُمْسِیَ وَلَیْسَ فِیْ قَلْبِكَ غَشٌّ لاَحَدٍ فَافْعَلْ.

میرے پیارے! اگر تم سے یہ ہوسکے تو ضرور کرلینا کہ تمھاری صبح وشام اس حال میں ہو کہ تمھارے دل میں کسی کی طرف سے کوئی کینہ کپٹ نہ ہو۔

اور آگے فرمایا:

یَا بُنَیَّ وَ ذٰلِكَ مِنْ سُنَّتِی، وَمَنْ اَحْییٰ سُنَّتِی فَقَدْ اَحَبَّنِیْ وَمَنْ اَحَبَّنِیْ كَانَ مَعِیْ فِیْ الْجَنَّةِ. (ترمذی شریف ۲/۹۶)

پیارے ! یہ میری سنت ہے اور جس نے میری سنت اور طریقہ کو زندہ کیا، اس نے مجھ سے محبت کی۔ اور جو مجھ سے محبت رکھے گا وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔

اس حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چہیتے خادم کو جو نصیحت کی ہے۔ اس پر عمل کرنا اگرچہ کارے دارد ہے لیکن اللہ کی نظر میں یہ بہت بڑا کمال اور عظیم سعادت ہے۔ حضرت انسؓ ہی کی روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ ''ابھی ایک جنتی شخص تم لوگوں کے درمیان آنے والا ہے۔ پس اچانک ایک انصاری صحابی تشریف لائے جن کی داڑھی سے وضو کا پانی ٹپک رہا تھا۔ اور انھوں نے اپنے جوتے بائیں ہاتھ میں اٹھا رکھے تھے۔ اگلے دن بھی آپ نے اسی طرح کا اعلان کیا، پھر وہی صحابی نمودار ہوئے اور اتفاق یہ کہ تیسرے دن بھی بعینہٖ یہی واقعہ پیش آیا۔ یہ دیکھ کر ایک دوسرے صحابی حضرت عبداللہ بن عمرؓو ان انصاری صحابی کے حالات کی تحقیق کے لئے ان کے ساتھ ہو لئے۔ اور کچھ بہانہ کر کے تین دن رات ان کے گھر ہی گذارے۔ مگر انھیں کوئی خاص عمل نظر نہ آیا۔ جب تیسرا دن ہوا تو انھوں نے پوچھا کہ میں تو یہ تحقیق کرنے کے لئے آپ کے ساتھ تھا کہ آخر آپ کے پاس کیا عمل ہے کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آپ کو جنت کی بشارت دی ہے؟ ان صحابی نے فرمایا کہ میرے پاس اور تو کچھ نہیں، جو ہے وہ آپ نے دیکھ ہی لیا ہے۔ البتہ میں اپنے دل میں کسی مسلمان کی طرف سے کوئی کینہ نہیں پاتا۔ اور نہ کسی کو اللہ کی عطا کردہ نعمت پر حسد کرتا ہوں۔ عبداللہ بن عمرؓو نے برجستہ فرمایا کہ بس یہی وہ خصوصیت ہے جس نے آپ کو جنت کی بشارت پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبانی دنیا ہی میں دلوادی ہے۔ (رواہ احمد، الترغیب والترہیب ۳/ ۳۴۸)

جلن، کینہ اور اور حسد انسان کے دین و ایمان کو تباہ کرنے والی چیزیں ہیں۔ اس کے برخلاف دل کی صفائی اور ہر مسلمان کے لئے خیر و نصیحت کا جذبہ ایمان کی اہم ترین علامت ہے۔ ارشاد فرمایا گیا الدین النصیحة، دین نام ہی خیر خواہی کا ہے۔ دنیا میں گفتگو اور بحث کے دوران یا معاملات اور معاشرت میں بہت سی ناگوار باتیں خواہی نخواہی پیش آجاتی ہیں۔ ایسا کوئی انسان نہیں ہے۔ جسے ناگواری سے سابقہ نہ پڑتا ہو۔ لیکن اس طرح کے جزئی معاملات اور حالات کی وجہ سے

انسان دوسرے کی طرف سے ہمیشہ کے لئے دائمی کینہ بٹھالے اور انتقام کی ٹھان لے تو نہ خود عافیت سے رہ سکتا ہے اور نہ دوسرے کو امن میں رکھ سکتا ہے۔ سکون اور عافیت کا راستہ یہ ہے کہ جہاں تک ہوسکے درگذر سے کام لیا جائے اور مخالف کی طرف سے اگر چہ سرد مہری کا اظہار ہو مگر اپنی طرف سے صلح کی گرم جوشی مسلسل باقی رہے۔ یہ طرز عمل اگر چہ طبعیت پر بہت شاق گذرتا ہے۔ اس لئے کہ شیطان اس راہ میں قدم قدم ''پر مصنوعی ناک کٹنے'' اور ''جعلی عزت خاک میں مل جانے'' کا طعنہ دیتا ہے جس سے اچھے اچھے بلند ہمّت ہار بیٹھتے ہیں۔ لیکن اگر ایک مسلمان یہ سوچ لے کہ اس کے محبوب آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک سنت اور آپ سے محبت کی علامت ہی یہ ہے تو پھر یہی کیا اس سے بھی بڑی بڑی خلاف طبعیت باتیں ہنسی خوشی برداشت کرنا اور اپنی انا، اور اپنے نفس کو رسول کی رضا کے لئے قابو میں کرنا آسان ہوسکتا ہے۔

افسوس ہے کہ آج ہمارے عوام وخواص میں کینہ کپٹ کا ناسور تیزی سے سرایت کرتا جارہا ہے کسی سے مخالفت یا تیز کلامی ہوجائے۔ بس ہمیشہ کے لئے بات چیت، اٹھنا بیٹھنا حتیٰ کہ صورت دیکھنا بھی بند کردیا جاتا ہے۔ ایک ہی گھر کے رہنے والے ایک ہی ادارے میں کام کرنے والے، حتیٰ کہ دفاتر میں ایک ہی کمرے میں بیٹھنے والے سالوں گذر جاتے ہیں کوئی دوسرے سے منہ لگانے کو تیار نہیں ہوتا۔ حالانکہ احادیث طیبہ میں تین دن سے زیادہ بات چیت اور سلام کلام بند کرنے کی سخت ممانعت وارد ہوئی ہے اور بعض مقبول اوقات میں ایسے اشخاص کی دعائیں قبول نہ ہونے کا اعلان بھی وارد ہے۔

اس لئے ہمیں ٹھنڈے دل سے اپنے حالات کا جائزہ لینا چاہئے اور خواہ ظاہری نقصان اٹھانا پڑے لیکن کوشش کرنی چاہئے کہ ہمارے دل میں کسی دوسرے کی طرف سے کینہ اور جذبۂ انتقام نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کے دلوں سے ہر قسم کی کدورتوں کو دور فرمائے اور قلب کی صفائی کی فکر عام فرمائے۔ اور ہم سب کو مقبول بندوں میں شامل فرمائے۔ (آمین)

(ندائے شاہی، ۱۹۹۹ء)

❍❖❍

یہ عبرت کی جا ہے تماشہ نہیں ہے

مرادآباد کی پُر شکوہ جامع مسجد دریائے رام گنگا کے کنارے واقع ہے اس دریا میں برسات کے علاوہ دیگر زمانہ میں پانی بہت کم رہتا ہے جس کی وجہ سے لوگوں نے دریا کے حدود میں تقریباً نصف حصہ تک مکانات بنالئے ہیں۔ اور وہاں کافی بڑے بڑے محلے آباد ہوگئے ہیں۔ برسات میں جب دریا میں پانی بڑھتا ہے تو یہ سارے مکانات زیر آب آجاتے ہیں۔ اور بہت سے مکانات دریا کی زد میں بہہ بھی جاتے ہیں۔ دریا کی یہ آبادی زیادہ تر غریب طبقہ پر مشتمل ہے۔ برسات کا زمانہ ان کے لئے بڑی مشقت اور تکلیف کا ہوتا ہے۔

چند روز قبل میرا مغرب کے وقت جامع مسجد جانے کا اتفاق ہوا۔ دیکھا کہ لوگوں کی کافی بھیڑ ہے جس میں مرد عورت بچے بوڑھے جوان سب شامل ہیں تعجب ہوا کہ یہ مجمع کیسا؟ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ یہاں کئی دن سے یہ میلہ لگ رہا ہے اور لوگ دریا کی طغیانی اور غریبوں کی بے سروسامانی سے لطف اٹھانے کے لئے شہر کے مختلف محلوں سے یہاں آرہے ہیں۔ دریا کے کنارے تو جو مجمع اور بھیڑ ہوگی وہ تو الگ رہی، جامع مسجد کا صحن اس وقت ایسا معلوم ہورہا تھا جیسے یہ مسجد نہ ہو، بلکہ کوئی تماشہ گاہ ہو۔ نقاب کی قید سے آزاد عورتوں کے جُھنڈ، اچھلتے کودتے بچوں کی ٹولیاں اور بے مہار نوجوانوں کی جماعتیں خوف خدا سے بے نیاز ہوکر سیلاب کے مناظر کا نظارہ کررہے تھے۔

یہ ایک مرادآباد ہی کا واقعہ نہیں بلکہ آج ساری دنیا کا یہی حال ہے۔ کسی پر مصیبت پڑے، عذاب آئے، آندھیاں چلیں، زلزلے بڑے بڑے شہروں کو کھنڈرات میں تبدیل کردیں یا سمندری طوفان لاکھوں لوگوں کو لقمۂ اجل بنالیں، ان حادثات کے بعد لوگ حادثہ کی جگہ کو تفریح گاہ بنالیتے ہیں۔ اب ہمارے دلوں میں غفلت اتنی راسخ ہوچکی ہے کہ بھیانک اور ہولناک مناظر بھی

ہماری چشم بصیرت کو بینائی نہیں عطا کر پاتے اور ہم اپنی چشم بینا سے کربناک حالات کا مشاہدہ کر کے بھی عبرت حاصل کرنے سے محروم ہی رہتے ہیں۔ دوسروں کی تکلیف کا احساس ہمارے دلوں سے نکل چکا ہے۔ جب تک مصیبت اپنے اوپر نہیں پڑتی اس وقت تک خدا یاد نہیں آتا۔ یہ دریا کی طغیانی کوئی تماشہ کی چیز نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے غضب اور قدرت کی علامت ہے۔ اسی طغیانی نے قوم نوح کو دنیا سے نیست و نابود کر ڈالا، اسی سیلاب نے قوم سبا کا وجود دنیا سے مٹا دیا۔ آج اللہ تعالیٰ اپنی نشانی دکھا رہا ہے کہ آج اس نے چند گھروں کو ڈبویا وہی اللہ سارے شہروں کو ڈبونے کی طاقت رکھتا ہے اس لئے اس سے ڈرتے رہنا اور اپنی زندگی کا محاسبہ کرتے رہنا ضروری ہے کہ ہمارے اعمال اللہ کے غضب کی دعوت دینے والے ہیں یا اس کی رحمتوں کے مستحق بنانے والے ہیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں حضرات صحابہؓ فرماتے ہیں۔

اِذَا حَزَبَهٗ اَمْرٌ صَلّٰی. (مسند احمد بن حنبل ۵/۳۸۸)

جب بھی کوئی ناگہانی واقعہ پیش آتا تو آپ نماز کی طرف توجہ فرماتے۔

جب آندھیاں وغیرہ چلتیں تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر خوف وخشیت کا غلبہ ہو جاتا کہ کہیں یہ وہ عذاب نہ ہو جو پہلی قوموں پر آچکا ہے۔ قرآن کریم میں جب پہلی قوموں کے عذاب کا ذکر کیا جاتا تو آپ پر خشیت طاری ہو جاتی۔ اور اس کی شدت کا اندازہ اس سے لگایا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ آپ سے حضرت صدیق اکبرؓ نے دریافت کیا کہ اے اللہ کے رسول! آپ کے بالوں پر بہت جلد سفیدی آگئی۔ تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا۔

اَجَلْ ! شَيَّبَتْنِى هُوْدُ وَاَخَوَاتُهَا الْوَاقِعَةُ وَالْقَارِعَةُ وَالْحَاقَّةُ. (روح المعانی ۱۱/۲۰۲)

جی ہاں! سورۂ ہود اور اس جیسی سورتوں (جن میں سابقہ قوموں کے حالات اور قیامت کے مناظر کا ذکر ہے) نے میرے بالوں کو سفید کر دیا مثلاً سورہ واقعہ سورہ قارعہ اور سورہ حاقہ وغیرہ۔

ایسے خوف وخشیت والے نبی کی امتی اللہ کا خوف اپنے دل سے نکال دیں اور مصیبتوں کو تفریح کا ذریعہ بنالیں۔ اس سے بڑے افسوس کی کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

جب غزوہ تبوک سے واپس تشریف لا رہے تھے تو آپ کا گذر قوم ثمود کی بستی (حجر) پر ہوا۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات صحابہؓ کو کیا ہدایتیں فرمائیں اور خود آپ نے کس عمل کا اظہار فرمایا! اس کے بارے میں مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ!

اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا نَزَلَ الْحِجْرَ فِيْ غَزْوَةِ تَبُوْكَ اَمَرَهُمْ اَنْ لَايُشْرَبُوْا مِنْ بِيْرِهَا وَلَايَسْتَقُوْا مِنْهَا فَقَالُوْا قَدْ عَجَنَّا مِنْهَا وَاسْتَقَيْنَا فَاَمَرَهُمُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَطْرَحُوْا ذٰلِكَ الْعَجِيْنَ وَيُهْرِيْقُوْا ذٰلِكَ الْمَاءَ .

(بخاری شریف ۱/۴۷۸)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پڑاؤ غزوۂ تبوک کے سفر میں مقام حجر (قوم ثمود کی تباہ شدہ بستی) پر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات صحابہ کو حکم دیا کہ یہاں کے کنویں سے نہ پانی پیو اور نہ پانی بھرو صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہم نے تو اس سے آٹا گوندھ لیا اور (برتنوں میں) پانی بھر لیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس گندھے ہوئے آٹے کو پھینک دینے اور پانی کو بہا دینے کا حکم فرمایا۔

اور دوسری روایت میں ہے:

لَمَّا مَرَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْحِجْرِ قَالَ لَا تَدْخُلُوْا مَسَاكِنَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ اَنْ يُصِيْبَكُمْ مَا اَصَابَهُمْ اِلَّا اَنْ تَكُوْنُوْا بَاكِيْنَ ثُمَّ قَنَعَ رَاْسَهٗ وَاَسْرَعَ السَّيْرَ حَتّٰى جَاوَزَ الْوَادِئَ. (بخاری شریف ۲/۶۳۷)

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حجر نامی بستی پر سے گذرے تو آپ نے حضرات صحابہؓ کو ہدایت کی کہ اپنی جانوں پر (معصیت کے ذریعہ) ظلم کرنے والوں کے گھروں سے روتے ہوئے گذرو۔ مبادا تم بھی ان جیسے عذاب میں مبتلا کر دیئے جاؤ، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چہرہ انور ڈھانپ لیا اور سواری کو تیز چلایا حتی کہ اس جگہ کو پار کر لیا۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرز عمل سے معلوم ہوا کہ ایسی جگہیں جہاں اللہ کے عذاب اور غضب کا مظاہرہ ہو وہ ہرگز اس لائق نہیں ہیں کہ انھیں تماشہ گاہ اور تفریح گاہ بنایا جائے۔

بلکہ ان سے عبرت ونصیحت اور موعظت حاصل کرنی چاہئے اور اس بات کا استحضار کرنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سب سے بڑی ہے۔اور خدانخواستہ ہم بھی اپنی بداعمالیوں کی پاداش میں اس طرح کے عذاب اور مصیبت میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔اللہ تعالیٰ اس پر پوری طرح قادر ہے۔اب بھی وقت ہے ہمیں اپنا طرزِ عمل بدلنا چاہئے اور محض سیر اور تفریح کی ریت کو مٹا کر خوف وخشیت اور عبرت و موعظت کی فضا بنانے کی کوششیں کرنی چاہئے۔اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو دولت استقامت سے نوازے اور دین پر چلنا آسان فرمائے۔آمین۔

(ندائے شاہی، ستمبر ۱۹۹۵ء)

یہ ’’ٹی۔ وی‘‘ ہے

پہلے زمانہ میں۔ اگر کسی شخص کو رقص و سرود کی محفلیں سجانی ہوتیں، گانے بجانے کا اہتمام کرنا ہوتا، طوائفوں اور بدکاروں کا اجتماع کرانے کا جی چاہتا تو ہزاروں روپے خرچ کرنے پڑتے تھے۔ پارٹیوں کی پیشگی بکنگ کرانی ہوتی تھی اور اپنے منظورِ نظر لوگوں کی خوشامدیں کرنی پڑتی تھی۔ جب کہیں جا کر چند گھنٹوں یا رات بھر کے لئے سامانِ عیش مہیا ہوا کرتا تھا۔

غریب کیا متوسط طبقہ کا آدمی تو اتنے خرچ اور مشقت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا، بلکہ بڑے بڑے مالدار بھی روز روز ایسی محفلیں کرانے کی ہمّت نہ کر پاتے تھے۔اس کا نتیجہ یہ تھا کہ بہت سے لوگ دلی خواہش رکھنے کے باوجود چار و ناچار اس طرح کی بے ہودہ مجلسوں میں شریک ہوکر گنہگار بننے سے محفوظ رہتے تھے۔مگر یہ صورت حال انسان کے دشمن اعظم ’’شیطان لعین‘‘ کے لئے نہایت تکلیف دہ اور مایوسی کا باعث تھی۔ وہ تو یہ چاہتا تھا کہ تمام ہی انسان خواہ وہ امیر ہوں یا غریب، بادشاہ ہوں یا رعایا، بڑے ہوں یا چھوٹے، اور مرد ہوں یا عورت، سب کے سب شیطانی واہیات مجلسوں میں ہر روز بآسانی شرکت کیا کریں، تا کہ وہ ان مجلسوں سے حیا باختگی، عصمت فروشی اور بے شرمی اور بے غیرتی کا با قاعدہ درس لے سکیں۔ اور معاشرہ انسانی فتنہ وفساد کی آماجگاہ بن جائے۔اس دیرینہ تمنا کی تکمیل کے لئے۔ پوری شیطانی فوج برسہا برس تک منصوبے بناتی رہی اور ممکنہ تجویزوں پر غور کرتی رہی۔ تا آنکہ سینما کی ایجاد ہوئی تو شیطان کی دلی مراد کافی حد تک بر آئی۔ جو لوگ معاشی پریشانیوں کی وجہ سے بُری مجلسوں میں شرکت نہ کر سکتے تھے، ان کی دشواریوں میں کچھ کمی آئی اور رفتہ رفتہ سینما اور تھیٹر شیطانیت کے اڈوں میں تبدیل ہو گئے۔ اور شیطانی فوج

نے اپنی نگرانی میں سینما کی من مانی اصلاحات کا کام سنبھال لیا۔ چنانچہ پہلے محض ڈرامے اسٹیج کئے جاتے تھے اس میں ترقی ہوئی تو پردہ پر تصویریں آنے لگیں۔ مگر ان میں آواز نہ ہوتی تھی۔ پھر مزید ترقی کر کے اس میں گانے بجانے کی آوازیں بھی شامل کر دی گئیں اور اس طرح سینما کی مجلسوں نے مکمل طور پر پرانے زمانے کی رقص وسرود کی محفلوں کی جگہ لے لی۔

لیکن ابلیس لعین کو انسانیت کی اس تباہی پر بھی صبر نہ آیا۔ اس لئے کہ فلموں کا صرف سینما میں ہی دکھایا جانا اس کی نظر میں بہت سے مہذب اور شریف لوگوں کے لئے ان نامبارک مجلسوں میں شرکت سے مانع تھا۔ پھر وقت کی کمی بھی لوگوں کو سینما میں حاضری سے روکتی تھی اسی طرح شہر کی فضا اگر خراب ہو جائے تو سینما ہالوں کی تالا بندی سے بھی لشکر ابلیس کو سخت اذیت پہنچتی تھی، اس لئے ضرورت تھی کہ کوئی ایسی ترکیب ہاتھ آئے جس کے ذریعہ بے حیائی کے پردہ میں تہذیب وشرافت کا جنازہ نکالا جائے اور بغیر کسی روک ٹوک کے طاغوتی مجلسیں سجانے کا انتظام ہو سکے۔

بالآخر وہ دن بھی آ گیا جب پورے عالم کے شیطانوں نے ''عالمگیر جشن کامیابی'' بنایا، پوری شیطانی لابی میں خوشی اور مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ اور ایسی فضا بنی کہ ہر شیطان کی باچھیں کِھل گئیں۔ یہ وہ منحوس دن تھا جب ٹیلی ویژن کی ایجاد ہوئی۔ چنانچہ شیطان نے آگے بڑھ کر ٹیلی ویژن کے پروگراموں کی باگ ڈور سنبھالی۔

آج یہ شیطان کا ڈبہ مجمع النجائث ہے! سرچشمۂ معصیت ہے! مبلغ شیطانیت ہے! اعمال اسلام کے لئے سم قاتل ہے! روحانیت کا لٹیرا ہے۔ اور اقدار انسانی پر بٹّہ لگانے والا ہے۔ ساری خرابیاں اس میں جمع ہیں۔ اور سب ہی غلاظتوں اور نجاستوں سے اس کا دامن پلید ہے۔ اور موجودہ دور میں دنیا کے اسّی فیصد جرائم اسی تربیت کا ثمرہ ہوتے ہیں جو ٹیلی ویژن کے فحش پروگراموں کے ذریعہ لوگوں کو دی جاتی ہے۔

جنازہ نکل گیا :

ٹیلی ویژن نے ہمارے معاشرہ میں داخل ہو کر ہماری روایتی شرم وحیا کا جنازہ نکال دیا۔ وہ روحانیت جو ہمارے سر کا تاج، ہماری سربلندی کی علامت اور ہماری پیشانی کا دمکتا ہوا نور تھی،

اسے ٹیلی ویژن کے فحش اور روحانیت سوز پروگراموں نے جڑ سے اکھاڑ پھینکا، گھر گھر سینما ہال بن گئے، گلی گلی میں فحاشی کے اڈے قائم ہو گئے۔ گھر والوں کی آنکھوں سے غیرت کا پانی ناپید ہو گیا، جو رہی سہی کسر تھی وہ ویڈیو فلم نے پوری کر دی۔ ڈش انٹینا نے سونے پر سہاگا کا کام کیا۔ اور حیا باختگی کی انتہا ہو گئی، دن و رات کا کوئی وقت ایسا نہیں جب اس شیطانی ڈبہ کے پردہ پر گھناؤنے مناظر نہ دکھائی دیتے ہوں۔ افسوس ان ایجادات پر نہیں ہے۔ تف ان پروگراموں پر نہیں۔ ملال ان شیطانی کوششوں پر نہیں، رنج کا مقام محض ٹیلی ویژن اور ان جیسے آلات کا دنیا میں وجود نہیں۔ بلکہ افسوس اور ہزار بار افسوس کا مقام یہ ہے کہ یہ لعنت آج قاطع فحاشیت، منبع انسانیت، سرچشمۂ عفت، نبی رحمت، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں اور نام لیواؤں کے گھروں میں، دوکانوں میں اور فیکٹریوں میں داخل ہو چکی ہے۔ اور انتہا یہ ہے کہ اس لعنت کو لعنت نہیں سمجھا جاتا۔ اس بُرائی کو بُرائی ماننے کے لئے کوئی تیار نہیں ہے۔ بیٹی کو جہیز دینا ہو یا بہو کے لئے اسباب عیش مہیا کرنا ہو، ہر موقع پر تحائف کی فہرست میں ''ٹی وی'' اور ''وی، سی، آر'' اور ساتھ میں ''ڈش انٹینا'' کی چھتری کا نام سرفہرست رہتا ہے۔ اور نئی روشنی کے لوگ اس وبا پر تنقید تک سننا گوارا نہیں کرتے۔

اپنی خبر نہیں :

حال ہی میں ایک اجتماع اصلاح معاشرہ کے موضوع پر منعقد تھا۔ دردمند حضرات جہاں اور خرابیوں پر روشنی ڈال رہے تھے وہیں ٹیلی ویژن کی حیا باختگی اور اس کے پیدا کردہ خطرناک اور مہلک اثرات کی طرف بھی توجہ دلا رہے تھے۔ حاضرین میں سے ایک صاحب کھڑے ہوئے اور فرمانے لگے کہ ''ٹیلی ویژن ایسی چیز ہے جو آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود نہیں تھی۔ یہ نئے زمانہ کی ایجاد ہے۔ اس میں بہت سے پروگرام بڑے معلوماتی ہوتے ہیں۔ اگر ہم نے ٹیلی ویژن گھر سے نکال دیا۔ تو ہم ساری دنیا سے کٹ کر رہ جائیں گے۔ اور دنیا کی باتوں پر ہم باخبر نہ رہ سکیں گے۔ اس لئے ٹیلی ویژن نکالنے کے بجائے اس کے مضر پروگراموں سے بچنے کی تلقین کرنی چاہئے''۔

یہ الفاظ بڑے خوبصورت ہیں اور یہ صرف موصوف ہی کا خیال نہیں بلکہ آپ جس ''ٹی وی ہولڈر'' سے پوچھیں گے وہ اسی طرح کا جواب آپ کو سناوے گا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ الفاظ و خیالات کا یہ تسلسل شیطان کا بُنا ہوا ایک جال ہے۔ جسے پھینک کر وہ اچھے اچھے اربابِ عقل و دانش کی فہم و ذکاوت کو مفلوج بنا دیتا ہے۔ آخر دنیا کی کون سی ایسی خرابی ہے جس میں کوئی نہ کوئی پہلو نفع کا نہ نکلتا ہو، خود قرآن کریم میں شراب اور جوئے جیسے جرائم میں بھی لوگوں کے کچھ منافع ہونے کا اثبات فرمایا گیا ہے۔ اس کے باوجود ان دونوں چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے، کیونکہ ان میں نفع کا پہلو کمزور اور نقصان کا پہلو غالب ہے۔ اسی طرح کا معاملہ ٹیلی ویژن اور اس کے پروگراموں کا ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس سے اگر خبروں کا ایک فیصدی فائدہ ہے (جو صرف ٹی وی پر منحصر نہیں بلکہ ریڈیو اور اخبارات سے بھی حاصل ہوسکتا ہے) تو اس کے ۹۹ فیصدی کلچر پروگرام حیا سوز اور بدترین سبق دینے والے ہوتے ہیں جس سے ہماری آنکھوں کے سامنے معاشرہ تباہ ہورہا ہے تو اس ایک فیصد موہوم یا جزئی نفع کی خاطر ۹۹ فیصدی نقصان کو برداشت کرلینا کہاں کی دانشمندی ہے؟ پھر ہمیں مسلمان ہونے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت کی لاج رکھتے ہوئے دنیا کے نفع نقصان کے مقابلہ میں آخرت کا نفع نقصان پیش نظر رکھنا چاہئے۔ اور قطع نظر اس سے کہ ہمیں ٹیلی ویژن سے آنکھوں کی لذت کانوں کی عیاشی اور جذبات برانگیختگی جیسے وقتی دنیوی فوائد حاصل ہوتے ہوں، پھر بھی ہمیں یہ غور کرنا چاہئے کہ اس کے ذریعہ ہم آخرت کے کتنے بڑے خسارے کو مول لے رہے ہیں۔ اور نہ صرف یہ کہ گناہ کے مرتکب ہیں بلکہ گناہ کو صحیح کرنے کے لئے لچر تاویلیں بھی کررہے ہیں۔ یہ عذر گناہ بدتر از گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں عقل سلیم سے نوازے۔ آمین۔

(ندائے شاہی، جنوری ۱۹۹۵ء)

❍❖❍

تجارتی بے اعتدالیاں

اسلام دینِ فطرت ہے اس نے اپنے ماننے والوں کو زندگی کے ہر شعبے سے متعلق اہم اور مفید ہدایات دی ہیں جن پر اگر خلوص دل سے عمل کیا جائے تو نہ صرف معاشرتی اور اجتماعی خرابیوں سے بچا جا سکتا ہے بلکہ خود انسان سچا اطمینان اور سکون حاصل کر سکتا ہے۔ انہی ہدایتوں میں سے وہ اسلامی احکامات بھی ہیں جو خرید و فروخت اور تجارت سے متعلق وارد ہوئے ہیں۔ معاشی اور اقتصادی میدان میں دینی اصول اور تعلیمات پر جمے رہنا اور ظاہری دنیوی منفعت کے مقابلے میں آخرت میں رضائے ایزدی کو طلب کرتے رہنا اگر چہ بڑی آزمائش ہے لیکن اسی اعتبار سے قابل قدر اور باعثِ اجر بھی ہے۔ یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ خرید و فروخت کے احکامات صرف تاجروں اور دوکانداروں کے ساتھ خاص ہیں۔ بلکہ یہ ہدایات بلا امتیاز سبھی افرادامت کے لئے ہیں اس لئے کہ تقریباً ہر شخص کو زندگی میں بار بار ضرورت کی چیزیں خریدنے اور کبھی کبھی بیچنے کی نوبت بھی آتی ہے اس لئے ضرورت ہے کہ ان احکامات کو مدنظر رکھا جائے اور ان پر عمل کرنے کی کوششیں کی جائیں۔

قرآن کریم اور احادیث مبارکہ میں جگہ جگہ حلال طریقہ پر دنیا حاصل کرنے کی ترغیب آئی ہے تاہم یہ بھی پیش نظر رکھا گیا ہے کہ لوگ خودغرض نہ بن بیٹھیں اور حلال وحرام کی تمیز اور اجتماعی مفادات سے قطع نظر کر کے دنیوی مال و دولت ہی کے پیچھے نہ پڑ جائیں ٹ ارشاد ربانی ہے۔

وَلَا تَاْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَ تُدْلُوْا بِهَا اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقاً مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ. (سورہ بقرہ آیت ۱۸۸)

اور نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کا آپس میں ناحق اور نہ پہنچاؤ ان کو حاکموں تک کہ کھا جاؤ کوئی حصہ لوگوں کے مالوں میں سے ظلم کر کے (ناحق) اور تم کو معلوم ہے۔

یہ آیت ان سبھی صورتوں کو محیط ہے جن کے ذریعہ مال و دولت کا حصول شرعاً حرام ہے۔ سود، جوا، دوسرے کے مال پر زبردستی قبضہ، جھوٹ بول کر مال بیچنا، دھوکہ اور خداع اسی طرح رشوت وغیرہ ساری چیزیں اس کے عموم میں داخل ہیں۔ اس لئے ہمیشہ ان ممنوعات سے دور رہنا چاہیئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم امت سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

''اے لوگو اصل مالداری (دینوی) ساز و سامان کی زیادتی نہیں بلکہ حقیقی مالداری دل کا غنی اور بے نیاز ہونا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کو اس کا مقررہ زرق ضرور عطا کرتا ہے۔ لہٰذا مانگنے میں خوبصورتی پیدا کرو۔ جو حلال ہے اسے لے لو اور حرام کو چھوڑ دو''۔ (الترغیب والترہیب ۲/ ۳۳۵)

مؤمن کی شان یہ ہے کہ اس کا دل تنگ نہ ہو بلکہ پوری قوم اور افراد کی خیر خواہی کا جذبہ اس کے دل میں موجود ہو۔ اسی بنا پر شریعت اسلامی ہر اس طریقۂ تجارت کو ناپسند کرتی ہے جو افراد یا معاشرہ کے لئے مضر ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ، بازار میں تشریف لے گئے ایک غلّہ کا ڈھیر لگا ہوا تھا آپ نے اپنا دست مبارک اس کے اندر ڈالا تو آپ کی انگلیاں غلّہ کی نمی سے بھیگ گئیں۔ آپ نے غلّہ کے مالک سے ارشاد فرمایا **ماھٰذا یا صاحبَ الطعام**، اے غلّہ والے یہ کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ بارش کی وجہ سے غلّہ بھیگ گیا تھا۔ اس پر آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ تو نے اس (بھیگے ہوئے غلّہ) کو اوپر کیوں نہیں رکھا کہ لوگ اس (کے عیب) کو دیکھ لیتے۔ جو ہمیں دھوکہ دے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ (جمع الفوائد ا/ ۲۴۷)

ایک دوسرے موقع پر آپ نے فرمایا:

''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے لہٰذا کسی مسلمان کے لئے اپنے بھائی کو بیچ کرتے وقت یہ جائز نہیں ہے کہ اس کے سامنے بیع کے عیب کو بیان نہ کرے''۔ (جمع الفوائد ص/ ۲۴۷) اسی طرح نجش سے ممانعت کی گئی یعنی کوئی شخص خریدنے کے ارادہ کے بغیر قیمت میں اضافہ کروا کر بیچنے والے کو

فائدہ کروائے۔ نجش کرنے والے کو سود خوار اور خائن کہا گیا ہے۔ (حوالہ بالا) یہی حال ان معاملات کا ہے جنھیں اختیار کر کے خواہ مخواہ اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ اور فرضی قلت دکھا کر ضروری استعمال کی چیزوں کی قیمتیں آسمان پر پہنچادی جاتی ہیں۔ اس عمل کو احادیث میں احتکار سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور اس بارے میں سخت ترین وعیدیں وارد ہوئی ہیں۔ ایک روایت میں ہے۔ وہ ذخیرہ اندوز شخص بہت بُرا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ قیمت کم کرے تو اسے بہت تکلیف ہو اور قیمت بڑھ جائے تو اسے خوش ہو۔" (جمع الفوائد/ ۲۵۱) دوسری حدیث میں بیان فرمایا گیا کہ "جو شخص مسلمانوں پر ذخیرہ اندوزی کرے تو اللہ تعالیٰ اسے کوڑھی اور مفلس بنا دے گا۔ نعوذ باللہ۔ (جمع الفوائد/ ۲۵۱) علاوہ ازیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جھوٹی قسمیں کھا کر یا اپنے سامان کی بیجا تعریف کر کے مال بیچنے والے کے بارے میں سخت عیدیں ارشاد فرمائی ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ تجارت کرنے والے ہی فاسق و فاجر ہیں۔ لوگوں نے عرض کیا۔ اے اللہ کے رسولؐ کیا اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال نہیں کیا۔ تو آپؐ نے جواب دیا ہاں! لیکن یہ (تاجر) جھوٹی قسمیں کھا کر گنہگار ہوتے ہیں اور بات چیت میں جھوٹ بولتے ہیں۔ (الترغیب والترہیب ۲/ ۳۴۸) یعنی بیع اگرچہ حلال ہے مگر اکثر تاجر اس میں ایسے کام ملا دیتے ہیں جس سے وہ مفت میں گناہ کے مستحق ہو جاتے ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ شریعت اسلامی تجارت کو امانت و دیانت اور جذبۂ خیر سگالی سے بھرپور دیکھنا چاہتی ہے۔ تاکہ عوام اقتصادی بدحالی کا شکار نہ ہوں اور قوم کا سرمایہ محض چند نفع اندوز افراد کے گرد منحصر نہ ہو جائے۔

شریعت کی اس منشا کے برخلاف ہمارا عام تجارتی طبقہ حلال و حرام کی تمیز سے بے نیاز ہو کر دنیوی مال و دولت کے حصول میں مصروف ہے۔ اور اس شعبہ میں جتنی بے اعتدالیاں کی جاتی ہیں ان کا پوری طرح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اس کا سبب دینی احکامات سے ناواقفیت کے علاوہ وہ خود غرضی اور مفاد پرستی بھی ہے جو شریعت کی نظر میں حد درجہ ناپسندیدہ ہے۔ اس معاملہ میں دین سے

بے توجہی اور لا پرواہی کے مناظر تقریباً ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ لیکن وہ بُرائیاں جو تجارت کا ناسور بن گئی ہیں ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

(۱) جھوٹ بول کر سامان بیچنا: یہ جھوٹ اس طرح بولا جاتا ہے کہ بولنے والے کو جھوٹ کا احساس تک نہیں ہو پاتا۔ مثلاً گھٹیا درجہ کی چیز کو اعلیٰ درجہ کی بتانا۔ اگر اپنے یہاں خریدنے والے کی مطلوبہ چیز موجود نہ ہو تو بلا تکلف یہ کہہ دینا کہ اس کمپنی کا مال نہیں آ رہا ہے جبکہ وہ مال دوسری دوکانوں پر موجود ہو۔ اگر خریدنے والا قیمت کم کرائے تو جھوٹ جواب دینا کہ اتنے میں تو خرید بھی نہیں ہے۔ اسی طرح پھلوں کو مشہور مقامات کی پیدوار کہہ کر بیچنا جبکہ وہ وہاں سے نہ آئے ہوں۔ اور اپنے یہاں موجود اشیاء کی بے جا تعریف کرنا، یہ سب جھوٹ میں داخل ہیں۔

(۲) دھوکہ اور نجش: دھوکہ بھی تجارت کا لازمی جز بن گیا ہے۔ خاص کر جانوروں کی بیع میں دلال عموماً نہ صرف دھوکہ دیتے ہیں بلکہ خواہ مخواہ قیمت میں اضافہ بھی کرواتے ہیں۔ خریدنے والا اگر سمجھدار نہ ہو تو اس بازار سے عموماً لُٹ ہی کر آتا ہے۔

(۳) سود کی ملاوٹ: سود کی آمیزش کی وبائی شکل تو یہی ہے کہ بنک سے لین دین رکھا جائے اس کے علاوہ بیع فاسد بھی سود ہی کے حکم میں ہے۔ جیسے کہ آموں کے باغات مول آتے ہی بیچ دینا۔ اور خریدنے والے کو پھل پکنے تک باغ اپنے قبضہ میں رکھنا۔ یہی حکم ان معاملات کا ہے جو سونا چاندی کی خرید وفروخت میں اختیار کئے جاتے ہیں۔ جن میں خریدنے والے اور بیچنے والے دونوں مبتلا ہیں حتی کہ اچھے اچھے دیندار حضرات بھی اس جگہ احتیاط نہیں کرتے۔

(۴) دوسرے کو نیچا کھانا: یہ خرابی اکثر بڑے کاروباری لوگوں میں پائی جاتی ہے وہ اپنی مارکیٹ برقرار رکھنے کے لئے ایسے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں جو دین وشریعت کے علاوہ انسانیت کے بھی خلاف ہیں۔ ایکسپورٹ، امپورٹ کے میدان میں یہ خودغرضی جگہ جگہ دیکھنے میں آتی ہے اور طرّہ یہ ہے کہ اسی چالبازی کو نہایت قابلِ تعریف سمجھا جاتا ہے۔

(۵) بلیک کرنا: جسے دوسرے الفاظ میں لوگوں کی ضرورت سے ناجائز فائدہ اٹھانا بھی کہا جاسکتا ہے۔سرکاری راشن کی دوکان والے تو اسے گویا اپنا واجبی حق سمجھتے ہیں۔اسی طرح تنگی کی صورت میں اشیاءضروریہ گیس سلنڈر، ڈیزل، اور پٹرول کی بلیک عام ہوجاتی ہے۔

یہ اوراس طرح کی خرابیاں ہمارے معاشرہ میں موجود ہیں۔ہمیں کم ازکم اپنے مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان خرابیوں سے بچنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ تاکہ حلال کمائی سے ہم پروان چڑھیں اور اللہ تعالیٰ کے دربار میں خوشنودی حاصل کرسکیں۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔سب سے عمدہ کمائی ان تاجروں کی ہے جو بات چیت میں جھوٹ نہ بولیں جب انھیں امین بنایا جائے تو امانت میں خیانت نہ کریں۔ جب ان سے کوئی وعدہ لیا جائے تو اس کے خلاف نہ کریں۔ جب کچھ خریدیں، تو اس چیز کی بُرائی نہ کریں۔ (کہ بیچنے والا قیمت کم کردے) جب بیچیں تو اپنے مال کی تعریف نہ کریں۔ جب ان پر کسی کا قرض ہوتو ادائیگی میں ٹال مٹول نہ کریں اور جب ان کا دوسرے پر قرض ہوتو اسے زیادہ تنگ نہ کریں۔(الترغیب والترہیب،۱/۳۴۷)

لیکن چونکہ تجارت میں استقامت بہت مشکل ہے اس لئے امانت دار اور سچے تاجر کی فضیلت بھی اسلام میں بہت زیادہ ہے۔ ارشاد نبویؐ ہے: سچا امانت دار تاجر قیامت میں انبیاء، صدیقین اور شہدا کے ساتھ ہوگا۔(الترغیب والترہیب۲/ ۳۶۵،ترمذی شریف۱/ ۲۲۹) دوسری جگہ ارشاد ہے کہ سچا تاجر قیامت میں اللہ تعالیٰ کے عرش کے سایہ میں ہوگا۔ (الترغیب والترہیب۲/ ۳۶۵)

کاش ہم ان فضیلتوں کے حصول کی سعی کریں اور فلاح دارین کے مستحق بن جائیں۔اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے خوف وخشیت سے نوازے اور حلال وحرام کی تمیز کی توفیق بخشے۔ آمین یارب العٰلمین.

(ندائے شاہی، جون ۱۹۹۳ء)

○❖○

اوقاف کی بے حرمتی

دین سے دوری اور فکر آخرت کے فقدان کی وجہ سے آج کل ہمارے معاشرہ میں وقف جائیدادوں کی بے حرمتی اور پامالی عام ہوتی جارہی ہے۔ یہ کوتاہی متعدد صورتوں میں پائی جاتی ہے۔ مثلاً:

(۱) بہت سی جگہوں پر اوقاف کے مکانات اور زمینیں لوگوں نے یا تو مفت میں قبضہ کر رکھی ہیں۔ یا اگر کرایہ دیتے ہیں تو اتنا معمولی ہے کہ دینا نہ دینا برابر ہے۔ اس گرانی کے دور میں جو جگہیں ہزاروں روپے میں بھی بآسانی دستیاب نہ ہوں وہ چند روپے میں کرایہ پر اٹھی ہوئی ہیں اور کرایہ دار اسے خالی کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ مقدمہ بازیاں گوارا ہیں لیکن وقف کے ساتھ تھوڑی سی بھی مروت اور خیر خواہی گوارا نہیں ہے۔ حالانکہ حضرات فقہاء نے اوقاف کی حفاظت اور ان کے منافع برقرار رکھنے کے لئے مستقل احکامات دیئے ہیں۔ فقہ کا جزئیہ مشہور ہے کہ ''اوقاف کی عمارتی جائیداد صرف ایک سال کے لئے اور صحرائی زمین صرف تین سال کے لئے کرایہ پر دی جاسکتی ہے۔ اس سے زیادہ کا بیک وقت معاملہ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اگلی مدت کے لئے نیا معاملہ کرنا ہوگا۔'' (فتاویٰ شامی ج۶/ ۶۰۵) یہ اسی وجہ سے ہے تاکہ لمبی مدت کی وجہ سے کرایہ دار قبضہ نہ کر بیٹھے یا یہ کہ کرایہ میں مناسب اضافہ نہ ہونے سے وقف کا نقصان ہو۔ فقہاء نے یہ بھی لکھا ہے کہ وقف کے بارے میں نزاع کی صورت میں ہمیشہ وقف کے لئے دینی اور دنیوی اعتبار سے نفع بخش پہلو ہی کو اپنایا جائے گا۔ مگر یہاں ہم اپنے ہی ہاتھوں اپنے اوقاف کا بے دریغ استحصال کر رہے ہیں۔ حکومت اگر کوئی قانون وقف کے خلاف لائے تو ہم بجا طور پر چیں بجبیں

ہو جاتے ہیں مگر جب ہم خود اوقاف کی پامالی کرتے ہیں تو کچھ احساس نہیں ہوتا۔ آج مدارس و مساجد کے لئے اوقاف کی حفاظت کا معاملہ ایک بڑا اور دسر بن گیا ہے۔ کرایہ داروں کی بے اعتدالیوں کی وجہ سے ان اداروں کو ہزاروں روپے عدالتی کارروائیوں میں خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ اور چار و ناچار وہ سب ذرائع استعمال کرنے پڑتے ہیں جو اس ملک میں عدالتی نظام کا خاصہ ہیں۔ ان سب بے احتیاطیوں کے اصل ذمہ دار وہ نادہند کرایہ دار ہیں جو وقف کے معیار کے مطابق کرایہ ادا نہیں کرتے۔ واضح رہے کہ وقف کا معاملہ اتنا نازک ہے کہ اگر متولی یا مہتمم مدرسہ بھی کسی کرایہ دار کو مناسب کرایہ سے کم پر وقف کا مکان دے دے تو بھی لینے والے پر لازم ہے کہ وہ اس قلیل کرایہ پر اکتفا نہ کرے بلکہ پورا مناسب کرایہ (جو اس علاقہ میں دیگر مکانوں یا دوکانوں کا رائج ہو) ادا کرے۔ (تنویر الابصار مع الدر المختار ۶/۶۱۳) بلکہ فقہاء نے یہاں تک لکھا ہے کہ اگر کوئی متولی جان بوجھ کر عام کرایہ سے کم مقدار مقرر کرے تو وہ معزول کئے جانے کے لائق ہوگا۔ اس لئے ضروری ہے کہ جو حضرات وقف جائیدادوں سے نفع اٹھاتے ہیں وہ اپنی شرعی ذمہ داری محسوس کریں اور وقف کو پورا معاوضہ ادا کرنے میں ہرگز دریغ نہ کریں۔ ورنہ ان کی اللہ کے یہاں گرفت ہوگی اور ممکن ہے کہ دنیا ہی میں وہ اس بے احتیاطی کا انجام دیکھ لیں۔

(اللھم احفظنا منہ)

(۲) فقہاء لکھتے ہیں کہ واقف جس مقصد کے لئے وقف کرے اس کا لحاظ رکھنا بہرحال ضروری ہے اور وقف نامہ میں جو شرائط اور مصارف وغیرہ مقرر کی جائیں ان پر عمل اور ان کا نفاذ ایسے ہی لازم ہے جیسے شارع علیہ السلام کی نص کو نافذ کرنا لازم ہوتا ہے۔ مگر آج اس معاملہ میں سخت بے احتیاطیاں ہو رہی ہیں۔ کتنے ایسے مدارس ہیں جنھیں واقف نے دینی تعلیم کے لئے وقف کیا تھا اور آج انھیں خالص عصری اسکولوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ مساجد کی زمینیں خرد برد کر دی گئیں۔ اور اب عیدگاہ کے میدانوں پر للچائی نظریں اُٹھ رہی ہیں۔ ابھی چند روز قبل مغربی یوپی کے ایک بڑے شہر میں عیدگاہ کے متولی صاحب نے یہ

دلیل دے کر کہ یہ قیمتی جگہ سال بھر خالی پڑی رہتی ہے لہٰذا اسے کار آمد بنانے کے لئے وہاں لڑکیوں کے اسکول بنانے کا اعلان کر دیا۔ اور جب مقامی علماء نے اس پر احتجاج کیا تو حسب معمول ان علماء کے خلاف اخبارات میں رپورٹیں شائع کرادیں کہ ''یہ علماء قوم کی ترقی میں رخنے ڈال رہے ہیں۔'' علماء ترقی کے خلاف نہیں ہیں۔ آپ ایک نہیں سو اسکول قائم کریں۔ لیکن دینی شعائر کو ان کاموں کے لئے تختۂ مشق نہ بنائیں۔ ذرا غور فرمائیں اگر اس طرح عیدگاہ کو اسکول بنانے کا سلسلہ چل پڑا تو پھر کسی بھی شہر کی عیدگاہ ان ہوا خواہوں کے دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکے گی۔ کیا ساری تعلیم وترقی کا مدار اسی پر رہ گیا ہے کہ اوقاف کی زمینوں کو ہتھیا کر انھیں مصرف بے مصرف خرچ کیا جائے؟ اگر کوئی قوم کا واقعی خیر خواہ ہے تو جہاں اور جگہوں پر بے دریغ روپیہ خرچ ہو رہا ہے، زمین کی خریداری پر بھی خرچ کیا جائے۔ اور پھر یکسو ہو کر قوم کی خدمت کی جائے۔ انشاء اللہ کوئی بھی عالم اس کے کام میں دخیل نہ ہوگا۔ بلکہ امکانی حد تک تعاون کیا جائے گا۔ لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ علماء مدارس و مساجد کی جائیدادوں کی خرد برد پر خاموش تماشائی بنے رہیں۔ ایسے ناجائز کاموں پر بہر حال احتجاج کیا جائے گا۔ اور حتی الامکان اسے روکنے کی کوشش کی جائے گی۔ ہماری درخواست ہے کہ ان اوقاف کے متولی صاحبان اپنی شرعی ذمہ داری نبھائیں۔ اور آخرت کے مواخذہ سے ڈریں۔ اور وقف کی ہو بھی جائیداد جس کام کے لئے وقف ہے اور اس کی آمدنی کے جو بھی مصارف ہیں وہ پوری امانت داری کے ساتھ مستحقین تک پہنچا کر اپنے فرض سے سبک دوش ہوں۔

(۳) آج کل اوقاف کی بے حرمتی کا افسوس ناک بلکہ عبرت ناک مظاہرہ یہ بھی ہے کہ اب عموماً عیدگاہ کے میدانوں اور قبرستانوں کو کھیل کا میدان بنالیا گیا ہے قبرستان جہاں جا کر انسان کو اپنی موت اور آخرت یاد کرنی چاہئے وہاں دن بھر کھیل کود اور شور وشغب ہوتا رہتا ہے۔ کتنے قبرستان تو جواریوں اور سٹّہ بازوں کے اڈے بن چکے ہیں۔ بہت سی جگہوں پر

قبرستان کی طرف گھروں کا دروازہ کھول کر انھیں اپنے مکان کا صحن بنالیا گیا ہے۔ اور انتہائی تکلیف کی بات یہ ہے کہ بالخصوص بڑے شہروں میں مکانات کی گندی نالیوں کا پانی قبرستان میں چھوڑ دیا جاتا ہے جس سے قبرستان میں سخت بدبو پیدا ہوجاتی ہے۔ چند روز قبل احقر کا ایک قریبی شہر کے ایک قبرستان میں جانا ہوا تو وہاں گندے پانی کی بدبو کی وجہ سے گذرنا دشوار تھا۔ قبرستان کی یہ بے حرمتی کرنے والے کسی اور مذہب کے نہیں ہیں کہ صبر کرلیا جائے۔ بلکہ یہ سب مسلمان کہے جانے والے لوگ ہیں۔ جن کے دل سے موت کا خوف اور آخرت کے عذاب کا تصور مٹ چکا ہے۔ قبرستان کی یہ زبوں حالی اور ان کی اس طرح بے حرمتی آج ملّت اسلامیہ کی پیشانی پر بدنما داغ ہیں۔ ہر شہر بستی اور محلّہ کے بااثر حضرات کا فرض ہے کہ مسلم اوقاف، عیدگاہوں اور قبرستانوں کی بے حرمتی پر روک لگانے کے لئے کمر بستہ ہوں۔ اور جو لوگ اس بارے میں بے احتیاطی کررہے ہیں ان کو سمجھانے کی کوشش کریں۔ یہ قوم وملت کی اہم ترین خدمت ہوگی۔ انشاء اللہ۔

(ندائے شاہی، اپریل ۱۹۹۹ء)

❍❖❍

جلسوں میں بگاڑ

ہمارے معاشرہ میں جہاں ہر شعبۂ زندگی میں بگاڑ آیا ہے، وہیں دینی جلسے بھی ظاہری اور باطنی بگاڑ سے محفوظ نہیں رہے ہیں۔ یہ بگاڑ مقررین میں بھی ہے اور سامعین میں بھی۔ حتی کہ اکثر منتظمین بھی اس وبا سے متاثر ہیں۔ سامعین و منتظمین کا بگاڑ یہ ہے کہ انھوں نے دینی جلسوں کو مشاعروں کی صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ جس طرح مشاعرہ کی کامیابی کا مدار مجمع کی زیادتی اور شاعروں کے زیادہ سے زیادہ داد تحسین وصول کرنے پر ہوتا ہے۔ اسی طرح دینی جلسوں کی کامیابی بھی انھوں نے اسی بھیڑ اور تحسین کو سمجھ لیا ہے۔ اسی نقطۂ نظر سے دینی جلسوں کے لئے ہزاروں لاکھوں روپے محض سجاوٹ اور لائیٹنگ پر لگا دیئے جاتے ہیں اور ایسے مقررین بلائے اور سنے جاتے ہیں جو اپنی جوشیلی، دلچسپ اور زمین و آسمان کے قلابے ملانے والی تقریروں سے مجمع کو لوٹ پوٹ ہونے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ چاہے اس کا باطنی اثر ہو یا نہ ہو۔ اسی وجہ سے اگر کوئی مقرر سیدھی سادی تقریر شروع کر دے تو رفتہ رفتہ مجمع بھی چھٹنا شروع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر منتظمین زیادہ چکاچوند انتظام نہ کر سکیں تو لوگوں کا جڑنا مشکل ہوتا ہے۔ اور پھر جلسے کے بعد اس پر بھرپور تنقیدی تبصرے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں نہ تو سامعین کو سننے کا ثواب مل سکتا ہے اور نہ منتظمین کو انتظام کا۔ ثواب حاصل کرنے کے لئے یہ نیت ضروری ہے کہ ہم دینی باتیں سننے جا رہے ہیں۔ اور دینی باتیں سنوانے کا انتظام کر رہے ہیں جبھی ہم لوگ ثواب کے مستحق ہو سکتے ہیں۔

اس سے کہیں زیادہ بگاڑ طبقۂ مقررین میں ہے۔ چنانچہ اب تقریریں اگرچہ بظاہر اصلاح کے لئے ہوتی ہیں مگر در پردہ ان کے ذریعہ سے سستی شہرت مطلوب ہوتی ہے۔ اب تقریر کے وقت مقرر کو اللہ کی خوشنودی سے زیادہ سامعین کی خوشنودی مطلوب ہوتی ہے کہ کہیں وہ ناخوش ہو کر جلسہ چھوڑ کر چلے نہ جائیں اور مقرر صاحب کی ناک کٹ جائے۔ اگر تقریر اچھی ہو گئی تو دل خود ہوتا ہے اور

آواز بیٹھ جائے یا لوگ زیادہ تعریف نہ کریں تو طبعیت مکدر ہو جاتی ہے اسی طرح بعض لوگ پیشہ کے طور پر وعظ ونصیحت کا کام انجام دیتے ہیں۔ان کی نظر میں سامعین نہیں بلکہ منتظمین کی خوشی سب سے زیادہ اہم ہوتی ہے۔تاکہ انھیں زیادہ سے زیادہ نذرانہ پیش کیا جاسکے۔اور بہت سے لوگ تو پہلے سے طے کر کے ہی تقریر کے لئے منظوری دیتے ہیں۔اور اگر ان کے ساتھ مرضی کے مطابق معاملہ نہ کیا جائے تو دوبارہ اس جگہ آنا بھی پسند نہیں کرتے ان سب خرابیوں ہی کا نتیجہ ہے کہ آج ہزاروں جلسوں کے باوجود ان کے اصلاحی اثرات جیسے نکلنے چاہئیں تھے ویسے نمودار نہیں ہو پاتے۔ اگر تقریر کی خدمت میں لگے ہوئے حضرات خود پکے عامل شریعت بن جائیں۔اور اخلاص وللّٰہیت سے کام کریں تو معاشرہ کا رنگ بدل سکتا ہے اور اصلاح کی ٹہنیاں بار آور ہو سکتی ہیں۔

احادیث طیبہ میں بے عمل اور خود غرض مقرروں کے متعلق سخت ترین وعیدیں وارد ہوئی ہیں۔ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ اس فصاحت و بلاغت سے متصف شخص کو مبغوض رکھتا ہے جو مٹھار مٹھار کر تکلف کے ساتھ بیان کرتا ہو۔ایک دوسری روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کی شب میں کچھ لوگوں کو دیکھا جن کے ہونٹوں کو جہنم کی قینچیوں سے کاٹا جارہا ہے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں تو حضرت جبرئیلؑ نے جواب دیا کہ یہ آپ کی امت کے وہ مقرر ہیں جو دوسروں کو نصیحت کرتے تھے اور خود نصیحتوں پر عمل نہ کرتے تھے۔اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اس لئے علم دین حاصل کرے تاکہ اس کے ذریعہ سے تقریر کر کے لوگوں کے دلوں کو قابو میں کیا جائے تو قیامت کے روز اس کی نہ کوئی نفل عبادت مقبول ہوگی اور نہ فرض۔ (مشکوٰۃ شریف ۲/۴۱۰)

اس لئے ہمارا تعلق کسی بھی طبقہ سے ہو ہمیں اپنی اصلاح کی کوشش کرنی چاہئے۔اگر ہم خطیب ہیں تو خاص طور پر اخلاص اور رضائے خداوندی کے لئے کرسیٔ خطابت پر جلوہ افروز ہوں تاکہ یہ محنتیں بار آور ہو سکیں۔اور سامعین میں سننے کے ساتھ ساتھ عمل کا جذبہ بیدار ہو سکے۔اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق سے نوازے۔آمین۔ (ندائے شاہی، دسمبر ۱۹۹۴ء)

دینی جلسے

(جوخود قابلِ اصلاح ہیں)

دین کے نام پر مجلسیں سجانا اور اجتماعات کرنا بہت اچھی بات ہے۔ اور اس طرح کی مجلسوں کے بڑے فضائل احادیث طیبہ میں وارد ہوئے ہیں۔ مگر موجودہ دور میں جہاں معاشرہ میں ہر سطح پر اخلاقی انحطاط آیا ہے۔ وہیں دینی جلسوں میں بھی بہت سی نامناسب باتیں شامل ہوگئی ہیں۔ اور روز بروز خرابیوں میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان مجالس کا جو فیض امت کو پہنچنا چاہئے تھا۔ وہ نہیں پہنچ پا رہا ہے۔ احقر کو بکثرت ایسے جلسوں میں شرکت کا موقع ملا ہے اس لئے جو باتیں خاص طور پر محسوس کیں انھیں عرض کرتا ہوں تاکہ متعلقہ حضرات اس طرف توجہ دے سکیں۔

(الف) سجاوٹ اور روشنی: آج کل جلسوں میں ہزاروں روپیہ صرف سجاوٹ، ڈیکوریشن اور روشنی پر صرف کیا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جلسہ نہیں بلکہ کسی امیر کبیر کی شادی کی تقریب ہورہی ہے۔ بعض جگہ تو یہ دیکھا گیا ہے کہ ایک محلّہ میں جلسہ ہے تو جلسہ گاہ میں جانے والے راستوں میں بہت دُور دُور تک جھالریں لگادی جاتی ہیں اور کئی روز پہلے سے سجاوٹ شروع ہوجاتی ہے۔ یہ سب چیزیں فضول خرچی میں داخل ہیں۔ ان کی اصلاح ضروری ہے اور اصلاح کی ذمہ داری ان مقررین پر عائد ہوتی ہے جو ایسے جلسوں میں بلائے جاتے ہیں۔ انھیں اس صورت حال پر سختی سے نکیر کرنی چاہئے۔ تاکہ اس اسراف کی حوصلہ افزائی نہ ہوسکے۔

(ب) ضرورت سے زیادہ لاؤڈ اسپیکر: اب جلسوں میں ضرورت سے زائد ہی نہیں بلکہ بہت زیادہ لاؤڈ اسپیکر لگائے جانے لگے ہیں۔ اصل جلسہ گاہ میں چاہے سو پچاس آدمی ہوں مگر دُور

دُور تک گلی کوچوں میں اسپیکر لگا دیئے جاتے ہیں۔ اس میں فضول خرچی اور اسراف تو ہے ہی۔ دوسری طرف دینی باتوں کی توہین اور اہل محلّہ کو ایذا پہنچانے کی خرابی بھی پائی جاتی ہے۔ محلّہ میں مریض بھی ہو سکتے ہیں۔ ایسے ضعیف بوڑھے بھی ہو سکتے ہیں جن کی نیندیں بلند آواز سے اُڑ جاتی ہیں۔ اور وہ اپنے گھروں میں پڑے پڑے جلسہ والوں کو کوستے رہتے ہیں۔ ایک صاحب نے بتایا کہ جب ان کے محلّہ میں ایک سالانہ جلسہ ہوتا ہے جس میں سو سے زیادہ اسپیکر لگائے جاتے ہیں تو وہ قصداً محلّہ چھوڑ کر چلے جاتے ہیں؟ تو غور فرمایئے کہ جلسہ ہو رہا ہے دین کے نام پر اور ہم ایذا پہنچا رہے ہیں اپنے پڑوسیوں کو۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟ شریعت نے دوسرے کی عبادت میں خلل پڑنے کے اندیشہ کے وقت مسجد میں بھی بلند آواز سے قرآن کریم پڑھنے سے روکا ہے تو پھر اس راتوں رات کے شور شرابے کی کہاں اجازت ہو سکتی ہے؟

(ج) نظمیں ہی نظمیں: بعض جگہ یہ دیکھا گیا کہ جلسہ کو مشاعرہ بنا دیا جاتا ہے۔ دینی و اصلاحی تقریریں ہوں یا نہ ہوں شاعروں کی نظموں کا بڑا اہتمام ہوتا ہے۔ ایک تو جلسہ ہی عشاء کے بعد دیر سے شروع ہوتا ہے۔ اور اس میں جو جاگ کر سننے کا وقت ہوتا ہے وہ زائد پروگراموں میں اور نظموں میں گذار دیا جاتا ہے اور جب مقرر صاحب سریر آرائے منصب خطابت ہوتے ہیں تو اکثر سامعین جا چکے ہوتے ہیں یا بحرِ نوم میں غوطہ زنی شروع کر دیتے ہیں جس سے جلسہ کا اصل مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔

اس لئے ضروری ہے کہ اس رواج کو ختم کیا جائے۔ اور تقریری پروگرام کو اولیت دی جائے۔ اور نظمیں اگر رکھی بھی جائیں تو انھیں ثانوی حیثیت دی جائے۔

(د) صبح کی نماز خطرے میں: اب جلسے رات میں اتنی دیر تک چلتے ہیں کہ جلسے کے اکثر شرکاء کی صبح کی نماز نہیں تو جماعت ضرور فوت ہو جاتی ہے۔ اور منتظمین کا تو پتہ ہی نہیں رہتا کہ کہاں گئے؟ ظاہر ہے کہ آدمی جب رات بھر جاگے گا تو صبح کا فریضہ کیسے ادا کر سکتا ہے؟ تو غور فرمایئے! رات بھر مقرر صاحب نماز کی اہمیت اور عبادت کی فضیلت پر دھواں دار تقریر

کرتے رہے اور اثر یہ ہوا کہ نماز فجر بھی گئی۔ تو ایسی محنت سے کیا فائدہ؟ اس لئے ضرورت ہے کہ جلسہ جلد ہی شروع کر کے جلد ہی ختم کیا جائے۔ اور سب سے بہتر تو یہ ہے کہ مغرب کے بعد سے جلسہ شروع کر کے نماز عشاء کچھ تاخیر سے با جماعت پڑھ لی جائے، تاکہ لوگ جاگ کر سن سکیں اور نماز فجر کے لئے بآسانی بیدار ہو سکیں۔ بعض علاقوں میں بحمدہ تعالیٰ مغرب کے بعد جلسوں کا رواج ہو گیا ہے تو اس کے اچھے نتائج برآمد ہو رہے ہیں۔ اور جہاں کسی وجہ سے مغرب کے بعد انتظام نہ ہو سکے تو وہاں بہر حال بعد نماز عشاء جلد شروع کر کے جلد ختم کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

(ہ) مقررین کی کثرت: اب سب سے بڑا جلسہ اسے سمجھا جاتا ہے جہاں تقریر کے لئے مقرروں کی پوری کھیپ موجود ہو۔ گویا جلسہ نہ ہوا، تقریر کا مقابلہ ہو گیا۔ اس میں کئی خرابیاں ہیں ایک تو وقت خواہ مخواہ زیادہ خرچ ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں آپ جلسہ جلدی ختم کرنا بھی چاہیں تو نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ جس شخص کو تقریر کے لئے بلایا گیا ہے وہ تقریر ضرور کرے گا ورنہ ناراض ہو جائے گا۔ دوسرے یہ کہ ہر مقرر دوسرے مقرر کے دباؤ میں رہتا ہے اور عوام کے لئے مفید ہو یا نہ ہو اپنا مضمون جلد سمیٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ تیسرے یہ کہ ایسی صورت حال میں عوام کے فائدے کی باتیں کم آتی ہیں اور مقررین اپنے زور خطابت اور دوسرے پر برتری حاصل کرنے پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ الا ماشاء اللہ۔ چوتھے یہ کہ ایسے جلسوں کے ختم پر سرکاء میں سے یہ کسی کو یاد نہیں رہتا کہ کیا نصیحت کی بات کہی گئی ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ بلکہ ہر ایک صرف مقرروں کے مابین تبصرہ کرتا نظر آتا ہے کہ کس کی تقریر اچھی رہی اور کس کی خراب۔ اس لئے ضرورت ہے کہ جلسوں کو ان خرابیوں سے بچایا جائے اور مقرروں کی بھیڑ جمع کرنے کے بجائے عوامی فائدے کو مدنظر رکھا جائے۔ اور جلسوں کو ناموری اور سستی شہرت کے بجائے عمومی اصلاح کا ذریعہ بنایا جائے۔ جلسہ میں خواہ ایک دو ہی مقرر ہوں مگر انھیں کھل کر اصلاحی مضمون بیان کرنے کا موقع دیا جائے۔ اس کے بغیر یہ دینی جلسے اپنے مقاصد میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے۔

مدارس کے جلسے :

دینی مدارس میں سال کے ختم پر جو بڑے بڑے جلسے ہوتے ہیں۔ نیز طلبہ کی انجمنوں کے جو اجلاس ہوتے ہیں۔ ان میں بھی بعض خرابیاں تیزی سے پھیل رہی ہیں جن پر ارباب مدارس کو سنجیدگی سے توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ مثلاً:

(۱) بڑی بچیوں کے پروگرام: ایک بڑا فتنہ بالخصوص دیہاتی علاقوں کے مدارس میں یہ ہے کہ مدرسہ کے جلسوں میں بڑی عمر (۱۲-۱۵ سال تک) کی بچیاں نظموں، ترانوں اور مکالموں کے پروگرام میں اسٹیج پر آکر حصہ لیتی ہیں۔ اور اگر اس پر نکیر کی جاتی ہے تو مدرسہ والے کہتے ہیں کہ صاحب بچیوں کے والدین کی خواہش پر ان کا پروگرام رکھا گیا ہے۔ اس لئے اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ والدین کے کہنے میں آکر شریعت کا مسئلہ تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ چاہے کسی کو اچھا لگے یا بُرا، کم از کم دینی مدارس کے ذمہ داران کو ان فتنہ انگیز پروگراموں کو بند کرنا چاہئے۔ اگر مدارس والے ہی دین پر عمل نہ کریں گے تو پھر عوام سے شکایت کا کیا موقع ہے؟

(۲) مکالمے نہیں ڈرامے: دینی و علمی معلومات کے لئے اگر طلبہ کو کچھ سوال و جواب سکھا دیئے جائیں اور انھیں مکالمہ کی شکل میں جلسہ میں پیش کر دیا جائے تو اس میں توفی نفسہ حرج نہیں، لیکن اب ان مکالموں نے ڈراموں کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ یعنی ہیئت، لباس، انداز سب کچھ بدل دیا جاتا ہے اور بعض مرتبہ تو نہایت بھونڈے مذاق کی شکل پیدا ہو جاتی ہے۔ گذشتہ سال ایک ادارہ کے طلبہ کی انجمن کے سالانہ اجلاس میں شرکت ہوئی تو طلبہ نے ''ہندومت اور اسلام'' پر ایک مکالمہ پیش کیا جس میں ایک طالب علم باقاعدہ ہندو پنڈت کی شکل میں بن کر آیا، جسے دیکھ کر سخت تکدر رہا۔ اور اسی وقت اس پر سختی سے نکیر کی گئی۔ اس قسم کے فضول اور واہیات پروگرام دینی اداروں کے قطعاً شایان شان نہیں۔ ایسے پروگراموں سے وقتی طور پر تو ہنسی مذاق اور ٹھٹھہ کا موقع تو مل سکتا ہے لیکن اس سے نہ

کبھی دینی فائدہ برآمد ہوا ہے اور نہ ہوسکتا ہے۔ اہلِ مدارس کو ان پروگراموں پر سختی سے نظر رکھنی چاہئے۔ بلکہ جو طلباء ایسے پروگراموں کے مرتکب ہوں انھیں قابل عبرت سزا دینی چاہئے۔ اگر ان پر ابھی سے روک نہ لگائی تو آگے ان کے نتائج اور بھی خراب ہو سکتے ہیں۔

(۳) سارا زور چندے پر: بعض مدارس کے جلسوں میں یہ دیکھا گیا کہ منتظمین کا سارا زور صرف اور صرف چندے پر ہوتا ہے انھیں اس سے کوئی مطلب نہیں کہ حاضرین کو دینی فائدہ پہنچایا نہیں بس وہ چندہ ہی کرنے پر ساری توجہ مرکوز کئے رہتے ہیں۔ تقریریں تو کیا ہوتیں، پورے جلسے میں چندہ دہندگان کے لئے لمبی چوڑی دُعائیں ہوتی رہتی ہیں۔ کوئی اس جلسہ میں پانچ روپے دے یا پانچ ہزار روپے، اسے جھولی بھر کر دعاؤں کی سوغات اناؤنسر صاحب کی طرف سے دی جاتی ہیں۔ چندہ کرنا منع نہیں ہے، مگر اس کی کوئی حد بھی تو ہونی چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ چندہ کے جوش میں دینی فائدہ ہی کو پس پشت ڈال دیا جائے۔ اگر چندہ کرنا ہی ہے تو اس کے لئے جلسہ گاہ سے الگ کاؤنٹر بھی بنائے جاسکتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ اعلان کر دیا جائے کہ فلاں جگہ چندہ جمع ہو رہا ہے۔

یہ چند سطور محض اصلاح کے جذبہ سے لکھی گئی ہیں۔ امید ہے کہ ان پر عمل کی کوشش کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ ہماری ہر سطح پر اصلاح فرمائے۔ آمین **وماتوفیقی الا باللّٰہ۔**

(ندائے شاہی، ستمبر ۱۹۹۸ء)

آگ کا کھیل

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا **من حسن اسلام المرأ ترکہ مالا یعنیہ** (ابوداؤد) یعنی اچھے مسلمان ہونے کی ایک نشانی یہ ہے کہ وہ لایعنی اور فضول چیزوں اور اعمال سے اجتناب کرتا ہو۔ ایک طرف جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ عظیم نصیحت ہے اور دوسری طرف آج ہماری زندگی ہے جو فضول اور بے فائدہ رسومات اور اعمال سے بھرپور ہوتی جارہی ہے۔ اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں تو بہت سی ایسی باتیں نظر آئیں گی جن کے ہم عادی ہوچکے ہیں حالانکہ اس میں نہ کوئی دینی فائدہ ہے نہ دنیوی کوئی منفعت ہے اور یہ باتیں ہم صرف غیر قوموں کی نقالی میں اختیار کئے ہوئے ہیں مثلاً ٹائی باندھنا، کھڑے ہوکر کھانا کھانا، بائیں ہاتھ سے پانی پینا، عورتوں کا پیشانی پر بندی لگانا وغیرہ۔

انہی رسومات میں سے ایک بدترین رسم جو ہمارے معاشرہ میں رائج ہے وہ شب برات کے موقع پر آتش بازی کی لعنت ہے۔ اس رسم کو برادران وطن کے تیوہار دیوالی سے لیا گیا ہے۔ اور صرف ایک رات میں بلا مبالغہ لاکھوں کروڑوں روپیہ آگ کے کھیل پر فضول پھونک دیا جاتا ہے۔ اس عمل سے نہ صرف یہ کہ دنیوی یا دینی قطعاً کوئی فائدہ نہیں بلکہ اس آگ کے مظاہرہ میں کتنی جانیں ہر سال ضائع ہوجاتی ہیں۔ اور کتنی املاک تباہ ہوجاتی ہیں۔ شریعت کی نظر میں یہ کھلی ہوئی تبذیر اور فضول خرچی ہے جو شیطانی صفت ہے۔ قرآن کریم میں تبذیر کرنے والوں کو شیطان کا بھائی بند کہا گیا ہے۔ (سورۂ بنی اسرائیل، آیت ۲۷)

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں میں آتش بازی جیسی بدترین رسم کا رواج اسلام کی پیشانی پر کلنک کا داغ ہے۔اس سے اسلام کی صورت مسخ ہوتی ہے۔جو ہمارے بھائی محض بچوں کی ضد پر ان کے لئے آتش بازی کا سامان مہیا کرتے ہیں یا بچوں کے کھیلوں کو دیکھ کر ڈانٹنے ڈپٹنے کے بجائے ان سے محظوظ ہوتے ہیں انھیں سنجیدگی کے ساتھ اپنے عمل کا جائزہ لینا چاہئے اور اپنی اسلامی ذمہ داری کو پورا کرتے ہوئے اپنے کسی بھی عمل یا قول سے اس بدترین رواج کی تائید نہ کرنی چاہئے۔خاص طور پر بچوں اور نوجوانوں پر روک لگانے کی ضرورت ہے۔ ہر علاقہ اور ہر محلّہ میں ایسے جماعتیں معین ہونی چاہئیں جو ذمہ داری کے ساتھ وقت کی قربانی دے کر اس رسم کو معاشرہ سے بالکلیہ نکال دینے کے لئے میدان میں آئیں اور والدین خصوصی طور پر اپنے بچوں کو اس سے باز رہنے کی تلقین کریں۔ مساجد میں بیانات کرائے جائیں اور انفرادی اور اجتماعی طور پر رائے عامہ بیدار کی جائے۔ایسا نہیں ہے کہ اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلے گا۔ہمیں معلوم ہے کہ جن دردمندانہ ملت نے اپنی ذمہ داری سمجھ کر اس سلسلہ میں محنت کی ہے۔انھیں کافی حدتک کامیابی ملی ہے اور محنت کی جائے تو ہر جگہ کامیابی مل سکتی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی ذمہ داریاں نبھانے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین۔

(ندائے شاہی، جنوری ۱۹۹۶ء)

عذر گناہ

برائیاں جب اس احساس کے ساتھ کی جائیں کہ یہ شرعاً ناپسندیدہ ہیں تو دیر سویر کبھی نہ کبھی ان سے بچنے اور توبہ کرنے کی توفیق نصیب ہو ہی جاتی ہے۔ کسی گناہ کی برائی کا دل میں شعور ایمان کی نشانی ہے اگر اس کی پاسداری کی جائے تو یہ دبی ہوئی چنگاری ایک نہ ایک دن شعلۂ جوالہ میں تبدیل ہو کر انسانی خواہشات کا قلع قمع کر دیتی ہے۔ ہمارے سامنے بہت سی ایسی مثالیں ہیں کہ کوئی شخص کسی غلط کام کا عادی تھا مگر اس گناہ کے ارتکاب پر اس کا دل اندر سے ملامت کرتا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی زندگی کا وہ مبارک لمحہ آیا جب اس نے اپنی دیرینہ غلط عادت سے توبہ کی اور وہ پوری طرح اسلام کا تابع فرمان ہو گیا۔ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سیدھے راستے کی مثال اس طرح بیان کی ہے کہ مثلاً کوئی سیدھی سڑک ہو، اس کے دونوں کناروں پر دیواریں بنی ہوں جن میں محرابیں کھلی ہوئی ہوں اور ان محرابوں پر پردے پڑے ہوئے ہوں۔ اور ایک شخص سڑک کے شروع میں کھڑے ہو کر آواز لگا رہا ہو کہ اے لوگو! ادھر ادھر نہ جاؤ بلکہ سب سیدھے راستے پر چلو۔ اور ایک آواز دینے والا سڑک کے اوپری حصہ میں کھڑا ہے۔ چنانچہ جب کوئی سڑک پر چلنے والا شخص سڑک کے کنارے لگی محرابوں میں داخل ہونے کے لئے پردہ ہٹاتا ہے تو وہ اوپر کھڑا داعی پکارتا ہے کہ خبردار ! اس محراب اور دروازے کو مت کھول کیونکہ اگر تو کھولے گا تو اس میں داخل ہو جائے گا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس مثال میں سیدھی سڑک سے مراد مذہب اسلام ہے۔ دیواروں میں کھلے ہوئے دروازے اللہ کے محارم ہیں اور ان پر پڑے ہوئے پردے اللہ تعالیٰ کی مقررہ حدیں ہیں، سڑک کے شروع میں آواز دینے والا قرآن کریم ہے۔ اور اوپر سے پکارنے والا وہ اللہ کا واعظ ہے جو ہر مومن کے دل میں موجود ہے۔ (مشکوۃ شریف ۱/۲۱)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ منکرات کے ارتکاب پر طبعیت کا اندر سے ملامت کرنا ایمان کی علامت ہے۔ اور جس شخص میں یہ ملامت کا جذبہ نہ پایا جائے بلکہ پورے شرحِ صدر اور اطمینان کے ساتھ گناہ کا ارتکاب کرتا ہو تو وہ سمجھ لے کہ اس کے ایمان میں بڑی کمی پائی جاتی ہے۔

ایک اور حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''جب تم میں سے کوئی شخص اپنے سامنے کسی بُرائی کو ہوتا دیکھے تو اپنے ہاتھ سے اسے روک دے، اگر ہاتھ سے روکنے کی طاقت نہ ہو تو زبان سے منع کر دے۔ اگر اتنی بھی ہمت نہ ہو تو کم ازکم اسے دل سے بُرا سمجھے۔ اور یہ ایمان کا سب سے کمترین درجہ ہے''۔ (مسلم شریف ١/٥١)

افسوس یہ ہے کہ اس زمانہ میں ایمان کی یہ چنگاری بھی ہمارے معاشرہ سے رخصت ہوتی جارہی ہے۔ ہم منکرات کے اتنے عادی ہوگئے ہیں کہ ان کے ارتکاب پر ہمارے اندر شرم وحیا کا احساس تو کیا ہوتا، الٹا انھیں ہم نے اپنی عزت ووقار کا ذریعہ سمجھ لیا ہے۔ معاشرہ کی اخلاقی وروحانی تباہی کا بنیادی سبب یہی ہے کہ منکرات کی برائی تک ہمارے دلوں سے نکل چکی ہے۔ اب کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنے غلط اور حرام کام کو تاویل کر کے کسی نہ کسی طرح صحیح ثابت کیا جائے اور نکیر کرنے والوں کو الزامی جواب دے کر خاموش کر دیا جائے، صحیح بات سننے کے بھی لوگ روادار نہیں ہوتے۔

ٹیلی ویژن، وی سی آر اور میوزک کی وبا ہمارے معاشرہ میں اتنی زیادہ پھیل چکی ہے کہ عام آدمی اس سے بچنے کا تصور بھی کبھی خیال میں نہیں لاتا۔ اور تقریبات میں نمائش، نام ونمود اور اسراف وتبذیر کو نئی نسل نے اپنا امتیاز بنالیا ہے۔ کوئی دردمند اگر ان امور پر انگلی اٹھائے تو اسے جواب ملتا ہے کہ:

(١) ہم اپنے خاندان کا ''اسٹنڈرڈ'' بڑھا رہے ہیں۔ (٢) ہم اپنے مہمانوں کی عزت کرتے ہیں۔ (٣) نیتوں کا حال اللہ کو معلوم ہے، کسی کو ہماری نیت پر اعتراض کا کیا حق ہے۔ (٤) ہمیں اللہ نے جتنا دیا ہے اسی اعتبار سے ہم خرچ کرنے کے مجاز ہیں۔ (٥) اور زیادہ سے زیادہ یہ اسراف ہی تو ہے۔ یہ کوئی بڑا گناہ تو نہیں۔

یہ جواب آپ کو ہر جگہ نظر آئیں گے۔ مگر اس کی خطرناکی کا ہمیں یہاں اندازہ نہیں ہے، جب میدان حشر بپا ہوگا اور ہمارا قدم اس وقت تک اپنی جگہ سے ہل نہ سکے گا جب تک کہ ہم سے پانچ باتوں کا جواب نہ لے لیا جائے کہ (۱) عمر کیسے گذاری (۲) جوانی کہاں گنوائی (۳) مال کیسے کمایا۔ (۴) مال کہاں خرچ کیا (۵) اور علم سے کیا فائدہ اٹھایا۔ (مشکوٰۃ ۲/۴۴۳) اس وقت ہماری آنکھیں کھلیں گی۔ اور اپنی غفلت پر شرمندگی ہوگی۔ مسلمان خاندان کی عزت شیطان کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے سے نہیں بڑھ سکتی۔ اسلام کی عزت تو سنت نبوی پر عمل کرنے میں ہے۔ برادری کا وہ اسٹینڈرڈ جو مغرب کے طور طریقوں سے حاصل کیا جائے اس کی مثال ریت کے تودے کے مانند ہے۔ جو ذرا سے پانی کے زور اور ہواؤں کی تیزی سے منٹوں میں برابر ہو جاتا ہے۔ اور آدمی کلبوں میں نمائش کرے اور نیتوں کے اخلاص پر اپنے دل کو مطمئن کرتا رہے، اس سے بڑی خود فریبی کچھ نہیں ہو سکتی۔ پھر یہ کہنا کہ ''اسراف ہی تو ہے'' ایک بڑے گناہ کو حقیر سمجھنے کے مرادف ہے جس کے نتائج انتہائی سنگین ہو سکتے ہیں۔ اس طرح کی حرکتوں اور فضول خرچیوں کے ریکارڈ قائم کرنے کے جذبہ کا وبال قوم پر اور خاندانوں پر پڑنا ناگزیر ہے۔ مال میں بے برکتی ہوگی۔ آپس میں اختلافات ابھریں گے، حسد اور کینہ اور ایک دوسرے پر تفاخر کا مرض پنپے گا۔ پھر قوم کی بیٹیاں بن بیاہی بیٹھیں گی۔ ظاہری حسن اور دھوم دھام سے شادی کے انتظام کے بغیر کوئی رشتہ پکا نہ ہو سکے گا۔ بڑھتی ہوئی بیماریوں پر ابھی نہ روک لگی تو جو خاندان اور برادریاں آج اپنے آپ کو سب سے زیادہ دیندار، سب سے زیادہ کاروباری اور عقل وفراست سے آراستہ سمجھتی ہیں وہ بھی تاریخ کی وادیوں میں گم ہو جائیں گی، اور ان کا کوئی نام لیوا بھی باقی نہ بچے گا۔

آج ہر برادری کے بڑوں کے کاندھوں پر مستقبل کا بوجھ ہے۔ بڑوں کو روک ٹوک کرنی چاہئے۔ فائدہ کی اُمید ہو تو برائیوں کو روکنے کے لئے سماجی بائیکاٹ اور خاص کر تقریبات میں تبذیر واسراف کا مقاطعہ کرنا چاہئے۔ بڑوں کی اس وقت کی خاموشی آگے کی بدترین دینی ودنیاوی تباہی کا پیش خیمہ ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں عقل سلیم سے نوازے۔ آمین۔

(ندائے شاہی، مارچ ۱۹۹۵ء)

ہاں ! ہم ''بنیاد پرست'' ہیں

آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''میری امت پر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ دین پر ثابت قدم رہنا اتنا مشکل ہو جائے گا جیسے انگارے کو مٹھی میں رکھنا مشکل ہوتا ہے''۔ (مشکوٰۃ شریف ۲/ ۴۵۹) یعنی دین داروں کے خلاف عالمی طور پر مخالفانہ ماحول بنادیا جائے گا، دین پر چلنے والوں کا برسرعام مذاق اڑایا جائے گا، سنتوں کی توہین کی جائے گی، تقوٰی کے تقاضوں پر عمل کرنے والوں کو ناگوار اور ذلت آمیز تبصروں سے سابقہ پڑے گا، بددینی اور بدعملی کو عین ترقی سمجھا جائے گا، اور دیانت وامانت اور ورع وتقویٰ کو قرون اولیٰ کی یادگار سمجھ کر ان اعمال کو قومی تنزلی کا سبب تصور کرلیا جائے گا۔

آنحضرت ﷺ کی یہ پیش گوئی آج کے دور پر حرف بحرف صادق آرہی ہے۔ آج پوری دنیا امت اسلامیہ کے دین دار طبقہ کو بدنام اور ذلیل کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی سامراجی اقوام کو اسلام کے شعائر اور امتیازی علامات کی بیخ کنی کا ''خبط'' ہو گیا ہے۔ اور ان کے دل ودماغ پر دینداروں کی مخالفت کی ''ہذیانی کیفیت'' پوری شدت سے طاری ہے، مغربی ذرائع ابلاغ نے (جو مکمل طور پر یہودی لابی کی گرفت میں ہیں) پوری دنیا میں مسلمانوں کو دو طبقوں ''روشن خیال'' اور ''بنیاد پرست'' میں تقسیم کرنے کی پرزور مہم چلا رکھی ہے۔ اور اس سلسلہ میں بدترین قسم کے گھٹیا اور اوچھے ہتھکنڈے استعمال کئے جارہے ہیں۔ مثلاً افغانستان میں طالبان کے ہٹ جانے کے بعد وہاں کے مغربیت زدہ بدنصیب افراد کے ڈاڑھیاں مونڈنے، سینما میں بھیڑ لگانے، اور عورتوں کے سڑکوں پر آنے کے بے ہودہ مناظر بار بار دکھلائے جاتے ہیں، اور ایسی خبروں کو شہ

سرخیوں میں جگہ دیکر ناواقف لوگوں میں اسلامی احکام اور امتیازات سے نفرت پیدا کرنے کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ اور سارے عالم میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی جارہی ہے کہ گویا کہ طالبان نے افغانستان میں اسلامی شریعت نافذ کرکے کوئی بڑا جرم کررکھا تھا جسکا سلسلہ اب ختم ہو چکا ہے۔ دینداروں کے خلاف یہ پروپیگنڈا اتنی شدت سے جاری ہے کہ اب بنیاد پرستی (فنڈامنٹلزم) ایک مستقل گالی کے درجہ کا لفظ بن چکا ہے۔ اور اس لفظ کا مفہوم من مانے طرز پر مغربی ذرائع ابلاغ نے صرف یہ طے کیا ہے کہ ''جو شخص بھی دین اسلام کی سربلندی کی بات کرے وہ بنیاد پرست ہے'' عجیب بات ہے کہ یہودی، عیسائی یا کوئی بھی غیر مسلم اپنے مذہب پر عمل کرے تو اسے کوئی ''بنیاد پرست'' نہیں کہتا اور اگر کوئی سچا مسلمان اپنے مذہب پر مکمل عمل پیرا ہو جائے، نماز کا پابند ہو، چہرے پر ڈاڑھی ہو اور لباس اسلامی بنالے بس اس پر ''بنیاد پرستی'' کا لیبل لگا کر اسے بے حیثیت بنانے کی کوشش شروع ہو جاتی ہے۔ یہ تفریق خود اس حقیقت کی غماز ہے کہ ان مغربی اقوام کو صرف اور صرف سچے مسلمانوں سے بغض ہے، اسی لئے وہ دین دار طبقوں کے خلاف ظلم اور جارحیت کے بہانے ڈھونڈتے رہتے ہیں، انکو خطرہ صرف اسی ایک بات سے ہے کہ کہیں اسلام کے نام لیوا واقعی پکے مسلمان نہ بن جائیں اور کہیں پھر دنیا میں دین حق کا غلغلہ نہ بلند ہو جائے۔ افسوس ہے کہ مغربی ذرائع ابلاغ کے اس مکروہ پروپیگنڈے کی سُر میں سُر ملانے میں روشن خیالی کی خوش فہمی میں مبتلا مسلمان بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔ یہ طبقہ اپنی مادیت پرستی، عیش وعشرت پر دل دادگی، اور فلاح آخرت سے نہایت غفلت کی وجہ سے طبعی طور پر دینی تحریکات اور دین کے فکری وعملی نفاذ میں مصروف لوگوں سے حد درجہ بعدر کھتا ہے۔ اور اپنے مسلمان ہونے کے دعوی کے باوجود مذہبی طبقہ کی بیخ کنی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتا، آج مسلم ممالک کے زیادہ تر حکمراں اسی بددین طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، جنہوں نے اپنے مغربی آقاؤں کے چشم اَبرو کا اشارہ پا کر دین کے نفاذ کی بات کرنے والوں پر شکنجہ کسنا شروع کر دیا ہے، اور تو اور ان کی نظروں میں اب مسجدوں اور مدرسوں کا وجود تک

کھٹکنے لگا ہے اور مدارس ومساجد کو قومیائے جانے کے اقدامات کا اعلان کیا جارہا ہے۔اور ایسی فضا بنائی جارہی ہے کہ دین کا نام لینے والوں پر زمین وسعت کے باوجود تنگ ہوجائے۔

مغربی طاقتوں نے اسلامی آثار کو مٹانے کے لئے ایسے ہی ضمیر فروش اور تنگ نظر، نام نہاد روشن خیال لوگوں کو سامنے کر رکھا ہے جو اپنی ایمانی غیرت وحمیت کو چند ٹکوں کے عوض فروخت کر کے قومی ترقی کے بلند بانگ دعوے کرتے نہیں تھکتے، انہیں نہیں معلوم کہ یہ سامراج جو آج انکی پیٹھ تھپتپا رہا ہے اور جسکی ظاہری قوت پر وہ غالباً خدا کی طاقت سے زیادہ تکیہ کئے ہوئے بیٹھے ہیں اسکے مذموم مقاصد صرف دینداروں کو ختم کرنے ہی سے پورے نہیں ہوجائیں گے بلکہ ملت اسلامیہ کے ایک ایک فرد سے دشمنی اس سامراج کے رگ وپے میں پیوست ہے اور وہ دنیا میں کسی فرد کو مسلمان ہونے کی حالت میں دیکھنا نہیں چاہتا۔لہذا دینداروں پر عتاب کے بعد اسکے نشانہ سے آئندہ بددین بھی بچ نہیں پائیں گے۔اصل میں بات یہ ہے کہ ان ''روشن خیالوں'' کا سارا مطمح فکر صرف اور صرف دنیوی منافع اور عیش وعشرت کے اردگرد گھومتا ہے۔اور وہ کبھی بھول کر بھی آخرت کی صلاح وفلاح کا خیال دل میں نہیں لاتے ایسے پکے دنیاداروں کو حدیث شریف میں بدترین مخلوق قرار دیا گیا ہے۔آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

يَأْتِيْ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ هَمُّهُمْ بُطُوْنُهُمْ، وَشَرَفُهُمْ مَتَاعُهُمْ وَقِبْلَتُهُمْ نِسَاؤُهُمْ وَدِيْنُهُمْ دَرَاهِمُهُمْ وَدَنَانِيْرُهُمْ أُولٰئِكَ شَرُّ الْخَلْقِ لَاخَلَاقَ لَهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ.

(الاشاعة لاشرط الساعة / ۷۲)

لوگوں پر ایک وقت ایسا آئے گا کہ انکو بس پیٹ کی فکر ہوگی، اور انکی بدترین توجہ مال ودولت کی طرف ہوگی، وہ عورتوں کو اپنا قبلہ بنالیں گے، اور دینار ودرہم (روپیہ وپیسہ) ہی انکا مذہب بن جائے گا۔ یہ مخلوق کے بدترین لوگ ہونگے، اللہ کے یہاں انکا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔

آج ایسے ہی دنیادار افراد ممالک اسلامیہ کے ارباب حل وعقد بنے بیٹھے ہیں، یہ لوگ محض وقتی معاشی فوائد کے لئے سب کچھ کر گذرنے کو تیار ہیں اور جو دین دار لوگ انکو دین کی طرف توجہ دلاتے ہیں وہ انکی نظر میں جاہل اور بے وقوف قرار پاتے ہیں۔ یہ ایک سخت امتحان کا مرحلہ ہے

ایک طرف دنیا کی چکاچوند اور عیش و عشرت کے اسباب ہیں اور دوسری طرف جہالت وحماقت کے طعنے ہیں، اب ان میں سے کون سا راستہ ایک مؤمن کو اختیار کرنا چاہئے اس سلسلہ میں آنحضرت ﷺ نے ہمیں یہ رہنمائی فرمائی ہے۔ آپ کا ارشاد ہے:

سَيَأْتِيْ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ يُخَيَّرُ فِيْهِ الرَّجُلُ بَيْنَ الْعَجْزِ وَالْفُجُوْرِ فَمَنْ اَدْرَكَ ذٰلِكَ الزَّمَانَ فَلْيَخْتَرِ الْعَجْزَ عَلَى الْفُجُوْرِ.

(فيض القدير ٤/١٥١)

عنقریب لوگوں پر ایسا زمانہ آئے گا کہ اس میں آدمی کو عاجزی (ذلت) اور فسق وفجور کے درمیان اختیار دیا جائے گا۔ لہٰذا جو شخص ایسا وقت پائے وہ فسق وفجور کے مقابلہ میں عاجزی اور درماندگی کو ہی اختیار کرلے۔

یعنی اپنی دنیا بنانے کے لئے آخرت خراب نہ کرے۔ بلکہ آخرت کی کامیابی کو اولیت دے۔ بھلے ہی اسے دنیا میں کمزوری کا طعنہ سننے کو ملے اور ایک اور حدیث میں آنحضرت ﷺ نے بگاڑ کے زمانہ میں سنت پر مضبوطی سے قائم رہنے کی ترغیب اس طرح ارشاد فرمائی:

مَنْ تَمَسَّكَ بِسُنَّتِيْ عِنْدَ فَسَادِ اُمَّتِيْ فَلَهٗ اَجْرُ مِائَةِ شَهِيْدٍ.

(الاشاعة ٧٦)

جو شخص میری امت کے بگاڑ کے زمانے میں میری سنت پر مضبوطی سے قائم رہا اس کو سو شہیدوں کے برابر ثواب عطا ہوگا۔

اس حدیث سے ناموافق حالات میں دین پر جمنے کے ثواب کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دنیوی اسباب ووسائل بھی یقیناً حاصل کرنے چاہئیں، ہماری صفوں میں ایسے افراد کا وجود بھی لازم ہے جو بہترین سائنس داں، ماہر ڈاکٹر اور کامیاب انجینئر ہوں، کیونکہ دنیوی تعلیم اور ٹیکنالوجی کی مہارت بھی بنیادی قومی وضروریات میں شامل ہے، لیکن یہ سب ترقیاں اسی وقت کارآمد ہوسکتی ہیں جب کہ ہمارے اندر اسلامی حمیت بھی پوری طرح زندہ ہو اور ہم اپنے ان وسائل کو اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کے لئے استعمال کریں۔ عصری وسائل کو جب دین کی سرپرستی ملے گی تو دین اور دنیا کے امتزاج سے امت ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہوگی اور دنیا کی کسی بھی سامراجی طاقت کو اسکی طرف نظر

اٹھا کر دیکھنے کا حوصلہ نہ ہوسکے گا۔ ایک مؤمن کلمہ گو کی شان یہی ہونی چاہئے کہ وہ کسی بھی وقت اپنا رشتہ دین سے نہ توڑے بلکہ ہر وقت اور ہر جگہ ذاتی، اجتماعی اور عملی طور پر دین کے غلبہ کے لئے کوشاں رہے۔ اگر اسی کا نام دنیا نے ''بنیاد پرستی'' رکھا ہے تو ہم ہزار مرتبہ فخر کے ساتھ کہیں گے کہ :

ہم بنیاد پرست ہیں اور تادم حیات بنیاد پرست رہیں گے۔ انشاء اللہ.

اور اسکے برخلاف دین سے کٹ کر اپنی بنیاد بھول جانے والوں کو جو ''روشن خیالی'' کا تمغہ دیا گیا ہے وہ ہماری نظر میں تمغہ نہیں بلکہ کلنک کا ٹیکہ ہے، اس لئے کہ جو بھی مسلمان دین حق سے ہٹ جائے گا اور امت کے مفادات سے منہ موڑے گا وہ ہرگز ہرگز روشن خیال نہیں ہوسکتا، بلکہ وہ تاریک خیال ہے جو خود بھی اندھیرے میں رہے گا اور دوسروں کو بھی اندھیرے میں رکھے گا، اور اندھیرا ہی اسکا انجام ہوگا۔ **اللّٰھم احفظنا منہ.**

(ندائے شاہی، فروری ۲۰۰۲ء)

اپنے سرمایہ دار بھائیوں سے
کچھ صاف باتیں

مال و دولت اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے جس کو کام میں لا کر انسان نہ صرف دنیا بلکہ آخرت میں بھی عزت کی زندگی اور راحت و عافیت حاصل کر سکتا ہے، حضرات صحابہ میں بڑے بڑے صحابہ سرمایہ دار گزرے ہیں لیکن ان کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنی مالداری کو آخرت کی راحت کے حصول کے لیے استعمال کیا کرتے تھے اور یہ سرمایہ داری انھیں کسی بھی نیک کام سے پیچھے نہیں رکھتی تھی، جس کا ثبوت اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ مہاجر فقرائے صحابہ رضی اللہ عنہم نبی اکرم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ ہمارے مالدار بھائی ہم سے بہت سبقت لے جا چکے، اور انھوں نے جنت میں اپنے لئے اونچے اونچے درجات ابھی سے بک کرا لئے ہیں، نبی کریم ﷺ نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ تو ان فقراء نے فرمایا کہ: حضرت! بات یہ ہے کہ وہ لوگ ہماری طرح نماز پڑھتے ہیں اور روزہ رکھتے ہیں لیکن وہ صدقہ خیرات کرتے ہیں اور ہم صدقہ نہیں کر سکتے، نیز وہ غلام آزاد کرتے ہیں اور ہمارے پاس اتنی استطاعت نہیں، اس پر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: کیا میں تمہیں ایسا عمل نہ بتاؤں کہ تم اس کے ذریعہ سے اپنے سے آگے جانے والوں کے درجہ کو پہونچ جاؤ گے اور تمہارے بعد میں آنے والے تمہیں نہ پا سکیں گے، اور تم سے افضل کوئی نہ ہوگا سوائے اس شخص کے جو تم جیسا عمل کرے؟ ان صحابہ نے عرض کیا کہ حضرت وہ عمل ضرور بتائیے! تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ہر نماز کے بعد سبحان اللہ، اللہ اکبر اور الحمد للہ ۳۳، ۳۳، مرتبہ پڑھ لیا کرو،

راوی کہتے ہیں کہ کچھ دنوں کے بعد وہی فقراء صحابہ پھر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ آپ ﷺ نے جو ہمیں نسخہ بتایا تھا وہ ہمارے مالدار بھائیوں کو بھی پتہ چل گیا اور انھوں نے بھی اسی پر عمل شروع کر دیا، یہ سن کر نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: **ذلك فضل الله يوتيه من يشاء** (یہ اللہ کا فضل ہے وہ جسے چاہے عطا کرے)۔(مسلم شریف ۱/۲۱۹)

اس واقعہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دور نبوت کے مالدار حضرات بھی خیر کے حصول کے کتنے زیادہ شوقین تھے اور سرمایہ داری کے باوجود ان میں آخرت سے غفلت کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا تھا اور ان کے لئے مال ودولت اُخروی ترقی کے لئے ایک عظیم مددگار کی حیثیت رکھتا تھا جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: **نعم المال الصالح للرجل الصالح** (حلال مال نیک شخص کے لئے بہترین مددگار رہے) (مسند احمد ۴/ ۱۹۷) اُس وقت جب جہاد یا دعوت وتبلیغ کا موقع ہوتا تو سب صحابہ خواہ غریب ہوں یا امیر اطاعت رسول میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے مالداروں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ ہم انتظام کئے دیتے ہیں صرف غریب لوگ چلے جائیں بلکہ وہ لوگ خود دین کے کاموں کے لئے پہلے ہی آگے بڑھنے کو تیار رہتے تھے اور جانی و مالی ہر قسم کی قربانی دینے میں کوئی دریغ نہ کرتے تھے۔

اس کے برخلاف آج ملت کے اکثر سرمایہ دار حضرات مال ودولت کے نشہ میں ایسے مدہوش ہو چکے ہیں کہ آخرت کا تصور ہی ان کے دل سے بالکل مٹ چکا ہے اور دن ورات پیسہ کمانے اور ذخیرہ جمع کرنے کے علاوہ کوئی اور فکر دامن گیر نہیں ہے، یہ حالت پوری ملت کے لئے انتہائی خطرناک ہے اور اللہ تعالی کے بدترین عذاب کو دعوت دینے کے مرادف ہے قرآن کریم میں اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا:

وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْراً.	اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو وہاں کے خوش عیش (یعنی سرمایہ دار) لوگوں کو (ایمان واطاعت) کا حکم دیتے ہیں اور پھر جب

(سورۃ بنی اسرائیل آیت : ۱۶) وہ لوگ وہاں شرارت مچاتے ہیں یعنی فسق وفجور میں مبتلا ہوتے ہیں تو ان پر حجت تام ہو جاتی ہے پھر ہم اس بستی کو تباہ اور غارت کر ڈالتے ہیں۔

یہ آیت امت کے ان مالداروں کے لئے سخت تازیانۂ عبرت ہے جو آج آخرت سے غافل ہو کر اور دنیاداری میں بدمست ہو کر اپنا قیمتی سرمایہ فضولیات میں ضائع کر رہے ہیں اور قوم وملت کے مفادات سے منہ موڑ کر محض ہوس پرستی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ملت کا یہ سرمایہ دار طبقہ خواب غفلت سے بیدار ہو اور اللہ تعالیٰ نے اسے جس عظیم نعمت سے سرفراز فرمایا ہے اس کی شکر گزاری بجالا کر بارگاہ خداوندی کا تقرب حاصل کرے، اور اپنے دنیوی وسائل اور ذاتی اثر ورسوخ کو کام میں لاکر ملت کی فلاح وبہبود اور اقتصادی اور تعلیمی ترقی کے لئے میدان عمل میں آئے اور ان ناقابل معافی برائیوں سے اپنے کو پاک کرے جن کی بناء پر یہ طبقہ رحمت خداوندی سے دور ہوتا جا رہا ہے۔

ذیل کے مضمون میں بطور خاص ان بعض برائیوں پر نکیر کی جا رہی ہے جو آج کثرت کے ساتھ ہمارے سرمایہ دار طبقہ میں جڑ پکڑتی جا رہی ہیں۔ جن کا فوری اور مؤثر علاج کرنا جلد از جلد ضروری ہے۔ اس تحریر کا مقصد کسی کی تحقیر وتوہین نہیں ہے بلکہ یہ تحریر ایک آئینہ ہے جس میں اپنا چہرہ دیکھ کر آدمی خود اپنی اصلاح کر سکتا ہے اور اپنے ضمیر سے باز پرس کرنے کی اس میں جرأت پیدا ہو سکتی ہے، آج بہت سے مالداروں کو صرف ایسے ہی لوگ پسند ہیں جو دن رات ان کی خوشامد اور جی حضوری میں لگے رہیں اور ان کی ہر صحیح وغلط بات پہ آمنا و صدقنا کہیں اور جھوٹی تعریفیں کر کے ان کی خوشنودی حاصل کریں۔ حالانکہ یہی خوشامدی لوگ ان کے سب سے بڑے دشمن ہیں ان کا خیر خواہ وہی ہو سکتا ہے جو ان کی غلطیوں پر برملا نکیر کرے اور ان کو صحیح دینی مسائل کی رہنمائی کرے تاکہ وہ آخرت میں عذاب خداوندی سے محفوظ رہ سکیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرا سب سے قریبی دوست وہ ہے جو میری غلطیوں پر تنبیہ کرے۔ بہرحال یہ چند باتیں محض توجہ دلانے کے لئے لکھی جا رہی ہیں خدا کرے کہ یہ ہم سب کے لئے نفع بخش ہوں تاہم یہ ضروری نہیں ہے کہ

مندرجہ ذیل منکرات ہر سرمایہ دار میں پائی جائیں بلکہ بفضلہٖ تعالیٰ اس گئے گذرے دور میں بھی معتد بہ تعداد میں ایسے اصحاب خیر موجود ہیں جو لکھ پتی ہونے کے باوجو سچے دین دار ہیں اور قوم وملت کا درد اپنے دل میں رکھتے ہیں۔ یقیناً انکا کردار لائق قدر ہے۔ لیکن انکی بہ نسبت غافل سرمایہ داروں کی تعداد بہر حال زیادہ ہے اور ان میں رواج پانے والی برائیاں باعث تشویش ہیں۔ ذیل میں ایسے ہی غفلت زدہ حضرات کی تنبیہ کے لئے چند باتوں کی نشان دہی کرائی جارہی ہے : ملاحظہ فرمائیں :

(۱) مال کی ہوس اور مدہوشی

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ آدمی کو اگر سونے سے بھری ایک وادی بھی دیدی جائے تو وہ دوسری وادی کا طلب گار ہوگا اور اگر دوسری وادی دیدی جائے تو تیسری وادی کے حصول کی کوشش کریگا اور آدمی کا پیٹ تو مٹی ہی بھر سکتی ہے۔ (بخاری شریف ۹۵۳/۲۰) یعنی مرنے کے بعد ہی اسکی ہوس انجام کو پہنچ سکتی ہے۔ آج اکثر سرمایہ داروں کا حال اس حدیث کے عین مطابق ہے، حلال وحرام کی تمیز جاتی رہی اور مالی ہوس دل ودماغ پر ایسی حاوی ہوگئی کہ سرمایہ دار کو پیسہ کے علاوہ کسی چیز کی سَدھ ہی نہیں رہی، حتیٰ کہ تعلقات میں بھی پیسہ ہی دخیل ہوگیا، رشتہ داری میں بھی بس انہیں سے رابطہ ہے جن کے پاس پیسہ ہے۔ اور جو بے چارے صاحب حیثیت نہیں ہیں ان کی خبر گیری تو کیا کرتے ان سے میل جول تک رکھنے کو روادار نہیں، اور اللہ کی طرف سے عطا کردہ بے حساب دولت کے باوجود بہت سے سرمایہ دار دوسروں کے حقوق دبائے بیٹھے ہیں، احقر کے علم میں بہت سے ایسے لکھ پتی حضرات ہیں کہ ان کے کاروبار تقسیم ہوئے سالوں گذر گئے لیکن آج تک لاکھوں روپے ایک فریق کے دوسرے پر واجب الاداء ہیں، اور وسعت کے باوجود ادائیگی کا کوئی ذکر فکر نہیں، حالانکہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ مالدار شخص کا حقوق کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرنا ظلم ہے۔ (مسلم شریف ۱۸/۲) مگر معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں اپنی موت یاد ہی نہیں کہ کب بلاوا آجائے اور ہم دوسروں کے بھاری حقوق سے بوجھل گردن کے ساتھ بارگاہ حق وانصاف میں حاضر کردئے جائیں ؟

اسی طرح مال میں مدہوشی کا عالم یہ ہے کہ اکثر سرمایہ دار لوگ کسی دینی سرگرمی میں وقت لگانے کو تیار نہیں، الحمدللہ تبلیغی جماعت کا کام پورے عالم میں چل رہا ہے لیکن آپ جائزہ لیجئے جماعت میں شہر شہر، اور بستی بستی گھومنے والوں میں مشکل سے ۴، ۵ فیصدی بھی سرمایہ دار حضرات دستیاب نہ ہوں گے۔ زیادہ تر وقت لگانے والے یا تو متوسط طبقہ کے ہیں یا غریب غرباء ہیں۔ یہی حال دینی اجتماعات اور جلسوں میں شرکت کا ہے کہ ہمیشہ ان جلسوں اور مواعظ کے مقابلہ میں سرمایہ دار حضرات اپنی کاروباری مصروفیات کو ترجیح دیتے ہیں، اور یہ سمجھتے ہیں کہ ان میں شرکت کرنا تو ہمارا کام ہے ہی نہیں، کسی میں بہت دین کا جذبہ ہوا تو بادل خواستہ یا ناخواستہ کچھ مالی تعاون کر دیا اور بس، یہ صورت حال خوش کن نہیں بلکہ انتہائی باعث افسوس ہے۔ دنیا کمانے میں ایسی بھی مدہوشی کیا کہ آدمی دینی تقاضوں ہی کو بالائے طاق رکھ دے اور سر سے پیر تک دنیا ہی کی فکر اوڑھ لے؟ کسی مومن کو یہ مدہوشی ہرگز زیب نہیں دیتی۔ ٹھیک ہے اللہ تعالیٰ نے حلال کمانے سے منع نہیں کیا، آپ ضرور کمائیں اور خوب کمائیں! لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنی اخلاقی، اجتماعی اور دینی ذمہ داریوں کو فراموش نہ کریں ورنہ یہ کمائی رحمت بننے کے بجائے سخت زحمت اور فتنہ اور وبال بن جائیگی۔

(۲) بددینی

سرمایہ دار گھرانوں میں جیسے جیسے سرمایہ کی فراوانی ہورہی ہے ان کی نسلوں میں عموماً اسی رفتار سے دین سے بےزاری بھی بڑھتی جارہی ہے۔ بےحیائی، بےغیرتی، اجنبی لڑکے لڑکیوں کا بےمحابا اختلاط اور میل جول اور ان کے ساتھ سیر سپاٹا اور تفریحات تو اس طبقہ میں کوئی معیوب بات رہ ہی نہیں گئی، پیسہ آنے کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ ہم اپنا دین ہی بالائے طاق رکھ دیں، دین کے احکامات سب کے لئے برابر ہیں جو چیز ایک عام شخص کے لئے گناہ ہے وہ سرمایہ داروں کے لئے بھی ممنوع اور باعث عذاب ہے۔ آج سرمایہ داروں کے یہاں جا کر دیکھئے کہ ان کے گھرانہ کا پورا نظام انگریزیت زدہ نظر آئے گا۔ ڈرائنگ روم تصویروں سے سجے ہوئے ہیں، بچے بچیوں کے لباس ایسے عریاں ہیں کہ پہچاننا مشکل ہے کہ یہ مسلمانوں کی اولاد ہیں یا انگریز کافروں کی؟، نئی نسل نماز

اور عبادت کے تصور سے بھی دور ہے، راتوں کو دیر تک جاگنا اور صبح دیر تک سوتے رہ کر اللہ کی نحوست مول لینا روز کا معمول ہے، عورتوں کا فیشن کا شوق نا قابل بیان ہے۔ ٹیلی ویژن اور اس کے فحش اور حیا سوز پروگرام گھر کی سب سے اہم مصروفیت ہے وغیرہ وغیرہ، یہ ایسی عادتیں ہیں جو سرمایہ کے ساتھ ساتھ گھروں میں سرایت کر رہی ہیں. اور بہت کم با توفیق سرمایہ دار اس سے محفوظ ہیں بلکہ زیادہ تر حضرات کے ذہنوں سے ان خرابیوں کی برائی تک نکل گئی ہے حد تو یہ ہے کہ آج بہت سی فرموں کے دفاتر میں بے پردہ نوجون لڑکیاں ملازم ہیں جس کی وجہ سے حیا سوز ذلت انگیز واقعات کثرت سے پیش آرہے ہیں، اور اب انہی باتوں کو قابل فخر اور باعث ترقی سمجھا جانے لگا ہے حالانکہ دین سے دوری اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی بر سر عام نافرمانی سے زیادہ ذلت اور خسارہ کی بات ایک مسلمان کے لئے اور کوئی نہیں ہو سکتی، اس لئے عقلمندی اور ہوشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم دین داری میں ایسے بدمست نہ ہوں کہ ہمارا دین ہی داغ دار ہو جائے۔ ہمیں دنیا سے زیادہ آخرت کی کامیابی کی فکر کرنی لازم ہے. اللہ تعالی اپنے فضل سے ہمیں توفیق عطا فرمائے۔ آمین

(۳) علماء کی تحقیر

کچھ مغرور سرمایہ دار اپنی دولت کے نشہ میں علماء دین کی تحقیر واہانت کی عادت میں مبتلا ہیں، وہ بظاہر اپنی پارسائی اور دلوں کی صفائی کا اظہار کرتے ہیں جب کہ ان کے ذہن و دماغ علماء کے بغض وعناد سے بھر پور ہیں۔ طبقۂ علماء سے یہ عداوت دنیا اور آخرت میں سخت نقصان کا موجب ہے. حدیث قدسی میں وارد ہے کہ اللہ تعالی فرماتا ہے ''جو شخص میرے کسی ولی سے دشمنی رکھتا ہے میں اس کے خلاف اعلان جنگ کر دیتا ہوں''۔ (بخاری شریف ۲/۹۶۳) گو کہ یہ عین ممکن ہے کہ کچھ لوگ علماء کے بھیس میں کسی بد معاملگی میں مبتلا ہو جائیں لیکن چند لوگوں کے غلط عمل سے پورے طبقۂ علماء سے بے اعتمادی کی فضا بنا لینا ہرگز انصاف کی بات نہیں ہے۔ مگر آج بہت سے سرمایہ داروں کی گفتگو کا ایک اہم موضوع علماء کے کردار کو مشکوک کرنا اور ان کے اعتماد کو مجروح کرنا ہوتا ہے۔ اور مدارس سے وابستہ علماء تو اس معاملہ میں خاص طور پر تختۂ مشق بنے ہوئے ہیں۔ حالانکہ ان ایرکنڈیشنڈ

کمروں میں بیٹھ کر مفت میں تبصرہ کرنے والوں کو اس کا ہرگز اندازہ نہیں ہوسکتا کہ یہ بے چارے علماء ساری دنیا جہان کی خاک چھان کر کس بے سروسامانی کے عالم میں مدارس ومکاتب چلا کر گاؤں گاؤں اور شہر شہر میں دین کے چراغ روشن کئے ہوئے ہیں؟۔ زبان سے تبصرے کرنا بہت آسان ہے مگر ذرا میدان میں نکل کر دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ یہ کیسا عظیم مجاہدہ ہے کہ ایک عالم کو وقت، جان اور مال کے ساتھ اپنا وقار اور عزت داؤ پر لگا کر دین کی کیسی محنتیں کرنی پڑتی ہیں؟ کتنے ایسے علماء ہیں کہ اگر انہیں اپنی ذات کے لئے روپیہ کی ضرورت ہو تو شاید وہ ایک پیسہ کا سوال کرنے کی بھی جسارت نہ کریں، مگر دین کے لئے نہ جانے کہاں کہاں جا کر کتنے جوکھم اٹھانے پڑتے ہیں اور کتنے ناگوار حالات اور باتوں سے سابقہ پڑتا ہے اس کا ہم گھر بیٹھ کر اندازہ نہیں لگا سکتے، احقر کا بہار کے ایک دور افتادہ گاؤں کے ایک مدرسہ میں جانے کا اتفاق ہوا دیکھا کہ ایک ایسے چھپر کے نیچے بچے محو تعلیم ہیں جہاں ٹاٹ تو کجا ٹوٹی پھوٹی چٹائی بھی مہیا نہیں ہے۔ اساتذہ کی تنخواہیں مہینوں سے واجب الادا ہیں، مگر دین کی محنت کا ایک شوق ہے جو انہیں اس مشغلہ میں لگائے ہوئے ہے، اسی طرح احقر کئی ایسے معیاری مدرسوں سے واقف ہے جہاں آدھے سال کے بعد ہی سے تنخواہیں رک جاتی ہیں اور طلبہ کے مطبخ کے خرچ کو چلانا بھی اہل مدرسہ کے لئے سخت مشکل ہوتا ہے۔ واقعۃً وہ اساتذہ قابل صد مبارک باد ہیں جو ایسے جاں گسل حالات میں استقامت کا ثبوت دے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے خزانہ غیب سے انکو اس صبر واستقامت پر عظیم اجر سے نوازے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

الغرض ان اہل سرمایہ کی نظر علماء کی ان عظیم خدمات پر نہیں، انہیں تو بس تبصروں سے مطلب ہے۔ اکثر مدارس کے سفراء کے ساتھ ان کا برتاؤ ایسا تحقیر آمیز ہوتا ہے جو انسانیت کے اعتبار سے بھی انتہائی باعث مذمت ہے۔ مگر ان مغرور سرمایہ داروں کو اس کا کچھ احساس نہیں، اسی طرح بعض علاقوں میں سرمایہ دار لوگ علماء اور مساجد کے ائمہ کو اپنا زرخرید غلام سمجھتے ہیں جہاں کوئی ناگواری کی بات ہوئی بس ان کے درپئے آزار ہو جاتے ہیں، کچھ سرمایہ داروں کا حال یہ ہے کہ انہیں خود تو کسی عالم کے یہاں حاضری کی توفیق ہوتی نہیں اور چاہتے یہ ہیں کہ علماء اپنے وقار کو پامال

کر کے ان کے در دولت پر حاضری دیا کریں۔اور بعضوں کا حال یہ ہے کہ محض ناموری اور بڑائی کے لئے کسی مشہور بزرگ سے تعلق قائم کرلیا اور وہ بزرگ اپنے اخلاق فاضلہ کی بنا پر ان سے کچھ خصوصیت کا معاملہ کرنے لگے تو اب یہ سرمایہ دار صاحب سمجھتے ہیں کہ خود ان سے بڑا کوئی ''پارسا'' نہیں اور ہر مجلس میں اٹھتے بیٹھتے ان بزرگ صاحب کا نام لیتے ہیں۔کبھی ان کی خدمت گذاری کا دعویٰ کرتے ہیں مگر گھر میں اور زندگی میں اور معاملات میں ان بزرگ کے حکم پر عمل ہے یا نہیں؟ اس کی کچھ پروا نہیں۔تو ایسے لوگ اچھی طرح یاد رکھیں کہ بزرگ کی اتباع کے بغیر یہ تعلقات کا ڈھونگ ہرگز کام نہیں آسکتا،اور پھر یہ بھی ضروری ہے کہ کسی ایک بزرگ سے تعلق کے بعد کسی دوسرے بزرگ یا عالم کے ساتھ حقارت کا معاملہ ہرگز نہ کریں ورنہ مفت میں نیکی برباد اور گناہ لازم آئے گا۔اس لئے سرمایہ دار حضرات کو اپنا محاسبہ کرنا چاہئے اور ہر ایسے عمل اور برتاؤ سے باز آنا چاہئے جو ان کے لئے آخرت میں نقصان اور خسارے کا باعث ہو،اللہ تعالیٰ ہمیں فکر سلیم عطا فرمائے۔آمین۔

(۴) زکوۃ کی ادائیگی میں بخل

ہر صاحب نصاب پر سال گزرنے پر ڈھائی فیصدی رقم غریبوں پر صرف کرنا یعنی زکوۃ دینا فرض عین ہے لیکن آج کل بہت سے سرمایہ دار ایسے ہیں جو (کروڑوں کے مالک ہونے کے باوجود) سال بہ سال حساب لگا کر زکوۃ اداء کرنے میں نہایت بخل سے کام لیتے ہیں اور اگر مجبوراً دینا ہی پڑے تو انتہائی دل تنگی اور ناگواری کے ساتھ بوجھ سمجھ کر زکوۃ دیتے ہیں یہ انتہائی خطرناک اور بدترین جرم ہے،اس سے کاروبار کی ساری برکت جاتی رہتی ہے اور اس کی نحوست سے دیگر اچھا مال بھی خطرہ میں آجاتا ہے۔

ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب بھی زکوۃ کا مال دوسرے مال میں مل جائے گا تو وہ اسے تباہ کر ڈالے گا۔(مشکوۃ ۱/۱۵۷) اس کا مطلب یہ ہے کہ جس مال میں زکوۃ واجب ہوگئی ہو اور اس میں سے زکوۃ نہ نکالی جائے تو یہ حصہ زکوۃ جب دوسرے مال سے ملے گا تو اسے بھی تباہ کر ڈالے گا۔(فضائل صدقات ۱/۲۵۶) نیز ایک روایت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا کہ دنیا میں جہاں بھی سمندر یا خشکی میں کوئی مال ضائع ہوتا ہے تو وہ یقیناً زکوۃ روکنے کی وجہ سے ہی ہوتا ہے۔(الترغیب والترہیب ۱۱۳۰، فضائل صدقات ۱/۲۵۴) اور ایک روایت میں ہے کہ جو قوم زکوۃ کی ادائیگی میں آنا کانی کرتی ہے اس پر قحط سالی مسلط کردی جاتی ہے، یہ تو دنیا میں ظاہر ہونے والے اثرات ہیں اور آخرت میں زکوۃ نہ دینے کا جو عذاب قرآن وحدیث میں بیان ہوا ہے اس کا تو یہاں تصور بھی محال ہے۔

اس لئے مالداروں پر لازم ہے کہ وہ اپنی خیر منائیں اور حساب لگا کر زکوۃ ہر سال ادا کرنے کا اہتمام کریں۔اور کوشش کریں کہ انکی زکوۃ صحیح مصرف میں خرچ ہو، اپنے قریبی رشتہ داروں کے حالات کا جائزہ لیکر زکوۃ سے ان کا تعاون کریں، دینی تعلیم کی اشاعت اور نادار طلبۂ مدارس کی کفالت میں صرف کریں، اور زکوۃ دیتے وقت ہرگز یہ نہ سوچیں کہ ہم نے رقم دیکر ان پر کوئی احسان کیا ہے بلکہ ان کا شکریہ ادا کریں کہ وہ ایک فرض کی ادائیگی میں معاون بن رہے ہیں، اگر یہ غرباء نہ ہوں تو زکوۃ کا فریضہ سرمایہ داروں کے ذمہ سے ساقط نہیں ہوسکتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ: قیامت کے قریب مال دار لوگ اپنی زکوۃ کی رقم لیکر گھومیں گے لیکن کوئی شخص اسے قبول کرنے پر تیار نہ ہوگا۔اس لئے آج جو مستحقِ زکوۃ فقیر دستیاب ہیں ان کا احسان مند ہونا لازم ہے کہ ان کی وجہ سے ایک فریضہ ادا ہو رہا ہے۔

(۵) حرام جگہوں پر صرف بے جا

ایک طرف زکوٰۃ اور خیرات میں حد درجہ بخل کا مظاہرہ ہے جس کی انتہا یہ ہے کہ کسی فقیر یا مدرسہ کے سفیر پر نظر پڑتے ہی پیشانی پر سلوٹیں پڑ جاتی ہیں اور اس سے سیدھے منہ بات کرنا بھی گوارا نہیں ہوتا دوسری طرف حال یہ ہے کہ کہیں نام ونمود کا موقع ہو، مشاعرہ یا کسی ثقافتی پروگرام کی اسپانسر شپ کا معاملہ ہو یا کسی کلب میں شرکت کا موقع ہو تو وہاں یہی سرمایہ دار تعاون کرنے میں سب سے آگے نظر آئیں گے، لاکھوں روپے بخوشی انکی جیب سے نکل جائیں گے بلکہ مزید ان پروگرام کرانے والوں کا شکر ادا کیا جائے گا کہ انھوں نے جناب کو اس قابل سمجھا کہ آپ کا روپیہ اس

''مقدس کام'' میں لگالیا گیا حد تو یہ ہے کہ آج بڑے بڑے تفریحی کلب جو یقیناً فواحش اور منکرات کے اڈے اور فضول مصروفیات کے آماج گاہ ہیں، ان کی تعمیر وانتظام میں ہمارے سرمایہ دار حضرات کا کروڑوں روپیہ لگ رہا ہے جس میں پیش آنے والے تمام فواحش اور بے حیائیوں کا وبال ان کے بنانے والوں پر ہوگا۔ قرآن کریم میں حرام جگہوں پر مال اڑانے والے مال داروں پر سخت نکیر کرتے ہوئے انھیں شیطان کا بھائی بند قرار دیا گیا ہے ارشاد خداوندی ہے :

وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْراً، اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ، وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا. (بنی اسرائیل ٢٦ - ٢٧)

اور (مال کو) بے موقع مت اڑانا، بے شک بے موقع اڑانے والے شیطان کے بھائی بند ہیں اور شیطان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے۔

افسوس ہے کہ ابھی شہر مرادآباد میں تفریح ''ٹاؤن کلب'' کے نام سے مسلمان سرمایہ داروں نے ایک تفریحی کلب بنایا ہے۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ کیا کمائی کا کوئی اور ذریعہ نہیں رہ گیا؟ یہی لہو ولعب کے اڈے کمانے کے لئے رہ گئے ہیں؟ دراصل یہ بھی ایک نحوست ہے کہ اب اپنا روپیہ اچھی جگہ پر لگنے کے بجائے ایسی قابل لعنت جگہوں پر صرف ہو رہا ہے۔

(٦) تقریبات میں بے حد فضول خرچی

شریعت میں تقریبات کے اندر سادگی اپنانے کی تعلیم دی گئی ہے۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: کہ سب سے بابرکت نکاح وہ ہے جو سب سے کم خرچ اور سب سے کم مشقت والا ہو۔ (مشکوٰۃ شریف ۲/ ۲۶۸) لیکن اس ہدایت کے بالکل برخلاف ہمارے سرمایہ دار حضرات کی تقریبات میں اسراف اور فضول خرچیاں اس قدر حد سے تجاوز کرچکی ہیں جن کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا ایک دو چیز میں اسراف ہو تو بیان بھی کیا جائے یہاں تو از اول تا آخر اسراف ہی اسراف ہے، نکاح ایک ہوتا ہے اور اس کی بغل بچہ بھرپور تقریبات نہ جانے کتنی ہوجاتی ہیں، منگنی کی تقریب، تاریخ طے ہونے کی تقریب، اپٹن کی تقریب، بھات کی تقریب، نوشہ سازی کی تقریب وغیرہ، اس کے بعد کہیں جا کر نکاح اور ولیمہ کا نمبر آتا ہے۔ اور مجال ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی خاندانی

رسم بھی چھوٹ جائے، اضافہ اور ایجاد تو ہوسکتی ہے مگر کمی کا سوال نہیں۔ پھر لمبی لمبی دعوتیں، انواع واقسام کے کھانوں اور پھر فضول ڈیکوریشن اور نمائش کا سلسلہ الگ رہا، آج جتنا زائد روپیہ ایک سرمایہ دار اپنے یہاں کی تقریب میں صرف کرتا ہے اس رقم سے دسیوں بے سہارا بہنوں کے نکاح کا انتظام ہوسکتا ہے مگر دولت کی ایسی مدہوشی میں ان غریبوں کا خیال کون کرے؟

گذشتہ ایک سال سے متواتر عالم اسلام تشویش ناک حالات سے دوچار رہا ہے۔ رہی سہی کسر گجرات کے ہولناک فسادات نے پوری کردی لیکن ان صبر آزما حالات میں بھی ہمارے سرمایہ دار بھائیوں کی تقریبات کی شان وشوکت اور فضول خرچیوں اور منکرات میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا گویا ہم نے اپنے کردار سے یہ بتلادیا کہ ہمارے مظلوم بھائیوں پر اگرچہ قیامت گذرتی رہے مگر ہمارے اوپر کوئی اثر پڑنے والا نہیں۔ ہم اپنی غفلت کی ڈگر پر برابر قائم رہیں گے، اور ایسی قدرتی تنبیہات ہمارے حواس درست کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں۔ نعوذ باللہ تعالیٰ

(۷) تعمیرات کی ریل پیل

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے ساتھ شر کا ارادہ فرماتا ہے (اور اس کے مال کو ضائع کرنا چاہتا ہے) تو اس کے مال کو اینٹ اور گارے میں لگوادیتا ہے۔ (الزواجر ۱/ ۴۳۸) اس ارشاد کی روشنی میں ہمارا عمل یہ ہونا چاہئے تھا کہ ہم کسی بھی غیر ضروری تعمیر سے اپنے کو پوری طرح محفوظ رکھتے، لیکن اس کے برعکس آج ہمارے مال دار حضرات کا حال یہ ہے کہ جدھر دیکھئے بڑے بڑے عالی شان محلات، بنگلوں اور فلیٹوں کی تعمیرات زور شور سے جاری ہیں۔ ہر مال دار اس معاملہ میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کو تیار ہے، معلوم ہوتا ہے جنت کے سب محل یہیں بنانے کا ارادہ ہے، سارے ارمان بس یہیں نکالے جارہے ہیں؟ تعمیرات میں اتنا کثیر سرمایہ لگانے والے حضرات سے اگر کسی قومی ضرورت میں سرمایہ لگانے کی بات کی جائے تو ہزار بہانے اور مجبوریاں ایک ہی سانس میں گنادیتے ہیں لیکن یہی پیسہ جب فضول تعمیرات میں خرچ ہوتا ہے تو اس پر کوئی افسوس نہیں ہوتا، ان کی اس بے حسی پر انا للہ کے سوا اور کیا پڑھا جاسکتا ہے۔

سوچ بدلنے کی ضرورت

دراصل درج بالا کوتاہیاں اس وجہ سے پیدا ہوتی ہیں کہ ہم نے دنیوی زندگی اوراس کی شان وشوکت ہی کو اصل مقصد بنالیا ہے۔اور آخرت کی دائمی زندگی ہماری نظروں سے اوجھل ہوتی جارہی ہے پھر یہ کہ ہم اپنی محدود سوچ کے اعتبار سے ہر وقت صرف اپنا ہی فائدہ پیش نظر رکھتے ہیں اورقوم وملت کے مفادات پر گہرائی سے غور نہیں کرتے اس لئے ہمیں اپنی سوچ بدلنی لازم ہے ہمیں صرف اپنی ہی فکر نہ ہو بلکہ دوسروں کی بھی فکر ہو،اور ہماری منصوبہ بندی صرف یہاں تک کے لئے ہی نہ ہو بلکہ دائمی زندگی کی فلاح و بہبود بھی ہر وقت ہمارے پیش نظر رہے،ایک روایت میں وارد ہے کہ ’’سب سے اچھا شخص وہ ہے جو لوگوں کو سب سے زیادہ نفع پہنچانے والا ہو‘‘۔ (الجامع الصغیر مع فیض القدیر/۵۹۰) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ عقلمند شخص وہ ہے جو خود اپنا محاسبہ کرتا رہے (اپنی غلطیوں پر نظر رکھے) اور آخرت کو مدنظر رکھ کر کام کیا کرے۔ (ترمذی شریف۲/۷۲)

لہذا ضرورت ہے کہ ہمارے سرمایہ دار احباب زندگی اور فکر کی ڈگر کو تبدیل کریں،اورقومی وملی ضرورتوں کی تکمیل کیلئے خود آگے آئیں۔اور جس طرح ذوق وشوق، جذبہ اور لگن کے ساتھ اپنا کاروبار بڑھانے میں محنت کرتے ہیں اسی طرح دلچسپی کے ساتھ قومی اور دینی ترقی کے کاموں میں بھی حصہ لیں،اوراپنے سرمایہ سے امت کو فائدہ پہنچانے کا جذبہ پیدا کریں۔

چند اہم قومی وملی ضرورتیں

آج ہمارا ملک رفتہ رفتہ فرقہ پرستی کے شکنجہ میں کستا جارہا ہے۔گجرات کے اندوہناک مظالم نے دردمندان ملت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے،اور فسطائی طاقتوں کے ذریعہ برسرعام پورے ملک کو گجرات بنانے اور مسلمانوں کو گھروں سے نکال کر پناہ گزیں بنانے کی تیاریاں جاری ہیں۔ اس لئے عقل مندی کا مقتضی یہ ہے کہ ہم گجرات کے حالات کا گہرائی سے جائزہ لیکر مستقبل کے تحفظات کی ابھی سے فکر کریں۔ورنہ خدانخواستہ اگر گجرات کا ہولناک تجربہ دوسری جگہ دوہرایا گیا

تو ہم کسی بھی دفاعی پوزیشن میں نہ رہیں گے۔ گجرات وغیرہ کے حالات پر نظر ڈالنے سے آئندہ کے تحفظ کے لئے ہر بڑی مسلم آبادی والے شہر میں شدت کے ساتھ درج ذیل مسلم اداروں کا وجود ضروری معلوم ہوتا ہے:

(۱) اسپتال اور شفا خانے :

فسادات کے دوران زخمیوں، مریضوں اور حاملہ عورتوں کو اس لئے دشواری پیش آتی ہے کہ مسلمانوں کے اسپتال موجود نہیں ہیں اور غیر مسلم اسپتالوں میں مسلمان مریضوں کے ساتھ نہایت تعصب کا برتاؤ کیا جاتا ہے، کتنی جانیں تو صرف بروقت طبی امداد میسر نہ ہونے کی بنا پر تلف ہو جاتی ہیں، اگر بڑی تعداد میں مسلمان ڈاکٹر اور شفا خانے مہیا ہوں تو شاید یہ نوبت نہ آئے۔ آج آپ جائزہ لے کر دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ ہر شہر میں ایسے اداروں کی سخت ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ سرمایہ دار حضرات جگہ جگہ رفاہی ٹرسٹ قائم کریں اور ان کے تحت معیاری اسپتال قائم کرنے کی فکر کریں یہ اس وقت ملت اسلامیہ کی بڑی خدمت ہوگی۔

(۲) اسکول کالج اور ٹیکنکل تعلیم کے ادارے :

آج اعلیٰ دنیوی تعلیم کے لئے ہمیں قدم قدم پر دوسروں کی طرف دیکھنا پڑتا ہے مسلمانوں کے تعلیمی ادارے ویسے بھی ضرورت سے کم ہیں اور معیاری اداروں کا تو گویا کہ فقدان ہے جو اسکول اور کالج چل رہے ہیں وہ یا تو جمود اور آپسی گروہ بندیوں کا شکار ہیں یا پھر انھیں صرف تجارتی نقطۂ نظر سے چلایا جا رہا ہے اور بچوں کو باصلاحیت بنانے اور انھیں ترقی کی راہ پر چلانے کی جانب محنتیں نہیں کی جا رہی ہیں اس لئے قوم کے سربرآوردہ افراد کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ ملت کی عصری تعلیم کا بہترین اور معیاری بندوبست کریں۔ اور ہر شہر میں جائزہ لیں کہ اس بارے میں ہماری محنت کتنی ہے اور غیر قوموں کی فکر کتنی زیادہ ہے؟ شہر مرادآباد جو اپنے اطراف میں ایک بڑی مسلم آبادی والا شہر ہے اور یہاں کے مسلمان بھی ماشاء اللہ صاحب حیثیت ہیں یہ حضرات اگر چاہیں تو بڑے بڑے

ادارے قائم کرسکتے ہیں مگر اس کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں ہے، دوسری جانب غیر مسلموں کے ادارے روز بروز نہ صرف ترقی پذیر ہیں بلکہ نئے نئے قائم کئے جارہے ہیں چند ہی سالوں میں یہاں کئی انجینیرنگ کالج، ڈنٹل کالج اور آئی ٹی آئی سینٹر وغیر قائم ہوچکے ہیں جن میں سے کوئی بھی بڑا ادارہ مسلمانوں کا نہیں ہے، جس کا نتیجہ صاف ہے کہ مجبوراً ہمیں اپنے بچوں کی اعلی تعلیم کے لئے غیروں کی خوشامد کرنی پڑتی ہے اور سرمایہ جو خرچ ہوتا ہے وہ الگ رہا! اور اب صورت حال ایسی ہوتی جارہی ہے کہ غریب گھرانے کا بچہ اعلی تعلیم حاصل ہی نہیں کرسکتا ہے اس لئے کہ اپنے ادارے ندارد ہیں اور دوسری جگہ کے اخراجات کا تحمل نہیں کیا جاسکتا، لہذا ملت کے سرمایہ دار طبقہ کو اپنی توجہ زیادہ سے زیادہ تعلیمی اسباب فراہم کرنے کی طرف لگانی چاہئے تا کہ مستقبل کی ضرورتیں پوری ہوسکیں۔

اس معاملہ میں جنوبی ہند کے مسلمانوں میں کافی شعور پایا جاتا ہے وہاں ہر شہر میں تعلیمی اور رفاہی ٹرسٹ موجود ہیں جن کے تحت بڑے بڑے ادارے دسیوں سال سے کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں. اسی کا نتیجہ ہے کہ وہاں مسلمانوں کا تعلیمی اوسط شمالی ہندوستان سے کہیں زیادہ ہے ہمیں بھی اپنے اندر وہی شعور اور بیداری پیدا کرنی ہوگی ورنہ قومی تنزل سے ہمیں کوئی روک نہیں سکتا۔

(۳) ٹریننگ سینٹر :

آج کل کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کا دور ہے ہر جگہ کمپیوٹر آپریٹر کی قدر و قیمت ہے ان کے لئے جابجا ملازمتوں کے مواقع فراہم ہیں، اس لئے ہمارے سرمایہ دار حضرات اپنے اپنے شہروں میں کمپیوٹر کورسیز سکھانے کے ادارے قائم کریں اور مناسب فیس مقرر کرکے مسلمان بچوں کو کمپیوٹر کی تعلیم دینے کا انتظام کریں اس پروگرام میں بہت زیادہ سرمایہ بھی نہیں لگتا، اور نفع بھی زیادہ ہے، اسی طرح سرکاری ملازمتوں کے لئے جو امتحانات ہوتے رہتے ہیں ان کی تیاری کے سینٹر قائم کریں تا کہ بے روزگار تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ترقی کے مواقع حاصل ہوں۔

(۴) تعلیمی وظائف :

ہونہار اور ذہین طلبہ کو اعلیٰ تعلیم دلانے کے لئے وظائف کا انتظام کرنا بھی سرمایہ دار حضرات کی ذمہ داری ہے آج ملت کے کتنے باصلاحیت بچے صرف اسی وجہ سے ترقی سے محروم ہیں کہ ان کے پاس اعلیٰ تعلیم کے وسائل نہیں ہیں اس لئے ایسے ادارے ہونے چاہئیں جن میں صلاحیت کی بنیاد پر طلبہ کی مدد کی جائے اور امداد نہ ہوتو کم از کم قرض حسنہ کے طور پر ایسے افراد کو سرمایہ فراہم کیا جائے۔

(۵) معاشی ذرائع کی فراہمی :

سرمایہ دار حضرات کو بالخصوص ایسے ذرائع آمدنی مہیا کرنے پر توجہ دینی چاہئے جن سے معاشرہ کے غریب طبقہ کو زیادہ سے زیادہ معاشی فائدہ پہونچ سکے اس کے لئے چھوٹی صنعتیں قائم کی جائیں اور ان کا دائرہ گھر گھر پھیلا دیا جائے ۔ان صنعتوں میں اپنی آمدنی سے زیادہ غریب طبقہ کے فائدہ کو ملحوظ رکھا جائے۔ یہ بھی ایک بڑی قومی وملی خدمت ہے جسے اگر حسن نیت سے کیا جائے تو اس میں زبردست نفع ہوگا اور اس کی برکت محسوس طور پر سامنے آئیں گی ،انشاءاللہ تعالیٰ۔اسی طرح صحافت کے میدان میں سرمایہ کاری کی ضرورت ہے۔آج فضا بنانے اور میدان ہموار کرنے میں اخبارات کا بڑا دخل ہے۔اگر ہمارے پاس اپنا مؤثر اخبار ہوتو ہم اپنا دفاع اچھے انداز میں کرسکیں گے،اس لئے سرمایہ دار حضرات اس جانب بھی اپنی توجہ مبذول کریں اور مختلف شہروں سے مختلف زبانوں میں اخبارات جاری کرنے کے اسباب فراہم کریں، یہ بھی ایک عظیم ملی ضرورت ہے۔

ان ضرورتوں میں زکوٰۃ کا روپیہ نہ لگائیں

آج کل عام طور پر جب درج بالا قومی وملی اہم ضرورتوں کا تذکرہ سرمایہ دار حضرات کے سامنے کیا جاتا ہے تو ان کی اولا پوری کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان میں زکوٰۃ کا روپیہ کھپا کر دامن جھاڑ لیا

جائے تا کہ مطالبہ کرنے والوں کی بات بھی رہ جائے اور اپنے سر سے زکوٰۃ کا بوجھ بھی اتر جائے، تو ایسے حضرات اچھی طرح سمجھ لیں کہ زکوٰۃ تو صرف فقراء کا حق ہے جسے غریب مسلمانوں (جن میں قریبی اعزاء، مفلوک الحال پڑوسی اور مدارس دینیہ کے نادار طلبہ وغیرہ شامل ہیں) پر ہی خرچ کیا جاسکتا ہے، ان جگہوں کے علاوہ دیگر ضرورتیں ہمیشہ امدادی رقوم سے پوری کرنی چاہئیں، اور زکوٰۃ اصل مستحقین تک پہونچانے کی فکر کرنی چاہیے، ورنہ آخرت میں باز پرس سے بچاؤ نہ ہوسکے گا۔

الغرض خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہمارے سرمایہ دار بھائی اللہ کی نعمت کی قدردانی کریں، حلال آمدنی حاصل کرکے حلال جگہوں پر خرچ کرنے کی عادت ڈالیں، اور اپنی منصبی اور قومی ذمہ داریوں سے پہلوتہی نہ برتیں، اور اپنی زندگی ہی میں ایسا انتظام کرکے جائیں کہ ان کے سرمایہ سے ملت تادیر فائدہ اٹھاتی رہے یہی صدقات جاریہ آخرت میں ان کے لئے سب سے زیادہ نفع بخش ثابت ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اصلاح حال کی فکر عطا فرمائے اور مرتے دم تک اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق سے نوازے۔ آمین۔

(ندائے شاہی، اگست، ستمبر ۲۰۰۲ء)

اپنے نونہالوں کو
آگ سے بچایئے!

اولاد بیمار ہوجائے! والدین پریشان ہوجاتے ہیں۔ بچہ کے جسم پر چوٹ لگ جائے! ماں باپ بے چین ہوجاتے ہیں۔ لخت جگر دنیوی آگ کے انگارے کو ہاتھ سے اٹھالے یا چولھے میں گر کر بھسم ہوجائے! تو والدین کی راتوں کی نیند حرام ہوجاتی ہے۔

کیوں؟ اس لئے کہ کوئی بڑے سے بڑا سنگدل بھی اپنی اولاد کو آگ کا ایندھن بنتے نہیں دیکھ سکتا۔ اپنے جگر گوشہ کو آگ سے محفوظ رکھنے کیلئے ماں باپ بڑی سے بڑی قربانی دینے سے دریغ نہیں کرتے۔ دنیا کے ہر معاشرہ میں جھانک کر اس فطری حقیقت کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ مگر آگ صرف یہی نہیں جو ہمیں دنیا میں دکھائی دیتی ہے۔ بلکہ ایک اور بھی آگ ہے جس کی ہیبت نا کی کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس میں ایندھن کے طور پر لکڑیاں نہیں جلتیں بلکہ انسانوں کے گوشت پوست اور پتھر اس میں ایندھن کی جگہ استعمال ہوتے ہیں۔ (سورۃ بقرہ ۲۴، سورہ تحریم ۶)

اس آگ کی گرمی اور جھلسا دینے کی صلاحیت دنیا کی آگ سے انہتر گنا بڑھی ہوئی ہے۔ (بخاری/۴۶۲) وہ آگ ایسی ہے جسے پہلے ایک ہزار سال تک دہکایا گیا جس سے وہ سرخ ہوگئی پھر ایک ہزار سال دہکایا گیا تو سفید ہوگئی۔ اور پھر تیسری مرتبہ ایک ہزار سال تک دہکایا گیا جس سے وہ سخت سیاہ ہوگئی ہے۔ (ترمذی ۲/۸۶) یہ جہنم کی آگ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ فرمائے آمین، اگر ہم واقعی اپنی اولاد سے اور گھر والوں سے محبت رکھتے ہیں تو جس طرح ہم انھیں دنیا کی معمولی آگ سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں اس سے کہیں زیادہ ان کی جہنم سے حفاظت کی فکر کرنی چاہیے اسی طرف قرآن کریم نے ایمان والوں کو توجہ دلائی ہے کہ "اے ایمان والو! تم اپنے کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں، جس پر تند خو اور مضبوط فرشتے متعین ہیں، جو خدا کی نافرمانی نہیں کرتے کسی بات میں جوان کو حکم دیتا ہے، اور جو کچھ ان کو حکم دیا جاتا ہے اس کو بجالاتے ہیں"۔ (تحریم ۶)

شناخت کی حفاظت

سر پر انگریزی بال، گلے میں ٹائی، ٹانگیں رانوں تک لباس سے بے نیاز، کتابوں کا بوجھ ''ادب کے ساتھ'' پیٹھ پر لادے ہوئے؛ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی عیسائی گھرانے کا فرد ہے۔ جبھی تو مشن اسکول جاتے وقت اپنی ممی اور ڈیڈی کو سلام نہیں بلکہ ''ٹاٹا'' کہتا ہے۔ سبحان اللہ اور الحمد للہ کے بجائے ''گڈ مارننگ'' اور ''گڈ ایوننگ'' کا تلفظ کرتا ہے۔ ہائے اللہ کے بجائے ''مائی گاڈ'' کہتا ہے۔ پیشاب کرتا ہے تو کھڑے ہوکر، پانی پیتا ہے تو بائیں ہاتھ سے، اور کھاتا ہے تو ننگے سر! نہیں، نہیں! یہ بچّہ عیسائی نہیں بلکہ ''مسلم معاشرہ'' کا ایک فردِ فرید ہے۔ کیوں اس لئے کہ اس کے والدین مسلمان ہیں۔ اچھا! تو یہ کیسے مسلمان ہیں؟ جنہیں دیکھ کر شرمائیں یہود و ہنود۔ کیا انھیں معلوم نہیں کہ وہ اپنی اولاد کو یوروپی تہذیب میں رنگین کر کے انہیں جہنم کا کندا بنا رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ انھیں اپنے بچوں سے ذرا بھی محبت نہیں۔ ان کی تکلیف بلکہ عظیم اور دردناک تکلیف کا کچھ بھی احساس نہیں، بچہ تو بے عقل اور اپنے نفع و نقصان سے بے خبر ہے۔ مگر ان مسلمان والدین کو کیا ہوا جو قرآن و حدیث پر ایمان کے دعوے کے باوجود بچہ کو جہنم سے بچانے کی فکر نہیں کرتے؟ کیا قرآنی آیتیں اور خدائی ہدایتیں ان کے دینی جذبات میں تلاطم کا سبب نہیں بنتیں؟ کیا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات ان کے دلوں میں جاگزیں نہیں ہوئیں؟ آخر یہ بے پرواہی کیوں؟۔ اور بچہ کے ساتھ یہ ظلم و ناانصافی کب تک؟۔

یاد رکھنا چاہئے کہ بچوں پر اسلامی رنگ کے علاوہ دوسری تہذیب کا رنگ چڑھانے کی سراسر ذمہ داری والدین پر ہوگی۔ اور جب قیامت کے روز اس کے متعلق سوال ہوگا، تو سوائے کف افسوس ملنے کے چارۂ کار نہ ہوگا۔ اولاد کو انگریزی پڑھایئے، انجینئر، اور ڈاکٹر بنایئے یا پائلٹ بنا کر ملک کا نام روشن کیجئے، الغرض دنیا کی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلایئے یہ وقت کی ضرورت ہے۔ مگر یہ تعلیم مذہبی شناخت کے ساتھ ہونی چاہئے۔ مسلمانوں کا تشخص اور شعار قائم رہنا چاہئے، اگر تشخص کی حفاظت کے بغیر تعلیم دلائی جائے گی تو وہ رحمت نہیں بلکہ بھیانک زحمت بن جائے گی۔ جائے عبرت ہے کہ آج تمام تر تعلیمی ترقیوں کے باوجود سکھ قوم اپنی مذہبی شناختوں کو سینہ سے لگائے

ہوئے ہے جس کے نتیجہ میں صدارت اعظمیٰ سے لیکر ادنیٰ سے ادنیٰ مناصب پر اس کے افراد ممتاز نظر آتے ہیں۔ اور ہر جگہ سر اٹھا کر چلتے ہیں۔ جب کہ مسلمان زبردست مرعوبیت اور احساس کمتری کا شکار ہو گئے ہیں۔ یہ دراصل بچپن کی ذہنی مرعوبیت اور اسلامی تشخص سے نا آشنائی کی دین ہے اگر اسلام کی سربلندی اور تعلیمات اسلامیہ کی عظمت ہمارے دلوں میں جاگزیں ہو تو مرعوبیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔

یہ غلاظت!

اف! یہ تعفن، نالیوں کا گندہ غلیظ پانی، نجاستوں کا جا بجا ڈھیر اور کوڑے کرکٹ کا انبار۔ اسی ماحول میں کچھ بچے قید لباس سے آزاد، اور آنے جانے والوں کی حقارت آمیز نظروں سے مطلقاً بے نیاز، نالیوں کی کیچڑ سے کھیلنے میں مست ہیں۔ اس کھیل کی زد میں صرف کھیلنے والے بچے ہی نہیں آتے، بلکہ راہ گیروں کو بھی وہاں سے دامن بچا کر گذرنا پڑتا ہے کہ مبادا کسی ''مہذب بچے'' کی نجاستوں میں لت پت گیندا سے ناپاک نہ کر دے۔ بچوں کی تہذیب کا یہ ''اعلیٰ معیار''، آج ہمارے شہروں کے مسلم محلوں کا طرۂ امتیاز بن گیا ہے۔ یہ بچے جو گندگیوں اور غلاظتوں میں پل کر جوان ہوتے ہیں ان کی طبعیتیں بھی غلیظ اور گندی ہو جاتی ہیں اور بالآخر یہ گندگیاں انھیں جہنم کا ایندھن بنا دیتی ہیں۔ ظاہر کا اثر باطن پر پڑنا لازمی ہے اور تجربہ شاہد ہے کہ ظاہری ناپاکی کا زہر اندر تک ضرور پھیلتا ہے۔ جو والدین اپنے معصوم بچوں اور لاڈلوں کو ظاہری ناپاکی سے بچانے کی کوشش نہیں کرتے، انجام کار ان کی اولاد باطنی اور اندرونی گندگیوں اور بری خصلتوں میں مبتلا ہو کر خود اپنے والدین کی زندگی اجیرن کر دیتی ہے۔

افسوس! وہ اسلام جس نے پاک رہنے والوں اور پاکی کا اہتمام کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی محبت کا مژدہ سنایا۔ (ترمذی شریف ۲/۱۰۷) اور جس نے طہارت کو نصف ایمان قرار دیا۔ (مشکوٰۃ ۱/۲۹) اسی اسلام کے ماننے والے دوسری قوموں کی دیکھا دیکھی ناپاکی کے راستے پر گامزن ہیں۔ گھر میں پاکی و ناپاکی کا کوئی اہتمام نہیں، بچوں کی طہارت کی فکر نہیں۔ اور صفائی ستھرائی کا وہ شرعی معیار

برقرار نہیں جو شریعت میں مطلوب ہے۔ محض ظاہری طور پر جھاڑو دیدینا اور ڈرائنگ روم سجا لینا نفاست پسندی نہیں بلکہ طہارت کے بارے میں فقہ اسلامی کے ضابطوں اور ہدایتوں پر عمل کرنا در اصل نفاست ہے۔ اس کا ہمیں خود بھی اہتمام کرنا ہے اور اپنے بچوں کو بھی اس کا عادی بنانا ہے۔ تاکہ ہم ان کے ساتھ سچی محبت کا ثبوت دیتے ہوئے انہیں جہنم کا ایندھن بننے سے محفوظ رکھ سکیں۔

بدزبانی

یہ بچہ سڑک پر جا رہا ہے اسے ذرا چھیڑ کر تو دیکھئے۔ آپ کو ایک ہی سانس میں ایسی مغلظات سنائے گا کہ آپ کے ہاتھ کے طوطے اڑ جائیں گے۔ اگر گالیوں کا مقابلہ ہونے لگے تو شاید ملکی سطح پر یہ بچہ اپنے فن کا ایسا شاندار مظاہرہ کریگا کہ ریفری بھی اس کے حق میں ''فرسٹ پوزیشن'' کا فیصلہ کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اس کے والدین تو ہو سکتا ہے کہ اپنے بچے کی اس عظیم کامیابی پر خوشی سے پھولے نہ سمائیں لیکن ہمارا کلیجہ اسے دیکھ دیکھ کر پھٹا جا رہا ہے۔ اس لئے کہ یہ بچہ اپنی ''گالم گفتاری'' کے ذریعہ نہ صرف اپنے کو جہنم کی دہکتی آگ کا ایندھن بنا رہا ہے بلکہ اپنی دنیا بھی برباد کر رہا ہے۔ کل جب یہ گالیوں کا عادی بن کر پروان چڑھے گا تو معاشرہ میں اس کی عزت خاک میں ملی ہوگی۔ شریف آدمی اس سے منہ لگنا بھی گوارا نہیں کریں گے۔ اور باعزت گھرانے والے اس سے بات کرتے بھی کترائیں گے ابھی تو یہ بچہ ہے اسے اچھے برے کا احساس نہیں، مگر اس کے خیر خواہ والدین کو کیا ہو گیا وہ کیوں اسے گالیوں کا عادی بنتا دیکھ کر خاموش ہیں؟ یا تو انھیں اس برائی کا احساس نہیں یا پھر انھوں نے اپنے پیاروں کی عاقبت کی خرابی سے آنکھیں موند رکھی ہیں۔

ابتداء ہی سے ضروری ہے کہ بچوں کی تربیت میں ان کی زبان کی سنجیدگی کا خاص طور پر لحاظ رکھا جائے۔ ورنہ یہ زبان کی بدعملی انھیں جہنم کا ایندھن بنا دیگی۔ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ لوگوں کو ان کی زبان کی بری باتیں جہنم میں اوندھے منہ دھکیل دیں گی۔ (مشکوٰۃ شریف ۱۴/۱)

بدکاروں سے محبت

آپ مسلم محلّہ میں جائیں اور کسی مسلمان ''باشعور'' بچے سے پوچھئے ''بیٹا! بتاؤ فلاں مشہور فلم کے ہیرو اور ہیروئن کے کیا نام ہیں''؟ وہ اس سوال سے بڑا خوش ہوگا اور فر فر سارے ہیروں کے نام گنوادے گا اور آپ کی خواہش ہو تو پوری دل چسپی سے اس فلم کی مکمل ''اسٹوری'' بھی کھڑے کھڑے سنادے گا۔ اس کے برخلاف اگر آپ نے کسی بچے سے پوچھ لیا۔ بیٹا کیا تمہیں معلوم ہے ہمارے حضور ﷺ کی کتنی صاحبزادیاں اور کتنے صاحبزادے تھے؟ یا ایسا ہی کوئی معمولی سا سوال آپ اس سے کردیں تو مجھے یقین ہے کہ موجودہ مسلم معاشرہ کے ساڑھے ننانوے فیصد بچے ان معمولی اور ضروری مذہبی معلومات کا جواب دینے سے عاجز نظر آئیں گے۔ اور عاجز کیوں نہ ہوں؟ جب وہ آنکھ کھول کر ٹی وی کے پردے پر تھرکتی ہوئی تصویریں اور فلموں کے مناظر دیکھتے ہیں تو انھیں ان ہیروئنوں اور ہیروؤں سے محبت نہ ہوگی تو اور کس سے ہوگی؟ اور جب ان معصوموں کے سامنے گھر کے بڑے چھوٹے ہر وقت ''کلاکاروں'' کا ہی ذکر خیر کریں گے تو انھیں ''کلاکاروں'' کے علاوہ آشنائی ہوگی تو کس سے؟ اور اس آشنائی پر والدین بھی داد دیں گے کہ واہ! ہمارا بچہ بڑا ذہین ہے۔ دیکھئے اتنی سی عمر میں اسے پورے فلم کی کہانی یاد ہوگئی۔ بار بار اس سے سنیں گے، کوئی مہمان آئے گا تو اسے بھی سنوا کر نہال ہوجائیں گے۔ مگر یہ سب بے حسی کی باتیں ہیں، یہ والدین بڑے ظالم ہیں، انھوں نے اولاد سے محبت کا جھوٹا دعویٰ کیا اس لئے کہ وہ بچوں کا فلموں کا عادی اور کلاکاروں کا عاشق بنا کر انھیں جہنم کی آگ تک لے جانے والے راستے پر دھکیل رہے ہیں۔ یہ فلموں میں کام کرنیوالے مرد وعورت دنیا کے سب بدترین لوگ ہیں۔ اور آخرت میں سب سے زیادہ عذاب کے مستحق ہیں۔ یہ بدنصیب خود بھی بدکار ہیں اور دوسروں کو بھی بدکار بنانے والے ہیں، یہ لوگ فحاشی اور عریانیت کا سرچشمہ ہیں، یہ شیطانیت کے مبلغ اعظم اور بے حیائی اور بے غیرتی کی فروغ کے لئے طاغوتی طاقتوں کے کامیاب ایجنٹ ہیں۔ ان سے محبت رکھنا، ان کا نام لینا، ان سے تعلق کا دم بھرنا، سب گناہ ہے، اور اللہ کے غضب کو دعوت دینے کے مرادف ہے۔ والدین اگر صحیح معنی میں اولاد کے خیر خواہ ہیں تو انھیں کوشش کرنی ہوگی کہ ہمارے لخت جگر کی زبان ان بدکاروں کے ناموں اور تذکروں سے آلودہ نہ ہو، بلکہ اللہ

اور اس کے رسول ﷺ، قرآن و حدیث، اور دین کی پاکیزہ باتیں معصوموں کے دلوں پر نقش کے جائیں۔ اور انھیں کا زبان سے اظہار کرایا جائے، اسی وجہ سے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب بچہ بولنے کے قابل ہو تو سب سے پہلے کلمہ طیبہ اور آیات قرآنی پڑھنا سکھانا چاہئے۔ جو والدین اس بارے میں کوتاہی کرتے ہیں وہ سمجھ لیں کہ اولاد کے بارے میں ان سے بڑا بےحس کوئی نہیں ہوسکتا۔ یہ اولاد کے ساتھ احسان نہیں بلکہ ان کے ساتھ بڑا ظلم ہے جس کا اندازہ آخرت میں جا کر ہوگا۔

بیکاری کی نحوست

پان کی دوکانوں پر، چائے کے سدابہار ہوٹلوں پر، اور گلیوں اور شاہراہوں کے نکڑوں پر، یہ ہم عمروں کی بھیڑ کیسی؟ جو ہنسی مذاق میں مشغول اور ادھر ادھر گنہ گار نگاہیں ڈالنے میں مصروف ہے۔ جائیے قریب جا کر معلوم کر لیجئے؟ ہر ایک اپنی شناخت ''اسلامی نام'' سے بتا دے گا۔ لیکن یہ مفت میں یہاں کھڑے ہو کر گناہ لوٹنے میں کیوں دلچسپی لے رہے ہیں؟ کیا انھیں کوئی روک ٹوک کرنیوالا نہیں ہے؟ ہاں! مگر روکے ٹوکے کون؟ اگر غیر روکے گا تو اس کی عزت کی خیر نہیں اور والدین کو اپنے پیاروں کی بیکاری اور مٹر گشتی پر فکر ہوتی تو رونا ہی کس بات کا تھا؟ معاشرہ میں بےکاری کا رجحان اس کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔ بیکاری ہزار خرابیوں کے پروان چڑھنے کا سبب بنتی ہے۔ بیکاری سے برائیوں کے چونچلے کھلتے ہیں۔ والدین کو چاہئے کہ بچوں کو شروع سے ہی کسی نہ کسی کام میں لگائے رکھیں اور انھیں ہرگز خالی نہ رہنے دیں ورنہ یہ بیکاری کی عادت انھیں جہنم کے راستے پر لگا دے گی۔ اس لئے والدین کی شرعی ذمہ داری ہے کہ اپنے جگر کے ٹکڑوں کو ایسی خصلتوں میں نہ پڑنے دیں جن سے ان کی دنیا و آخرت کا نقصان ہو۔ اس مقصد کے لئے انھیں بیکاری سے حتی الامکان بچانا لازمی ہے۔ آدمی مصروف رہے تو بےشمار برائیوں سے خود بخود بچا رہتا ہے۔ غیر قوموں میں اس کا خاص اہتمام ہے کہ وہ اپنے بچوں کو ابتداء ہی سے تعلیم کے ساتھ ساتھ فارغ اوقات میں اپنے کاروبار میں ساتھ لگانے کا اہتمام کرتے ہیں۔ مگر مسلمان معاشرہ میں اولاً تعلیم ہی ضرورت سے کم ہے اور تعلیم ہے بھی تو اس کے ساتھ بیکاری اور بری صحبت جیسی خرابیاں بھی ساتھ میں لگی ہوئی ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس سلسلہ میں قومی بیداری پیدا کی جائے اور والدین کو آگاہ کیا جائے کہ وہ اپنی اولاد کو بیکاری کے عیب سے بچائیں۔ ورنہ اولاد جہنم کا ایندھن بن جائے گی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بری عادتوں سے بچوں کو بچانے کا کس قدر خیال تھا اس کا اندازہ آپ اس سے لگائیں کہ آپ نے ہدایت دی ہے کہ جب بچہ بڑا ہو جائے تو اس کا بستر الگ کر دو۔ اور ہم عمروں کو ایک جگہ نہ لیٹنے دو۔ وغیرہ وغیرہ۔ (مشکوٰۃ شریف ۱/۵۸) اسی طرح جب وہ جوان ہوں تو ان کی شادیوں کی فکر کرو۔ (مشکوٰۃ شریف ۲/۲۷۱) اس لئے کہ شادی کے قابل ہونے کے بعد زیادہ تاخیر معاشرہ کے مزاج کو بگاڑ دیتی ہے اور ایسا معاشرہ جن میں بڑی عمر کے کنواروں کی کثرت ہو، کبھی بھی پاکیزہ نہیں رہ سکتا۔ اگر ہمیں اپنے آپ کو ذلت و رسوائی سے اور بچوں کو جہنم سے بچانا ہے تو ہمیں صحیح معنٰی میں انھیں بری صحبت سے اسی طرح بچانے کا اہتمام کرنا ہوگا جیسے ہم کسی دشمن سے اسے بچانے کی فکر کرتے ہیں۔ یہ بری صحبتیں بچوں کے مستقبل کو داغدار بنانے والی ہیں اور ان کی عاقبت کو خراب کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں۔ جو والدین ان کا خیال نہیں رکھیں گے۔ انہیں یقیناً خون کے آنسو رونا پڑے گا۔ اور وہ ایسی بری صحبت میں رہنے والے بچوں سے اپنے لئے جس بھلائی کی بھی توقع کریں وہ ہرگز پوری نہیں ہو سکے گی۔ بچوں کو نیک صحبت کا عادی بنانا چاہئے، اللہ والوں کا تعلق اور احترام اپنے دل میں پیدا کرنا چاہئے اور دینی مجلسوں میں بچوں کو اہتمام کے ساتھ شریک کرنا چاہئے۔ اس سے طبیعت پر بہت مفید اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

تربیت کیسے؟

حاصل یہ کہ صالح معاشرہ کی تشکیل کے لئے ماں کی گود تربیت کا اولین مقام ہے جس کے اثرات عمر بھر انسان میں پائے جاتے ہیں۔ پھر کچھ شعور آ جانے کے بعد گھر کے اندر اور باہر باپ کی نگہداشت کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ اسلام بچوں کی تربیت اور نگہداشت کے سلسلہ میں جن پاکیزہ طریقوں کی ہدایت دیتا ہے ان کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

(۱) جب بچہ پیدا ہو تو اس کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہی جائے تاکہ وہ بعد میں شیطانی اثرات سے محفوظ رہے۔

(۲) پیدائش کے بعد کسی صاحبِ خیر اور نیک شخص سے تحنیک کرائیں یعنی کھجور یا کوئی میٹھی چیز ان سے چبوا کر بچے کو دیں، یہ بھی برکت کا ذریعہ ہے۔

(۳) ساتویں دن عقیقہ کیا جائے اور سر کے بال مونڈ کر اس کے بقدر چاندی صدقہ کریں۔
(۴) اچھا اور بابرکت نام رکھا جائے تاکہ وہ نیک فال ہو۔
(۵) جب وہ بولنے کے قابل ہو تو اسے سب سے پہلے کلمہ لا الٰہ الا اللہ سکھائیں۔
(۶) عقل وشعور پوری طرح آنے سے پہلے ہی سے بچوں کے دلوں میں حلال وحرام کی تمیز اور جہنم سے ڈرنے کا جذبہ پیدا کیا جائے اور شیطانی کاموں کی نفرت دل میں بٹھادی جائے اور اللہ تعالیٰ کا خوف دل میں جاگزیں کردیا جائے۔
(۷) دنیوی جھوٹے اور واہیات قصوں کہانیوں کے بجائے بچوں کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات، صحابہؓ اور اہل بیت کی عظمت کی داستانیں اور قرآن کریم میں آمدہ اصلاحی قصے بار بار سنائے جاتے رہیں۔ تاکہ وہ شروع سے ہی ان دینی چیزوں سے آشنا رہیں۔
(۸) جھوٹ، غیبت، گالی وغیرہ اخلاقی برائیوں پر بچوں کی سرزنش کرتے رہیں۔
(۹) جب بچہ سات سال کا ہو جائے اور نماز سکھادیں گے اور تو اسے گاہے بگاہے نماز کو لیجایا کریں۔
(۱۰) جب دس سال کا ہو جائے اور نماز نہ پڑھے تو سرزنش کر کے نماز پڑھوائیں۔
(۱۱) شعور آنے کے بعد بچے کا بستر الگ کردیں۔
(۱۲) بلوغ کے قریب ۱۳/۱۴ر سال کی عمر میں خاص نگرانی کریں کہ بچوں اور بچیوں میں جنسی جذبات بھڑکانے والی چیزیں نہ پیدا ہوسکیں۔
(۱۳) اس عمر میں لڑکوں اور لڑکیوں کا اختلاط نہ ہونے دیں۔
(۱۴) بالغ ہونے کے بعد جلد شادی کردیں۔
(۱۵) ضروری دینی تعلیم اور قرآن کریم سکھانے میں ہرگز کوتاہی نہ کریں۔
(۱۶) دنیوی علوم بھی ضرورت کے مطابق سکھائیں مگر دین سے بے بہرہ نہ رکھیں اور تشخص سے بیگانہ نہ ہونے دیں۔
(۱۷) بیکاری سے ہر ممکن اجتناب کریں۔
(۱۸) برے ساتھیوں کی صحبت سے ہر طرح بچائیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل خیر کی توفیق عطا فرمائے اور بچوں کی صحیح تربیت کی توفیق سے نوازے۔ آمین

بے حیائی پرنکیر

دینی غیرت کا فقدان

موجودہ دور میں ہمارا معاشرہ ایک تشویشناک روحانی بیماری میں مبتلا ہوتا جارہا ہے۔ بیماری یہ ہے کہ اب گھر کے بڑے بوڑھے ذمہ دار لوگ بھی گھر والوں اور گھر والیوں کی بے حیائیوں اور معصیت پر ناگواری کا اظہار نہیں کرتے۔ گھروں کا ماحول بگڑنے میں اس ''غیرت کے فقدان'' کا بڑا دخل ہے۔ کیونکہ گھر کے ذمہ دار کی گرفت کا خوف ایسی چیز ہے جو گھر والوں کو بہت سی بے راہ رویوں سے روک سکتی ہے۔ اور یہ گرفت موقوف ہے غیرت پر، لیکن جب خود آدمی بے غیرت ہوجائے تو پھر گرفت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو غیرتمند بننے کی تلقین فرمائی ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں ارشاد ہے۔ اَلْغَيْرَةُ مِنَ الْاِيْمَانِ (غیرت ایمان کا جز ہے) اور ساتھ میں بے غیرتی پر سخت ترین الفاظ میں نکیر فرمائی ہے۔ ایک حدیث کا ٹکڑا ہے۔ اَلْمِذَاءُ مِنَ النِّفَاقِ (اور اجنبی مرد وعورت کا بے حجابی کے ساتھ گفتگو کرنا نفاق کا جز ہے) اور ایک حدیث میں ارشاد ہے۔

ثَلٰثَةٌ لَايَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ اَبَداً، اَلدَّيُّوْثُ مِنَ الرِّجَالِ، وَالرَّجِلَةُ مِنَ النِّسَاءِ وَ مُدْمِنُ الْخَمْرِ.

تین آدمی کبھی جنت میں نہ جائیں گے۔ (۱) دیوث مرد، (۲) مردوں کی ریس کرنے والی عورتیں اور (۳) شراب کا عادی شخص۔

حضرات صحابہؓ نے عرض کیا کہ شراب کے عادی کو تو ہم نے پہچان لیا مگر یہ دیوث کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دیوث وہ ہے جو اپنے گھر والوں (بیوی، بیٹی وغیرہ) کے پاس

اجنبی لوگوں کی آمد ورفت کو اہمیت نہیں دیتا'' حضرات صحابہؓ نے عرض کیا کہ یہ مردوں جیسی عورتیں کون سی ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : ''یہ وہ عورتیں ہیں جو مردوں سے مشابہت اختیار کرتی ہیں''۔(یعنی بال، لباس وغیرہ مردوں جیسا پہنتی ہیں۔جیسا کہ آج کل عام فیشن ہو چکا ہے۔ **نعوذ باللہ منہٗ**) (البیہقی فی شعب الایمان ۷/۴۱۲)

ان ہدایات اور وعیدوں کی روشنی میں ہمیں معاشرہ کو غیرت مند بنانے کی ضرورت ہے۔اگر صحیح معنی میں دینی غیرت وحمیت ہمارے اندر پیدا ہو جائے تو بے حیائی اور بے پردگی کے سیلاب پر بند لگایا جاسکتا ہے۔امام بیہقی (م ۴۵۸ء) نے اس ضمن میں ایک بڑا نصیحت آموز واقعہ لکھا جو ہماری غیرت کو مہمیز لگانے کے لئے کافی ہے۔موصوف اپنی سند سے موسیٰ بن اسحاق قاضی کے زمانہ کا ایک واقعہ نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ان کی عدالت میں ایک برقعہ پوش عورت نے اپنے شوہر پر ۵۰۰ ،اشرفی مہر کا دعویٰ دائر کیا۔شوہر مہر کی اس مقدار کا منکر تھا۔تو عورت کے وکیل نے اپنے دعویٰ کے ثبوت پر گواہ پیش کئے۔گواہ میں سے ایک شخص نے مطالبہ کیا کہ میں عورت کا چہرہ دیکھ کر گواہی دوں گا چنانچہ گواہ چہرہ دیکھنے کے لئے اور عورت چہرہ دِکھانے کے لئے کھڑی ہوگئی۔یہ دیکھ کر شوہر کی غیرت کو جوش آ گیا اور اس نے کہا کہ ''آخر کس وجہ سے میری بیوی پر اجنبی مرد کی نظر ڈالی جارہی ہے؟ اب میں قاضی کے سامنے خود گواہی دیتا ہوں کہ میرے اوپر اس عورت کے ۵۰۰ دینار خالص سونے کے واجب ہیں۔مگر میری بیوی اپنا چہرہ ہرگز نہ دکھائے۔''یعنی یا تو اب تک منکر تھا کہ عورت عدالت میں دعویٰ پر مجبور ہوئی۔لیکن جب غیر مرد کی نظر پڑنے کا سوال آیا تو غیرت ایمانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پورا مطالبہ فوراً منظور کرلیا۔اس کی اس غیرت وحمیت کا عورت پر اتنا اثر ہوا کہ اس نے اسی وقت وہ سارا مہر معاف کردیا۔یہ عجیب قصّہ دیکھ کر قاضی صاحب نے حکم دیا کہ اس واقعہ کو حسن اخلاق کے یادگار واقعات میں درج کیا جائے۔(شعب الایمان للبیہقی ۷/۴۱۳)

اس واقعہ کو سامنے رکھ کر ہم غور کریں کہ آج ہمارے معاشرہ کا کیا حال ہے؟ ہماری ہی گھر کی عورتیں پورے میک اپ اور زیب وزینت کے ساتھ بے پردہ بازاروں میں گھومتی ہیں، اسکول

جاتی ہیں، ملازمت پر جاتی ہیں، گھروں میں نامحرم مردوں کے ساتھ ہنسی اور مذاق کرتی ہیں اور ہم اپنی آنکھوں سے یہ سب مناظر دیکھ کر نظر انداز کر جاتے ہیں، گویا کوئی بات ہی نہ ہو۔ احادیث میں اس بے غیرتی کو ''دیوثت'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جو ایک مومن کے لئے بڑی عار اور ذلت کی بات ہے اللہ تعالیٰ ہماری اصلاح فرمائے۔ اور ہمیں صحیح سمجھ عطا فرمائے اور ہمیں دنیا اور آخرت کی ذلتوں سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

(ندائے شاہی، جون ۱۹۹۸ء)

پردہ کیوں؟

زمانہ جوں جوں آگے بڑھ رہا ہے اور نئی تہذیب کے رسم ورواج جیسے جیسے ہمارے اندر رواج پا رہے ہیں، نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد صد فیصد اپنی حقانیت ثابت کرتا جا رہا ہے کہ:

مَا تَرَكْتُ فِتْنَةً بَعْدِيْ اَضَرَّ عَلَى الرِّجَالِ مِنَ النِّسَاءِ. (شعب الایمان ۴/۱۳۶)

میں نے اپنے بعد مردوں کے لئے عورتوں سے زیادہ کوئی اور فتنہ نقصان دہ نہیں چھوڑا۔

عورتوں کی آزادی اور مساوات کے بظاہر خوشنما عنوان سے بے حیائی فحاشی اور عریانیت کا جو وحشیانہ مظاہرہ آج ہماری تہذیب و ثقافت کا جز بن چکا ہے۔ وہ اس عظیم فتنہ کی فتنہ سامانی بیان کرنے کے لئے کافی ہے۔ بازاروں سے لے کر عبادت گاہوں تک، کالجوں سے لے کر گھر کی چہار دیواریوں تک، دفاتر سے لے کر تفریح گاہوں تک حتی کہ سفر میں حضر میں، اجتماعی زندگی میں، انفرادی رہن سہن میں، چھوٹوں کی مجلسوں میں، بڑوں کی محفلوں میں، الغرض ہر جگہ مرد وعورت کے اختلاط اور میل جول نے فضاؤں کو متعفن اور بدبودار اور معاشرہ کو گندا اور داغدار بنا رکھا ہے۔

خود غرض نئے معاشرہ کی نظر میں عورت کی جنس صرف اغراض فاسدہ کی تکمیل اور تجارتی سامانوں کی تشہیر کا ذریعہ ہے۔ وہ ہر جگہ عورت کو اسی نظر سے دیکھتا ہے ایسے لباس ایجاد کئے جاتے ہیں جو ستر پوشی نہیں ستر فاشی کرتے ہیں۔ ایسے اسبابِ زینت مہیا کرائے جاتے ہیں جو زینت نہیں زحمت بلکہ فطری بناوٹ کو بدلنے کا ذریعہ ہیں۔ پھر تجارتی اشتہارات، اخبارات کے کالموں، تھیٹروں اور سینما ہالوں میں عورت کی جو درگت بنتی ہے اور جس طرح صنف نازک کا استحصال کیا جاتا ہے وہ اس مذموم معاشرہ کی ہوس پرستی اور خود غرضی کی کھلی ہوئی نشانی ہے اور طرہ یہ ہے کہ اس

معاشرہ کی عورتیں بھی اپنے استحصال کو حقیقی آزادی اور مذہبی روک ٹوک کو قید و بند سمجھتی ہیں۔لعنت ہے ایسی آزادی پر جو عزت کو پامال کردے۔تف ہے ایسی مساوات پر جو حقیقی ذمہ داریوں سے غافل کردے اور ہزار بار پناہ ہے ایسی خود غرضی سے جس کی بنا پر انسان اپنے مقصد تخلیق کو بھلا بیٹھے۔

اسلام نے فحاشی اور بدکاری کو روکنے کے لئے اپنے ماننے والوں کو واضح احکامات دیئے ہیں جو اس کے دین فطرت ہونے کے پوری طرح لائق اور صنف نازک کی طبیعت کے عین مطابق ہیں۔دین اور شریعت کی نظر میں اس سلسلہ کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ ''زنا کاری معاشرہ کا بدترین اور گھناؤنا جرم ہے'' ارشادِ خداوندی ہے۔

لاَ تَقْرَبُوْا الزِّنَا اِنَّه‘ کَانَ فَاحِشَةً . (بنی اسرائیل آیت ۳۲)

زنا کے قریب مت جاؤ وہ بے حیائی ہے۔

پھر اسلام اس جرم کو روکنے کے لئے صرف زبانی جمع خرچ ہی نہیں کرتا بلکہ عملی طور پر بھی اسلام کا قانون ''انسداد بدکاری'' نہایت مکمل،مؤثر اور بے لچک ہے۔مثلاً:

(الف) اسلام نے زنا کی سزا (شادی شدہ کے لئے سنگساری اور غیر شادی شدہ کے لئے سو کوڑے) اتنی عبرتناک مقرر کی ہے کہ اس کے باقاعدہ نافذ ہونے کی صورت میں معاشرہ میں بدکاری کے رجحانات ہرگز پنپ نہیں سکتے۔یہ صرف سزا ہی نہیں بلکہ اصلاح معاشرہ کی بہترین ترکیب ہے۔اسی لئے قرآن کریم نے زانیوں کو سزا دیتے وقت یہ ہدایت دی ہے۔

وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ. (نور ۲)

اور دیکھیں ان کا مارنا کچھ لوگ مسلمان۔

تا کہ دوسروں کو عبرت حاصل ہو اور ان کے دلوں میں اس جرم کی شقاوت بیٹھ جائے۔

(ب) بدکاری پر بند لگانے کے لئے اسلام اجنبی عورتوں مردوں کے اختلاط کو حتی کہ ایک دوسرے کو نظر بھر دیکھنے سے بھی منع کرتا ہے۔تا کہ انتہائی جرم تک رسائی کا موقع ہی نہ مل سکے۔

ارشاد فرمایا گیا:

قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ.
(سورہ نور آیت ۳۰)

کہہ دے ایمان والوں کو کہ نیچی رکھیں اپنی نگاہیں اور تھامتے رہیں اپنے ستر کو اس میں خوب ستھرائی ہے ان کے لئے۔

وَقُلْ لِلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ. (نور آیت ۳۱)

اور کہہ دے ایمان والیوں کو نیچی رکھیں ذرا اپنی آنکھیں اور تھامتی رہیں اپنے ستر کو۔

اسی طرح عورتوں کو حکم دیا گیا کہ وہ پوری طرح پردہ میں رہیں اور اپنا کوئی عضو ظاہر نہ کریں، سورہ احزاب میں ارشاد ایزدی ہے۔

يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِاَزْوَاجِكَ وَ بَنٰتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ. (احزاب ۵۹)

اے نبی کہہ دے اپنی عورتوں کو اور اپنی بیٹیوں کو اور مسلمانوں کی عورتوں کو نیچے لٹکالیں اپنے اوپر تھوڑی سی اپنی چادریں۔

ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ مسجد سے نکل رہے تھے عام نمازی بھی ساتھ تھے جن میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی نکلتے وقت جلدی کرنے میں دونوں خلط ملط ہو گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں سے ارشاد فرمایا:

اِسْتَأْخِرْنَ فَاِنَّهٗ لَيْسَ لَكُنَّ اَنْ تَحْقُقْنَ الطَّرِيْقَ عَلَيْكُنَّ بِحَافَّاتِ الطَّرِيْقِ.

ٹھہر جاؤ تمھیں راستہ بھر کر چلنے کا حق نہیں ہے تم کنارے چلا کرو۔

راوی کہتا ہے کہ آپ کے اس ارشاد کے بعد عورتیں راستہ میں اس طرح دیوار سے چپک کر چلتی تھیں کہ کبھی کبھی ان کا کپڑا دیوار میں اُلجھ جاتا تھا۔ (مظاہر حق ۴/۲۷)

الغرض اسلام کسی بھی صورت میں اجنبی مرد و عورت کے اختلاط کو پسند نہیں کرتا۔ انتہا یہ کہ نابیناؤں اور مصنوعی اذکار رفتہ لوگوں کا اجنبی عورتوں سے اختلاط بھی شرعاً ناپسندیدہ اور ممنوع ہے۔

چنانچہ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ روایت فرماتی ہیں کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھی اور آپ کے پاس ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں کہ حضرت عبداللہ بن ام مکتومؓ (نابینا) تشریف لائے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم دونوں کو ان سے پردہ کرنے کا حکم دیا۔ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! وہ تو نابینا ہیں نہ ہمیں دیکھتے ہیں نہ جانتے ہیں۔ اس پر آپ نے ارشاد فرمایا: ''کیا تم دونوں بھی نابینا ہو کیا تم انھیں نہیں دیکھ رہی ہو''۔ (ابوداؤد شریف ۲/۲۱۲) ایک دوسری حدیث میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج مطہرات کے گھروں میں ہیجڑوں اور مخنثوں کے داخلے سے بھی منع فرمایا۔ (ابوداؤد شریف ۲/۲۱۱) علاوہ ازیں ذخیرۂ حدیث میں بکثرت ایسی روایتیں ہیں جن میں اجنبی مرد و عورت کو ایک دوسرے کو بالقصد اور بلا عذر دیکھنے سے شدت سے منع فرمایا گیا ہے۔ ارشاد نبوی ہے:

لَعَنَ اللّٰهُ النَّاظِرَ وَالْمَنْظُوْرَ اِلَيْهِ. (مشکوٰۃ شریف ۲/ ۲۷۰)

اللہ کی لعنت ہے بلا عذر دیکھنے والے اور دیکھے جانے والے پر۔

نیز آپ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے فرمایا:

يَا عَلِيُّ لَا تُتْبِعِ النَّظْرَةَ النَّظْرَةَ فَاِنَّ لَكَ الْاُوْلٰى وَلَيْسَتْ لَكَ الْاٰخِرَةُ.

(مشکوۃ شریف ۲/ ۲۶۹)

اے علی! ایک مرتبہ نظر پڑنے کے بعد دوسری مرتبہ نہ دیکھو اس لئے کہ تمھارے لئے اوّل میں رخصت ہے دوسری میں نہیں۔

ایک اور حدیث میں پاکباز مردوں کو خوشخبری دی گئی ہے۔

مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَنْظُرُ اِلٰى مَحَاسِنِ امْرَأَةٍ اَوَّلَ مَرَّةٍ ثُمَّ يَغُضُّ بَصَرَهٗ اِلَّا اَحْدَثَ اللّٰهُ عِبَادَةً يَجِدُ حَلَاوَتَهَا. (مشکوٰۃ شریف ص/ ۲۷۰)

کوئی آدمی مسلمان اول مرتبہ اچانک کسی عورت کے حسن کو دیکھے اور دوراً آنکھیں نیچی کرلے تو اللہ تعالیٰ اسے ایسی عبادت کی توفیق دیتا ہے جس کی مٹھاس وہ محسوس کرتا ہے۔

(ج) فحاشی کے رجحانات کی حوصلہ افزائی نہ کرتے ہوئے اسلامی شریعت نے عورت کو ایسا لباس

پہننے کی تاکید کی ہے جو اس کے پورے جسم کو مستور رکھ سکے جو نہ عریاں ہو اور نہ اتنا چست یا باریک کہ اندرونی اعضاء کی ساخت ظاہر ہو کر فتنہ انگیزی کا سبب بن جائے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہے کہ حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ نے باریک کپڑے پہن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو آپ نے شدت سے ناگواری کا اظہار فرمایا اور ایک روایت میں ہے کہ اٹھ کر گھر سے باہر تشریف لے گئے اور بعد میں فرمایا کہ جب عورت بالغ ہو جائے تو سوائے چہرہ اور ہتھیلیوں کے کوئی حصّہٗ بدن اس کا ظاہر نہ رہنا چاہئے۔ (چہرہ اور ہاتھ بھی صرف ضرورت کے لئے کھولے جائیں) (ابوداؤد شریف ۲/۲۱۲)

اور حدیث میں ایسی عورتوں کے بارے میں جہنمی ہونے کی پیشین گوئی فرمائی گئی ہے جو عریاں لباس پہن کر خود بھی مردوں پر ریجھتی ہیں اور مردوں کو بھی اپنے اوپر رجھانے کی کوشش کرتی ہیں۔ وہ جنت میں داخل تو کیا ہوتیں جنت کی خوشبو بھی نہ پاسکیں گی اگرچہ اس کی خوشبو دور دراز مسافت سے محسوس کی جاسکتی ہے۔ (مسلم شریف ص/ ۲۰۵)

(د) اور اگر غائر نظر سے دیکھا جائے تو شریعت نے مردوں کو چار بیویاں رکھنے کی جو اجازت دی ہے وہ بھی دراصل اسی ''انسداد بدکاری قوانین'' کی ایک کڑی ہے اس لئے کہ فطرت کے مطابق جذبات کی تسکین کے بعد دیگر موانع اور سزاؤں کی موجودگی میں بدکاری کا خطرہ کم سے کم تر رہ جاتا ہے اور معاشرہ صحیح سمت کی طرف گامزن ہو کر قانونی رخصتوں پر عمل کرنے کا عادی بن جاتا ہے۔

یہ چند اشارات ہیں جن سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ زیر بحث مسئلہ میں اسلام کا انداز فکر اور لائحہ عمل کیا ہے اور وہ اپنے اندر کتنی گیرائی، گہرائی اور تاثیر رکھتا ہے حقیقت یہ ہے کہ ان واقعات میں سے کسی ایک دفعہ میں بھی ڈھیل معاشرہ کے لئے سم قاتل بن جاتی ہے اور آج اس پہلو سے جو بگاڑ آرہا ہے دیکھا جائے تو یہی ڈھیل اس بگاڑ کا سبب ہے۔ ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ دنیا کے مروّجہ قوانین عورت کو اس کے اصل مرتبہ تک پہنچاتے ہیں یا اسلام کے

آفاقی اصول وضوابط اس کی عصمت وعفت کے حقیقی محافظ ہیں؟ ذرا سوچئے! بے پردگی پر روک لگائے بغیر کیا انسدادِ فحش کاری کا کوئی قانون مؤثر ہوسکتا ہے؟ اور کیا مخلوط زندگی کے خاتمہ کے بغیر فحاشی کے سیلاب کو روکنا ممکن ہے؟ یاد رکھئے ! اسلام کے قوانین صنف نازک کو وہ مقام دیتے ہیں جو اس کی فطری صلاحیتوں کے شایانِ شان ہیں جبکہ نئی تہذیب کے دلدادہ، عورت کے نام نہاد خیر خواہ عورت کو اصل مقام سے گرا کر بکاؤ مال کے درجہ میں رکھ دیتے ہیں جنھوں نے عورت کو شہرت اور پبلیسٹی کا ذریعہ بنالیا ہے جو اپنے گھٹیا سے گھٹیا مال کو عورت کی عریاں تصویروں کی بدولت ہاتھوں ہاتھ فروخت کرتے ہیں اور یہ عورت کی ناعاقبت اندیشی ہے کہ وہ اسلام کے محفوظ قوانین سے نکل کر ظالم اور استحصال کرنے والے ہاتھوں کا کھلونا بن کر زمانہ کی رَو میں بہتی چلی جارہی ہے۔ اسلام کے نام لیواؤں کے لئے یہ وقت امتحان ہے۔ یا تو وہ اپنی اسلامیت کے اظہار کے لئے اسلامی قوانین پر مضبوطی سے عمل کریں یا پھر اپنی ماؤں، بیٹیوں اور بہنوں کو بے پردہ کرکے، ناجائز لباس پہنا کر اور غیر شرعی زینت میں مبتلا کرکے ان کی عفت وعصمت درندہ صفت استحصال کرنے والوں کے حوالے کردیں۔ مگر یہ یاد رکھیں کہ اسلام کی اتباع میں عافیت ہی عافیت ہے اور غیروں کی پیروی کرنے کی وجہ سے دنیا میں بھی خون کے آنسو رونا پڑے گا اور آخرت میں جو انجام ہوگا وہ الگ رہا۔ **اللّٰهم احفظنا منه۔**

(ندائے شاہی، اگست ۱۹۹۲ء)

یہ بے پردگی

صحیح مسلم شریف میں روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جن لوگوں کو میں نے جہنم میں دیکھا ہے ان میں سے دو جماعتیں میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھیں (یعنی وہ آئندہ زمانہ میں پیدا ہوں گی) ایک وہ ظالم و جابر جن کے ہاتھ میں کوڑے ہوں گے اور وہ خواہ مخواہ لوگوں پر ظلم و جبر کرتے اور ان پر دھونس جماتے ہوں گے۔ دوسرے وہ عورتیں جو لباس پہننے کے باوجود ننگی نظر آئیں گی۔ یعنی اتنا مختصر لباس پہنیں گی کہ اعضاء کھلے رہ جائیں گے یا اتنا چست اور باریک لباس اختیار کریں گی کہ سارے اعضاء صاف اُبھرے ہوئے دکھائی دیں گے یہ عورتیں خود بھی مردوں پر ریجھنے والی ہوں گی اور وہ مردوں کو بھی اپنی طرف رجھانے والی ہوں گی اور سروں پر جوڑے باندھ کر مٹک مٹک کر سڑکوں پر چلیں گی۔ ایسی عورتوں کے بارے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ وہ اپنی بدکاریوں کے سبب سے جنت کی خوشبو بھی نہ سونگھ سکیں گی حالانکہ اس کی خوشبو کافی دور سے آنے لگتی ہے۔ (مسلم شریف ٢٠٥٢)

ہمارے زمانہ میں یہ دونوں جماعتیں نہ صرف وجود میں آ چکی ہیں بلکہ ان کی بہتات ہے۔ جا بجا آپ کو دادا گیری کرتے ظالم و جابر لوگ نظر آئیں گے۔ اسی طرح مذکورہ صفات کی حامل عورتیں سڑکوں، اسکولوں اور تقریبات میں نظر آئیں گی۔ اب بازاروں میں عورتوں کی اس قدر کثرت ہونے لگی ہے کہ غیرت دار اور حیادار آدمی کے لئے دوکانوں سے اپنی ضرورت پوری کرنا ایک مشکل امر بن گیا ہے۔ مردوں کو شرم آ جاتی ہے مگر عورتوں کو شرم نہیں آتی۔ اور دن بدن اس صورتحال میں زیادتی ہوتی جا رہی ہے۔ غیر مسلم خواتین سے بحث نہیں خود ہماری مائیں اور بہنیں بھی کثرت کے ساتھ سڑکوں پر بے پردہ دکھائی دیتی ہیں۔ اور اسکول و کالج میں پڑھنے والیاں تو یہ سمجھتی

ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ سے پردہ کا حکم معاف کرا کے آئے ہیں (نعوذ باللہ) والدین کو بھی اپنی بچیوں کی بے پردگی پر غیرت نہیں آتی۔ اور اتنا بھی احساس نہیں ہوتا کہ وہ کس طرح اپنی عزت کو ہوس ناک نظروں کے سامنے رُسوا کر رہے ہیں۔ تقریبات کے موقع پر کھل کر بے پردگی کی جاتی ہے۔ اور کہیں تو یہ غضب ہوتا ہے کہ مرد بیرے عورتوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ اور بے غیرت عورتیں اجنبی مردوں کے ہاتھ سے کھانا کھاتی ہے۔ اسی طرح گھروں کے اندر پردہ کا اہتمام باقی نہیں۔ ذرا سے رشتہ کو بے پردگی کا بہانا بنالیا جاتا ہے۔ نامحرم لڑکے وقت بے وقت گھروں میں آتے جاتے ہیں۔ ہنسی مذاق کرتے ہیں اور گھر والے اسے محض دوستی پر محمول کرتے رہتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں گھر گھر بدکاریاں ہوتی ہیں۔ اور فتنے برپا ہوتے رہتے ہیں۔ اب فرموں اور کارخانوں میں لڑکیوں کی ملازمت کا فیشن بنتا جارہا ہے۔ جس کی وجہ سے روز شرمناک واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔ یہ تو دنیا کی مصیبتیں ہیں۔ آخرت میں اس بے حیائی پر جو سخت عذاب ہوگا اور جنت سے محرومی ہوگی وہ اس کے علاوہ ہے۔

اس سے بھی بڑھ کر خطرناک بات یہ ہے کہ جب علماء اس بے حیائی پر نکیر کرتے ہیں تو بجائے اس کے کہ لوگ اپنی غلطی کا احساس کریں اور شرم و غیرت کا اظہار کریں، الٹے بے پردگی کی طرف سے وکالت شروع کر دیتے ہیں۔ اور غیروں کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے یہ کہا جاتا ہے کہ پردہ عورتوں کی ترقی میں رکاوٹ اور ان کے لئے بڑی حق تلفی ہے۔ اور دوسری مہمل موشگافی یہ کی جاتی ہے کہ اسلام میں چہرے اور ہتھیلیوں کا پردہ نہیں ہے۔ علماء نے اسے خواہ مخواہ ضروری قرار دے دیا ہے۔ حالانکہ یہ دونوں باتیں سرے سے غلط ہیں جو دشمنان اسلام کے زہریلے پروپیگنڈے کی وجہ سے ہمارے ذہنوں میں راسخ ہوگئی ہیں۔ اس لئے کہ:

(الف) انسان کی اصل ترقی محض دولت کے حصول اور مادی اسباب کی فراہمی میں نہیں ہے۔ بلکہ واقعی ترقی یہ ہے کہ انسان اپنی انسانیت کے تقاضوں کو پورا کرنے والا بنے۔ اس میں شریفانہ انسانی خصلتیں پیدا ہوں۔ اور وہ اپنے مقصد تخلیق سے آگاہ ہوکر عزت کے ساتھ زندگی گزارے اور جانوروں کی بہیمانہ حرکتوں سے باز رہے۔ اسلام کی نظر میں اصلی اور واقعی ترقی یہی ہے۔ اب دیکھ لیجیے کہ پردہ اس واقعی ترقی کے لئے رکاوٹ ہے یا اس کے لئے مددگار

ہے؟ پردہ سے شرافت کا معیار بلند ہوتا ہے۔ انسان کو انسانیت کا سبق ملتا ہے۔ وہ بدکاریوں کی نجاستوں سے محفوظ رہتا ہے۔ یہ پردہ نہ جانے کتنے فتنوں سے نجات کا ذریعہ اور امن و عافیت کا بہترین وسیلہ ہے جبکہ بے پردگی سے انسان کا جوہر انسانیت یعنی جذبۂ شرم وحیا داغدار ہوجاتا ہے۔ جانوروں کی سی خصلتیں اس میں پیدا ہوجاتی ہیں۔ گھر گھر فتنے کھڑے ہوتے ہیں۔ خاندانوں میں نزاع وافتراق ہوجاتا ہے اور انسانی نسلیں غیر محفوظ اور رشتے غیر معتبر ہوجاتے ہیں۔

(ب) پردہ سے عورتوں کی حق تلفی ہرگز نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ عورت کی حق تلفی سے بچاؤ کے لئے بہترین ڈھال کا کام دیتا ہے۔ تجربہ کر کے دیکھ لیں۔ جس معاشرہ میں پردہ کا رواج ہوگا۔ وہاں عورتوں پر دست درازی اور ان کے ساتھ ظلم وتعدی کی شرح یقینی طور پر نہایت معمولی ہوگی۔ دراصل عورت کے حق کو تلف کرنے والے وہ لوگ ہیں جنھوں نے محض اپنی مطلب برآری کے لئے عورت کو دنیا کی چمک دمک کا لالچ دے کر اسے گوشۂ عافیت سے نکال کر دنیا کے حقیر بکاؤ مال میں تبدیل کر دیا ہے۔ اسلام نے تو عورت پر کمائی کا بوجھ بھی نہیں رکھا بلکہ اس کے شوہر یا دیگر رشتہ داروں کو اس کی کفالت کا ذمہ دار بنایا ہے۔ تاکہ صنف نازک کو کسی مشقت کا تحمل نہ کرنا پڑے۔ اور وہ عافیت کے ساتھ اپنی گھریلو ذمہ داریاں انجام دیتی رہے۔ جو لوگ پردہ کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں وہ عورتوں کے خیر خواہ نہیں بلکہ ان کے سخت ترین دشمن اور بدخواہ ہیں۔

(ج) چہرہ کا پردہ بھی اسلام میں ضروری ہے خاص کر اس فتنہ کے دور میں بلا شدید ضرورت کے عورت کے لئے غیر مردوں کے سامنے چہرہ کھولنا اور مردوں کا اجنبی عورتوں کا چہرہ دیکھنا قطعاً جائز نہیں ہے۔ (معارف القرآن ۶/۴۰۳) یہ بات علماء اپنی طرف سے نہیں کہتے بلکہ آیاتِ قرآنیہ، احادیث طیبہ اور فقہائے امت کی تصریحات اس پر صراحۃً دال ہیں۔ اس سلسلہ میں علماء کا استہزاء اور استخفاف جو آج کل بزعم خود دانشوروں کا شیوہ ہے نہایت خطرے کی چیز ہے۔ نعوذ باللہ۔ (ندائے شاہی، دسمبر ۱۹۹۵ء)

○❖○

باورچی خانہ سے جہنم کی طرف

روزنامہ قومی آواز (۱۳؍ستمبر ۹۹ء) میں سپریم کورٹ کے ایک مسلمان ایڈوکیٹ صاحب کا مراسلہ شائع ہوا جس میں نہایت فخریہ انداز میں آزاد خیال خواتین کی تنظیم ''سعیدہ طاہر صدیقی فورم'' کے ایک جلسہ کی روداد سے قارئین کو روشناس کرایا گیا۔ اس اجلاس کا موضوع خواتین کو مردوں کے دوش بدوش لانے کے طریقوں پر کھلے دل سے غور کرنا تھا۔ مراسلہ نگار صاحب کے بقول اس مردوزن کے مخلوط پروگرام کی سب سے خاص اور اہم ترین بات یہ رہی کہ تقریروں کے دوران تعلیم، ملازمت معاشیات اور سیاسیات کے موضوعات تو زیر بحث آئے لیکن باورچی خانہ اور زچہ خانہ کا تذکرہ تک نہیں کیا گیا۔ خواتین کا یہ رجحان مراسلہ نگار کی نگاہ میں نہایت قابل ستائش ٹھہرا اور اسے خواتین کی روشن خیالی اور ترقی پسندی کی دلیل سمجھا گیا۔

یہ تو ایک جلسہ کی روداد تھی جس سے دانشورانہ ذہنیت کا ایک نمونہ منظر عام پر آ گیا اور ایک صاحب کو اس پر فخر کا موقع بھی ہاتھ آیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج کا ہر لبرل دانشور اِن خیالات کا حامی ہی نہیں بلکہ پرجوش مبلغ بھی ہے۔ ان لوگوں کا نام مسلمانوں جیسا ضرور ہے لیکن ان کی پوری فکری جدوجہد اسلامی معاشرتی نظام کی تنسیخ اور اس کے مٹانے کے اِرد گرد گھوم رہی ہے، ایسے ہی لوگوں کی کوششوں کا ثمرہ ہے کہ آج کسی بھی شہر میں صبح سویرے سورج نکلتے ہی کھڑے ہو کر دیکھ لیں۔ ہزاروں نوجوان لڑکیوں کا سیلاب پوری عریانیت اور حشر سامانیوں کے ساتھ شہر کے گرلز اسکولوں اور کالجوں کی طرف رواں دواں دکھائی پڑتا ہے۔ لڑکیوں کی تعلیم گاہیں اپنی وسعت دامانی کے باوجود تنگ سے تنگ پڑتی جارہی ہیں۔ اس سیلاب میں دیگر قومیں تو ہیں ہی مسلم لڑکیوں کی

تعداد بھی اوروں سے کم نہیں کہی جاسکتی، ان لڑکیوں کے پورے پورے دن آزادی کے ساتھ گھر سے باہر رہنے کی وجہ سے نوجوان معاشرہ میں جو گندگی اور تعفن پھیل رہا ہے وہ سب کے سامنے ہے اور اس آزادی کی وجہ سے روایتی خاندانی نظام جس طرح بکھرتا جارہا ہے وہ پوری قوم کے لئے لمحۂ فکریہ ہے۔ جہاں لوگ اپنی لڑکیوں کے رشتے نہ ملنے سے پریشان ہیں اس سے زیادہ گھر والوں کی رضامندی کے بغیر لڑکیوں کے اپنے من پسند رشتے منتخب کر لینے سے ذہنی اذیت اور تکلیف میں مبتلا ہیں اور بسا اوقات یہ رشتے مذہب اور برادری کی حدود کو پار کر کے شریف گھرانوں کی عزت کو دائمی بٹّہ لگا رہے ہیں۔

ایسے ماحول میں پڑھنے والی لڑکیاں خدمت کے جذبہ سے عاری، حد درجہ کاہل اور فیشن کی پرستار ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے انھیں باورچی خانہ یا زچہ خانہ کی ذمہ داری سنبھالنے میں اپنی توہین محسوس ہوتی ہے اور جب وہ اس کا برملا اظہار کرتی ہیں تو پوری قوم تو فکر کی گہرائیوں میں ڈوب جاتی ہے مگر یہ دانشور بغلیں بجاتے ہیں کہ ہمارا مقصد بر آیا اور ہماری کوششیں کامیاب ہوئیں گویا کہ ان کی ساری کوششوں کا حاصل یہی ہے کہ عورت کو باورچی خانے اور زچہ خانے سے نکال کر سڑک پر لا کھڑا کر دیا جائے۔

اب ہمارا ان دانشوروں سے سوال ہے کہ یہ بتایا جائے کہ ''باورچی خانہ اور زچہ خانہ'' انسانی ضرورت ہے یا نہیں؟ اگر آپ کہیں کہ ضرورت نہیں تو یہ فطرت اور واقعہ کے خلاف ہے۔ آج کوئی چھوٹے سے چھوٹا گھر بھی ایسا نہیں بتایا جاسکتا جہاں باورچی خانہ کی ضرورت نہ ہو۔ اور کسی ایسی آبادی کی نشاندہی نہیں کی جاسکتی جہاں زچگی کی حاجت نہ ہو۔ جب ان شعبوں کی ضرورت مسلّم ہے تو اب بحث یہ ہے کہ یہ ذمہ داری کس پر ڈالی جائے۔ اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد آج تک فطری اور طبعی تقاضوں کے تحت یہ دونوں شعبے عورت کے سپرد رہے ہیں۔ اب آخر یہ دانشور چاہتے کیا ہیں؟ کیا ان ذمہ داریوں میں تبدیلی کے متمنی ہیں۔ یعنی باورچی خانہ اور زچہ خانہ کا نظام مردوں کے حوالہ کر دیا جائے اور عورتوں کو بے دخل کر کے انھیں سنا دیا جائے کہ بس بہت ہو چکا اب اس وزارت کی ذمہ داری ہم ادا کریں گے۔ تو ہمارا مطالبہ ہوگا کہ سب سے پہلے اس سلسلہ میں

دانشور حضرات میدان میں آئیں اور اپنے گھر کے باورچی خانے اور زچہ خانے کے نظام سے عورتوں کو بے دخل کریں۔ یا کم سے کم ان کے ساتھ برابر کے شریک ہوں۔ یہ بات شاید کسی حد تک باورچی خانے میں تو چل جائے گی لیکن زچہ خانے میں تو شرکت کی حد تک بھی نہیں چل سکتی اس لئے کہ یہ خدمت ساخت کے اعتبار سے صرف عورت ہی کے لئے مقدر ہے۔ عورت کو اس سے بے دخل نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس سے عورت کو بے دخلی کی کوشش کی جائے تو یہ شعبہ ہی بند کرنا پڑے گا۔

اس سے پتہ چلا کہ یہ دانشور اور روشن خیال مغربیت زدہ لوگ محض اپنی ہوس کی تسکین کے لئے ظاہری طور پر عورت کو باورچی خانے اور زچہ خانے سے باہر لانے کا خواب دکھاتے ہیں اور اسے آسودگی دینے کا فریب دیتے ہیں مگر عورت کے کاموں میں شرکت کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔ ان کا اصل پلان یہ ہے کہ عورت کا ہر ممکن استحصال کیا جائے۔ مردوں کی ذمہ داری والے کام (معاشی محنت) بھی اسی سے ہی لئے جائیں۔ گویا کہ صنف نازک پر دوہری کمر توڑ ذمہ داریوں کا بوجھ ڈال دیا جائے اور افسوس کہ آج کی عورت انہی مفاد پرست مشیروں کے مشوروں پر عمل کرنے کو اپنے لئے فخر کی چیز سمجھ رہی ہے۔ لڑکیوں کی تعلیم کے نام پر ان کی عزت وعصمت کا سودا ہو رہا ہے۔ انھیں رُسوا اور ذلیل کیا جا رہا ہے۔ ان کی ہیجان انگیز اداؤں سے ساری دنیا کی تجارتیں چل رہی ہیں۔ ان کے بدن کے روئیں روئیں کو بکاؤ مال بنا دیا گیا ہے۔ مگر حیرت ہے اس کم عقلی پر کہ یہ نچوڑی جانے والی عورت اپنے نچوڑنے والے کے لئے تو رطب اللسان ہے اور جو مذہبی نظریہ اسے اس بدترین ظلم سے نجات دینا چاہتا ہے اسے اپنا دشمن سمجھ رہی ہے۔ واقعی ظالم بھی کیسا ہوشیار ہے کہ اس نے خود محافظوں ہی کو مظلوم کی نظر میں ملزم بنا دیا ہے کہ حفاظت کے اسباب ہی ختم ہو کر رہ جائیں۔

ہم لڑکیوں کی تعلیم کے مخالف نہیں لیکن ان کی ایسی تعلیم کے سخت خلاف ہیں جس سے ان کی نسوانیت اور اسلامیت داغدار ہو جائے اور ان کی شرم وحیا کا جنازہ نکل جائے۔ اور افسوس ہے کہ آج لڑکیوں کی ایسی ہی حیا سوز تعلیم وتربیت پر سارا زور صرف ہو رہا ہے۔ شہر مرادآباد میں لڑکیوں کے ایک ہائی اسکول کے افتتاح کے لئے راقم الحروف کو دعوت دی گئی۔ احقر نے منتظم صاحب سے

کہا کہ میں ضرور شرکت کروں گا۔ لیکن ایک شرط ہے کہ آپ اپنے اسکول کی لڑکیوں کے لئے پردہ کو لازمی قرار دیں تا کہ معلوم ہو سکے کہ یہ مسلمانوں کا اسکول ہے۔ مگر منتظم صاحب یہ شرط قبول کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ کیونکہ انھیں معلوم ہے کہ اس شرط کے ساتھ ان کا اسکول مزعومہ کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکے گا۔ اس لئے کہ آج کے والدین کو تو اپنی لڑکیوں کو ماڈرن بنانے کا شوق ہے وہ بھلا پردہ والے اسکول کو کیسے برداشت کر سکتے ہیں؟ انھیں یہ خطرہ ہے کہ لڑکیاں اگر ماڈرن نہ ہوں تو انھیں قبول کون کرے گا؟ حالانکہ یہ سراسر خود فریبی ہے۔ اپنے اِرد گرد نظر اٹھا کر دیکھیں آج رشتوں کے انتظار میں گھر بیٹھنے والیوں میں انہی ماڈرن لڑکیوں کی تعداد زیادہ ہے۔ ایسی لڑکیوں کی اگر شادی ہو بھی جاتی ہے تو ان کے نازنخروں اور شاہ خرچیوں کی وجہ سے اس کا کامیاب ہو پانا بھی مشکل ہوتا ہے۔ کتنے ہی خاندانی تنازعات انہی ''مہذب لڑکیوں'' کی بدعنوانی کی پیداوار ہیں۔ مگر ماحول ایسا بنا دیا گیا ہے کہ اچھے اچھے عقلمند بھی اس کی رو میں بہے چلے جا رہے ہیں اور اپنی معصوم بچیوں کی عفت وعصمت کو اپنے ہی ہاتھوں مٹانے کے اسباب خود ہی مہیا کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور اس نقصان کا احساس تک نہیں ہے۔ ان جدید تعلیم یافتہ لڑکیوں کی آزاد روی معاشرہ کو کہاں تک پہنچائے گی، اس کے تصور ہی سے کلیجہ منہ کو آ رہا ہے۔ ہماری نظر میں اس وقت ملت اسلامیہ میں پھیلنے والا یہ سب سے بڑا اور بدترین فتنہ ہے۔ اگر لڑکیوں کی بے پردگی اور عریانیت پر آج بند لگانے کی کوشش نہ کی گئی تو آنے والی نسلوں میں دینی شناخت کا تلاش کرنا بھی مشکل ہو جائے گا۔ اور یہ ''ننگا پن'' ہمارے دین وایمان کی جڑیں تک کھود ڈالے گا اس لئے کہ ان عریانیت پسند ماؤں کی گود میں پلنے والی اولاد سے آئندہ دینی اعتبار سے کسی خیر کی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں عقل سلیم سے نوازے۔ اور شر و رو فتن سے محفوظ فرمائے۔ آمین۔

(ندائے شاہی، اکتوبر ۱۹۹۹ء)

❍❖❍

تن ہمہ داغ داغ شد

چند روز قبل ایک روشن خیال دانشور صاحب کا مضمون اخبار قومی آواز میں شائع ہوا جس میں بڑے زور وشور سے یہ شکوہ کیا گیا تھا کہ مسلم قائدین اور علماء ملت نے ''بنگلور کے مقابلۂ حسن''، ''ممبئی میں مائیکل جیکسن کی نیم عریاں محفل رقص وسرود'' اور ''فدا حسین کی فحش مصوری'' پر احتجاج کیوں نہیں کیا؟ موصوف کے خیال میں یہ تین واقعات ایسے ہیں جن پر تمام مسلمانوں کو پرزور احتجاج کرنا چاہئے تھا۔ اورانھوں نے احتجاج نہ کر کے گویا کہ بہت بڑا قصور کیا ہے۔

ہمارے خیال میں اگر موصوف کے بقول یہ ''قصور'' ہے تو اس کے جواب میں یہ مضبوط عذر پیش کیا جاسکتا ہے۔ کہ اس طرح کے واقعات پر احتجاج سے مذکورہ پروگراموں پر تو کوئی اثر نہیں پڑتا۔ البتہ ان کی مزید تشہیر ہوجاتی ہے اور ''میڈیا'' کو اخبارات سیاہ کرنے کا ایک حربہ ہاتھ آجاتا ہے۔ اس لئے کہ ذرائع ابلاغ کا یہ پُرانا وطیرہ ہے کہ نام نہاد اختلاف کے بہانہ سے اصل پروگرام کی تشہیر کی جاتی ہے۔ چنانچہ گذشتہ سال مصر میں خواتین کی عالمی کانفرنس کے موقع پر ''اسقاط حمل'' کے حق پر اختلاف کرنے والوں کو نشانہ بنا کر نہایت بے حیائی اور بے شرمی کے ساتھ ہفتوں عالمی اخبارات کے صفحات سیاہ کئے جاتے رہے۔ اور ریڈیو اور ٹیلی ویژنوں پر بے غیرتی کے ساتھ مباحثے ہوتے رہے۔ اور اب بنگلور میں مقابلۂ حسن کے موقع پر چند تنظیموں کو کھڑا کر کے اس پروگرام کی تشہیر کی راہیں ہموار کی گئیں۔ علاوہ ازیں اگر ان حیا سوز پروگراموں پر احتجاج کی باگ ڈور علماء ملّت اپنے ہاتھ میں لے لیتے تو احتجاج تو الگ رہتا، اس عنوان کی آڑ میں ''روشن خیالوں'' کو اسلام پر طعن وتشنیع کا موقع فراہم ہوجاتا اور یہی ''باشعور دانشور'' جو علماء کے احتجاج نہ کرنے پر

آج چیں بجبیں نظر آ رہے ہیں ''احتجاجی علماء'' پر دقیانوسی، قدامت پسندی اور شدت پسندی جیسے نہ جانے کتنے الزامات لگا دیتے۔ اور یہ احتجاج مزید نقصان کا ذریعہ بن جاتا۔

خیر! اگر علماء ملّت نے درج بالا واقعی اندیشوں کے پیش نظر خواتین کے مقابلہ حسن اور بدنام زمانہ گویّے کے ''حیا سوز شو'' پر احتجاج نہیں کیا تو ان کے پاس تو معقول عذر تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ مسلمان دانشور جو مشرقی تہذیب کی دہائی کے نام پر اس طرح کے پروگراموں کو مادرِ وطن کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ سمجھتے ہیں۔ انھیں احتجاج سے کس نے منع کیا تھا؟ انھوں نے اس بارے میں جلوس کیوں نہیں نکالے اور انھوں نے قوم کی رہنمائی کیوں نہیں کی؟ وہ احتجاج کرتے۔ تو ہم بھی ان کی بھرپور تائید کرتے۔ اور شانہ بشانہ چل کر ان کی تحریک کو کامیاب بناتے اور دامے، درمے، قدمے، سخنے ہر طرح کی امداد کرتے۔ لیکن پھر ہمارے احتجاج کا دائرہ انہی تین وقتی حادثات تک محدود نہ رہتا بلکہ ہم تو آگے بڑھ کر یہ مطالبہ کرتے کہ:

(۱) ملک کے چپہ چپہ پر قائم سبھی ناچ گھر بند کر دیئے جائیں۔ جن میں ثقافت اور منورنجن کے نام پر برملا مادر زاد ننگے ناچ ہوتے ہیں اور عریاں فلمیں دکھائی جا رہی ہیں اور جن کی تشہیر کے لئے آج مادر وطن کے در و دیوار بے حیائی اور فحاشی کا مظہر بن چکے ہیں۔ آج ملک کا کون سا ایسا چوراہا بچا ہے جہاں عریاں فلمی اشتہارات کا سیلاب نہ ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ ان بے شرمی کے مناظر کی وجہ سے آج حیادار شخص کا گھر سے نکلنا اور سر اُٹھا کر چلنا مشکل بن گیا ہے کیا ان پر احتجاج کرنا ہماری ذمہ داریوں میں شامل نہیں ہے۔ آخر دانشوران قوم کی نظریں ان بے حیائیوں کی طرف کیوں نہیں اٹھتیں؟ کم از کم مسلمانوں کو تو سامنے آ کر اپنے محلوں، مکانوں اور گھرانوں کو اس نحوست سے بچانے کی تحریک چلانی ہی چاہئے۔

(۲) اور ہم یہ مطالبہ کرتے کہ ''ڈش انٹینا'' کیبل ٹی وی، اور دوردرشن کے فحش پروگراموں کا مکمل بائیکاٹ کیا جائے اور ان آلات کو گھر سے باہر نکال دیا جائے۔ جنھوں نے ہماری شرم و غیرت کا جنازہ نکال کر رکھ دیا۔ اور ہم میں وہ بے ہودہ اخلاق پیدا کر دیئے جن کی

جانوروں سے بھی توقع نہیں رکھی جاسکتی۔ یہ مقابلۂ حسن اور مائیکل کے شوتو ایک وقتی پروگرام تھے جو منعقد ہوکر ختم ہو چکے۔ لیکن جن گھروں میں ٹیلی ویژن اور ڈش انٹینا لگے ہوئے ہیں ان میں تو روز ہی مقابلۂ حسن اور گانے بجانے کی مجلسیں سجائی جاتی ہیں۔ یہ کیسی غیرت ہے کہ ایک واقعہ پر تو ہماری مشرقی تہذیب داغدار ہو جائے اور روز کے واقعات پر کانوں پر جوں بھی نہ رینگے۔ بلکہ اگر علماء اس پر نکتہ چینی کریں تو ان پر لعن طعن کیا جائے۔ اس لئے ہم احتجاج کرتے تو ہمارے احتجاج کے ایجنڈے میں ٹی وی پروگرام بھی ضرور شامل ہوتے اور ہمارے مخاطب سبھی مسلمان ہوتے خواہ دانشور ہوں یا غیر دانشور، ہمارا ضمیر ہرگز اس نفاق کی اجازت نہیں دیتا کہ گھر کے ڈرائینگ روم میں بیٹھ کر ٹیلی ویژن پر فحش پروگرام دیکھے جائیں اور باہر نکل کر بے حیائی کے خلاف نعرے لگائے جائیں۔ ہم جس طرح باہر کی بے حیائی کے خلاف ہیں۔ اسی طرح اپنے گھروں کو بھی بے حیائی سے پاک دیکھنا چاہتے ہیں۔

(۳) پھر اور آگے بڑھ کر ہم ''دختران ملت'' کے بے پردہ دکھائی دینے پر سراپا احتجاج بن جاتے جو آج بازاروں کی رونق بنی ہوئی ہیں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بے پردہ ''دانشوری'' کی تعلیم پا رہی ہیں۔ نوکریوں کے نام پر غیر مردوں کے درمیان بیٹھ کر ہوسناک نگاہوں کا مرکز بن رہی ہیں اور تفریح گاہوں میں آج جن کی عزتیں نیلام ہو رہی ہیں۔ کیا یہ بدترین حیا سوز مناظر احتجاج کے قابل نہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ جو شخص اپنی بہو بیٹیوں کے ان مکروہ کرداروں پر چیں بجبیں نہیں ہے تو پھر اسے کسی بھی بے حیائی پر احتجاج کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اپنی بیٹیوں کی بے پردگی پر تو خاموش رہنا اور اپنے اختیار سے باہر کے پروگراموں پر احتجاج کے مشورے دنیا لکیر پیٹنے سے زیادہ کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔

پھر جب احتجاج کا سلسلہ اور دراز ہوتا تو ہم یہ بھی مشورہ دیتے کہ جس شخص کے دل میں بھی ایمان کی رمق باقی ہے وہ میدان میں آئے اور اپنی تقریبات میں عورتوں اور مردوں کے بے محابا

اختلاط اوران کی تصویر کشی اور مووی گری (جسے جدید دور میں قابل شرم نہیں بلکہ قابل فخر اور باعث عزت سمجھا جاتا ہے) کے رواج کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے اور قرآن وسنت کی روشنی میں ہراس سوراخ کو بند کر ڈالے جہاں سے بے حیائی کے جراثیم نکل نکل کر معاشرہ کی غیرت وحمیت کو خوراک بنا رہے ہیں اور جن کی طرف سے ہمارا روشن خیال طبقہ نہ جانے کب سے آنکھیں موندے ہوئے ہے دوسروں کے احتجاج کا مرحلہ تو بعد میں ہے۔ پہلے اپنے کردار کا تو جائزہ لیا جائے، آج ہماری مخلوط تعلیم گاہوں اور دانش کدوں میں ریگنگ کے نام پر کیا کیا بدتمیزیاں سرعام ہوتی ہیں؟ آرٹ اور کلچر کے عنوان سے کیسے بدترین اور فحش ڈرامے اسٹیج کئے جاتے ہیں اور آزادی کے پردے میں کیسے کیسے خفیہ تعلقات استوار ہوتے ہیں؟ پھر ہماری مطالعہ گاہوں میں کیسی فحش تصویر والے میگزین اور ناول ذوق وشوق سے پڑھے جاتے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ آخران پر بھی تو ہماری رگ حمیت پھڑکنی چاہئے۔

اگر ان تمام بے حیائیوں کو ختم کرنے کا جذبہ دل میں نہ ہوتو پھر وقتی طور پر فحاشی کے خلاف مظاہرہ کرنے یا جلوس نکال دینے یا محض اظہار مذمت کر دینے سے مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔ بلکہ ہمارے خیال میں فحاشی کے واقعات کا منفی انداز میں ذکر کرنا بھی اس کی اشاعت کا ایک خوبصورت انداز ہے۔ اوراس میں بھی بے شرم طبیعتیں اپنی لذت کا سامان فراہم کر لیتی ہیں جیسا کہ آج کل کے اخباری رپورٹوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اولاً پورا واقعہ ساری جزئیات کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے اور آخر میں اس پر چند آنسو بہالئے جاتے ہیں اور بس! یعنی کام بھی ہوجائے اور الزام بھی نہ آئے۔ اسی بنا پر قرآن کریم نے فاحشہ کی نشر واشاعت ہی کو سرے سے ممنوع اور سخت عذات کا موجب قرار دیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَةُ فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ (سورۂ النور آیت : ۹)

جولوگ چاہتے ہیں کہ چرچا ہو بدکاری کا ایمان والوں میں ان کے لئے عذاب ہے دردناک دنیا میں اور آخرت میں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہماری نظر میں فحاشی کے خلاف محض شور شرابہ کافی نہیں بلکہ صدق دل سے پورے عزم وحوصلہ کے ساتھ بے حیائی کی ابتدائی بنیادوں ہی کو ختم کرنے کی سعی کرنا ضروری ہے۔ اور ہندوستان جیسے غیر مسلم اکثریتی ملک میں دوسروں کے پروگراموں کے خلاف ہماری کوئی ناگواری اثر انداز نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا ہمارے لئے کام کا میدان صرف اپنے ہم مذہب افراد ہی ہیں۔ اگر ہمارے اندر واقعی شرم وحیا ہے اور ہم واقعۃً اپنے کو فحاشی سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو اولاً ہمیں کوشش کرنی ہوگی کہ ہماری کوئی ماں بہن بے پردہ نہ رہے۔ ہمارے تعلیمی اداروں میں مخلوط تعلیم کا نظام ختم ہو۔ ہماری عورتیں مردوں کے درمیان بیٹھ کر نوکری نہ کریں۔ اور ہمارے گھروں سے فحاشی کے آلات نکال دیئے جائیں۔ یہ اصل میں کرنے کے کام ہیں جن کی طرف سے ہمارے معاشرہ کا غالب طبقہ غفلت میں پڑا ہوا ہے۔ اس راہ میں محنت نہ کرنا واقعی ایسا قصور ہے جس کے جواب میں کوئی معقول عذر پیش نہیں کیا جاسکتا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں خود احتسابی کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

(ندائے شاہی، ستمبر ۱۹۹۶ء)

خواتین کے لئے ریزرویشن کی وَبا

(اور اسلامی نقطۂ نظر)

بلدیاتی اداروں اور گرام پنچایتوں میں عورتوں کے لئے نشستیں محفوظ کرنے کے بعد اب پارلیمنٹ کے حالیہ اجلاس میں یہ بل پیش کیا جاچکا ہے کہ قومی پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلیوں کی ۳۰ فیصدی سیٹیں خواتین کے لئے ریزرو کردی جائیں۔ اور اس بات کا پورا امکان ہے کہ آئندہ چند مہینوں میں یہ بل منظوری حاصل کرلے گا اور اس طرح پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کو ''زنانہ'' بنانے کی راہیں ہموار ہوجائیں گی۔ ایسے حالات کے متعلق اسلامی نقطہ نظر کیا ہے۔ اور ووٹ دہندگان کا کیا فرض ہوتا ہے؟ اس موضوع پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ زیر نظر مضمون میں اسی پہلو پر اجمالی بحث کی گئی ہے۔

حجاب :

اسلام نے عورت کو اس کی فطرت کے اعتبار سے بہت سے تحفظات عطا کئے ہیں جن میں سب سے اہم جو حکم دیا گیا وہ یہ ہے کہ وہ بے حجابی سے بچیں، پردہ کی پابند رہیں اور بلا ضرورت اپنے گھروں سے باہر نہ نکلیں۔ چنانچہ ازواج مطہرات کے توسط سے امت کی عورتوں کو حکم دیا گیا۔

وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرَّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰی. (سورۂ احزاب)

اور تم اپنے گھروں میں قرار سے رہو اور قدیم زمانۂ جاہلیت کے دستور کے موافق مت پھرو۔

نیز فرمایا گیا:

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِاَزْوَاجِکَ وَ بَنٰتِکَ وَ نِسَاءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ. (سورۂ احزاب آیت: ۵۹)

اے نبی اپنی بیویوں سے بھی کہہ دو اور اپنی بیٹیوں سے بھی کہہ دو اور تمام مومنوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ وہ اپنے چہروں پر اپنی چادریں لٹکا لیا کریں۔

نیز مردوں کو حکم دیا گیا:

وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعاً فَاسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ. (سورۂ احزاب ۵۳)

اور جب تم ان سے کوئی چیز مانگو تو پردے کے باہر سے مانگا کرو۔

نیز سورہ نور کی آیت ۳۰-۳۱ میں عورتوں اور مردوں کو اجنبی لوگوں سے نگاہیں نیچی رکھنے اور شرمگاہ محفوظ رکھنے کا حکم دیا گیا ہے اور احادیث طیبہ میں بھی عورت کو گھر میں رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔ اجنبی مردوں سے تنہائی کرنے سے منع کیا گیا ہے اور بلاضرورت گھر سے نکلنے پر روک لگائی گئی ہے۔ تاکہ عورت کی عفت وعصمت پوری طرح محفوظ رہے۔ اور وہ اپنی گھریلو ذمہ داریاں انجام دے کر عالم کو امن وسکون فراہم کرتی رہے۔ اس پردہ کے حکم پر عمل کئے بغیر نظام معاشرت کسی طرح بھی اطمینان بخش نہیں ہوسکتا۔ خود نئے دور کے منصف مزاج دانشور بھی اس حقیقت کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہتے کہ آج عورت کو پردہ سے باہر نکال کر دنیا کے خاندانی نظام کو اور فیملی سسٹم کو تباہ کر دیا گیا ہے۔ سوویت یونین کے آخری صدر میخائیل گورباچیف نے اپنے آخری دور میں ''پروسٹرائکا'' کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی اس میں انھوں نے عورتوں کے متعلق ایک خاص باب قائم کیا اور صاف اور واضح لفظوں میں یہ لکھا کہ:

> ''ہماری مغرب کی سوسائٹی میں عورت کو گھر سے باہر نکالا گیا اور اس کو گھر سے باہر نکالنے میں بیشک ہم نے کچھ معاشی فوائد حاصل کئے اور پیداوار میں کچھ اضافہ ہوا اس لئے کہ مرد بھی کام کر رہے ہیں اور عورتیں بھی کام کر رہی ہیں۔ لیکن پیداوار کے زیادہ ہونے کے باوجود اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارا فیملی سسٹم تباہ ہو گیا اور اس فیملی سسٹم کے تباہ ہونے کے نتیجہ میں ہمیں جو نقصانات اٹھانے پڑے ہیں وہ نقصانات ان فوائد سے زیادہ ہیں جو پروڈکشن کے اضافہ کے نتیجہ میں ہمیں حاصل ہوئے لہٰذا میں اپنے ملک میں پروسٹرائکا کے نام سے ایک تحریک شروع کر رہا ہوں اس میں میرا ایک بہت

بنیادی مقصد یہ ہے کہ وہ عورت جو گھر سے باہر نکل چکی ہے۔ اس کو واپس گھر میں کیسے لایا جائے۔ اس کے طریقے سوچنے پڑیں گے۔ ورنہ جس طرح ہمارا فیملی سسٹم تباہ ہو چکا ہے اسی طرح ہماری پوری قوم تباہ ہو جائے گی۔'' (اصلاحی خطبات ۱۴۴، مولانا محمد تقی عثمانی)

پردہ سے عورتوں کی حق تلفی نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ عورتوں کے حقوق کی پامالی سے بچاؤ کے لئے بہترین ڈھال کا کام دیتا ہے۔ تجربہ کر کے دیکھ لیں، جس معاشرہ میں پردہ کا رواج ہوگا وہاں عورتوں پر دست درازی اور ان پر ظلم وتعدی کی شرح یقینی طور پر نہایت معمولی ہوگی۔ دراصل عورت کے حق کو پامال کرنے والے وہ لوگ ہیں جنھوں نے محض اپنی مطلب برآری اور لذت کوشی کے لئے عورت کو دنیا کی چمک دمک کا لالچ دے کر اسے گوشۂ عافیت سے نکال کر دنیا کے حقیر بکاؤ مال میں تبدیل کر دیا ہے۔ اور ساری دُنیا کی خدمت گذاری کے کاموں پر لگا کر اسے ذلیل کر کے رکھ دیا ہے۔ اور پھر یہی لوگ ''برعکس نام نہند زنگی را کافور'' کا مصداق بن کر اپنے آپ کو عورت کا سب سے بڑا ہمدرد کہتے نہیں تھکتے۔ یا للعجب۔

گھر سے باهر نه نكلنے كا حكم :

عورت کا بے محابا گھر سے نکلنا ہی اصل فتنے کی بنیاد بنتا ہے۔ اس لئے اسلامی شریعت نے عورت کو گھر میں رہنے کا حکم دیا۔ پھر نہ صرف یہ کہ انھیں کمانے کی مشقت سے آزاد کر دیا بلکہ وہ تمام عبادات و فرائض بھی ان سے ساقط کر دیئے جن میں اسے گھر سے باہر جانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ مثلاً:

(الف) عورت پر جہاد فرض نہیں۔

(ب) عورت پر جمعہ وعیدین واجب نہیں۔

(ج) عورت کے ذمہ جماعت سے نماز پڑھنا ضروری نہیں۔

(د) اسی طرح بغیر محرم اور شوہر کے اسے اکیلے سفر پر جانے کی بھی اجازت نہیں۔ اس لئے کہ اکیلے سفر کرنے میں اس کی عزت اور عفت وعصمت کو برابر خطرہ لگا رہتا ہے۔ یعنی بلا ضرورت عورت کا گھر سے باہر نکلنا شریعت کی نظر میں بالکل پسندیدہ نہیں ہے۔ ایک حدیث میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ عورت جب گھر سے باہر نکلتی ہے تو شیطان اس کی تاک میں رہتا ہے۔ (مشکوٰۃ ۲/ ۲۶۹)

اجنبیوں سے اختلاط پابندی :

نامحرم لوگوں سے اختلاط بھی سخت فتنے کا موجب بنتا ہے۔جس سے عورت کی عزت داغدار ہوجاتی ہے۔اس لئے شریعت میں نامحرم مردوعورت کے اختلاط اوران کی ملاقاتوں پر بھی سخت نکیر کی گئی ہےایک حدیث میں ہے کہ''دواجنبی مردوعورت جب تنہائی میں اکٹھے ہوتے ہیں توان میں کا تیسرا شیطان ہوتا ہے''۔(مشکوۃ شریف ا/۱۲۰) جوانھیں معصیت پر آمادہ کرتا ہے۔ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ''آدمی کے سر میں اگر لوہے کی میخ ٹھوک دی جائے۔تو یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ کسی غیر عورت کو ہاتھ لگائے''۔اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ''آدمی کا کیچڑ اور مٹی میں لتھڑے ہوئے خزیر سے لت پت ہوجانا اس سے بہتر ہے کہ اس کا کندھا کسی ایسی عورت کو چھوئے جواس کے لئے حلال نہ ہو''۔(الترغیب والترہیب۳/ ۳۹)

آج کے آزاد معاشرہ میں جنسی بے راہ روی اور زیادتیوں کا سبب یہی مردوعورت کا بے محابا اختلاط ہے جس نے انسانیت اورنسوانیت کی قدروں کوتارتار کردیا ہےاور گھر گھر بدکاریوں کوجنم دیا ہے۔آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک کالج میں پڑھنے والے جوان لڑکےاورلڑکیاں،ایک دفتر میں بیٹھ کرخوش گپیاں کرنے والے ملازم مرداورعورتیں ایک جگہ رہیں اور پھر بھی فتنہ میں مبتلا نہ ہوں۔ان کے مضر اثرات سے بچنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ اس اختلاط پر سخت گیری کے ساتھ بند لگایا جائے۔اس کے بغیر عورت کے تحفظ کا سوال ہی پیدانہیں ہوتا۔

حکمرانی پر پابندی:

شریعت میں عورت کی قیادت وسیادت پر بھی روک لگادی گئی ہے اس میں بھی قوم کے ساتھ ساتھ خودعورت کے تحفظ کا خیال رکھا گیا ہے۔اس ممانعت کی ایک وجہ تو ظاہر ہے کہ عورت اپنی فطری کمزوری اور انفعالی مزاج کی بنا پر کاروبار حکومت بہتر ڈھنگ سے نہیں چلاسکتی۔اسی وجہ سے حدیث میں فرمایا گیا کہ''وہ قوم کبھی فلاح یاب نہیں ہوسکتی جو کسی عورت کو اپنا حکمراں بنالے''۔ (بخاری شریف۲/۱۰۵۲)اور دوسری وجہ یہ ہے کہ حکمرانی کے لئے گھر سے باہر نکلنا، رعایا کی خبر گیری کرنا، کارکنان حکومت سے خلوت وجلوت میں مشورے لینا اورانھیں ہدایات دینا ناگزیر ہوتا ہے۔ظاہر

ہے کہ یہ سب لوگ عورت کے محرم نہیں ہو سکتے۔لہٰذا اگر عورت حکمرانی کرے گی تو لازماً اسے اپنے تحفظات کے شرعی حدود سے باہر آنا پڑے گا جو اس کے لئے موجب ہلاکت ہے۔ام المومنین سیّدنا حضرت عائشہ صدیقہؓ جب جنگ جمل کے موقع پر ایک بڑی جمعیت کے ساتھ تشریف لے گئیں تو آپ کا یہ فعل حضرات صحابہؓ کو ناگوار گذرا اور ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو ایک اثر انگیز خط لکھا۔جس میں یہ الفاظ تھے۔

وَلَوْ عَلِمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلّٰى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّ النِّسَاءَ يَحْتَمِلْنَ الْجِهَادَ عَهِدَ اِلَيْکَ، اَمَا عَلِمْتِ اَنَّهُ قَدْنَهَاکِ عَنِ الْفَرَاطَةِ فِى الْبِلَادِ، فَاِنَّ عَمُوْدَ الدِّيْنِ لَا يَثْبُتُ بِالنِّسَاءِ اِنْ مَالَ وَلَا يُرَابُ بِهِنَّ اِنْصَدَعَ جِهَادُ النِّسَاءِ غَضُّ الْاَطْرَافِ وَضَمُّ الذُّيُوْلِ وَقَصْدُ الْوَهَازَةِ. (العقد الفريد ٥/٦٦ –بحواله احسن الفتاوى٦/١٧٢)

اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوتا کہ خواتین پر جہاد کی ذمہ داری ہے تو وہ آپ کو اس کی وصیت کرتے۔کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو شہروں میں آگے بڑھنے سے روکا تھا۔اس لئے کہ اگر دین کا ستون متزلزل ہونے لگے تو وہ عورتوں کی وجہ سے کھڑا نہیں ہوسکتا۔اور اگر اس میں شگاف پڑ جائے۔تو عورتوں سے اس کا بھراؤ ممکن نہیں۔عورتوں کا جہاد یہ ہے کہ وہ نگاہ نیچی رکھیں، دامنوں کو سمیٹیں اور چھوٹے قدموں سے چلیں۔

عورتوں کا حکمراں بننا:

تو یہاں حکم شرعی بے شک یہی ہے کہ عورت کو مطلق العنان اور با اختیار حکمران اور وزیر اعظم بنایا بنانا شریعت میں جائز نہیں ہے۔اور کسی اسلامی ملک میں اگر مسلمان اپنا قائد کسی عورت کو اپنے اختیار سے بنائیں گے تو وہ سب گنہگار ہوں گے اور حدیث نبوی کی رو سے عدم فلاح کے مستحق ہوں گے۔

لیکن جمہوری حکومتوں میں ایک اور پہلو سامنے آیا ہے کہ وہاں حکومت کے مشیروں کے طور پر قانون ساز انتظامی اداروں (مثلاً پارلیمنٹ، اسمبلی یا نگر پالیکا وغیرہ) کے ممبر بنائے جاتے ہیں، جن کے مشورے پر حکومت چلائی جاتی ہے۔تو سوال یہ ہے کہ ان اداروں کی ممبری کا منصب عورت کو دینا

درست ہے یا نہیں؟ اس صورت میں عورت ممبری حاصل کر کے حکمراں نہیں بنتی۔ بلکہ حکومت کی مشیر کی حیثیت میں رہتی ہے اور شریعت میں عورت کو مشیر بنانے یا اس سے وقتی طور پر مشورہ لینے کی کوئی ممانعت موجود نہیں ہے۔ اسی بنیاد پر حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے (امدادالفتاویٰ ۵/۹۱-۹۳ میں) اور مفتی اعظم ہند حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلویؒ نے کفایت المفتی (۹/۴۵۶) میں اس طرح کی مشاورتی حکومتوں میں عورتوں کی ممبری کی اجازت دی ہے۔ لیکن یہ اجازت اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ شرعی حدود اور حجاب کی پابندی کے ساتھ ہو۔ یعنی نہ تو بے پردہ ہو کر عورت اجنبی مردوں کے سامنے آئے نہ ان سے بے محابا اختلاط ہو، اور نہ کسی اجنبی کے ساتھ خلوت کا موقع ہو۔ اور ان حدود کی رعایت جبھی ممکن ہے جبکہ عورت خود اجلاس میں آ کر اپنی رائے نہ بیان کرے بلکہ اس کے اور دیگر ممبران کے درمیان کسی محرم مرد کا واسطہ ہو یا اور کوئی شرعی طریقہ ہو جس سے اس کی رائے سے استفادہ کیا جائے۔ اس کے بغیر شرعی حدود کی رعایت ہو ہی نہیں سکتی۔

ظاہر ہے کہ یہ رعایت کسی اسلامی ملک میں تو شاید ممکن ہو سکے۔ لیکن ہندوستان جیسے ملک میں ان حدود کی رعایت قطعاً ممکن نہیں ہے تو یہاں نفس ممبری کے جواز کے ذریعہ کسی بھی مسلمان عورت کو دامن حیا تار تار کر کے بے حجابی کی ہرگز اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اور نہ کسی مفتی کو اس کا اختیار ہے۔ الغرض ان اداروں کی ممبری کے معاملہ میں اصل مسئلہ ان کے جواز یا عدم جواز کا نہیں بلکہ حجاب اور بے حجابی کا ہے۔ اگر بالفرض کہیں حجاب اور حدود شرعیہ کے ساتھ ممبری کے فرائض کی انجام دہی کا امکان ہو تو گنجائش ہوگی ورنہ نہیں۔

عورت کو ووٹ دینا:

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اگر عورت خود امیدوار بن جائے تو اب ووٹ دینے والے کیا کریں؟ تو یہاں چند صورتوں کے احکامات حالات کے اعتبار سے الگ الگ ہوں گے۔

(الف) اگر حکومت اسلامی ہو اور عورت کو بااختیار حکمراں بنایا جا رہا ہو (وزارت عظمیٰ یا ملکۂ عظمیٰ) تو اس کے حق میں ووٹ دینا از روئے حدیث ممنوع ہے اس کے مقابلہ میں مرد کو اس منصب پر فائز کرنا ضروری ہے۔

(ب) اگر اسلامی ملک نہ ہو اور کسی عورت (مسلمہ یا غیر مسلمہ) کو بااختیار حکمراں بنایا جارہا ہو اور اس کے مقابلہ میں کوئی ایسا امیدوار ہو جس کی کامیابی سے مسلمانوں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں دفع مضرت کی غرض سے اہون البلیتین (دو مصیبتوں میں سے کمتر مصیبت) کو اختیار کرتے ہوئے مذکور امیدوار عورت کو ووٹ دینے کی گنجائش ہے۔

(ج) اگر اسلامی ملک ہو اور عورت کسی ادارے کی رکنیت اور ممبری کے لئے امیدوار ہو تو صرف اسی صورت میں ووٹ دینے کی اجازت ہے۔ جبکہ شرعی حدود کی رعایت رکھتے ہوئے ممبری کا کام انجام دیا جاسکے۔

(د) غیر اسلامی ملک میں بھی اولاً یہ دیکھا جائے کہ کون سی عورت حجاب کی رعایت رکھ سکے گی اور کون نہیں رکھ سکے گی۔ جس کے بارے میں اطمینان ہو اسے ہی ووٹ دیا جائے۔ جیسا کہ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلویؒ نے لکھا ہے کہ ''اگر اس کا اطمینان ہو کہ عورتیں حجاب شرعی کی رعایت رکھیں گی اور کسی نامشروع فعل کی مرتکب نہ ہوں گی۔ تو ان کو ووٹ دینا مباح ہوگا''۔ (کفایت المفتی ص۴۵٦ جلد۹)

(ہ) اگر کسی جگہ مقابلہ میں آنے والی سبھی عورتیں بے پردہ ہوں یا ان میں سے کسی کا بھی شرعی حدود میں قائم رہنا بظاہر غیر ممکن ہو، یا بے پردہ مسلم عورتوں کا مقابلہ غیر مسلم عورتوں سے ہو اور ان غیر مسلم عورتوں کی کامیابی سے مسلمانوں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو اس صورت میں بھی دفع مضرت کے لئے دو مصیبتوں میں سے کمتر مصیبت کو اختیار کرتے ہوئے اس عورت کو ووٹ دینے کی گنجائش ہوگی جو بظاہر مسلمانوں کے حق میں زیادہ مفید ہو۔ جیسا کہ بہت سی جگہوں میں غیر مسلم مرد کے مقابلہ میں مسلمان فاسق مرد کو ووٹ دینے کی اجازت دی جاتی ہے۔ بلکہ قومی اور ملی مفاد کے حصول کے لئے بھی غیر مسلم کی حمایت کی جاتی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ بے پردہ عورت معصیت سے بری قرار دی جائے بلکہ وہ جب تک شرعی حدود کی پابندی نہ ہوگی۔ ہرگز معصیت سے بری نہیں ہوسکتی۔

ملکی صورتِ حال:

یہ تو شرعی صورتوں کا بیان ہوا۔اب ان کی روشنی میں ہمیں اپنے ملک کے حالات کا جائزہ لینا چاہئے۔ ہندوستان کے دستور میں یہ بات لکھی گئی ہے کہ اقتدار حکومت میں صنف کی بنیاد پر کوئی فرق نہیں کیا جائے گا۔اسی کا سہارا لیتے ہوئے مغربی تہذیب اور عالمی تبدیلیوں سے متاثر ہوکر عورتوں کو اقتدار میں حتمی حصہ دار بنانے کے عنوان سے لوکل باڈیز سے لے کر پارلیمنٹ تک تمام اداروں میں خواتین کے لئے ایک تہائی سیٹیں محفوظ کرنے کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔تاکہ ان اداروں میں عورتوں کا پہنچنا یقینی بنایا جاسکے اس منصوبہ میں دانستہ یا نادانستہ طور پر یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ خاص کر مسلم اکثریتی حلقوں میں خواتین کے لئے نشستیں محفوظ کی گئی ہیں، اب اگر وہاں مسلم عورتیں امیدوار نہ ہوں تو یہ سب سیٹیں دوسروں کے ہاتھ میں چلی جائیں گی۔اوراگر امیدوار بنیں تو پھر بظاہر شرعی حدود کی پابندی ممکن نہیں ہے،تو اب ایسی جگہ کے مسلمانوں کو کیا کرنا چاہئے۔ یہ اصل سوال ہے جس کا جواب گذشتہ تفصیل سے واضح ہو چکا ہے کہ!

مسئلہ تو یہی ہے کہ چونکہ شرعی حدود کی رعایت رکھنا یہاں سخت دشوار ہے اس لئے عورتوں کو امیدوار بننے کی اجازت نہیں۔لیکن اگر کوئی عورت اس حکم کے علی الرغم کھڑی ہوجائے تو دیکھ لیں کہ وہ اپنے مقابل امیدوار عورت کے مقابلہ میں قوم کے لئے زیادہ مفید ہے یا نہیں اگر مفید ہو تو اسے ووٹ دے کر کامیاب بنانے کی اجازت ہے۔

اور ساتھ میں اپنے تمام وسائل استعمال کرتے ہوئے مسلم اکثریتی علاقوں کو خواتین کے محفوظ کرنے پر حکومت سے مؤثر احتجاج کرنا چاہئے۔اور کوشش کرنی چاہئے کہ یہ علاقے عورتوں کے لئے خاص نہ قرار دیئے جاسکیں؛ کیوں کہ اگر ہم مسئلہ مسائل میں الجھے رہے اور حکومت سے احتجاج نہ کیا تو دستور کا سہارا لے کر کل اس سے بھی خطرناک صورت حال سے ہمیں دوچار ہونا پڑ سکتا ہے۔

(ندائے شاہی،نومبر ۱۹۹۶ء)

مدارسِ اسلامیہ

مغربیت کے جنون میں ہوش کا چراغ

آج پورے عالم میں مغربیت کا رعب چھایا ہوا ہے۔ ہر شخص اور ہر ادارہ اس کوشش میں ہے کہ وہ اپنے کو مغربیت کے طور طریق میں ڈھال کر سرخرو ہو جائے۔ افکار وخیالات سے لیکر اعمال و کردار میں مغربیت اس دور میں محبوب ومقبول بن چکی ہے۔ لباس مغربی، تراش وخراش مغربی، کردار مغربی، انداز مغربی، معاشرہ مغربی، رہن سہن مغربی، الغرض ہر چیز مغربی رنگ میں رنگین ہے۔ یہ مغربیت آج اس ماحول میں بھی رچ اور بس گئی ہے جو اپنے کو اسلامی نام سے موسوم کرتا ہے۔ بڑے بڑے دیندار لوگ بھی باعزت محفلوں میں جب جاتے ہیں تو ایسی ہیئت میں جاتے ہیں کہ اسلامی شناخت کا شائبہ بھی نہ ہونے پائے۔ تقریبات میں مغربی طرز اپنانا معیار شرافت گردانا جاتا ہے۔ سنت کے آداب و مستحبات رخصت ہو چکے ہیں۔ کھانے پینے میں فخریہ بائیں ہاتھ کا استعمال عام ہے۔ ننگے سر رہنا اور ٹخنہ کو بند رکھنا موجب شرافت ہے اور کھڑے کھڑے کھانا باعث افتخار ہے۔ الغرض زندگی مغربی تکلفات کے بوجھ تلے دب چکی ہے اور کوئی اس بوجھ کو اتار دینے کو تیار نہیں۔ بلکہ اس ''بوجھ'' کو انسانیت کے نام نہاد ''ارتقاء'' کا نام دے دیا گیا ہے۔ اور جو اس کے خلاف کرتا ہے اور مغربی مرعوبیت کو قبول نہیں کرتا اسے قدامت پسند اور دقیانوسیت جیسے الفاظ سے نوازا جاتا ہے۔ یہی ماحول آج مسلم ممالک کی اسلامی یونیورسٹیوں کا بھی ہے کہ وہاں اگرچہ دینی علوم کی تعلیم کا نظم ہے لیکن طرز تعلیم اور طور طریقے سب وہی ہیں، جو مغربی یونیورسٹیوں کا خاصہ ہیں۔ کرسیوں اور میزوں پر پڑھائی ہوتی ہے۔ اسلامی لباس کی کوئی پابندی نہیں، دیکھ کر یہ اندازہ نہیں لگایا جاسکتا ہے کہ یہ طالب علم دینیات کا ہے یا کسی اور شعبے کا یعنی

ظاہری طور پر اسلامی امتیازات ختم ہوتے جارہے ہیں اور عملی اعتبار سے سہولت پسندی اور آزاد روی عام ہے۔

ایسے ماحول میں ہندو پاک کے عربی دینی مدارس کا نظام بسا غنیمت ہے۔ یہاں ابھی تک الحمدللہ پرانے دور کے آثار اور مناظر محسوس طور پر نظر آتے ہیں۔ ہمارے زمانۂ طالب علمی میں کویت کے علماء کا ایک وفد دارالعلوم دیوبند آیا تھا جس کے سربراہ کویت یونیورسٹی کے شعبہ اصولِ فقہ کے رئیس شیخ محمد حسن ہیتو تھے۔ان حضرات کی تشریف آوری پر دارالعلوم دیوبند میں ایک باوقار جلسہ استقبالیہ منعقد کیا گیا جس میں تقریر کرتے ہوئے شیخ محمد حسن ہیتو نے دارالعلوم کے طریقہ تدریس سے متاثر ہوکر فرمایا تھا۔

> ’’بخدا یہ دیکھ کر میری آنکھیں آنسوؤں سے تر ہوگئیں کہ آپ کے یہاں زمین پر بیٹھ کر علومِ نبوت کے دریا بہائے جاتے ہیں۔ میرے نزدیک علوم کے برکت کا راز انہی آداب میں سربستہ ہے۔ جب سے ہم نے اس مبارک طریقہ کو چھوڑ کر کرسیوں اور ڈیکسوں پر پڑھانا شروع کیا ہے، ہماری یونیورسٹیوں اور تعلیم گاہوں سے جاہل علماء نکلنے لگے ہیں۔اور علم کا اثر رخصت ہو چلا ہے۔‘‘

آپ نے فرمایا:

> ’’میں بہت سے اسلامی وغیر اسلامی ممالک کا سفر کر چکا ہوں لیکن جو طریقۂ درس اور علم کی روشنی میں نے یہاں محسوس کی ہے اس کی مثال نہیں ملتی ہے۔‘‘

دارالعلوم دیوبند اور اس کے لئے نہج پر چلنے والے اداروں کے بارے میں ایک عرب عالم کا یہ تاثر پوری ملّت اسلامیہ ہند کے لئے باعث افتخار ہے۔اور اس امتیاز کا اصل سبب صرف یہ ہے کہ ان اداروں میں ابھی تک کافی حد تک سلف صالحین کے طریقوں کا اجرا اور دین حنیف کی اتباع کا جذبہ پایا جاتا ہے تجربہ یہ بتاتا ہے کہ اپنے شعائر اور شناخت کی بقاء ہی ترقی کی بنیاد اور امتیاز کی علامت ہے۔ اگر یہ دینی ادارے مغربی رو میں بہہ جائیں تو پھر معاشرہ میں ان کی کوئی

وقعت اور مقام باقی نہیں رہ سکتا کیونکہ یہ کتنا ہی بدل جائیں مغرب پسندوں کی منشا کو کبھی پورا نہیں کر سکتے۔اس لئے لازم ہے کہ دینی ادارے اور مدارس اپنی روایتی پہچان کو برابر بنائے رکھیں اور ماحول کے زہریلے اثرات سے متاثر ہوئے بغیر پوری قوت کے ساتھ اکابر کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن رہیں اور مادّیت کے عروج کی طرف توجہ کے بجائے روحانیت، دینی تربیت اور معیار تعلیم کی ترقی کی طرف پوری توجہ مرکوز رکھیں۔قوم وملّت کا مفاد اسی میں ہے۔اللہ تعالیٰ ہمیں استقامت عطا فرمائے۔آمین۔

(ندائے شاہی، مارچ ۱۹۹۹ء)

اور — اسپین جواب دیتا

اندلس اور غرناطہ کی تاریخ کے اوراق میرے سامنے کھلے ہوئے تھے، نہ جانے کتنی دیر سے میں اسپین کی کربناک اسلامی تاریخ کے مطالعہ میں مصروف تھا۔ پے در پے ناکامی، بزدلی اور ذلت ونکبت کے واقعات پڑھ کر میری آنکھوں سے نیند اچاٹ ہو چکی تھی۔ - - یہ وہی اسپین ہے جس نے یورپ کو انگلی پکڑ کر ترقی کی راہ پر چلنا سکھایا، یہ وہی اندلس کی بدنصیب سرزمین ہے جہاں روشن ہونے والی تہذیب کی شمعوں نے مغرب کے ظلمت کدہ کو قمقہ زار بنادیا۔ جہاں کی وادیوں میں سالہا سال غازیان اسلام نے نغمہ سرائی کی۔ اور جہاں کی آبادیاں صدیوں تک علمی مباحثوں اور مذاکروں سے گونجتی رہیں۔ اور جہاں اسلامی پرچم آٹھ سو سال تک بلا شرکت غیرے پوری آب وتاب کے ساتھ لہراتا رہا۔ میرے سامنے غازی اسلام طارق ابن زیاد کی بارہ ہزار فوج کا کارنامہ بھی تھا، جس نے اپنے مثالی عزم سے ایک لاکھ سے زیادہ ٹڈی دل دشمن کی فوج کو سرنگوں ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ میری نگاہوں میں اندلس کے اسلامی دماغوں کی وہ نئی نئی ایجادات اور اختراعات بھی تھیں جنھوں نے دنیا کو نئے دور میں داخل کر دیا تھا اور اندلس کے وہ کتب خانے بھی کم دلچسپی کے حامل نہ تھے جن میں ہمہ وقت ہزار ہا ہزار نادر ونایاب کتابوں کا ذخیرہ موجود رہتا تھا اسی کے ساتھ مجھے ان خانہ جنگیوں اور اقتدار کی رسہ کشیوں کا بھی علم تھا جنھوں نے اندلس میں اسلامی حکومت کی جڑیں کھوکھلی کر دیں تھیں اور بغض وعداوت کی آگ میں جلنے والے ان عیسائیوں کی ریشہ دوانیوں کو بھی جانتا تھا جنھوں نے اسپین سے اسلام کا نام ونشان مٹا دینے کا عزم کر رکھا تھا۔ اخیر میں تاریخ کے حوالے سے میرے سامنے وہ حالات بھی آئے جب اندلس سے اسلام کا نام ونشان

مٹ گیا۔ عالی شان مسجدیں اور دینی مراکز کھنڈر میں تبدیل ہو گئے۔خون مسلم کی ارزانی سے اندلس کی سرزمین رنگین ہوگئی۔اورعیسائی ظالموں نے آٹھ سوسالہ پرانی اسلامی مملکت کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔

پڑھتے پڑھتے یکا یک مجھے محسوس ہوا کہ اندلس کے اسلامی کھنڈرات،ٹوٹے پھوٹے آثار، کتب خانوں کی جلی ہوئی کتابیں اور خاک وخون میں تڑپتے ہوئے مسلمانوں کی لاشے میرے سامنے ہیں اور میں ان کے درمیان غم وافسردگی کے عالم میں کھڑا ہوں۔کچھ ہی لمحات گذرے تھے کہ میرا جی چاہا کہ میں ان سے خطاب کرکے اپنے دلی جذبات کوالفاظ کے پیکر میں ڈھال دوں، زبان نے اجازت لی، دل نے اجازت دی اور پھرقوت گویائی اپنے جوہر اس طرح دکھانے لگی۔

اے اسپین کے لالہ زارو ! اندلس کی وادیو ! اورغرناطہ کے صحراؤ !دنیانے تم سے تہذیب وتمدن کا درس لیا،ترقی کی راہوں میں تمہارے نقوش قدم مشعل راہ ثابت ہوئے،تم نے اسلامی علوم ہی نہیں بلکہ دنیا کے مروجہ علوم کوبھی بام عروج پر پہنچانے میں اہم کردارادا کیا۔قرطبہ کی جامع مسجد، اندلس کا قصرالحمراءاوراسلامی دورحکومت کے پرشکوہ آثارتمہارے کارناموں کے عینی گواہ ہیں۔

۸۰۰سال میں پیڑھیاں بدل جاتی ہیں۔دنیا کی رفتاراورطورطریقے تبدیل ہوجاتے ہیں،تم اس طویل مدت میں غازیان اسلام کے قدم چومتے اوران کے راہوں میں پھول نچھاورکرتے رہے بارہاان کے استقبال کے لئےتم فرش راہ بن گئے۔لیکن مجھے یہ پوچھنے کی اجازت دو۔کہ جب اسلامی حکومت کا جنازہ تمہاری شاہراہوں سے گذراتو تمہارے رگ وریشہ میں بس جانے والے اسلامی جذبے نے مزاحمت کیوں نہیں کی؟ یہاں کے اسلامی ذروں نے اتنی جلدی کفرکی غلامی کیسے قبول کرلی تمہاری مسجدوں نے کفر کے پیغامبرعیسائیوں کے سامنے سرڈالنا کیسے گوارہ کیا۔؟تم نے اپنے جاں بازسپوت موسیٰ بن ابیل غسانی کے جرات مندانہ حوصلے کا ساتھ کیوں نہیں دیا۔؟اگرتم نے ذرا عزم وحوصلہ سے کام لیا ہوتا تو تاریخ اسلامی اسپین کی سیاہ تاریخ سے داغدار نہ ہوتی اوردشمنان اسلام دینا کے دیگرعلاقوں میں اسپین کی تاریخ دہرانے کی جسارت نہ کرپاتے۔

اے اسپین! وقت کے مورخ آئیں گے اور تجھ سے پوچھتے رہیں گے کہ آخر مسلمانوں کا قصور کیا تھا کہ تو نے ان کے ہزار احسانات کے باوجود اپنے یہاں سے ان کے آثار تک کو مٹا دیا۔ کیا اس سے بڑھ کر کوئی احسان فراموشی اور بے وفائی کی مثال ہو سکتی ہے؟۔

اے قرطبہ، اندلس، غرناطہ اور اطلیلہ کی سرزمین! تیری شہرت کو اوج ثریا پر پہونچانے والے مسلمان تیری بے وفائی کے شاکی ہیں تو ہی بتا! کیا احسان کا بدلہ اسی طوطہ چشمی سے دیا جاتا ہے؟ جس کا تو نے اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ مظاہرہ کیا ہے۔ کاش! تو نے بھی ہندوستان کی سرزمین کی طرح اسلام دوستی کا نمونہ پیش کیا ہوتا۔ جہاں صدیوں انگریزی حکومت اور غیروں کی اکثریت رہنے کے باوجود آج بھی اسلامی تہذیب کی نشانیاں صفحہ گیتی پر روشن ہیں۔ مسجدوں سے اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ مدرسوں میں قال اللہ اور قال الرسول کے زمزمے گونجتے ہیں اور چپہ چپہ پر اسلامی آثار کے نقوش نمایاں ہیں''۔

یہ الفاظ سن کر اسپین کے کھنڈرات اور مظلوم مسلمانوں کے بے جان لاشے انگڑائی لینے لگے۔ وہ جذبات کے طوفان کا جواب دینا چاہتے تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ اگر رب ایزدی انہیں گویائی عطا کرتا تو وہ رندھی ہوئی آواز میں یوں گویا ہوتے۔

''اسلام ہماری عزت، مسلمان ہمارے محافظ اور دین محمدی ہماری زندگی ہے۔ ہم نے اپنی زندگی کے کسی لمحے میں بھی اسلام اور اس کے پیروکاروں سے بے اعتنائی نہیں برتی، ہم ان کے لئے آج بھی دیدۂ ودل نچھاور کرنے کے متمنی ہیں۔ مگر اسے ہماری بدبختی کہئے یا قوم مسلم کی محرومی کہ یہاں اسلامی اقدار کی حفاظت اور مسلمانوں کی مذہبی شناخت برقرار رکھنے کے لئے حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور قطب عالم امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی وغیرہ جیسا کوئی دردمند پیدا نہ ہو سکا۔ جس کی وجہ سے ہم دیوبند کے دارالعلوم، سہارنپور کے مظاہر علوم، اور مرادآباد کے مدرسہ الغرباء قاسم العلوم مدرسہ شاہی جیسے مدارس سے محروم رہے۔ ہماری وہ علمی مجلسیں جو حکومت کے بل بوتے پر چلتی تھیں حکومت ختم ہوتے ہی ویرانی کی داستان سنانے لگیں۔ اگر

ہمارے یہاں کے مدبر بھی اس راہ پر گامزن ہوتے جو نازک وقت میں ہندوستان کے مخلص علماء نے اپنائی تھی تو ہمارے ماتھے پر اسلام سے بے اعتنائی اور بے وفائی کا داغ نہ لگتا اور ہمارے علمی سوتے مخلص رجال کار کی تیاری سے خشک نہ ہوتے۔ ہمیں ہندوستان کی سرزمین پر رشک آتا ہے جس کی کوکھ سے ایسے عبا قرامت نے جنم لیا۔ جنھوں نے نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے عالم میں دین کی شمعیں روشن کر دیں۔ اور ہندوستان کو تو انہوں نے رشک عالم بنا دیا اگر ان کی جدوجہد شامل حال نہ ہوتی تو ہندوستان کا حال بھی ہم سے مختلف نہ ہوتا۔ ہم تاریخ کے واسطے سے ہندوستان کو ہدیۂ تبریک پیش کرنا چاہتے ہیں اور اپنی اوپر گذری ہوئی داستان عبرت کے بنا پر یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ جب تک یہ سرزمیں دینی مدارس کے ثمرات سے مستفیض ہوتی رہے گی یہاں اسلام کی جڑیں مضبوط سے مضبوط تر رہیں گی۔ ''انشاء اللہ تعالیٰ'' اور دنیا کی کوئی طاقت ان مدارس سے نکلنے والے ٹھوس عقیدے اور عزم وحوصلہ کے پیکر خادمان اسلام کا سامنا کرنے کی جرأت نہ کر سکے گی''۔

''اسپین'' کا یہ جواب کسی بھی منصف مزاج شخص کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی تھا۔ دارالعلوم دیوبند، مدرسہ شاہی مرادآباد اور اسی فکر سے تعلق رکھنے والے دیگر مدارس کی عظمت واہمیت میرے سامنے روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی اور میرے ہاتھ بے اختیار بارگاہ ایزدی میں اٹھ گئے۔ اے پروردگار عالم! یہ دین کے قلعے دینی مدارس اپنی بقا کے لئے تیری رحمت اور توجہ کے محتاج ہیں، تو انہیں اپنے فضل سے آباد رکھ اور اس سلسلہ کے بانیوں کی قبروں کو نور سے منور کر، اور جو اس تحریک کی بقا میں کسی طرح بھی شریک ہیں یا شریک رہے ہیں ان کو جزائے خیر مرحمت فرما۔ آمین۔

(ندائے شاہی، ''تاریخ شاہی نمبر'' (نومبر، دسمبر ۱۹۹۲ء)

○❖○

علم یا معاش

اب سے تقریباً ۱۲؍سال پہلے کا واقعہ ہے۔ امروہہ کی جامع مسجد میں ایک سیرت کا جلسہ تھا۔ جس میں مہمان خصوصی کے طور پر ایک مشہور دانشور صاحب کو دعوت دی گئی تھی۔ بچپن کا زمانہ تھا، زیادہ شعور نہیں تھا۔ البتہ اتنی بات ضرور یاد رہ گئی کہ موصوف نے اپنی تقریر میں ایک ایسی غلط دانشوری کردی تھی کہ ہماری بے شعوری کو بھی شعور آ گیا تھا۔ اور ہمارے بعض احباب تو اس قدر چراغ پا ہوگئے تھے کہ بس چلتا تو وہ بھرے مجمع میں مقرر صاحب کی ادعائی دانشوری کے کس بل نکال دیتے۔ مگر مصلحت کا خیال اور مدرسہ سے وابستگی کی نزاکت نے انھیں اس حسرت کے نکالنے سے باز رکھا تھا۔ دانشور صاحب اگر اپنی نسبت سے دانشوری بگھارتے تو شاید ہمارے کان پر جوں بھی نہ رینگتی۔ مگر غصّہ کی بات یہ تھی کہ صاحب موصوف نے دانشوری کا رنگ احادیث شریفہ میں گھولنے کی جسارت کردی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت وسیرت سے سراپا بیزار اور یہود ونصاریٰ کے تمدن کے ظاہری مبلغ ہونے کے باوجود انھوں نے زبردستی محدثانہ منصب پر براجمان ہوتے ہوئے بڑے طمطراق اور چیلنج کے انداز میں یہ ارشاد فرمایا تھا کہ:

’’احادیث شریفہ میں جہاں بھی علم کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے مثلاً:

اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ بِالصِّيْنِ فَاِنَّ طَلَبَ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ .

(فیض القدیر۱/ ۶۷۵)

’’علم حاصل کرو اگرچہ وہ چین میں ہو اس لئے کہ علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر ضروری ہے۔‘‘

اس میں علم دین ہی کی تخصیص نہیں ہے بلکہ دنیا کا ہر علم مراد ہے۔ اور کٹھ ملاؤں نے ان ہدایات کو صرف علم دین کے ساتھ جو خاص کیا ہے اس کی کوئی دلیل نہیں ہے یہ محض ان کی ذہنی اپج ہے‘‘۔

ترجمانی:

موصوف نے جو ارشاد فرمایا تھا وہ ان کا ذاتی خیال ہی نہ تھا۔ بلکہ یہ دراصل پورے طبقۂ دانشوراں (جو برعکس نام نہند زنگی را کافور کے پورے مصداق ہیں) کی ترجمانی تھی۔ اگر آپ کو یقین نہ ہو تو آج بھی تحقیق کر کے دیکھ لیجیے۔ پوش کالونیوں کے ڈرائنگ روموں پر کان لگائیے، عصری یونیورسٹیوں کے سیمیناروں میں بیٹھئے، موقع ملے تو کسی وائس چانسلر سے انٹرویو کا شرف حاصل کیجیے، زیادہ فرصت نہ ہو تو کم از کم روزمرّہ کے اخبارات میں مراسلات کا کالم اور مضامین کا صفحۂ سیاہ ضرور پڑھ لیجیے۔ ہر جگہ آپ کو یہی خیال سطور یا بین السطور میں جھلکتا نظر آئے گا۔ اور اس کی تان یہاں آ کر ٹوٹے گی کہ ''مدارس دینیہ میں علوم عصریہ کی تعلیم لازمی ہونی چاہئے''۔

ٹسوے:

اس مخصوص طبقہ نے اب دینی سرگرمیوں پر ٹسوے بہانا اپنا شعار بنا لیا ہے جب دیکھو کوئی نہ کوئی دانشور کسی نہ کسی مسلم مسئلہ پر بے چین ہے اور دینی مدارس کی فکر نے تو ان کی نیند ہی حرام کر دی ہے۔ ہائے! ان مدرسوں نے قوم کی ترقی روک لی۔ وائے! ان اداروں نے ملّت کو بے روزگار بنا دیا۔ افسوس! مدرسے ملت کے لئے ناسور بن گئے۔ آہ! مدرسوں نے قوم مسلم کا اکیسویں صدی میں داخلہ بند کر دیا ہے۔ اس طرح کی آہیں اور کراہیں آج وقتاً فوقتاً دانشوروں کی خفیہ مجالس سے ''لیک'' ہوتی رہتی ہے۔ بلکہ قصداً ان کا افشاء کیا جاتا ہے تاکہ یہ باور کرایا جاسکے کہ ''سارے مدارس کا درد ہمارے جگر میں ہے۔''

بات کیا ھے؟

ان لوگوں کے دلوں میں دینی مدارس کا درد مشفقانہ نہیں، بلکہ بغض وعناد اور حسد وجلن کے اس زہر کا اثر ہے جس نے انھیں صحیح بات سوچنے اور سمجھنے سے محروم کر دیا ہے۔ انھیں کڑھن اس بات کی ہے کہ آج کے گئے گذرے دور میں بھی مسلم معاشرہ میں بیس بیس سال میں فراغت حاصل کرنے والے ''دانشور'' کو اعزاز کا وہ مقام حاصل نہیں ہوتا جو ایک مخلص اور ماہر عالم دین کو چند سالوں کی تعلیم سے حاصل ہو جاتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان علماء کو بھی اپنی ہی صف میں کھڑا کریں تاکہ وہ

بھی دین فروشی میں ان کے شانہ بشانہ چلتے ہوئے دکھلائی دے سکیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ کسی اور طرح سے علماء کا اثر ورسوخ مسلم معاشرہ سے کم نہیں ہوتا۔ تو اس تعلیم ہی میں گھن لگانے کی بات پھیلاؤ جس سے اصل میں آدمی کو اعزاز ملتا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی اور یہ دانشور اپنے دعوے میں واقعی مخلص ہوتے اور انھیں واقعتاً مسلم قوم کی دینی اور دنیاوی ترقی کی فکر ہوتی تو یہ لوگ دینی مدارس پر کیچڑ اچھالنے کے بجائے ان مسلم کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دینی علوم لازمی کرنے کی تحریک چلاتے جن کی تعداد یقیناً دینی مدارس سے پچاسوں گنا زیادہ ہے۔ ان دانشوروں کا اپنی یونیورسٹیوں اور تعلیم گاہوں میں علوم دینیہ سے دانستہ بے اعتنائی برتنا اور دینی مدارس پر عصری علوم تھوپنے کے لئے شور مچانا ان کے دوغلے پن کی کھلی دلیل اور منافقانہ مزاج کی واضح علامت ہے۔ اور دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ طبقہ دعویٰ اسلام کے باوجود ''فکر آخرت'' کی نعمت سے بالکلیہ محروم ہے۔ اسی لئے کوئی بھی ایسی کوشش جس کا مدار آخرت کی کامیابی اور مرنے کے بعد کی زندگی کی فلاح پر ہو۔ وہ اس طبقہ کی نظر میں کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ یہ طبقہ صرف دنیا کی ترقی ہی کو باعث نجات خیال کرتا ہے۔ اور ہر جگہ اس ترقی کو حاصل کرنے کے لئے سرگرداں رہتا ہے۔ اس کی نظر میں قوم کے ساتھ سب سے بڑی خیر خواہی یہ ہے کہ اسے ''دنیا کماؤ'' بنا دیا جائے۔ چاہے آخرت بگڑے یا رہے۔ اس سے انھیں کوئی سروکار نہیں ہے۔

علم کیا ہے؟

اسی بنا پر انھوں نے قرآن وحدیث میں آمدہ لفظ ''علم'' کو عام معنی پر محمول کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ اپنی مقصد برآری میں تعاون مل سکے۔ اور عوام میں اپنی دھاک بٹھائی جاسکے۔ جبکہ شریعت اسلامی کی نظر میں علم ان معلومات کا نام ہے جن کے ذریعہ آخرت کی کامیابی اور اللہ رب العزت کی رضامندی حاصل ہو اور جس کا ثمرہ صاحب علم پر خشیت خداوندی کی صورت میں ظاہر ہو۔ چنانچہ سورۂ زمر (آیت ۲۸) میں اس کی وضاحت کی گئی ہے۔ علم کا اطلاق اصطلاحاً اور حقیقتاً صرف ان علوم پر کیا جاسکتا ہے جن کی وراثت حضرات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چھوڑ کر دنیا سے تشریف لے

گئے ہیں۔اسی وجہ سے علماء کو وارثین انبیاء کا خطاب دیا گیا ہے۔(مشکوٰۃ،ص۳۰) نصوص شرعیہ میں جہاں بھی علم سیکھنے سکھانے کی بات آئی ہے اس سے علم دین ہی مراد ہے۔جو آخرت کی کامیابی اور فلاح کا ذریعہ ہے اور اسی خصوصیت کی بنا پر اس کی فرضیت کا حکم دیا گیا ہے اور اس کی تحصیل کی تائید کی گئی ہے۔

ذریعہ معاش:

علم دین کے علاوہ دنیا میں جتنے علوم بھی پائے جاتے ہیں وہ درحقیقت علم نہیں بلکہ ذریعہ معاش ہیں۔یعنی ان کا فائدہ صرف دنیا تک محدود ہے مرنے کے بعد وہ علوم علم ہونے کے اعتبار سے قطعاً کسی کام نہ آئیں گے۔کوئی کتنا ہی بڑا ڈاکٹر یا انجینئر ہو وہ اپنی ڈاکٹری یا انجینئری کی بنیاد پر جنت میں نہ جائے گا۔وہاں تو صرف علم دین اور اس پر عمل ہی کام آئے گا۔شریعت کی نظر میں جس طرح تجارت کرنا،لوہاری کا کام کرنا، بڑھئی بن کر لکڑیاں جوڑنا وغیرہ دنیا کمانے کے فن ہیں بعینہ یہی حیثیت ان علوم جدیدہ کی بھی ہے جو صرف دنیا کمانے کے لئے پڑھے اور پڑھائے جاتے ہیں اس لئے انھیں علم نہیں ''ذریعۂ معاش'' کہنا چاہئے۔ان پر حقیقتاً علم کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔علم تو اصل میں وہی ہے جو دنیا اور آخرت دونوں جگہ علم ہونے کی حیثیت سے کام آئے اور یہ صفت صرف قرآن وحدیث اور اس سے متعلق علوم ہی میں پائی جاتی ہے۔البتہ اگر کسی علم کو قرآن و حدیث سمجھنے کے لئے اپنایا جائے یا اخروی نفع کے لئے اس کی تحصیل کا ارادہ کیا جائے تو اسے بھی حقیقی علم کے زمرہ میں داخل کیا جا سکتا ہے۔

ثانوی حیثیت:

اسلامی تعلیمات میں فکر آخرت کو اوّل حیثیت اور فکر دنیا کو ثانوی حیثیت دی گئی ہے۔قرآن کریم کے واضح اعلانات اور احادیث طیبہ کی ہدایات اس سلسلہ میں شاہد ہیں۔اس اعتبار سے علوم دینیہ کو مسلمانوں کی زندگی میں اولی حیثیت حاصل ہونی چاہئے اور جو علوم ''ذریعۂ معاش'' ہیں انھیں بہرحال ثانوی درجہ پر رکھنا چاہئے۔اسلام ذریعۂ معاش اختیار کرنے کا مخالف نہیں۔ہاں انھیں

اصل مقصودِ زندگی بنالینے کے خلاف ہے۔فقہ اسلامی میں ایسا کوئی جزئیہ نہیں ہے۔جس میں حلال کمائی کے لئے کسی دنیوی علم یا زبان وغیرہ سیکھنے پر پابندی لگائی گئی ہو۔علماء پر یہ بہت بڑاالزام ہے کہ وہ علوم عصریہ کے یعنی ''ذرائع معاش'' کے مخالف ہیں۔حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم کسی بھی جائز ذریعۂ معاش کواختیار کرنے سے منع نہیں کرتے۔ہمارا کہنا صرف یہ ہے کہ ان ذرائع کوعلم حقیقی کے مقابلے میں مقصود ہونے کا درجہ نہ دیا جائے۔

مدارس کا مقصد تاسیس:

ایک مرتبہ ہم چندساتھی مظفرنگر سے دیوبند کی بس میں سوار ہوئے۔راستہ میں ایک غیرمسلم ماسٹر سے ملاقات ہوگئی، تعارف ہوا، ہم نے بتایا کہ ہم ایشیا کی سب سے بڑی اسلامی یونیورسٹی دارالعلوم دیوبند میں پڑھتے ہیں۔ اور دارالعلوم دیوبند کے کچھ حالات بتائے، طلباء کی تعداد سہولیات وغیرہ۔وہ سن کرمتعجب ہوا۔پھراس نے پوچھا کہ آپ لوگ اتنی بڑی تعداد میں یہاں سے پڑھ کرکہاں جاتے ہیں؟ کیا عرب ممالک میں نوکری ملتی ہے؟ یااورکوئی مفاد آپ کو حاصل ہوتا ہے؟ ہم نے دوٹوک جواب دیا کہ ہم یہاں اس لئے پڑھ نہیں رہے ہیں کہ ہمیں کہیں سروس ملے یا دنیا کا کوئی نفع حاصل ہو۔ہمارا مقصدتو اپنی مرنے کے بعد کی زندگی سنوارنا ہے۔اب رہ گیا معاش کا مسئلہ تو ہمارا ایمان ہے کہ خدا پر بھروسہ ہوتو معاش کے راستے خود بخود کھلتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ پورے ملک میں بے شمار اسلامی مدارس ہیں جن میں ہمارے لئے''ہم خرما وہم ثواب'' کے مصداق روٹی روزی کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔

ہمارا جواب سن کروہ شخص بول اٹھا کہ واقعی آپ ہی لوگ اصل میں علم سیکھنے والے ہیں ورنہ ہمیں توپڑھنے سے پہلے یہ فکررہتی ہے کہ اس پڑھنے سے کیا فائدہ ہوگا اورکتنی تنخواہ ملے گی؟

حاصل یہ ہے کہ دینی مدارس کا مقصدقوم کو''کماؤافراد'' دینانہیں ہے بلکہ فکرآخرت کے حامل پیروؤں سے امت کو مالامال کرنا ہےاور جب مدارس کا یہ مقصدہی نہیں توان کے فضلاء سے یہ امید رکھنا ہی فضول ہے کہ وہ علم برائے معاش حاصل کریں اورمعاشی ترقی کی راہ میں آگے بڑھیں۔ہاں

جن مدارس کی بنیاد معاش کے حصول کے لئے رکھی گئی ہے یا رکھی جائے ان سے یقیناً معاشی ترقی کی توقع رکھنی چاہئے۔اس میں ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ بلکہ اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے کہ کوئی ہمارے یہاں ''علم برائے آخرت'' حاصل کر کے کسی اور جگہ جا کر ''علم برائے معاش'' سے آراستہ ہو۔ مدارس سے تعلق رکھنے والا کوئی فرد اس کے ارادہ میں نہ حائل ہوا ہے نہ ہوگا۔

مدارس کا تناسب:

طبقہ دانشوراں کا محبوب مشغلہ دینی مدارس میں جدید علوم داخل کرنے کے لئے شور مچانا رہتا ہے۔ حالانکہ دینی مدارس کی تعداد مسلم آبادی کے تناسب سے عصری اسکولوں کے مقابلہ میں حددرجہ کم ہے۔بمشکل مسلم آبادی کا ایک فیصدی بلکہ اس سے بھی کم حصّہ مدارس میں پڑھنے آتا ہے جبکہ اسکولوں اور کالجوں میں جانے والوں کی تعداد کم ازکم پچیس فیصدی تو ضرور ہوگی گویا کہ اگر پندرہ کروڑ کی مسلم آبادی میں ۱۵/لاکھ بچے مدرسوں میں آتے ہیں تو تین کروڑ ۷۵/لاکھ اسکولوں میں جاتے ہیں۔تو تعجب کی بات یہ ہے کہ اسکول میں جانے والی اکثریت کے دین وایمان کی کوئی فکر نہیں کی جاتی اور جو آبادی کا صرف ایک فیصدی حصّہ دنیا کے چند روزہ نفع سے بے نیاز ہوکر آخرت کی فکر کرتا ہے۔اس کا تشخص مٹانے کے لئے جتن پر جتن کئے جاتے ہیں کہ کسی طرح ان ۱۵/لاکھ کو بھی ۳/کروڑ پچھتر لاکھ دنیاداروں کی فہرست میں شامل کردیں :

''بریں عقل و دانش بباید گریست''

روزگار کا مسئلہ:

اس طبقہ کو مولویوں کے روزگار کی بڑی فکر رہتی ہے۔اور ہمدردیوں کے پل باندھتے ہوئے طالبانِ علومِ نبوت کی غربت وافلاس کا رونا رویا جاتا ہے جبکہ ہمارے ایک دوست نے اس پورے معاملے پر غور کر کے بڑے پتہ کی بات کا انکشاف کیا ہے۔موصوف فرماتے ہیں کہ:

''جب جدید علوم کے ''جنٹل مین'' سروس کی تلاش میں جوتیاں چٹخاتے ہوئے تنگ آگئے۔اور سرکاری اور غیر سرکاری نوکریوں کے پتے انھیں ہوا دینے لگے تو ان کی نظر مدارس پر گئی۔ جہاں علوم نبوت کے حاملین بڑے سکون واطمینان کے ساتھ

مشغول خدمت ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ ایسے مدارس کی اور ایسے مطمئن افراد کی تعداد بڑھتی ہی جارہی ہے اور اس نوکری میں نہ سفارش ہے نہ رشوت نہ کوئی اور لعنت، تو ان کی رال مدرسوں پر ٹپکنے لگی اور سوچنے لگے کہ اپنی بے روزگاری ختم کرنے کے لئے کچھ جگہیں مدارس میں بھی نکالنی چاہئے چنانچہ انھوں نے نعرہ لگانا شروع کیا کہ مدارس میں علوم جدیدہ باقاعدہ پڑھائے جائیں۔اس نعرہ سے اصل مقصد یہ ہے کہ اسکولوں کے پڑھے ہوئے طلبا میں جو''تشویشناک بے روزگاری'' آرہی ہے اس کی کچھ تلافی ہوسکے۔ اور مدرسوں میں بھی ان بے روزگاروں کو ٹیچری کی جگہیں مل سکیں۔''

موصوف کی تحقیق پر بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے کہ کس خوصورت انداز سے ڈھول کا پول کھول دیا۔اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر دے۔واقعہ واقعۃً یہی ہے۔

آپ معاشرہ کا جائزہ لے کر دیکھ لیجیے۔مولوی (صحیح معنی میں مولوی) آپ کو گھومتے ہوئے نہیں ملیں گے جبکہ گریجویٹ بے روزگار قدم قدم پر اتنے ملیں گے کہ آپ انھیں گنتے گنتے تھک جائیں گے۔اس لئے اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ یہ طبقہ اپنے طبقہ کی بے روزگاری اور معاشی بدحالی کو چھپانے کے لئے علماء پر بے روزگاری کا طعنہ لگاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ ہم نے بڑا تیر مار لیا۔حالانکہ علماء کے لئے بے روزگاری کوئی عیب نہیں اس لئے کہ ان کا علم روزگار سے جڑا ہوا ہے ہی نہیں۔ ہاں گریجویٹوں کے لئے بے روزگاری کا عیب بلکہ بڑا عیب ہے کہ ان کے پڑھنے کا اصل مقصد ہی دنیا کمانا تھا جس میں وہ ناکام رہے۔''نہ خدا ہی ملا، نہ وصال صنم۔''

احسان مانیے:

یہاں اس حقیقت سے بھی غافل نہیں رہنا چاہئے کہ ہندوستان میں مسلمانوں پر قومی حیثیت سے جتنا بڑا احساس مدارس دینیہ کا ہے اور تحریک مدارس نے ملّت اسلامیہ ہند کو تحفظ کا جو مقام دیا ہے وہ کسی اور تحریک کے حصہ میں نہیں آیا۔ یہ مدارس اگرچہ دیکھنے میں محض علوم اسلامیہ کے محافظ

ہیں۔لیکن بباطن تحفظ شریعت کے مضبوط قلعے اورحفاظت اسلام کی محفوظ چھاؤنیاں ہیں۔آج برصغیر میں دینی اوراسلامی سرگرمیاں بظاہرِاسباب انہی اداروں کی خاموش خدمات کی رہینِ منت ہیں۔واقعہ یہ ہے کہ اگر یہ ادارے نہ ہوتے تو یہ ادعائی دانشورشاید ظاہری طور پر بھی اسلامی ناموں سے محروم رہتے۔مدارس کوطعن وتشنیع کا نشانہ بنانا اوران کے کردار کو مجروح کرنے کی کوشش کرنا احساس فراموشی کی بدترین مثال ہے۔یہ مدرسے خواہ کیسے بھی ہوں جب تک بھی ہندوستان جیسے غیرمسلم اکثریتی ملک میں باقی رہیں گےاور پروان چڑھتے رہیں گےاس وقت تک اسلام زندہ رہے گا،اسلامی تشخص باقی رہے گا،شعائرِاسلام بلندرہیں گےاورمسلمانوں کوقومی حیثیت سے کوئی مٹانہیں سکے گا۔انشاءاللہ العزیز۔

اس ملک میں مسلمانوں کا وجودو بقاءانہی مدارس سے وابستہ ہے بلکہ دنیا کے جس خطہ میں بھی بنیادی دینی تعلیم کےاس طرح کےادارے ہوں گے، وہاں مخالف تیز وتند ہواؤں کے باوجوداسلامی زندگی کےواضح نقوش پائے جاتے رہیں گے۔اورمسلمانوں میں اسلامی شعورزندہ رہے گا۔

ہمارا فرض:

لیکن یہ جب ہی ہوگا جبکہ اہل مدارس بھی واجبی اورمنصبی فرائض سے غافل نہ رہیں۔شخصی اختلافات اورگروپ بندی کےزہر سےاپنے اداروں کو پاک رکھیں۔مدارس کودنیا طلبی کے لئے زینہ نہ بنائیں۔محض مادی ترقی ہی پیش نظرنہ رکھیں بلکہ اصل مقصود''فکرآخرت کے حامل افراد کی تیاری'' کوملحوظ خاطر رکھیں۔اورمحض رضائے خداوندی کے لئے اخلاص وللّٰہیت کے ساتھ دینی خدمات کی انجام دہی اپنا شعار بنالیں۔اگران باتوں کا ہم لحاظ رکھیں گےتو نہ کسی دانشورکو ہمارے کردار پرانگلی اٹھانے کا موقع ملے گا اورنہ کسی کوہماری برملا بےوقعتی کی ہمت اورجسارت ہوسکے گی۔

(ندائے شاہی،نومبر۱۹۹۴ء)

○❖○

دینی مدارس اور اُن کا نصابِ تعلیم

آئے دن اخبارات و رسائل میں دینی مدارس اور ان کے طریق تعلیم اور نصاب کے بارے میں مضامین اور تبصرے شائع ہوتے رہتے ہیں اور اکثر مضامین وہ لوگ لکھتے ہیں جو مدارس کی زندگی، خدمات اور افادیت سے تقریباً ناآشنا ہوتے ہیں۔ ان کے پیشِ نظر صرف عرب ممالک کے وہ جدید عصری کالج اور یونیورسٹیاں ہوتی ہیں۔ جو طریقِ تعلیم میں مغربی یونیورسٹیوں کی پیروی کررہی ہیں وہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کے دینی مدارس بھی اپنا سادہ طرز تعلیم چھوڑ کر عربی کالجوں کا طریقہ اختیار کریں چونکہ یہ بحث اب بہت عام ہوچکی ہے۔ حتی کہ مادیت اور مغرب پرستی کے غلبہ نے نام نہاد دانشوروں کو اس قدر شکوک وشبہات میں مبتلا کردیا ہے کہ وہ مدارس اسلامیہ کو ''دقیانوسیت'' کی علامت سمجھنے لگے ہیں۔ اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ اس موضوع پر ذرا تفصیل سے روشنی ڈالی جائے۔ اور اہلِ مدارس کے بارے میں جو غلط فہمیاں پیدا کی جاتی ہیں ان کا ازالہ کیا جائے۔ اس کے متعلق چند اشارات یہاں پیش کئے جارہے ہیں:

(۱) دینی مدارس کے قیام کا مقصد اولیں ''دین کو صحیح شکل میں محفوظ رکھنا اور مخلص علماء تیار کرنا ہے'' یہ مقصد اسی وقت پورا ہوسکتا ہے جبکہ قدیم اسلامی علوم وفنون پوری طرح محفوظ اور رائج رکھے جائیں۔ اس لئے کہ احکام شریعت عقل سے نہیں بلکہ نقل سے ثابت ہیں۔ قرآن وحدیث کی تفسیر وتشریح اسی طرح اسلامی عقائد اور ان کی تفصیلات وہی معتبر ہیں جو متقدمین نے لکھیں یا ان سے نقل ہوتی چلی آرہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان اصولی اور قطعی علوم کے بارے میں جدید تحقیقات اکثر جادۂ حق سے ہٹنے کا سبب بن جاتی ہیں۔ اسی بناء پر مدارس اسلامیہ میں حتی الامکان متقدمین کی

معتبر کتابیں داخل نصاب کی جاتی ہیں تا کہ طالب علم فکری طور پر قدیم علماء سے وابستہ رہے اور اس میں نظری آزادی اور بے محابا جرح وتنقید کے خیالات نشو ونما نہ پا سکیں۔

(۲) اس عظیم اور مبارک مقصد کے حصول میں جو چیزیں اصولی طور پر آڑے آ سکتی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ مدارس کے نصاب میں باقاعدہ عصری علوم اور کتابوں کو جگہ دی جائے۔ اس لئے کہ ایسی صورت میں توجہ کی کمی اور یکسوئی کے فقدان کی وجہ سے طالب علم دینی علوم اور روایات کی حفاظت نہ کر سکے گا بلکہ اکثر یہ ہوگا کہ طلبہ پوری توجہ عصری علوم کی طرف مبذول کر دیں گے اور دینی تعلیم ناقص چھوڑ کر عصری کالج یا یونیورسٹی میں داخلہ لے لیں گے۔ اور دینی مدارس کھلا ہوا مذاق بن کر رہ جائیں گے۔ چنانچہ جن مدارس نے یہ طریقہ اپنایا ہے وہ بھلے ہی کسی خاص زبان یا ظاہری علم کی ترویج واشاعت کے دعویدار ہوں لیکن ٹھوس علمی استعداد اور عملی ہم آہنگی سے ان کی درسگاہیں خالی نظر آتی ہیں۔ لہٰذا دینی مدارس کی اپنی انفرادی حیثیت برقرار رکھنے اور احتیاط کا تقاضہ یہی ہے کہ مروّجہ عصری علوم کو مدارس کے لازمی نصاب میں شامل نہ کیا جائے۔ البتہ مناسب ہے کہ معلومات عامہ کے ضمن میں تاریخ، جغرافیہ اور معاشیات سے متعلق اہم نوٹ طلبہ کو املا کرا دیئے جائیں جیسا کہ بہت سے مدارس میں یہ مفید سلسلہ جاری ہے۔

(۳) از روئے شریعت کسی بھی زبان کو سیکھنا ممنوع نہیں ہے۔ لہٰذا ہندی یا انگریزی تعلیم کے ناجائز ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ یہ بات قابلِ غور ہے کہ یہ تعلیم مدارس میں لازم کرنا قیام مدارس کے مقصدِ اصلی میں مخل تو نہیں؟ اس بارے میں آراء مختلف ہو سکتی ہیں اور ماضی میں بھی رہی ہیں۔ لیکن تجربہ یہ بتاتا ہے کہ جن مدارس اور دینی اداروں نے اپنے نصاب میں اس طرح کی تعلیم ضروری قرار دی ہے۔ عموماً وہاں کے فضلاء فراغت کے بعد دینی لائن سے ہٹ کر دنیوی مناصب اور منافع حاصل کرنے میں لگ گئے ہیں اور اپنے علمی امتیاز حتیٰ کہ ظاہری عالمانہ وضع قطع سے بھی محروم ہو گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت حال نہایت تکلیف دہ اور دینی مدارس کی بقا اور افادیت کے لئے سنگین خطرہ بن جاتی ہے۔ اگر یہی طریقہ سارے مدارس اپنا لیں تو شاید فراغت

کے بعد کوئی مولوی صورت ڈھونڈے نہ ملے اور مدارس کی زینت بننے والے افراد کسی بھی درجہ میں میسّر نہ آسکیں۔ اسی وجہ سے اکثر اہلِ مدارس انگریزی زبان اور عصری اور مادی علوم داخلِ نصاب کرنے میں احتیاط برتتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی یہ احتیاط حالات کے عین مطابق اور وقت کا عین تقاضہ ہے اور دینی تعلیمی سلسلہ جاری رکھنے کے لئے ناگزیر ہے۔

(۴) اکثر دانشورانِ قوم یہ آواز اٹھاتے ہیں کہ ''مدارس کے نصاب میں انگریزی زبان اور عصری علوم شامل کر کے علماء کو اپنی تبلیغی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا چاہئے اور اپنے کو نئے زمانہ سے ہم آہنگ بنانا چاہئے'' —— دیکھنے میں یہ بڑی خوبصورت تجویز ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ نامکمل اور یکطرفہ ہے اس کا دوسرا اہم ترین جزیہ ہے کہ ''با اختیار پرائیویٹ مسلم اسکولوں اور کالجوں کو بھی اپنے نصاب میں تبدیلی کر کے اس میں بنیادی دینی علوم کو لازمی بنانا چاہئے اور اپنی دنیوی تعلیم کو دین سے ہم آہنگ کرنے کی سعی کرنی چاہئے تاکہ کم از کم وہاں پڑھنے والے مسلم طلبہ اپنا دین و ایمان تو محفوظ رکھ سکیں اور نماز روزہ جیسے فرائض سے تو غافل نہ رہیں۔ اگر وہ کالج اپنی مجبوریوں کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکتے تو پھر مدارس بدرجہ اولیٰ اپنے طرز میں تبدیلی نہیں لا سکتے۔ اس لئے کہ زمانہ سے ہم آہنگ ہونا شرعاً ضروری نہیں۔ جبکہ دین سے مطابقت ہر حال میں ضروری ہے اور اس سے کوئی مسلمان صرف نظر کرنے کا مجاز نہیں ہے۔

(۵) تاہم یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ مخلص اور ذی ہوش علماء دین اگر عصری علوم اور دیگر عالمی زبانیں سیکھ کر ان کے ذریعہ دعوت و تبلیغ اور زبانی و قلمی جہاد کا فریضہ انجام دیں تو یہ عصر حاضر کی بڑی قابل قدر اور مہتم بالشان دینی خدمت ہوگی۔ اس نہج پر افراد سازی کے لئے اکابر علماء دیوبند برابر کوشاں رہے ہیں اور ماضی میں اس کے لئے اعلیٰ سطح پر کوششیں کی گئی ہیں۔ البتہ چونکہ ان حضرات کے نزدیک افراد سازی کے ساتھ ساتھ مدارس کا اولین مقصد بھی پیشِ نظر تھا، اس لئے انھوں نے مدارس کے نصاب میں تبدیلی منظور نہ کر کے مطلوبہ افراد مہیا کرنے کے لئے ایک اسلم طریقہ تجویز کیا تھا جو ان کی بے مثال دوراندیشی، فراستِ ایمانی اور تدبّر کی کھلی ہوئی دلیل ہے۔ وہ

طریقہ اور تجویز یہ تھی کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے گریجویٹ دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیں اور دیوبند کے چنیدہ فضلاء علی گڑھ میں داخلہ لیں، اور دونوں جگہ کی انتظامیہ ان کی مالی و تعلیمی کفالت کرے۔ اسی بناء پر حضرت شیخ الہندؒ جمعیۃ الانصار کے جلسوں میں نہ صرف علماء بلکہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو بھی مدعو کرتے تھے۔'' صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب جمعیۃ کے کئی اجلاسوں میں بطور خاص شریک ہوئے اور ان سے طلبہ کے تبادلہ کا باقاعدہ معاہدہ کیا گیا''۔ (شیخ محمد اکرام موجِ کوثر ص۳۰۳) نیز جامعہ ملیہ اسلامیہ کو بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی سمجھنا چاہئے۔ افسوس ہے کہ بعض سیاسی وجوہات کی بنا پر اس تجویز پر پوری طرح عمل درآمد نہ ہوسکا۔ بعد میں حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ نے اس روایت کو زندہ کرنے کی کوشش کی اور جامعہ ملیہ سے رابطہ قائم کیا لیکن پھر یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔ حالانکہ ضرورت اس کی مقتضی ہے کہ یہ اسلم راستہ پھر اختیار کیا جائے۔ تاکہ نہ تو مدارس کے نظام پر براہِ راست کوئی زد پڑے نہ کالجوں کو مزید مکلّف بنایا جائے بلکہ اپنے اپنے دائرہ میں رہ کر دونوں طرح کے ادارے کام کریں اور افادہ و استفادہ کا سلسلہ دونوں طرف سے جاری رہے۔ ضرورت ہے کہ اس کے لئے باقاعدہ نظام بنایا جائے بلکہ ہوسکے تو دونوں طرف ایک مختصر مدتی نصاب مقرر کیا جائے تاکہ کم وقت میں مقصد کی تکمیل ہوسکے۔

حاصل یہ ہے کہ مدارس اسلامیہ میں عصری علوم کی ترویج و اشاعت کا نعرہ ناعاقبت اندیشی پر مبنی اور ناقابلِ عمل ہے۔ ضرورت کی تکمیل اس عمل کے بھی ہوسکتی ہے۔ مدارس کو بہرحال اپنا روایتی از تعلیم نہ چھوڑنا چاہئے۔ اور مادیت و مغربیت پر نظر نہ کرتے ہوئے اخلاص کے ساتھ اپنی عظیم تر دینی خدمات میں مشغول رہنا چاہئے۔ اگر اس کے خلاف کیا گیا تو دینی مدارس دین کے قلعے نہ ہوکر لاحاصل اور بے مقصد سرگرمیوں کے پلیٹ فارم بن جائیں گے۔

(ندائے شاہی، اکتوبر ۱۹۹۱ء)

دارالعلوم دیوبند کی کردارکشی کیوں؟

دارالعلوم دیوبند کا تقریباً ڈیڑھ سوسالہ شاندار کردار ایک کھلی کتاب کے مانند ہے اس ادارے نے ملک وقوم سے کبھی غداری نہیں کی بلکہ اس کی کوکھ سے ہمیشہ وفا شعار، با کردار اور امن پسند شہریوں نے جنم لیا ہے جنہوں نے پورے عالم میں جا کر علم کی شمعیں جلائیں ہیں اور قوم وملت کو شعور وآگہی کی دولت سے نوازا ہے۔ دارالعلوم دیوبند ایک ادارہ نہیں بلکہ صدق ووفا کی ایک جیتی جاگتی تحریک ہے جس کی بلندترین خدمات تاریخ میں سنہرے حروف سے نقش ہیں، اس تعلیمی بیداری کی تحریک نے صرف بارونق شہروں اور آبادیوں تک ہی اپنی کرنیں محدود نہیں رکھیں بلکہ یہ تحریک گاؤں گاؤں پھیلی، پہاڑوں، وادیوں اور صحراؤں میں پروان چڑھی، حتی کہ دوردراز اور دشوار گذار نا قابل عبور مقامات تک اس کے فرزندوں نے رسائی حاصل کر کے ان پسماندہ اقوام کے بچوں کو شعور عطا کیا جو آج تک مہذب اقوام کی توجہ کے مستحق نہ بن سکے تھے۔ دارالعلوم کے درودیوار سے جو خمیر اٹھتا ہے وہ ملک وملت کے لئے کندن بن کر چمکتا اور دمکتا ہے۔ دارالعلوم کے فرزند ملک کی تقدیر پر بوجھ نہیں بلکہ قوم کی عظمت کے سرتاج ہیں۔ دارالعلوم دیوبند اور اسلامی مدارس میں انسانیت دوستی، رواداری، حق نوازی، اور وفا شعاری کا درس دیا جاتا ہے۔ یہاں سے فارغ ہونے والے افراد قومی وقار کے محافظ اور ملکی عزت وعظمت کے امین ہیں جو قومی خزانہ سے ایک پائی لئے بغیر خود اپنے ملی سرمایہ سے تعلیمی اور تربیتی بے لوث خدمات انجام دیکر ملک وقوم کو اپنے عظیم احسانات سے گراں بار کررہے ہیں۔

الف : دارالعلوم دیوبند اور دیگر مدارس میں پڑھایا جانے والا نصاب بالکل جگ ظاہر ہے۔ اس میں کوئی بھی مضمون ایسا نہیں ہے جس سے نفرت پھیلتی ہو یا کسی مذہب کے ماننے والوں کے

خلاف اشتعال انگیزی کی جاتی ہو بلکہ یہ نصاب ایک دوسرے کے احترام، پڑوسیوں کے ساتھ رواداری اور عہد کی پاس داری کی تلقین کرتا ہے۔

ب : دارالعلوم دیوبند اور مدارس دینیہ کے دروازے ہر شخص کے لئے کھلے ہوئے ہیں، کوئی بھی شخص مدرسہ میں جا کر اپنی آنکھوں سے وہاں انجام پانے والی سرگرمیوں کا مشاہدہ کرسکتا ہے۔ وہاں تعلیم وتربیت اور دینی اعمال کے سوا کوئی خفیہ پروگرام کسی سطح پر نہیں چلایا جاتا۔

ج : تمام بڑے اور بااثر مدارس سوسائیٹی ایکٹ کے تحت رجسٹرڈ ہیں اور ان کا سالانہ حساب سرکاری آڈیٹر کے ذریعہ آڈٹ ہوکر سرکاری محکمہ جات تک پہنچایا جاتا ہے۔ جس میں آمدو صرف کی مکمل تفصیلات درج ہوتی ہیں۔ اور یہ سب کارروائی ملکی قانون کے مطابق انجام پاتی ہے۔

د : اکثر مدارس میں عربی اعلی تعلیم کے ساتھ ابتدائی درجات (مکتب) میں ضروری عصری تعلیم ہندی، اردو، حساب وغیرہ کی تعلیم بھی دیجاتی ہے۔

ہ : بہت سے مدارس میں کمپیوٹر اور انگریزی کی اعلی سطحی تعلیم کا بھی نظم کیا جارہا ہے۔ اسی طرح صنعت وحرفت کے شعبوں پر بھی توجہ دی جارہی ہے۔

و : بلا مبالغہ ۷۰ فیصد چھوٹے بڑے مدارس مالی اعتبار سے تنگی میں مبتلا رہتے ہیں، ان کے ذمہ داروں کو اپنا واجبی خرچ چلانے کے لئے بھی کافی تگ ودو کرنی پڑتی ہے۔ اس لئے انہیں کسی دوسری سرگرمی کے بارے میں سوچنے تک کا بھی موقع نہیں مل پاتا۔

ز : دارالعلوم دیوبند اور دیگر مدارس پر سالوں سے سرکاری خفیہ ایجنسیاں پوری نظر رکھے ہوئے ہیں، مدارس کی ہر نقل وحرکت کی خبر خفیہ ریکارڈ میں محفوظ کیجاتی ہے لیکن آج تک ان مدارس کی سرگرمیاں ملک دشمن ثابت نہیں ہوئی ہیں۔

ح : دارالعلوم دیوبند کا معائنہ کرنے والے ہر شخص نے برملا یہ اعتراف کیا ہے کہ اس ادارہ کے خلاف لگائے گئے الزامات محض جھوٹا پروپیگنڈا ہیں اور ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں

ہے۔ابھی چند روز قبل جرمنی کے نائب سفیر نے ڈیڑھ دن دارالعلوم دیو بند میں قیام کر کے وہاں کے حالات کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا، اساتذہ، طلبہ اور ذمہ داران سے براہِ راست گفتگو کی، اور جاتے ہوئے کتاب المعائنہ میں یہ لکھ کر گیا کہ ''مجھے یہاں کے ذمہ داروں، طلبہ اور دیگر اراکین سے طویل گفتگو کا موقع ملا، یہ بات چیت جس کھلے پن اور شفافیت کا مظہر تھی وہ میرے لئے نہایت امید افزا تھی، اس گفتگو کے ذریعہ سے مجھے مذہب کے حوالہ سے عالمی تنازعات کے حل کے سلسلہ میں رہنمائی ملی''۔

اسی طرح جو صحافی دارالعلوم کا جائزہ لینے آئے وہ سب یہی تاثر لے کر گئے کہ یہاں کی کی کوئی بات قومی اعتبار سے قابل گرفت نہیں ہے۔

دارالعلوم دیو بند اور دینی مدارس کے اس صاف شفاف کردار پر ملک وقوم کے ہر فرد کو مشکور وممنون ہونا چاہیے کہ جو کام سرکاری محکمہ جات کے ذریعہ اس خوبی کے ساتھ انجام نہیں پا سکتا وہ وسائل کی کم یابی اور بے سروسامانی کے باوجود ان مدارس کے ذریعہ انجام پا رہا ہے لیکن اس کے برخلاف آج عالمی حالات سے فائدہ اٹھا کر ملک کی بدترین فسطائی جماعت آر ایس ایس اور اس کی بغل بچہ تنظیموں نے مدارس اسلامیہ بالخصوص دارالعلوم دیو بند کے خلاف طوفان بدتمیزی برپا کر رکھا ہے ہر دو چار روز بعد اخبارات میں کبھی بدطینت ''پروین توگڑیا'' کے حوالے سے اور کبھی ''اشوک سنگھل'' اور ''سدرشن'' کے حوالے سے مدارس کے خلاف انتہائی اشتعال انگیز بیانات شائع ہو رہے ہیں جن میں مدارس کے کردار کو بری طرح خواہ مخواہ مجروح کیا جا رہا ہے۔نیز آج کل جابجا آر ایس ایس کے تربیتی کیمپوں میں خاص طور پر غیر مسلم نوجوانوں میں مدارس سے نفرت پیدا کرنے کے لئے ذہن سازی کی جا رہی ہے۔

سوال یہ ہے کہ آخر دارالعلوم دیو بند یا مدارس اسلامیہ کا قصور کیا ہے؟ کیا ان کا قیام دستور ہند کے خلاف ہے؟ کیا ان میں پڑھائے جانے والے مضامین ملک کی سلامتی کے لئے خطرہ ہیں؟ کیا ان کے ذرائع آمدنی قانون کے خلاف ہیں؟ کیا ان سے وابستہ افراد ملک دشمن سرگرمیوں

میں ملوث ہیں ؟ کیا مدارس ملک کی ترقی میں کوئی رکاوٹ ڈال رہے ہیں؟ اور کیا ان مدارس کی تعلیمات سے ملک میں بسنے والے کسی دوسرے مذہب یا عقیدہ کے حاملین کو کوئی ٹھیس پہونچتی ہے؟ اگر جواب سو فیصد نفی میں ہے جیسا کہ واقعہ بھی یہی ہے تو پھر مدارس کی کردارکشی کی آخر بنیاد کیا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ مدارس کے خلاف یہ مذبوحی حرکتیں قطعاً بے بنیاد ہیں۔ ملکی قانون اور مدارس کی سرگرمیوں کے اعتبار سے کوئی بھی بات کسی درجہ میں بھی قابل گرفت نہیں ہے۔ البتہ اصل بات یہ ہے کہ یہ مدارس آر ایس ایس اور اس کی زیر اثر فسطائی تنظیموں کے منصوبوں کی تکمیل میں سب سے بڑی رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ آر ایس ایس کا پلان یہ ہے کہ سارے ملک کے مسلمانوں کا رشتہ ان کے دین سے کاٹ کر بزعم خود ان کا ''بھارتیہ کرن'' کر دیا جائے۔ یعنی ان سے اسلامی تشخص اور تہذیب وتمدن مٹ جائے، اور دیو مالائی ہندوانہ ذہنیت ان میں سرایت کر جائے، وہ قرآن و حدیث کی بات نہ کریں بلکہ گیتا اور رامائن کی بات کریں۔ وہ حمد وثنا نہ پڑھیں بلکہ وندے ماترم کو جپا کریں، وہ بسم اللہ سے کام شروع نہ کریں بلکہ ناریل پھوڑ کر افتتاح کیا کریں، وہ سلام چھوڑ دیں اور ہاتھ جوڑ کر نمستے شروع کر دیں۔ آر ایس ایس کی ساری سرگرمیاں اسی نقطہ پر مرکوز ہیں کہ کس طرح ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کا بھارتیہ کرن کیا جا سکے، اور اسلامی تشخص سے انہیں دور کیا جا سکے؟ آر ایس ایس کے اس خطرناک پلان میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی دینی مدارس ہیں جن کا سرخیل دارالعلوم دیوبند ہے۔ آر ایس ایس اور وشو ہندو پریشد کو یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ جب تک اس ملک میں مدارس اسلامیہ موجود ہیں یہاں کے مسلمانوں کو مرتد نہیں بنایا جا سکتا، اس لئے وہ ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ ملک دشمنی، ہندو دشمنی یا دہشت گردی کے الزامات تو محض بہانہ ہیں، اصل خطرہ انہیں مدارس کے دینی کردار سے ہے کہ ان کی وجہ سے مسلمانوں کو جو ایمانی اور روحانی غذا میسر آرہی ہے اس کا کوئی توڑ وشو ہندو پریشد کے پاس نہیں ہے۔ اس لئے وہ ان جھوٹے بہانوں کے ذریعہ مدارس پر قدغن لگانے کے بہانے تراش رہے ہیں ان شرارت آمیز کوششوں کی وجہ وطن دوستی قطعاً نہیں بلکہ اسلام کے خلاف چھپے ہوئے بغض وعناد اور کینہ کا مظاہرہ ہے جو ہر اعتبار سے قابل صد مذمت ہے۔

واضح رہے کہ ہم مسلمانوں کو دستور ہند نے مذہبی آزادی کا جو حق دیا ہے ہم اس سے کبھی بھی دست بردار نہیں ہوسکتے، ہم محبّ وطن ضرور ہیں لیکن اپنے دین وایمان اور مذہبی حقوق پر آنے والی کسی آنچ کو ہم ہرگز برداشت نہیں کرسکتے، ہمارے مدارس قانون کی پاس داری کرتے ہوئے اپنی دینی اور قومی خدمات میں برابر مشغول رہیں گے۔ اوران کے تحفظ کے لئے ہم اپنی پوری قوت صرف کردیں گے تاکہ ہماری آنے والی نسلیں دین سے محروم نہ رہیں اور اس ملک میں تا قیام قیامت دین کی شمعیں فروزاں رہیں۔

آج جو فرقہ پرست لوگ نفرت کی تحریک چلا رہے ہیں شاید انہیں خود بھی اندازہ نہیں کہ وہ کتنا خوف ناک آگ کا کھیل کھیل رہے ہیں، یہ آگ اگر خدانخواستہ مزید پھیلی تو کسی فرقہ تک محدود نہ رہے گی بلکہ پورے ملک کو جلا کر بھسم کردے گی اور پھر جو آگ لگانے والے ہیں وہ بھی اسی آگ میں جل کر تاریخ کا عبرت ناک باب بن جائیں گے، اس لئے ضرورت ہے کہ ان فتنہ پروروں کی حرکتوں کا سخت نوٹس لیا جائے۔ خود منصف برادران وطن سامنے آئیں اور ملک کو بچانے کے لئے اپنی ذمہ داری ادا کریں۔

اور مسلمان آپسی فروعی اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر ایک مضبوط دیوار بن جائیں۔ یہ نہ سوچیں کہ یہ سب تو دیوبندی مدارس کے خلاف ہورہا ہے ہمارا تو دیوبند سے تعلق نہیں لہذا ہم کیوں دفاع کریں؟ یہ محض خام خیالی ہے بلکہ پرلے درجہ کی جہالت اور عصبیت ہے جس کا اظہار آج ایک ناعاقبت اندیش طبقہ کی طرف سے کیا جارہا ہے۔ اس لئے کہ جب براوقت آتا ہے تو یہ نہیں دیکھا جاتا ہے کہ کون دیوبندی ہے اور کون بریلوی؟ بلکہ ہر اس شخص اور ادارہ کو نشانہ بنایا جاتا ہے جس کا نام مسلمانوں جیسا ہو۔ لہذا مسلمانوں کو صورت حال کی نزاکت کا احساس کرکے خاص طور پر اس وقت ذاتی، اور جزئی اختلافات کو علمی حد تک محدود کردینا چاہئے اور مشترکہ مسائل پر اتفاق واتحاد کی راہ اپنانی چاہئے۔ اس کے بغیر چارہ کار نہیں ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالی مدارس ومساجد کی حفاظت فرمائے اور انہیں شر پسندوں کے شر سے پوری طرح محفوظ رکھے۔ آمین

(ندائے شاہی، جولائی ۲۰۰۲ء)

لڑکیوں کی دینی تعلیم کا مسئلہ

اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہے کہ جس طرح لڑکوں کے لئے دینی تعلیم اور احکام شریعت کا جاننا لازم اور ضروری ہے اسی طرح عورتوں اور لڑکیوں کے لئے بھی علم دین سیکھنا ضروری ہے۔ بالخصوص اس لئے کہ خواتین کی گود بچے کے لئے پہلے مدرسہ کی حیثیت رکھتی ہے اگر خواتین میں دینی رجحان ہوگا تو انکی گود میں پلنے والے بچوں میں بھی دینداری آئے گی، اور شروع سے ہی انکے عقائد درست ہونگے اور نیک اعمال کا شوق اور جذبہ پیدا ہوگا، نیز دینی احکام سے واقفیت کی وجہ سے خود خواتین اپنی گھریلو معاشرتی ذمہ داریوں سے آگاہ ہونگی اور پورے گھرانے کو دینی ماحول میں رنگنے کی کوشش کریں گی، تجربہ سے ثابت ہے کہ کسی دیندار لڑکی کی شادی ایسے ماحول میں ہوئی جہاں پہلے سے زیادہ دینداری نہیں تھی مگر اس بہو کے آجانے سے وہاں کا ماحول رفتہ رفتہ بالکل بدل گیا، اور ہر بڑے چھوٹے میں دین کا اثر ظاہر ہوگیا، مگر عورتوں کی تعلیم کا معاملہ جتنا ضروری ہے اتنا ہی نازک بھی ہے، عورت کے معاملہ میں اسلامی شریعت اس قدر محتاط واقع ہوئی ہے کہ اسکے متعلق ذرہ برابر بھی کوتاہی اور لاپروائی شریعت کو گوارا نہیں ہے۔ بے حیائی، اور بدکاری کے ہر راستہ کو شریعت نے مکمل طور پر بند کرنے کا حکم دیا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے مسجد نبوی میں نماز کی بڑی فضیلت ہونے کے باوجود صحابیات کے لئے اپنے گھروں میں نماز پڑھنے کو افضل قرار دیا۔ پھر دور نبوت کے بعد جب اخلاقی انحطاط کا آغاز ہوا تو اسی وقت سے حضرات صحابہ نے پیش بندی کے طور پر عورتوں کو مسجد میں باجماعت نماز ادا کرنے سے بالکل روک دیا اور ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا یہ کہنے پر مجبور ہوئیں کہ "اگر آنحضرت ﷺ آج کے حالات کا مشاہدہ

فرماتے تو خود ہی عورتوں کو مسجدوں میں آنے سے منع فرمادیتے''۔(مسلم شریف ۱/۱۸۳) نیز احادیث طیبہ میں اجنبی مرد کے ساتھ تنہائی، نامحرم کے ساتھ سفر (گو کہ وہ حج کا مقدس سفر ہو) اور بلاضرورت گھر سے باہر نکلنے سے عورت کو صاف منع کر دیا گیا ہے۔اورقرآن میں حکم دیا گیا کہ اگرگھر سے نکلیں بھی تو چادروں (اور برقعوں میں) لپٹ کرمکمل پردے کے ساتھ نکلیں۔(احزاب آیت ۵۹) اور فرمایا کہ''زمانہ جاہلیت کی طرح بے حیائی کے ساتھ نہ پھرا کریں''۔(احزاب آیت ۳۳) اس طرح کی سخت پیش بندیوں کی روشنی میں لڑکیوں کی دینی تعلیم کا نازک مسئلہ حل کرنا لازم ہے۔یہ بات نہیں کہ زمانۂ سابق میں عورتیں دینی تعلیم سے بالکل کوری رہتی تھیں۔ بلکہ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر زمانہ میں کچھ ایسی دیندار عالمہ فاضلہ خواتین رہی ہیں جنہوں نے بقدر استطاعت دین کی اشاعت کا کام انجام دیا ہے۔اورساتھ میں ہرطرح کے شرور وفتن سے محفوظ بھی رہی ہیں۔لہذا خواتین کے لئے دینی تعلیم ضروری ہونے پرکوئی اختلاف نہ ہےاورنہ کبھی رہا ہے۔اصل مسئلہ یہ ہے کہ انکا طریقہ تعلیم کیا ہو؟ جس سے تعلیم کا واقعی فائدہ بھی حاصل ہواورفتنوں سے امکانی حدتک حفاظت بھی رہے۔اس پرغورکرنا ضروری ہے۔

سب سے بہتر طریقہ

خواتین کے متعلق اسلامی تعلیمات کی روشنی میں سب سے بہتر، مفیداورمحفوظ طریقہ تو یہ ہے کہ انکے لئے انکے گھروں میں رہتے ہوئے تعلیم کا نظم کیا جائے۔مثلاً گھر میں رہنے والی بڑی خواتین ہی انہیں پڑھائیں۔یا اگر مرد عالم ہوں تو وہ کچھ وقت نکال کر اپنی محرم عورتوں کو دینی تعلیم دیں۔جس لڑکی میں ذہانت اورصلاحیت زیادہ دیکھیں اسے اعلیٰ تعلیم دیں، ورنہ عام ضروری مسائل سے واقف کرادیں، اورعلم کے مطابق عمل کرنے کی تربیت بھی دیں۔

دوسرا محفوظ طریقہ

اگرگھر میں انتظام نہ ہوسکے تو رشتہ داریا محلّہ میں اگرکوئی قابل خاتون ہوتو اسکے پاس جاکر پڑھا کریں، جیسا کہ زمانہ دراز سے دیندار گھرانوں میں یہ دستور چلا آرہا ہے۔حکیم الامت مجدد

الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں :

''اسلم طریقہ لڑکیوں کے لئے یہی ہے جو زمانۂ دراز سے چلا آتا ہے کہ دو دو چار چار لڑکیاں اپنے اپنے تعلقات کے مواقع میں آویں اور پڑھیں۔'' (اصلاح انقلاب امت ۱/۲/۷۲)

محلّہ جاتی مکاتب نسواں

تیسرا موزوں اور مفید طریقہ یہ ہے کہ محلّہ میں خالص بچیوں کا دینی مکتب قائم ہو۔ اور ان میں پڑھانے والی استانیاں علم وعمل کی صفت سے متصف ہوں۔ محلّہ کی بچیاں مکمل پردے کے ساتھ وہاں جائیں اور پڑھکر اپنے گھر واپس آجائیں، مکتب میں لڑکوں کے ساتھ اختلاط نہ ہو۔ اور وہاں تربیت کا بھی معقول نظم ہو۔ اور اخلاقی نگرانی کا مکمل بندوبست ہو۔

لڑکیوں کے باقاعدہ مدارس کیلئے پیش کردہ توجیہات

مذکورہ تین طریقے بڑی حد تک فتنوں سے محفوظ ہیں۔ اور صحیح بات یہی ہے کہ خواتین کی دینی تعلیم کے لئے حتی الامکان انہی طریقوں کو اختیار کرنا چاہئے اور ان سے آگے نہیں بڑھنا چاہئے، مگر زمانہ کی تبدیلی اور ماحول کی خرابی نے حالات ایسے پیدا کردئے ہیں کہ دین کے تحفظ اور خواتین میں صحیح دینی رجحانات کی حفاظت کے لئے مکاتب سے آگے بڑھکر مدارس کی شکل میں اداروں کے قیام کی ضرورت پیش کی جاتی ہے اور اس سلسلہ میں درج ذیل وجوہات کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

الف : آج لڑکیوں کو انگریزی تعلیم دلانے کی ایک ہوڑ لگی ہوئی ہے۔ بڑے بڑے دیندار گھرانے بھی اس سے محفوظ نہیں ہیں۔ اور اس تعلیم سے معاشرہ میں جو اخلاقی انحطاط اور بے حیائی کے زہریلے جراثیم پھیل رہے ہیں۔ ان سے بچانے کے لئے محض انکے مفاسد بیان کر دینا کافی نہیں بلکہ صحیح اور محفوظ متبادل پیش کرنا ضروری ہے ورنہ لڑکیوں میں الحاد اور بددینی کا یہ بڑھتا ہوا طوفان ہرگز روکا نہیں جاسکتا۔ لہذا ضروری ہے کہ اھون البلیتین (دو پریشانیوں میں سے کمتر مصیبت) کو برداشت کرتے ہوئے ایسے ادارے قائم ہوں جو بد

اخلاقیوں اور بے حیائیوں سے محفوظ ہوں آج لڑکیوں کو بالکلیہ پڑھنے سے روکا نہیں جاسکتا، اگر آپ دین پڑھانے کا معقول نظم نہیں کریں گے تو انہیں حیاسوز عصری تعلیم اور فکری آوارگی سے روکنا ممکن نہ رہے گا۔

ب : کتنے علاقے اور گاؤں دیہات ایسے ہیں جہاں دور دور تک کوئی ایسی پڑھی لکھی خاتون نہیں ہے جہاں جاکر لڑکیاں دین سیکھ سکیں اور نہ وہاں ایسے اسباب ووسائل ہیں کہ نسوانی مکاتب کا قیام ہو سکے۔ اگر وہاں رہنے والی دین سیکھنے کی خواہشمند لڑکیوں کے لئے دوسری معقول اور محفوظ جگہوں پر تعلیم کا نظم نہ ہوگا تو ایسے پورے کے پورے علاقے کی خواتین دین سے محروم رہ جائیں گی۔

ج : بہت سے ایسے حضرات جو معاش کے سلسلہ میں یوروپ اور دیگر ترقی یافتہ ملکوں میں جاکر آباد ہو گئے ہیں، انکے لئے اپنی بچیوں کی عفت وعصمت کا تحفظ بڑا سنگین مسئلہ ہے۔ کیونکہ ان ممالک کے تمام اسکول مخلوط اور بے حیائی کا سرچشمہ ہیں۔ وہاں تعلیم حاصل کرنے والی لڑکی کا پاک باز رہنا سخت مشکل ہے۔ ایسے فکرمند والدین محض بچیوں کے تحفظ کے لئے انہیں لڑکیوں کے دینی مدارس میں داخل کرانا ہی غنیمت جانتے ہیں۔ چنانچہ گجرات اور مہاراشٹر میں ایسے ''جامعات البنات'' کی تعداد کثیر ہے جن میں غیر مقیم ہندوستانیوں کی بچیاں تعلیم پاتی ہیں۔ اور انکے والدین دین وایمان کے تحفظ کے لئے انکا یہاں قیام ضروری سمجھتے ہیں۔

ان میں سے بعض باتیں واقعی بھی ہیں جن کی بنا پر ''لڑکیوں کے مدارس'' کے قیام کے نازک ترین کام کو علماء کسی حد تک برداشت کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ لیکن بہرحال یہ کام خطرات اور اندیشوں میں گھرا ہوا ہے۔

اقامتی یا غیر اقامتی ادارے

تعلیم نسواں کی زیادہ بڑی ضرورت تو ایسے غیر اقامتی اداروں سے پوری ہوجاتی ہے جہاں لڑکیوں کے قیام کا بندوبست نہ ہو بلکہ تعلیم کے وقت طالبات آئیں اور چھٹی پر واپس ہوجائیں۔ لیکن درج بالا اسباب بعض صورتوں میں اقامتی اداروں کے بھی متقاضی ہیں۔ اس لئے انکی ضرورت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا، تاہم ایسے اداروں میں سخت ترین احتیاط عمل میں لانا ضروری ہے۔ ورنہ یہ عمل رحمت کے بجائے بدترین زحمت بن جائے گا۔

نسوانی مدارس میں مفاسد اور انکا سد باب

ایک طرف وہ واقعی ضرورتیں ہیں جنکا ذکر اوپر کیا گیا دوسری طرف مسئلہ کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ عام طور پر لڑکیوں کے مدارس کے منتظمین اس نازک کام میں اتنے محتاط نہیں ہیں جتنا محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اوران مدارس میں مفاسد کے خطرات واقعہ بن کر سامنے آتے رہتے ہیں۔ چند اہم مفاسد ذیل میں درج کیئے جاتے ہیں۔

الف : پردہ کے بارے میں بے احتیاطی

بہت سے زنانہ مدارس میں آمد و رفت کے دوران پردہ کا اہتمام نہیں ہوتا بڑی بڑی لڑکیاں رکشوں اور بسوں میں بے پردہ آتی جاتی ہیں، اور معلوم نہیں ہو پاتا کہ یہ کالج کی لڑکیاں ہیں یا دینی مدرسے کی؟ اسی طرح کبھی جامعۃ البنات میں لڑکیوں کو لیجانے والی گاڑی میں نامحرم ڈرائیور سے خلوت کی نوبت آجاتی ہے جو قطعاً جائز نہیں ہے۔ گاڑی کا نظم ایسا بنانا ضروری ہے کہ تنہا کوئی لڑکی ڈرائیور کے ساتھ نہ رہے ورنہ سخت گناہ ہوگا (مستفاد احسن الفتاویٰ ۸/۵۱) علاوہ ازیں جامعہ میں رہنے والے مرد ملازمین یا ذمہ داران سے بھی بے حجابی کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، جسکی بالکل اجازت نہیں ہے۔ نیز بعض اقامتی مدارس میں اسکا زیادہ اہتمام نہیں کیا جاتا کہ لڑکیوں کو لیکر

آنے اور جانے والے حضرات اسکے شرعی محرم ہیں یا نہیں؟ اس بے احتیاطی کی وجہ سے بھی طرح طرح کے فتنے رونما ہوتے ہیں۔

ب : نامحرم استاذوں کی تدریس

بعض جامعات میں ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ وہاں بڑی کتابوں کا درس مرد اساتذہ دیتے ہیں۔ جو اگرچہ پردہ میں ہو پھر بھی فتنہ سے خالی نہیں ہے۔ فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب لدھیانویؒ فرماتے ہیں:

''نامحرم مرد سے پڑھنا بوجوہ ذیل ناجائز ہے (۱) روزانہ نامحرم کی صحبت میں بیٹھنا (۲) زیادہ دیر تک بیٹھے رہنا (۳) اشکالات علمیہ حل کرنے اور فہم و تفہیم کے لئے استاذ و طالبات کے درمیان بار بار مراجعہ (۴) قرب مکانی مجلس وعظ کی بنسبت زیادہ ہوتا ہے (۵) طالبات معدودات ہوتی ہیں اور استاذ کی نظر میں مشخصات و معہودات (یعنی متعین ہوتی ہیں) مجلس وعظ میں عموماً ایسا نہیں ہوتا۔ (۶) معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ استاذ رجسٹر میں حاضری لگانے کے لئے ہر طالبہ کا نام پکارتا ہے اور وہ جواب دیتی ہے۔ اس سے جانبین کے درمیان خصوصی معرفت اور مزید تعلق پیدا ہوتا ہے۔ (احسن الفتاوی ۸/۶۱)

لہٰذا لڑکیوں کے مدرسوں میں مرد اساتذہ کو ہرگز نہیں پڑھانا چاہئے۔ اور جہاں یہ سلسلہ جاری ہے اسے فی الفور بند کرنا لازم ہے۔

ج : عالمہ اور فاضلہ کی ڈگری سے غرور

ان جامعات سے فارغ ہونے والی طالبات میں عام طور پر استعداد میں نقص کے باوجود اپنے علم و فضل پر عجب و تکبر اور غرور کا مرض بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ جبکہ اکثر جامعات کا نصاب معمولی ہے اور اس سے ایسی مکمل استعداد پیدا نہیں ہو پاتی جو ہر ضرورت کو پوری کردے لیکن نصاب کی اس

کمی کے باوصف طالبات کو عالمہ اور فاضلہ کی سند دیدی جاتی ہے اور وہ اسی پر انحصار کر کے اپنے کو اتنا بلند سمجھنے لگتی ہیں کہ بڑے علماء کو بھی خاطر میں نہیں لاتیں۔ نیز اس کبر کی وجہ سے انکی بعد میں ازدواجی زندگی بھی تلخ ہو جاتی ہے۔ اور یہ سب باتیں تربیت کی کمی کی وجہ سے رونما ہوتی ہیں۔

اس کے علاوہ اور بھی بعض مفاسد ہیں جنکا ذکر باعث طوالت ہے۔

کیا مفاسد کی وجہ سے لڑکیوں کے ادارے بند کردئے جائیں

اب یہاں بحث یہ ہے کہ کیا مذکورہ مفاسد کی وجہ سے تمام جامعات البنات کو بند کردینے کا مشورہ دینا چاہیئے؟ ظاہر ہے کہ یہ کوئی منصفانہ مشورہ نہیں کہلایا جاسکتا، کیونکہ یہاں قصور تعلیم یا مدرسہ کا نہیں بلکہ انتظام کا ہے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ ارشاد فرماتے ہیں:

"تعلیم نسواں کا مسئلہ بڑا مشکل ہے، ہم تو دیکھتے ہیں کہ جہاں لڑکیوں کا مدرسہ ہوتا ہے وہاں مفاسد ضرور ہوتے ہیں کہیں آنکھ لڑگئی، کہیں اور بے حیائی کی باتیں ہوتی ہیں، ایسے واقعات بہت ہوتے ہیں۔ اسکا اثر یہ ہوا کہ بڑے بوڑھوں کا طبقہ خود تعلیم نسواں کے مخالف ہوگیا۔ حالانکہ یہ بھی غلطی ہے۔ اسمیں تعلیم کا قصور نہیں بلکہ منتظمین اور طرز تعلیم کا قصور ہے۔ اسکی ایسی مثال ہے کہ کسی نے اپنے گھر والوں کو کھانا کھلایا اور اتفاق سے بیوی بچوں سب کو ہیضہ ہوگیا، اب آپ نے رائے قائم کی کہ کھانے پینے سے تو ہیضہ ہوجاتا ہے اسلئے کھانا پینا سب بند، اور دل میں ٹھان لی کہ کھانے پینے کے برابر کوئی چیز بری نہیں (ظاہر ہے کہ یہ مان لینا حماقت ہے. مرتب) سو تعلیم سے اگر کسی کو نقصان پہنچے گا تو یہ تعلیم کی وجہ سے نہیں بلکہ طریقہ تعلیم کی بدنظمی کی وجہ سے ہے۔ اگر مفاسد کا اعتبار کیا جائے تو اسمیں عورتوں کی کیا تخصیص ہے۔ اگر مردوں کو پیش آئیں تو وہ بھی ایسے ہی ہونگے۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ عورتوں کو تعلیم سے روکا جائے اور مردوں کو تعلیم میں ہر طرح کی آزادی دی جائے؟"۔ (اسلامی حکومت و دستور مملکت ۳۳۲ مرتبہ مولانا محمد زید مظاہری)

حضرت والاؒ کے اس پر از بصیرت ارشاد سے معلوم ہوا کہ مفاسد کا علاج اداروں کو بند کر دینا نہیں ہے۔ ورنہ دوسرے راستوں سے مزید مفاسد پیدا ہو جائیں گے، بلکہ ضروری ہے کہ اداروں کو باقی رکھ کر انکے مفاسد کے سد باب کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔

مفاسد پر بند کیسے لگے؟

ہذا مفاسد مذکورہ کو ختم کرنے کے لئے لازم ہے کہ کم از کم درج ذیل نکات پر سو فیصد عمل کیا جائے۔

(۱) پردہ کا مکمل اہتمام ہو، آمد و رفت یا اقامت کے دوران کوئی بھی سیانی بچی (جسکی عمر فقہاء نے ۹-۱۰ برس لکھی ہے) بے پردہ نہ پائی جائے۔

(۲) مرد ملازمین حتی کہ چپراسی، دربان یا ڈرائیور کسی سے طالبات کا قطعاً کوئی رابطہ نہ ہو، اور اسکی سخت نگرانی کی جائے۔

(۳) جامعہ میں پڑھانیوالی صرف استانیاں ہوں، کسی بھی مرد استاذ (جوان یا بوڑھے) کو ہرگز مدرس نہ رکھا جائے۔ خواہ وہ کتنا ہی پاکباز اور صالح کیوں نہ ہو، اسلئے کہ شیطان کے اثر سے حفاظت کی کوئی ضمانت نہیں دے سکتا۔

(۴) جامعہ کا نصاب معتبر علماء کے ذریعہ تجویز کرایا جائے، یہ نہ ہو کہ جیسا جی میں آیا کتابیں متعین کر لیں، اور تعلیم شروع کر دی۔

(۵) ہر لڑکی کو عالمہ فاضلہ بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ ضروری دینی معلومات اور روزمرہ کی ضرورت کا علم سب کو سکھایا جائے اور جو لڑکیاں ذہین اور باکردار اور سلیم الطبع ہوں آگے کی تعلیم صرف ایسی ہی لڑکیوں کو دیجائے۔

(۶) تعلیم کے ساتھ تربیت، اور امور خانہ داری کی مشق پر بھرپور توجہ دیجائے۔

(۷) منتظمین اپنی محارم عورتوں کے ذریعہ نظام چلائیں، ایسا نہ ہو کہ مرد منتظم بالکل اجنبی ہو، اور خواتین استانیوں اور ذمہ داروں میں کوئی اس کا محرم نہ ہو، ایسی صورت میں سخت فتنہ کا اندیشہ ہے۔

منتظمین جامعات سے گذارش

یہ گذارشات محض اصلاح اور خیر خواہی کے مقصد سے تحریر کی گئی ہیں، مقصود یہ ہے کہ ہمیں کوئی ایسا عمل نہیں کرنا چاہئے کہ دوسرے کی آخرت بنانے کی فکر میں ہمارا اخروی نقصان ہو جائے۔ ہم تو اس فکر میں رہیں کہ امت کی خواتین دینی علوم سے بہرہ ور ہو جائیں مگر طریقہ عمل کی خرابی اور بے احتیاطی کی وجہ سے ہمارا نامۂ اعمال روشن ہونے کے بجائے سیاہ ہو جائے۔ یہ کوئی عقلمندی کی بات نہ ہوگی، عورتوں کی تعلیم کا معاملہ جتنا نازک ہے اتنی ہی نزاکت کے ساتھ اسکے نظام کو قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ اور اگر منتظمین لوجہ اللہ اس امر کا تہیہ کر لیں تو انشاء اللہ خدا کی مدد ہوگی اور اس محنت کے مفید ثمرات سے امت فیضیاب ہوگی۔ انشاء اللہ تعالیٰ.

(ندائے شاہی، اکتوبر ۲۰۰۰ء)

افکار باطلہ کی تردید

ناطقہ سربگریباں ہے

گیس کی پائپ لائن پھٹ جائے اس میں سے گیس کا رساؤ ہونے لگے، اور کوئی ڈاکٹر صاحب آ کر اس کی مرمت کی ترکیبیں بتانے لگیں، تو لوگ کہیں گے: ''ڈاکٹر صاحب! آپ ازراہِ کرم اپنے مطب میں ہی تشریف رکھیں، جسم کی رگ پھٹے تو آپ شوق سے اس کا علاج فرمائیں؛ لیکن گیس کی لائن پھٹنے سے متعلق آپ کی رائے معتبر نہیں ہے۔''

آدمی کے دل کی حالت بگڑ جائے، سانس پھولنے لگے، جسم پسینہ سے شرابور ہو جائے۔ ایسے وقت میں کوئی انجینئر صاحب تشریف لائیں اور مریض کے بارے میں تشخیص و تجویز کا شوق فرمانے لگیں تو مریض کے تیمار داران سے اس طرح مخاطب ہوں گے۔ ''جناب انجینئر صاحب! گستاخی کی معافی، آنجناب کو فن معالجہ سے کیا واسطہ؟ برائے مہربانی آپ اپنی انجینئری اپنے ہی پاس رکھیں ہمارے مریض کے سلسلے میں تشخیص و تجویز کی خامہ فرسائی نہ فرمائیں۔''

لیکن عجیب بات ہے۔ اگر کوئی مسلمان (مصیبت اور قسمت کا مارا) اتفاقاً طلاق دے دے یا اسی طرح کا کوئی اور دینی مسئلہ پیش آ جائے تو ایک دم سے خود ساختہ روشن خیال اور ترقی پسند دانشورانِ قوم کی ایک بھیڑ اکٹھی ہو جاتی ہے اور عورتوں سے ہمدردی کے پردہ میں براہِ راست قرآن سے اجتہاد و استنباط کرتے ہوئے دینی مسائل میں بے لاگ اور بے دریغ رائے زنی کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ تعجب اس رائے زنی پر ہرگز نہیں ہے اس لئے کہ اس ''اسلام بیزار طبقہ'' سے تو اس کے علاوہ کسی حرکت کی امید ہی نہیں۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ ان کی اس جسارت پر ''ملت'' محض تماشائی بنی رہتی ہے۔ اور کوئی ایسا جرأت مند اور حوصلہ مند نہیں ہوتا جو پوری قوت سے دانشوروں کو یہ کہہ کر لگام دے سکے۔

''محترم دانشورانِ قوم! پہلے اپنی صورت آئینے میں دیکھیں، پھر مقدس قرآن و حدیث کے احکامات پر بے جا رائے زنی کی جسارت اور ہمّت کریں۔ جنھیں محکم و منسوخ کا پتہ نہیں، جنھیں نحو و

صرف اور اشتقاق سے ذرا بھی مس نہیں، اصول حدیث وتفسیر کی جن کو ہوا بھی نہیں لگی اور جو نصوص شرعیہ کے پس منظر اور مقاصد نزول سے کچھ بھی واقف نہیں۔ انھیں کیا حق پہنچتا ہے طلاق ونکاح جیسے خالص دینی مسائل میں اجتہاد کرنے کا؟ وہ اچھی طرح یاد رکھیں کہ حضرات صحابہ وتابعین، فقہا ومحدثین اور علماء مفتیان (جنھوں نے اپنی زندگیاں دین حنیف کی ترویج واشاعت اور تعلیم وتعلم کے لئے وقف کردیں اور جو ابتداء اسلام سے آج تک ملّت بیضاء کے دینی تشخص کی حفاظت کے لئے ہر طرح کی قربانی پیش کرتے رہے) کے خلاف ان جیسے عامیوں اور کم سوادوں کے ذلت انگیز اجتہادات کو ملت اسلامیہ ہرگز ہرگز قبول نہیں کرسکتی۔''

اب وقت آ گیا ہے کہ منصوص اور اجماعی مسائل میں ان نام نہاد روشن خیالوں کی دخل اندازی اور علماء واسلاف پر بہتان طرازی کا مؤثر جواب دیا جائے۔ گذشتہ دنوں میں اس طبقہ نے تین طلاق کے مسئلہ کی آڑ میں فقہ اسلامی سے متعلق جو زہرا افشانی کی ہے وہ علماء حق اور دردمندان ملّت کو جھنجھوڑنے کے لئے کافی ہے اگر اس زہرا افشانی کا سنجیدگی سے جائزہ نہ لیا گیا اور ملّت کی جانب سے ٹھوس، مدلل اور جامع موقف نہ اپنایا گیا تو ان روشن خیالوں کی نادان دوستی سے ہندوستان میں اسلامی حقوق اور تشخص کو سخت ترین نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ دراصل یہ وہ لوگ ہیں جن کے نام اگرچہ اسلامی ہیں مگر ان کے دلوں میں اسلام اور حاملینِ دین کی طرف سے کینہ اور بغض وعداوت چھپا ہوا ہے اور ایسے ہی سہولت پسندوں کے بارے میں نبی آخرالزمان صادق ومصدوق محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشین گوئی مروی ہے۔

''عنقریب وہ وقت آئے گا جب پیٹ بھرا (مالدار) شخص اپنے تکیہ سے ٹیک لگائے ہوئے یہ کہے گا۔ جو قرآن میں حلال ہے اسے ہی حلال جانو اور جو اس میں حرام ہے بس اسے ہی حرام کہو (یعنی وہ حدیث وغیرہ کو نہ مانے گا۔ پھر آپ نے ارشاد فرمایا) اور بیشک اللہ کے رسول نے جو حرام کیا وہ (بھی) اللہ تعالیٰ کے حرام کرنے کے مانند ہے۔'' (مشکوٰۃ شریف ۱/ ۲۹)

اس لئے اسلامیانِ ہند کا یہ فرض ہے کہ وہ ہر موقع پر اس ''اسلام بیزار'' طبقہ کی حوصلہ شکنی کرکے ملی حمیت وغیرت کا ثبوت دیں اور ہر دینی مسئلہ میں صرف علماء مفتیان کی رائے پر ہی عمل کریں۔ اخباری بیانات، تحریرات اور بے سروپا مغالطوں سے ہرگز متاثر نہ ہوں۔ (ندائے شاہی، ستمبر ۱۹۹۳ء)

❍❖❍

عرس نہیں! میلے

ایک صاحب کے بارے میں معلوم ہوا جو کہنے کو تو دیو بندی ہیں مگر ان کا معمول یہ ہے کہ ''عرس صابری'' کے موقع پر ''کلیر'' میں سالانہ لنگر کا بھی انتظام کرتے ہیں۔ پوچھا گیا کہ بھئی یہ کیا ہے؟ جواب ملا کہ ''صاحب یہ ہمارا آبائی معمول ہے'' یعنی ہم اپنے آباؤ اجداد کی اس عظیم سنت کو نہیں چھوڑ سکتے۔ یہ جواب سن کر مجھے قرآن کریم کی آیت یاد آ گئی۔ قرآن نے مشرکین کے بارے میں فرمایا کہ ''جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس وحی کی طرف جو اللہ نے اتاری ہے اور رسول کی (تعلیمات کی) طرف، تو وہ کہتے ہیں کہ ہم کو تو وہی طریقہ کافی ہے جس پر ہم نے اپنے آباء (واجداد) کو پایا ہے'' قرآن کریم نے آگے مشرکین کے اس جواب کا بھی دنداں شکن جواب دیا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ کاش یہ جواب ان تمام بھائیوں تک پہنچ جائے جو محض قدیم رسم ورواج اور اپنے بڑوں کی اندھی پیروی کرتے ہوئے خلاف شریعت اور خلاف سنت کاموں کو ثواب سمجھ کر انجام دیتے ہیں۔ قرآن کریم نے جواب دیا ہے ''(بتاؤ) اگر چہ ان کے باپ کچھ بھی نہ جانتے ہوں۔ اور انھیں سیدھی راہ کا پتہ نہ ہو۔ (تو کیا پھر بھی وہ ان کو مقتدیٰ مانتے رہیں گے)'' یعنی کیا محض باپ ہونا اقتدا کے لئے کافی ہے یا باپ کا باپ ہونے کے ساتھ ساتھ عقلمند ہونا بھی ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ اپنے پاگل باپ کی کوئی نقل نہیں اتارتا۔ بلکہ اس کے افعال کو بے عقلی پر محمول کرتا ہے۔ اسی طرح عالم بیٹا علم کے معاملہ میں جاہل باپ کی تحقیق پر ہرگز عمل نہیں کرتا۔ تو جب تم دنیا کے معاملہ میں بے عقل باپ کے طریقہ پر نہیں چلتے تو دین کے معاملہ میں تم یہ کیوں کہتے ہو کہ ہمارے آباؤ اجداد کا طریقہ ہی ہمارے لئے کافی ہے۔ ان کے بارے میں یہ کیوں نہیں تحقیق کرتے

کہ وہ صحیح راستے پر تھے بھی یا نہیں؟ اس لئے اولاً یہ سمجھ لیں کہ کسی بھی معاملہ کو صحیح قرار دینے کے لئے محض یہ کہہ دینا ہرگز کافی نہیں کہ ہمارے باپ دادا ایسا کرتے چلے آئے ہیں؛ لہٰذا ان کا یہ عمل ہمارے لئے حجت ہے؛ بلکہ یہ دیکھا جائے گا کہ ان باپ داداوں نے کس شرعی دلیل سے اس حکم پر عمل کیا ہے۔ اگر وہ قابل قبول ہو تو فبہا۔ ورنہ شریعت کے حکم اور قرآن وحدیث کے مقابلہ میں بڑے سے بڑے باپ دادا کے عمل کو ایک طرف رکھ دیا جائے گا اور قرآن وسنت کا حکم ہی قابل نفاذ ہوگا۔

اب اس اصول کی روشنی میں ہمیں اپنے اعمال کا جائزہ لینا ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات کے قریب جو چند نہایت اہم وصیتیں امت کو فرمائی ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ ''میری قبر کو سجدہ گاہ مت بناؤ'' ظاہر ہے کہ حضرات صحابہؓ میں جس درجہ کا ایمان تھا ان سے یہ توقع نہیں رکھی جاسکتی تھی کہ وہ آئندہ وشرک میں مبتلا ہو جائیں گے اور اللہ رب العزت کے مقابلہ میں نعوذ باللہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معبود بنالیں گے۔ لیکن پھر بھی آپ نے اپنی قبر اطہر کے سامنے جھکنے سے منع فرما دیا تاکہ وفور محبت اور عقیدت کی رو میں بہہ کر کہیں امت شرک کے راستہ میں نہ چل پڑے اور اللہ اور اس کے پاک رسول کے احکامات کو بھلا کر انھیں تماشوں میں گھر کر نہ رہ جائے۔ تو غور فرمائیں کہ جس بات کو آپ نے رسول ہونے کے باوجود اپنے لئے پسند نہیں فرمایا تو کیا یہ ممکن ہے کہ آپ اپنی امت کے کسی فرد کے بارے میں اس طرز عمل کی اجازت دیں گے اور اس پر راضی ہو جائیں گے۔ کوئی بھی دینی سمجھ رکھنے والا شخص اس کا تصور نہیں کرسکتا۔

پھر بات صرف سجدہ ہی تک نہیں رہی بلکہ ان بڑے بڑے اولیاء اللہ کے مزارات پر جانے والے لوگ خالق حقیقی کو بھول کر ان ہی مزار والوں کو مختار کل سمجھنے کا عقیدہ رکھتے ہیں ان سے ہی مرادیں مانگی جاتی ہیں۔ ان ہی کے نام پر منتیں چڑھائی جاتی ہیں۔ اور ظاہری طور پر وہی معاملہ کیا جاتا ہے جو عابد ومعبود اور خالق ومخلوق کے درمیان ہوتا ہے، بزرگ کے قبہ کا طواف ہوتا ہے اور بیت اللہ کی طرح اس کی تعظیم کی جاتی ہے۔ نعوذ باللہ من ذلک۔ یہ سب جہالت اور ناواقفیت کی باتیں ہیں شیطان نے ان اعمال کو ہماری نظروں میں اتنا مزین کر دیا ہے کہ ہماری سوچنے اور سمجھنے

کی صلاحیت ہی مفلوج ہو کر رہ گئی، اور عقل وخرد کے باوجود ہم سے بے عقلی کے افعال صادر ہونے لگے ہیں۔

آج یہ کس کو نہیں معلوم کہ عرس کے نام پر لگنے والے یہ میلے بزرگوں سے عقیدت کے نہیں بلکہ غنڈہ گردی اور بے حیائی کے اڈے بن چکے ہیں۔ کون سی ایسی بدکاری ہے جو ان میلوں میں نہیں ہوتی؟۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کو عرس کہنا ہی غلط ہے یہ تو تفریح کے میلے ہیں۔ بزرگوں کے نام پر ایسی بے حیائیاں کرنا ان کی تعظیم نہیں بلکہ ان کی سخت قسم کی توہین اور تذلیل ہے۔ جن بزرگوں نے اپنی پوری زندگیاں دین کی اشاعت وحدانیت کی تبلیغ اور اسلامی احکامات کی ترویج واشاعت میں گذار دیں، آج ان ہی کے نام پر اور انہی کی آرام گاہوں پر دین کی عظمت کو تار تار کیا جائے، دینی حدود وقیود کی دھجیاں اُڑائی جائیں اور پیغمبر کی وصیت کو پیروں تلے روندا جائے۔ پھر یہ سمجھا جائے کہ ہم بزرگوں کا احترام کرنے والے اور سنت کو سینے سے لگانے والے ہیں۔ اس سے بڑی خود فریبی کیا ہو سکتی ہے؟۔

آج ضرورت ہے کہ ہم اپنے اعمال کا محاسبہ کریں اور رسوم ورواج کے تنگ خول سے نکل کر قرآن وسنت کی صاف شفاف رہنمائیوں کو سینے سے لگائیں۔ اور اپنی جان ومال کو کسی بھی ایسی جگہ خرچ ہونے سے بچائیں جس سے شریعت کی خلاف ورزی ہوتی ہو۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''جو شخص کسی قوم کی تعداد (اور شوکت) کو بڑھائے اس کا حشر بھی اس قوم کے ساتھ ہوگا'' بزرگوں کا احترام اپنی جگہ ہے لیکن وہ اسی حد تک ہونا چاہئے جہاں تک شریعت نے اجازت دی ہو۔ اس لئے کہ شریعت سب سے برتر ہے اور ایک مسلمان کے لئے شریعت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں عقل سلیم سے نوازے۔ آمین۔

(ندائے شاہی، ستمبر ۱۹۹۶ء)

دین ہے یا مذاق

ہر زمانہ میں کچھ نہ کچھ ایسے نام نہاد بزعم خود ''مفکرین اسلام'' پائے جاتے رہے ہیں۔ جو دین کی توضیح وتشریح کے پردے میں دین کی بنیادوں کو متزلزل کرنے اور اہل دین علماء سلف کی خدمات کو سبوتاز کرنے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو ہمیشہ اس بات کی فکر رہتی ہے کہ کون سا ایسا نکتہ نکالا جائے جس سے علماء سلف کی تغلیط ہو سکے اور ان حضرات کے بارے میں عوام وخواص کے درمیان بدگمانی پھیلائی جا سکے۔ ہمارے ملک میں اس ''تحریک مغالطہ'' کے قائد اعظم وحیدالدین خاں صاحب ہیں جو عرصہ دراز سے اپنے خوب صورت طرز تحریر، دلچسپ مضامین اور واقعات کے معروضی مطالعہ کے ضمن میں دینی اصول وقواعد میں معنوی تحریف، باطل قسم کے اجتہادات اور علماء مخلصین کی دینی محنتوں کو غلط ٹھہرانے کے نظریہ پر مضبوطی سے عمل پیرا ہیں۔ اور پوری منصوبہ بندی کے ساتھ اباحیت پسندوں کو تحریری مواد فراہم کر رہے ہیں۔ وقت کے ساتھ ان کی مغالطہ انگیزیوں کی تعداد بھی بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اس سلسلہ کا ایک نیا شگوفہ اس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔ موصوف نے اپنے ترجمان ''الرسالہ'' کے شمارہ ۴، ۲۵ جنوری ۱۹۹۸ء میں ص ۱۲ پر حکمتِ دعوت کے عنوان سے روس کے پہلے عیسائی بادشاہ ''ولادیمیر'' کے مذہب عیسائیت اختیار کرنے کا واقعہ ایک مسیحی راہب یعقوب کے حوالہ سے لکھا ہے کہ:

''بادشاہ مذکور نے اپنے آبائی مذہب سے بے زار ہو کر صحیح مذہب کی تحقیق کے لئے یہودی، عیسائی اور مسلم علماء کو اپنے دربار میں بلایا۔ یہودی مذہب تو اسے پسند ہی نہ آیا۔ مذہب اسلام اسے بہت اچھا لگا۔ مگر اس نے علماء سے یہ شرط لگائی کہ اگر مجھے شراب پینے کی اجازت دیں تو میں اسلام

لے آؤں۔ علماء نے اس کی یہ شرط تسلیم نہ کی اور وہ اسلام لانے سے باز رہا۔ پھر اس نے کبیدگی کے باوجود عیسائی مذہب اختیار کر لیا۔"

اب جن علماء نے صحیح موقف اختیار کرتے ہوئے شراب کو جائز قرار دینے سے انکار کر دیا تھا۔ ان پر غصہ اتارتے ہوئے خاں صاحب کس طرح خامہ فرسائی فرماتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

"مذکورہ علماء نے جو بات کہی وہ فقہی مسئلہ کے اعتبار سے درست تھی۔ مگر وہ دعوتی مسئلہ کے اعتبار سے درست نہ تھی۔ فقہ کی کتاب میں اسلام کے مسائل صرف اپنی قانونی حیثیت میں بیان کئے جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ فقہ کی کتابوں میں مسائل کی جو فہرست دی گئی ہے اس کو ویسے کا ویسے نافذ بھی کرنا ہے۔ عملی نفاذ میں تدریج کا اصول ہے نہ کہ فہرست بندی کا اصول، اسلام کے دور اول میں اسی تدریج کو استعمال کیا گیا ہے حتی کہ مکی دور میں یہ حال تھا کہ ایمان لانے کے باوجود شراب پینے والے شراب پیتے تھے۔ یہی تدریجی حکمت بعد کے زمانوں میں بھی اختیار کی جائے گی۔ "تدریجی حکمت" کے بغیر دعوت کی توسیع ممکن نہیں۔ (الرسالہ جنوری ۱۹۹۸ء)

خان صاحب موصوف کا یہ تبصرہ (بلکہ بالفاظ حقیقت مغالطہ) اتنا زہرناک ہے کہ اس نے پورے کے پورے دین کی بنیادوں کو متاثر کر دیا ہے اگر اس تدریج کو اسی اطلاق کے ساتھ باقی مان لیا جائے تو پھر دین دین نہ رہ کر مذاق بن جائے گا۔ اور چند ہی دنوں میں اسلامی شریعت کی عمارت زمین بوس ہو جائے گی۔ آج اگر کسی بادشاہ کی رعایت میں شراب کی اجازت دی جائے، تو کل دوسرا کھڑا ہوگا کہ مجھے خنزیر کھانے کی اجازت ملے تب میں اسلام لاؤں گا۔ تیسرا کھڑا ہو کر کہے گا کہ مجھے زنا کی اجازت ملے تو میں اسلام لے آؤں گا۔ چوتھا کھڑا ہو کر مطالبہ کرے گا کہ مجھے جوا کھیلنے اور سود کھانے کی مطلق اجازت دی جائے۔ اس کے بعد ہی میں اسلام قبول کروں گا۔ اور وحید الدین خان صاحب جیسے لوگ مکی دور سے استدلال کرتے ہوئے اور اپنی من گھڑت تدریجی حکمت پر عمل کرتے ہوئے ہر ایک مطالبہ پر آمنّا وصدقنا کہتے رہیں گے تو پھر آخر کون سی ایسی حرام چیز باقی رہے گی جو حلال نہ ہو جائے؟ جب تدریج ہی پر عمل ٹھہرا تو پھر ہر ایک کو اس کی منشاء کے مطابق ڈھیل دینی پڑے گی اور ساری حرام چیزوں کی حرمت بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔

پھر ذرا سوچئے تو سہی کہ اگر بالفرض دعوتِ اسلام کے لئے مزعومہ ''تدریجی حکمت'' کے بطور ایک حرام چیز کسی کے لئے وقتی طور پر حلال کردی جائے تو اس تدریج کی مدت کب ختم ہوگی؟ اور اس کی کیا گارنٹی ہے کہ چند دنوں کے بعد وہ ''نومسلم'' اسے پھر حرام ہی سمجھنے لگے؟ یہ بھی تو عین ممکن ہے کہ وہ تدریج ہی کو اصل حکم شریعت سمجھ لے۔ یا پھر بعد میں یہ کہنے لگے کہ مجھے مزید ڈھیل دی جائے جبھی میں اسلام پر برقرار رہوں گا۔ تو پھر خان صاحب جیسے ''داعیان اسلام'' کی تدریج کا کیا انجام ہوگا؟

یہ ''تدریجی حکمت'' کا باطل تصور دراصل قیاس فاسد کی پیداوار ہے۔ اللہ تعالیٰ علماء کی قبروں کو نور سے منور فرمائے جنھوں نے ''اجتہاد مطلق'' کا دروازہ بند کرنے کا اعلان کررکھا ہے۔ ورنہ خان صاحب جیسے جدت طراز مجتہدین کب کے دین کو بیچ کر شریعت کو تار تار کرچکے ہوتے۔ خان صاحب پر اسلام کا مکی دور ایسا سوار ہے کہ وہ کائنات کے ہر مسئلہ کو صرف اور صرف ''مکی دور'' کی عینک سے دیکھنے کے عادی ہوگئے ہیں اب تک تو صرف جہاد اور اقدام کے جذبات کو سرد کرنے کے لئے مکی دور کا سہارا لیا جاتا تھا۔ اب آگے بڑھ کر حرام کو حلال کرنے کے لئے اور احکام شریعت کو بدل ڈالنے کے لئے بھی مکّی دور کا سہارا لیا جانے لگا۔

حالانکہ اسلامی تعلیمات سے واقفیت رکھنے والا ہر شخص بآسانی یہ سمجھ سکتا ہے کہ دین کی تشکیل کے دوران کسی چیز کا حرام نہ ہونا اور بات ہے۔ اور تشکیل ہوجانے کے بعد حرام شدہ چیز کو پھر سے حلال کردینا اس سے بالکل مختلف بات ہے۔ ایک کو دوسرے پر قیاس کرتے ہوئے یہ کہنا کہ ابتداء اسلام میں فلاں چیز حلال رہی، لہٰذا اب بھی حلال ہوسکتی ہے۔ یہ قیاس نہیں ہے بلکہ نری جہالت ہے۔ اگر خان صاحب کی اس منطق کو مان لیا جائے تو اسلام کا نہ قبلہ باقی رہے گا نہ کوئی عبادت فرض رہے گی۔ اس لئے کہ ابتداء میں ایک زمانہ ایسا گذر چکا ہے جب یہ عبادتیں اور احکامات لازم نہیں تھے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ ''تدریج'' کی ان پھونکوں سے اسلام کے مضبوط احکامات کو مضمحل نہیں کیا جاسکتا۔ اوروں کی بات تو دور رہی خود پیغمبر اسلام حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اللہ تعالیٰ

نے یہ اختیار مرحمت نہیں فرمایا کہ آپ خود اپنی مرضی سے اللہ کے حکم کے بغیر کسی حلال کوحرام یا حرام کوحلال کر دیں۔ چنانچہ:

(۱) مشہور مفسر قرآن علامہ قرطبیؒ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''جامع احکام القرآن'' (۲/۲۴) میں لکھا ہے کہ جب مدینہ کے معتبر یہودی عالم حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مشرف بہ اسلام ہوگئے تو انھوں نے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام سے درخواست کی کہ ''انھیں نماز میں توریت پڑھنے کی اور اس کے بعض احکامات پرعمل کی اجازت دے دی جائے۔'' اگر خان صاحب کی من گھڑت ''تدریجی حکمت'' ہی پیش نظر ہوتی تو کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ ان حضرات کو وقتی طور پر نماز میں توریت پڑھنے کی اجازت دے دی جاتی جس کی وجہ سے ممکن تھا کہ اور یہودی بھی ایمان لے آتے۔ مگر قرآن کریم نے اس موقع پر تدریج کا بالکل خیال نہیں کیا بلکہ بہت زوردار انداز میں یہ حکم نازل فرمایا:

يَـاَيُّهَـا الَّـذِيْـنَ اٰمَـنُوْا ادْخُلُوْا فِى السِّلْمِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ. (البقرہ۲۰۸)

''اے ایمان والو! داخل ہو جاؤ اسلام میں پورے اور مت چلو قدموں پر شیطان کے، بیشک وہ تمھارا صریح دشمن ہے۔''

آیت میں بتا دیا گیا کہ ایمان لانے کے بعد اسلام کے کسی بھی حکم کو جان بوجھ کر چھوڑ دینا شیطانی اثر کی بنا پر ہے جس کی ہرگز اجازت نہیں دی جاسکتی۔

(۲) امام دارقطنیؒ نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل فرمایا ہے کہ:

كَلَامِىْ لَايَنْسَخُ كَلَامَ اللّٰهِ وَ كَلَامُ اللّٰهِ يَنْسَخُ كَلَامِىْ. (مشکوۃ شریف ۱/۳۲)

''میرا (اپنا اجتہادی) کلام، اللہ کے کلام (حکم) کو منسوخ نہیں کرسکتا۔ اور اللہ کا کلام میرے (اجتہادی) حکم کو منسوخ کرسکتا ہے''۔

اس ارشاد کو سامنے رکھ کر خود غور فرمائیے کہ جن چیزوں کے بارے میں قرآن کریم میں صاف حرمت موجود ہے۔ مثلاً شراب جوا، سود وغیرہ۔ ان کی حرمت کو منسوخ کرنے کا جب خود حضرت شارع علیہ السلام کو حق نہیں تو ہما شما کو تدریج کے نام (وقتی طور پر ہی سہی) اسے منسوخ کرنے کا کیسے استحقاق ہوسکتا ہے؟

(۳) آیات قرآنیہ **اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ، الآیہ.** (المائدہ:٤) **اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ.** (آل عمران) **وَمَنْ یَبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْناً فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہ، الآیہ** ۔ وغیرہ میں صاف طور پر اعلان فرما دیا گیا ہے کہ دین کے تمام احکامات کامل ومکمل ہو چکے ہیں۔ اب ان مکمل احکامات کے علاوہ کوئی راستہ اللہ تعالیٰ تک رسائی کا ذریعہ نہیں بن سکتا تو اب ان میں کمی بیشی یا وقتی اور عارضی اور تدریجی طور پر گھٹانے بڑھانے کی بھلا کہاں گنجائش ہوسکتی ہے؟

(۴) اس موقع پر ہمیں خلیفۂ اوّل سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے جرأت مندانہ کردار کو پیشِ نظر رکھنا چاہئے کہ جس وقت آپ نے بارِ خلافت سنبھالا تو عرب کے کچھ قبیلے پوری طرح مرتد ہوگئے تھے۔ اور کچھ ایسے تھے جو اگرچہ اسلام کے مدعی تھے مگر انھوں نے زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کردیا تھا۔ سیّدنا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ان کے خلاف بھی اعلان جہاد کردیا اور فرمایا کہ جو شخص پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں ایک رسّی بھی زکوٰۃ میں ادا کرتا تھا اور اب نہ دے گا تو اس سے جہاد کیا جائے گا۔ جبکہ حضرات صحابہ کرام کی عام رائے یہ تھی کہ ان مانعین زکوٰہ سے ابھی کچھ تعرض نہ کیا جائے اور دوسرے محاذوں پر اپنی پوزیشن مضبوط کی جائے۔ اسی بناء پر سیدنا حضرت عمرؓ نے عرض کیا۔

یَا خَلِیْفَةَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ تَاَلَفِ النَّاسَ وَارْفُقْ بِھِمْ.
(مشکوٰۃ شریف)

”اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین ! لوگوں کی دلجوئی فرمائیے اور ان کے ساتھ نرمی کا معاملہ کیجئے“۔

حضرت عمرؓ کے عرض کرنے پر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جو شاندار اور پُرعزم جواب دیا وہ اسلامی تاریخ میں قیامت تک کے لئے سنہرے حروف سے نقش ہوگیا۔ آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

اَجَبَّارٌ فِی الْجَاهِلِيَّةِ وَخَوَّارٌ فِی الْاِسْلَامِ، اِنَّهٗ انْقَطَعَ الْوَحْیُ وَ تَمَّ الدِّیْنُ، اَیَنْقُصُ وَاَنَاحَیٌّ. (مشکوٰۃ شریف ۲/۵۵۶)

''عمر! زمانہ جاہلیت میں بڑے بہادر تھے اور اسلام لاکر بزدل بن گئے؟ اچھی طرح سمجھ لو کہ اب وحی کا سلسلہ بند ہو چکا اور دین پایہ تکمیل کو پہنچ چکا ہے کیا دین میں کمی ہو اور میں زندہ (دیکھتا) رہوں۔ (یہ نہیں ہوسکتا)؟''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ میں چاہتا ہوں کہ کاش میری پوری زندگی کے اعمال ابوبکرؓ کے ایک دن اور ایک رات کے اعمال کے برابر ہو جائیں، رات وہ جو سفر ہجرت کے دوران غارِ ثور میں پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ گذاری اور دن وہ جب مانعین زکوٰۃ سے جہاد کا جرأت مندانہ فیصلہ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اسی دینی تصلب اور اسلامی جرأت وحمیت نے عرب میں دوبارہ اسلام کا دبدبہ قائم کیا تھا۔ ورنہ اگر خان صاحب کی ''تدریجی حکمت'' پر عمل کیا جاتا تو نہ صرف یہ کہ زکوٰۃ کا خاتمہ ہو جاتا بلکہ دین کے دیگر احکامات سے بھی روگردانی عام ہو جاتی اور چند ہی دنوں میں دین کا جنازہ نکل جاتا۔

(۵) خان صاحب کا یہ جملہ ''عملی نفاذ میں تدریج کا اصول ہے نہ کہ فہرست بندی کا اصول'' سراسر مغالطہ پر مبنی ہے۔ اس لئے کہ نفاذ میں تدریج اس وقت ہوسکتی ہے جبکہ نفاذ کا تحقق ہی نہ ہوا ہو۔ جیسا کہ اسلام کے ابتدائی دور میں مرحلہ وار احکام کا نفاذ ہوتا رہا، لیکن جب اسلام کا مکمل نفاذ ہو چکا، بایں معنی کہ اس کے احکام پر عمل موجب ثواب اور نافرمانی موجب عذاب ہے۔ تو اب تدریج کے کیا معنی؟ اگر اب بھی تدریج کا حکم ہو تو پھر دین کامل ہی کہاں رہے گا؟ بس پوری زندگی تدریج ہی میں گذر جائے گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ اسلام میں اس تدریجی حکمت کی کوئی گنجائش نہیں ہے جسے خان صاحب نے پیش کر کے علماء پر نزلہ اُتارا ہے۔ ہمارا دین کامل و مکمل ہے۔ اور ہم اس کی دعوت دوسروں تک پہنچانے میں بس اس حد تک مکلّف ہیں کہ احکام شریعت بلاکم وکاست ان کے سامنے بیان کر دیں۔ کسی بڑے سے بڑے آدمی یا جماعت کی رورعایت میں اسلام کے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ حکم کو بھی نہ بدلا جا سکتا ہے اور نہ چھوڑا جا سکتا ہے۔ احکامات میں تبدیلی کی قیمت پر ہمیں اسلام کی عددی طاقت میں اضافہ ہرگز منظور نہیں ہے۔ ہم تو صرف انہی شائقین اسلام کو خوش آمدید کہہ سکتے ہیں۔ جو پورے شرحِ صدر کے ساتھ سو فیصد اسلام کے رنگ میں رنگین ہونے کو تیار ہیں۔ خدا ہمیں استقامت نصیب فرمائے اور ہمارے مفکرین کو واقعی فکر سلیم سے نوازے۔ آمین۔

(ندائے شاہی، مئی ۱۹۹۸ء)

فتنہ غیر مقلدیت

ترمذی شریف ابواب الفتن میں ایک طویل حدیث ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کی چند عادات وخصائل بیان کر کے ارشاد فرمایا ہے کہ جب یہ باتیں پائی جائیں گی تو دنیا پر بلائیں نازل ہوں گی، زلزلے آئیں گے اور اس طرح بے در پے علامات قیامت کا ظہور ہوگا جیسے کہ ہار کے دانے شیرازہ ٹوٹنے سے بکھر جاتے ہیں۔ انہی منکرات میں سے ایک صفت آپ نے یہ ارشاد فرمائی کہ:

لَعَنَ آخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اَوَّلَهَا. (ترمذی شریف۲/۴۵)

''امت کے بعد میں آنے والے لوگ اپنے اسلاف پر لعن طعن کریں گے۔''

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جوں جوں زمانۂ نبوت سے بعد ہوتا جا رہا ہے یہ قبیح صفت امت میں بڑھتی جا رہی ہے۔ اور یہی بات درحقیقت ساری دینی خرابیوں کی جڑ اور بنیاد ہے اس لئے کہ جب اسلاف کرام کا اعتماد مجروح کیا جائے گا تو دین بھی مجروح ہوئے بغیر نہ رہے گا۔ یہ دین سینہ بہ سینہ ہم تک اس مکمل حالت میں پہنچا ہے۔ یہ شریعت واسطہ در واسطہ ہمیں ملی ہے ان واسطوں میں سے کسی ایک واسطہ کا ناقابل اعتماد ہونا پورے دین اور شریعت میں تشکیک کا سبب بن سکتا ہے۔ اس لئے یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ راہ حق اور جادۂ مستقیم وہی ہے جس کی بنیاد سلف صالحین کے اعتماد پر رکھی گئی ہے۔ جس میں ذاتی قول کے مقابلے میں حاملین دین وشریعت کی رائے کو اہمیت دی جاتی ہے جو عقل کے مقابلہ میں نقل صحیح کو ترجیح دینے کی تلقین کرتا ہے اور جس میں نصوص کی تشریح وہی معتبر ہوتی ہے جو اسلاف کرام سے منقول ہو۔ اہلِ سنت والجماعت

کا طرۂ امتیاز یہی سب چیزیں ہیں جن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ حق پر وہ جماعت ہے جو ما انا علیہ واصحابی کے طریقہ پر عمل پیرا ہو۔

دور حاضر کا ایک بڑا فتنہ عمومی ترک تقلید بھی ہے جس نے آج کل ملک کے مختلف حصوں میں انتشار وافتراق کا دروازہ کھول رہا ہے اس نظریہ کے حامی افراد خاص طور پر حضرات ائمہ اربعہ اور ان کے ماننے والوں پر نہایت رکیک انداز میں طعن وتشنیع کرتے ہیں اور آیات واحادیث کی غلط تشریحات وتاویلات کر کے عوام کو فریب میں مبتلا کرتے ہیں۔ یہ فرقہ ۱۲۴۶ھ کے بعد کی پیدوار ہے اس کا بانی عبدالحق نامی ایک شخص تھا جس کو حضرت سید احمد شاہ بریلویؒ (شہید بالاکوٹ) نے غلط عقائد کی بنا پر اپنی جماعت سے خارج کر دیا تھا اس وقت کے علماء حرمین شریفین نے اس کے قتل کا فتویٰ دیا تھا مگر وہ کسی طرح بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا اس نے ابتداءً اپنے آپ کو محمدی کہنا شروع کیا مگر عوام میں یہ جماعت وہابی کے نام سے مشہور ہو گئی اس لئے بعد کے آنے والے عبدالحق کے پیروکاروں نے جماعت کا نام اہلِ حدیث انگریزوں سے رجسٹرڈ کرایا جس میں مولانا سید نذیر حسن صاحب دہلوی اور مولانا محمد حسین بٹالوی کا نام سرفہرست ہے۔یہی دونوں حضرات غیر مقلدیت کو فرقہ کی حیثیت دلانے والے ہیں۔

ترکِ تقلید گمراہی کا ایسا دروازہ ہے جو انسان کو محض خواہش نفس کا تابع ہی نہیں بناتا بلکہ بسا اوقات اللہ کے مقبول بندوں اور ائمہ عظام اور مخلص خدام دین سے بلاسبب بغض وعناد اور ان کی شان میں سخت گستاخانہ رویہ اپنانے کا سبب بن جاتا ہے۔اور ان حرکات کی وجہ سے آدمی خیر سے محروم ہو جاتا ہے۔مشہور غیر مقلد عالم مولانا محمد حسین بٹالوی (متوفی ۱۳۳۸ھ) اپنی جماعت کو متنبہ کرتے ہیں:

> ''پچیس سالہ تجربہ سے ہم کو یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ جو لوگ بے علمی کے ساتھ مجتہد مطلق اور مطلق تقلید کے تارک بن جاتے ہیں وہ آخر اسلام کو سلام کر بیٹھتے ہیں۔کفر و ارتداد اور فسق کے اسباب اور بھی دنیا میں بکثرت موجود ہیں مگر دینداروں کے بے

دین ہوجانے کے لئے بے علمی کے ساتھ ترکِ تقلید بڑا بھاری سبب ہے۔''
(رسالہ اشاعت السنہ ۲ جلد ۱۱، مطبوعہ ۱۸۸۸ء)

اس کے برخلاف آج کا ہر غیر مقلد براہِ راست قرآن وحدیث سے استنباط کا اپنے کو اہل سمجھتا ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ اپنی کم فہمی اور لاعلمی پر مبنی تحقیق کو صحیح اور سلف صالحین کی تشریحات کو غلط ثابت کرنے میں پورا زور صرف کردیتا ہے اور شرم وحیا کو بالائے طاق رکھ کر اکابر صحابہؓ وتابعینؒ بالخصوص ائمہ اربعہ کو توہین وتضحیک کا نشانہ بناتا ہے اور پھر طرہ یہ کہ اپنی نام نہاد تحقیق کو اصل دین اور دیگر تحقیقات کو دین سے خارج کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتا۔ ایسے بے توفیق لوگ اگر اپنے انفرادی معاملات تک ہی ایسا کرتے تو شاید اتنی فتنہ انگیزی نہ ہوتی مگر جب فتنہ ہی مقصود ہو اور سلف صالحین پر سے اعتماد اٹھا دینے ہی کا منصوبہ ہو تو اسی پر اکتفا کیسے ہوسکتا ہے؟ آج کا غیر مقلد اپنے مذہب ومسلک کا پُرجوش مبلغ بھی ہوتا ہے جس کی بنا پر بعض مقلد بھی بے علمی کی وجہ سے شکوک وشبہات میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔

ایسے مسائل کی فہرست کافی طویل ہے جن میں غیر مقلد حضرات بحث کرکے عوام کو الجھاتے ہیں (مثلاً قرأت فاتحہ خلف الامام، آمین بالجہر، تکبیرات عیدین وغیرہ وغیرہ) لیکن ہم یہاں اختصار کے ساتھ صرف ایک مسئلہ کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں جس میں اس وقت عمومی ابتلاء ہے اور لوگ بلا جھجک غیر مقلد کے غلط فتوے پر عمل کرلیتے ہیں۔ وہ مسئلہ ایک مجلس کی تین طلاق کا ہے اس پر متعدد کتب اور تفصیلی فتاویٰ لکھے جاچکے ہیں۔ لیکن عوام پھر بھی احتیاط نہیں کرتے اور فریب میں مبتلا ہوجاتے ہیں لہٰذا اس کے متعلق چند اشارات ذہن میں ملحوظ رہنے چاہئیں۔

(۱) چاروں اماموں اور جمہور علماء امت کا متفقہ فیصلہ ہے کہ ایک وقت میں دی گئی تین طلاقین تین ہی سمجھی جاتی ہیں اور اس کی وجہ سے بیوی پر طلاق مغلظہ واقع ہوجاتی ہے۔ اس اجماع کے بعد اس کے خلاف کسی بھی فتویٰ کا نہ تو شرعاً اعتبار ہے اور نہ اس پر عمل کرنا جائز ہے۔

(۲) امام احمد بن تیمیہؒ اور ان کے شاگرد علامہ ابن قیمؒ نے اس مسئلہ میں جمہورِ امت سے اختلاف

کیا ہے۔ لیکن انہی کے تلامذہ علامہ ذہبیؒ اور علامہ ابن رجب حنبلیؒ اور دوسرے محققین علماء حنابلہؒ نے اس مسلک کی سختی سے تردید کی ہے۔ کیونکہ اس زمانہ میں بھی تین طلاقوں کو ایک ماننا روافض اور اہل تشیع کا شعار تھا۔

(۳) خود غیر مقلدین کے مشہور مفتی اور عالم مولانا ابوسعید شرف الدین دہلویؒ نے بھی فتاویٰ ثنائیہ میں مضبوط اور مستند دلائل سے ان لوگوں کا رد کیا ہے جو طلاق مغلظہ کو طلاق رجعی قرار دیتے ہیں۔ (فتاویٰ ثنائیہ ص۴۳، ۳۶، جلد۲ بحوالہ عمدۃ الاثاث ص۱۰۴)

(۴) موجودہ دور میں سعودی عرب کے دارالافتاء ''ادارۃ البحوث العلمیہ والدعوۃ والارشاد'' نے اس مسئلہ پر پوری بحث و تمحیص کے بعد یہ فتویٰ جاری کیا ہے کہ تین طلاقوں کو ایک قرار دینا صریح نصوص اور اجماع امت کے خلاف ہے۔ یہ مفصل فتویٰ مجلۃ البحوث الاسلامیہ ریاض شمارہ ۳۔ ۱۳۹۷ھ میں شائع ہو چکا ہے اور آج سعودیہ میں یہی قانون رائج ہے۔

الغرض یہ حکم اجماعی ہے کہ بیک وقت تین طلاق حرمت مغلظہ کو ثابت کر دیتی ہیں اور رجعت کی کوئی شکل اس کے بعد باقی نہیں رہتی۔ اس کے خلاف عمل کرنا سراسر خواہشات نفس کی پیروی ہے جو ہرگز درست نہیں اور محض اس بنیاد پر اپنا مسلک بدل دینا نہایت خطرناک ہے۔ فتاویٰ شامی میں لکھا ہے کہ اگر کوئی حنفی مرد کسی شافعیہ عورت کو نکاح کا پیغام دے اور وہ عورت یہ شرط لگائے کہ تجھے اپنا مذہب تبدیل کرنا پڑے گا اور وہ مرد اس کے کہنے پر اپنا مذہب تبدیل کر لے پھر نکاح کرے تو اگرچہ نکاح منعقد ہو جائے گا لیکن ابوبکر جوزجانیؒ ایسے شخص کے بارے میں فرماتے ہیں کہ مجھے اس کے سوء خاتمہ کا اندیشہ ہے کہ اس نے محض ایک عورت کی خاطر اپنا وہ مذہب تبدیل کر لیا جسے وہ اب تک حق سمجھتا تھا۔ (بحوالہ فتاویٰ رحیمیہ جلد۵/ص۳۰)

اس لئے ضروری ہے کہ ائمۂ اربعہ کے مقلدین اپنے مذہب پر مضبوطی سے عمل پیرا رہیں اور غیروں کی فتنہ انگریزیوں کا شکار نہ ہوں۔ یہی مامون و محفوظ راستہ ہے۔ اور اس سلسلے میں جب کوئی گفتگو کرے تو اس سے خود بحث نہ کریں بلکہ اپنے علماء کے حوالہ کر دیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو راہِ مستقیم پر گامزن رکھے۔ آمین۔ (ندائے شاہی، ستمبر۱۹۹۲ء)

تحریک لا مذہبیت (غیر مقلدیت/سلفیت)

افتراق بین المسلمین کی سب سے خطرناک عالم گیر مہم

آج کے دور میں امت کی شیرازہ بندی کی جتنی ضرورت ہے اتنی شاید زمانۂ سابق میں کبھی نہ رہی ہو، آج دشمنان دین ہر طرف سے اور ہر جگہ جمع ہو کر امت مسلمہ کو نوالۂ تر بنانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ سیاسی، اقتصادی، تعلیمی، ہر اعتبار سے مسلمانوں کا وزن پوری دنیا میں ناقابل یقین حد تک گھٹ چکا ہے۔ اکثر مسلم کہے جانے والے ممالک بھی اندرونی طور پر پوری طرح غیر مسلم شاطر طاقتوں کے دست نگر بن چکے ہیں۔ مسلم حکومتوں کے ارباب حل وعقد بھی زیادہ تر دین سے بے بہرہ بلکہ الحادی نظریات کے حامل ہیں۔ ایسے ماحول میں اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ جہاں تک ممکن ہو مسلمانوں کی صفوں میں انتشار کو ختم کیا جائے اور فروعی مسائل میں الجھنے کے بجائے اصولی طور پر اتحاد واتفاق مضبوط کرنے کی راہ اپنائی جائے۔ اور کلمہ کی وحدت اور متواتر اجماعی عقائد کو اتحاد کی بنیاد بنایا جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ حد تک اتفاق اور ہم آہنگی کا راستہ ہموار ہو سکے۔

لیکن اس شدید ضرورت کے برعکس کچھ بے توفیق فتنہ پروروں نے پوری شدت کے ساتھ افتراق بین المسلمین کی مہم چھیڑ رکھی ہے۔ یہ لوگ چھوٹے چھوٹے مسائل کو رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کر کے عوام میں معرکۂ کارزار گرم کر دیتے ہیں اور ایک محض افضل اور غیر افضل کے اختلاف کو ایمان وکفر کا اختلاف بنا کر پیش کرتے ہیں، اس سلسلہ کا سب سے بڑا خطرناک فتنہ

جس نے اب رفتہ رفتہ تقریباً پورے عالم میں ہاتھ پیر پھیلا لئے ہیں غیر مقلدیت اور لا مذہبیت کا ہے (جس سے وابستہ لوگ نام نہاد طور پر اپنے کو سلفی اور اہل حدیث کہتے ہیں) چند سالوں میں اس فرقہ نے سعودی عرب کے با اثر اصحاب ظواہر (غیر مقلد) علماء و مفتیان کو شیشہ میں اتار کر اور سعودی حکومت کا اخلاقی و مادی تعاون حاصل کر کے تمام مقلدین عوام و علماء بالخصوص حضرات حنفیہ کے خلاف برسر عام بدزبانی، طعن و تشنیع اور تہمت طرازی کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ لوگ حکومت سعودی کی سرپرستی میں حرمین شریف کے شعبۂ وعظ و تذکیر میں دخیل ہیں اور حج و رمضان کے مہینوں میں وعظ و تذکیر کے عنوان سے جوار دو میں بیانات ہوتے ہیں انمیں تذکیر یا وعظ تو برائے نام ہوتا ہے بس تقریر کا سارا زور عوام کے سامنے چند رٹے رٹائے اختلافی مسائل و دلائل بیان کرنے اور علماء سلف اور ائمۂ عظام پر تبصروں اور تبرے بازیوں پر صرف ہوتا ہے۔ ان کی تقریروں کو سننے والا ہر شخص بآسانی اس نتیجہ تک پہنچ سکتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ اور انکے اصل مذہب سے بغض و عناد انکے دلوں کی گہرائیوں میں پیوست ہے جسکا اظہار موقع بموقع زبان کی شدت اور گندگی سے ہوتا رہتا ہے۔

شرانگیز مغالطہ

غیر مقلد اور لا مذہبی لوگ سادہ لوح عوام کو اپنا ہمنوا بنانے کے لئے یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ ایک طرف کوئی حدیث بیان کریں گے، اور پھر اسکے مقابلہ میں امام ابوحنیفہؒ کا کوئی قول ذکر کر کے دونوں کے درمیان موازنہ کرتے ہوئے یہ ثابت کریں گے کہ نعوذ باللہ احناف قول رسول ﷺ کے مقابلہ میں قول ابوحنیفہ کو ترجیح دیتے ہیں، حالانکہ یہ بات سرے سے غلط ہے کوئی بھی حنفی شخص کتاب و سنت کے مقابلہ میں کسی دوسرے کا قول ہرگز قبول نہیں کرسکتا، بات صرف اتنی ہے کہ حضرات احناف فہم کتاب و سنت میں امام ابوحنیفہؒ کے علم پر اعتماد کرتے ہیں، اور یہ حسن ظن رکھتے ہیں کہ انھوں نے نصوص سے سمجھ کر جو رائے اپنائی ہے وہ کتاب و سنت کے عین مطابق ہے امام ابوحنیفہؒ خود انتہائی احتیاط کرنے والے تھے، مسائل کے استنباط اور تخریج و تحقیق میں انھوں نے جو

طریقہ اپنایا ہے اسکا اظہار آپ نے خود ان الفاظ میں کیا ہے :

اٰخُذُ بِكِتَابِ اللّٰهِ فَاِنْ لَّمْ اَجِدْ فَبِسُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَاِنْ لَمْ اَجِدْ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ وَلَا سُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اَخَذْتُ بِقَوْلِ اَصْحَابِهٖ اٰخُذُ بِقَوْلِ مَنْ شِئْتُ بِهٖ وَاَدَعُ مَنْ شِئْتُ مِنْهُ وَلَا أَخْرُجُ مِنْ قَوْلِهِمْ اِلٰى قَوْلِ غَيْرِهِمْ، فَاَمَّا اِذَا انْتَهٰى الْأَمْرُ إِلٰى إِبْرَاهِيْمَ وَالشَّعْبِيِّ وَابْنِ سِيْرِيْنَ وَالْحَسَنِ وَعَطَاءَ وَسَعِيْدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ وَعَدَّدَ رِجَالاً فَقَوْمٌ اِجْتَهَدُوْا فَاَجْتَهِدُ كَمَا اجْتَهَدُوْا.

(تاریخ بغداد بحوالہ الفقه الحنفى ۱/۲۲)

میں (سب سے پہلے) کتاب اللہ کو اختیار کرتا ہوں، اگر اسمیں مسئلہ نہ پاؤں تو سنت رسول اللہ ﷺ کی طرف رجوع کرتا ہوں، اور اگر کتاب اللہ اور سنت نبوی دونوں میں مسئلہ نہ ملے تو پھر آنحضرت ﷺ کے صحابہؓ کے اقوال کو اختیار کرتا ہوں، اور انمیں سے (غور وفکر کر کے) جسکا قول چاہے لے لیتا ہوں اور جسکا قول چاہے چھوڑ دیتا ہوں۔ اور میں صحابہؓ کے اقوال کو چھوڑ کر ان کے علاوہ کسی کے قول کو اختیار نہیں کرتا، اور جب معاملہ (صحابہؓ سے آگے بڑھ کر) ابراھیم نخعیؒ، امام شعبیؒ، ابن سیرینؒ، حسن بصریؒ، عطاءؒ، سعید ابن المسیب، اور متعدد افراد کے نام گنائے ان تک پہونچ جائے تو یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اجتہاد سے مسائل کا حکم معلوم کیا ہے تو میں بھی اسی طرح خود اجتہاد کرتا ہوں جیسے ان حضرات نے اجتہاد کیا۔ (یعنی میں ان تابعین کی رائے کا پابند نہیں ہوں)۔

اس صراحت سے معلوم ہو گیا کہ امام ابوحنیفہؒ کا طریقہ استنباط عین موافق شریعت ہے، اور اختلافی مجتہد فیہ مسائل میں آپ کا ہر قول دلائل سے مؤید ہے، جن مسائل میں دور صحابہ میں اختلاف ہو چکا ہے، اور ان پر اجماع کی کوئی صورت نہیں ہوسکی ہے ان کا اختلاف قیامت تک مرتفع نہیں ہوسکتا، اب یہ حضرات مجتہدین کا کام ہے کہ ان میں سے جو قول انہیں دلیل کے اعتبار سے

مضبوط نظر آئے اسے اختیار کر لیں اور اپنے درجے کے دوسرے مجتہد کو اپنی رائے کے قبول کرنے پر مجبور نہ کریں، بلکہ ان میں سے ہر رائے کا اختیار کرنے والا اپنی جگہ پر صائب ہے، اور ہر رائے ''صواب محتمل خطاء'' ہے لہذا اگر امام ابوحنیفہؒ اپنی وسعت علمی، دقت نظر اور تخریج واستنباط کی بے مثال صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے کسی ایک رائے کو ترجیح دیدیں اور یہ حکم شرعی ان کی طرف منسوب ہو جائے تو اس سے ہرگز یہ لازم نہیں آتا کہ حدیث کے مقابلہ میں قول ابی حنیفہؒ کو راجح کہا جا رہا ہے، یہ غیر مقلدوں کی محض تلبیس ہے، حقیقت کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

ایک ہی امام کی اتباع کیوں ضروری ہے؟

غیر مقلدین یہ بات بھی بڑے زور وشور سے اٹھاتے ہیں کہ جب چاروں مذاہب برحق ہیں تو پھر ایک ہی امام کی تقلید کو ضروری کیوں خیال کیا جاتا ہے؟ ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ جس مسئلہ میں چاہیں حسب سہولت دوسرے کے مسلک پر عمل کر لیں، تو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ گو کہ کسی متعین عالم کی اتباع وتقلید فرض عین کے درجے کی چیز نہیں ہے لیکن عوام کی سہولت پسندی، بے احتیاطی، بددیانتی اور افتراق وانتشار کو دیکھتے ہوئے صدیوں سے امت کا اس پر عملاً اتفاق رہا ہے کہ ایک عامی شخص (جس میں وہ علماء بھی شامل ہیں جن میں اجتہاد کی مطلوبہ صلاحیت نہیں ہے) کے لئے صرف ایک امام کی تقلید لازم اور واجب ہے، کیونکہ جب وہ مجتہد نہیں ہے تو وہ سمجھ ہی نہیں سکتا کہ کس کی رائے راجح ہے اور کس کی مرجوح اب جب بھی وہ مسلک سے خروج کرے گا تو یقیناً کسی نہ کسی ذاتی غرض اور خواہش کی وجہ سے ہوگا، اور اتباع ھویٰ شریعت میں قطعاً جائز نہیں، تو یہ شخصی تقلید، حکم انتظامی اور فرض لغیرہٖ ہے تاکہ عوام المسلمین مذہبی اعتبار سے افتراق وانتشار سے محفوظ رہیں، اور اسکی نظیر دور عثمانی میں حضرات صحابہؓ کے اتفاق سے قرآن کریم کی سات لغات میں سے صرف لغت قریش کو اختیار کرنے اور بقیہ مصاحف کو ختم کرنے کا واقعہ ہے، اسی بات کو مزید وضاحت کے ساتھ فقیہ النفس قطب عالم امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے اپنے درج ذیل فتویٰ میں بیان فرمایا ہے۔ ذہن ودماغ کے استحضار کے ساتھ اسکا مطالعہ کیا جائے۔ حضرت فرماتے ہیں:

’’تقلید شخصی اور غیر شخصی دونوں مامور من اللہ تعالیٰ ہیں اور جس پر عمل کرے عہدہ امتثال سے فارغ ہوجاتا ہے دراصل یہ مسئلہ درست ہے۔ اور جو ایک فرد پر عمل کرے اور دوسرے پر عمل نہ کرے اس میں دراصل کوئی عیب نہ تھا بوجہ مصلحت ایک پر عمل کرنا درست ہے پس فی الواقع اصل یہی ہے لہٰذا جو تقلید شخصی کو شرک کہتے ہیں وہ بھی گنہ گار ہیں کہ مامور من اللہ کو حرام کہتے ہیں اور جو بدون حکم شرعی کے غیر شخصی کو حرام کہتا ہے وہ بھی گنہ گار ہے کہ مامور کو حرام بتاتا ہے دونوں ایک درجہ کے ہیں اصل میں۔ اور سائل خود اقرار کرتا ہے کہ مطلق شرعی کو اپنی رائے سے مقید کرنا بدعت ہے یہ قول اسکا صحیح ہے مگر حکم شرع خواہ اشارۃً یا صراحۃً اگر قید کرے تو درست ہے۔ پس اب سنو کہ تقلید شخصی کا مصلحت ہونا اور عوام کا اس میں انتظام رہنا اور فساد وفتنہ کا رفع ہونا اس میں ظاہر ہے اور خود سائل بھی مصلحت ہونیکا اقرار کرتا ہے لہذا یہ استحسان اور عدم وجوب اسی وقت تک ہے کہ کچھ فساد نہ ہو اور تقلید غیر شخصی میں وہ فساد وفتنہ ہو کہ تقلید شخصی کو شرک اور ائمہ کو سب وشتم اور اپنی رائے فاسد سے رد نصوص ہونے لگے جیسا کہ اب مشاہدہ ہو رہا ہے تو اس وقت ایسے لوگوں کے واسطے غیر شخصی حرام اور شخصی واجب ہوجاتی ہے اور یہ حرمت اور وجوب لغیرہ کہلاتا ہے کہ دراصل جائز اور مباح تھا کسی عارض کی وجہ سے حرام اور واجب ہوگیا تو اس سبب فساد عوام کی وجہ سے کہ ہر ایک مجتہد ہوکر خراب دین میں پیدا کرتا ہے خود مولوی محمد حسین بٹالوی ایسے مجتہدین جہلاء کو فاسق کہتے ہیں۔

پس اس رفع فساد کے واسطے شخصی کا واجب ہونا اور غیر شخصی کا ایسے جہلاء کے واسطے حرام ہونا اور عوام کو اس سے بند کرنا واجب ہوا اور اس کی نظیر شرع میں موجود ہے لہذا یہ تقیید مطلق کی نص سے کی گئی ہے نہ کہ بالرائے، دیکھو کہ جناب فخر عالم علیہ السلام نے قرآن پڑھنا لغت زبان عرب میں حق تعالیٰ سے جائز کرایا اور علی سبیل البدل کسی لغت میں پڑھو جائز ہے اور اس وسعت کو حضور ﷺ نے بڑی مشقت وسعی سے حلال کرایا اور حق تبارک تعالی نے اجازت مرحمت فرمائی۔ مگر جب اس اختلاف لغات کے سبب باہم نزاع ہوا اور اندیشہ زیادہ نزاع کا ہوا تو باجماع صحابہ قرآن شریف کو

ایک لغت قریش میں کر دیا گیا اور سب لغات جبراً موقوف کر دئے گئے کہ جملہ دیگر مصاحف جلا دئے اور جبراً چھین لئے گئے دیکھو یہاں مطلق کو مقید کیا مگر بوجہ فساد امت کے۔لہذا جب کہ تقلید غیر شخصی کرنے میں فساد ظاہر ہے اس میں کسی کو بشرط انصاف انکار نہ ہوگا تو اگر واجب لغیرہٖ شخصی کو کہا جاوے اور غیر شخصی کو منع کیا جاوے تو یہ بالرائے نہیں بلکہ بحکم نص شارع علیہ السلام کے ہے کہ رفع فساد واجب ہر خاص و عام پر ہے"۔(فتاویٰ رشیدیہ و تالیفات رشیدیہ/۲۰۴ مطبوعہ پاکستان)

دور حاضر کا تجربہ بھی یہی بتاتا ہے کہ جو شخص بھی کسی امام کی تقلید کا راستہ چھوڑ کر ہرجائی بننے کی کوشش کرتا ہے تو رفتہ رفتہ اسکی آزادی کھلی گمراہی اور کفر و ضلال تک پہنچا دیتی ہے، خود بعض مشہور غیر مقلد علماء نے بھی اس پر تنبیہ کی ہے، عام طور پر باطل فرقوں کے دام تزویر میں یہی آزادی اور تجدد پسند لوگ پھنستے ہیں جو اپنے کو ایک عالم کا پابند نہیں سمجھتے بلکہ حق ناحق بس اپنی رائے اور خواہش ہی کی پیروی کرتے رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس انتشار سے امت کے ہر فرد کو محفوظ فرمائے۔آمین.

اذاصح الحدیث فھو مذھبی کا صحیح مطلب

فتنہ پرور غیر مقلدین عوام کو دھوکہ دینے کیلئے امام ابوحنیفہؒ کا یہ ارشاد: **اذاصح الحدیث فھو مذھبی.** (جب صحیح حدیث سامنے آجائے تو وہی ہمارا مذہب ہوگا) بڑے زور و شور سے پیش کرتے ہیں، اور یہ ثابت کرتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ نے تو دیانت کا ثبوت دیتے ہوئے، غیر راجح مسئلہ بیان کرنے کے باوجود اپنا دامن یہ کہکر بچالیا کہ اگر اس کے مقابلے میں صحیح حدیث آجائے تو وہی میرا مذہب ہوگا، لیکن ان کے مقلدین ان کی اس ہدایت کو نظر انداز کرتے ہوئے صحیح احادیث آجانے کے باوجود امام صاحب کے اقوال کو سینے سے لگائے رہتے ہیں۔یہ بات دیکھنے میں بڑی خوبصورت معلوم ہوتی ہے اور ایک خالی الذہن آدمی اسے سن کر بے اختیار مقلدین احناف سے بدگمانی دل میں بیٹھا لیتا ہے، حالانکہ یہ پوری تقریر محض تلبس اور حقیقت واقعہ سے قصداً روگردانی پر مبنی ہے، اسلئے کہ "اذاصح الحدیث" کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ جہاں کہیں بھی صحیح حدیث نظر

آ جائے بس فوراً اس پر عمل کرلیں، اور نہ یہ کسی کا مذہب ہوسکتا ہے، اسلئے کہ بہت سی احادیث اگر چہ صحیح ہیں لیکن ان کے مضامین میں تعارض ہے، اس تعارض کو ختم کرنے کے لئے مجتہد کے اجتہاد کی ضرورت پڑتی ہے، اور مجتہد ناسخ منسوخ، قوت وضعف اور اصول شریعت سے موافقت وغیرہ امور پر پورے غور وفکر کے بعد ہی کسی ایک جانب کو راجح اور دوسرے کو مرجوح قرار دیتا ہے، ذخیرۂ حدیث کا ادنیٰ سا مطالعہ کرنے والا شخص بھی اس بات کو جانتا ہے، کہ بہت سی احادیث صحیح سند سے مروی ہونے کے باوجود منسوخ ہیں، یا باجماع امت ان کے ظاہر پر عمل ترک کر دیا گیا ہے، مثلاً آگ پر پکی ہوئی چیزوں کو کھانے سے وضوٹوٹنے کی روایت صحیح سند سے ثابت ہے، لیکن منسوخ ہے، اور آج اس پر کوئی عمل نہیں کرتا۔ (ترمذی شریف ۱/۲۴)

اسی طرح متعہ کی مشروعیت کی روایات بھی صحیح ہونے کے باوجود منسوخ ہیں (بخاری شریف ۲/۶۰۶) امام ترمذیؒ نے کتاب العلل میں لکھا ہے کہ میری کتاب میں دو حدیثوں کو چھوڑ کر ہر حدیث پر امت کے کسی نہ کسی طبقہ کا عمل ہے ان میں سے ایک حدیث شرابی کو قتل کرنے کے بارے میں ہے اور دوسری حدیث بلا عذر جمع بین الصلاتین کے بارے میں ہے۔ (کتاب العلل ۲/۲۳۳)

اس سے یہ معلوم ہوگیا کہ امام ابوحنیفہؒ کی مراد ہرگز یہ نہیں ہے کہ کہیں بھی کوئی حدیث صحیح نظر آ جائے تو فوراً اسے مذہب بنالیا جائے بلکہ لازمی طور پر اس حدیث کا دیگر نصوص واحادیث سے موازنہ ومقابلہ کیا جائے گا پھر جو رائے صحت کے ساتھ سامنے آئے گی صرف اسے ہی قبول کیا جائے گا، اور حضرات احناف ایسے مختلف فیہ مسائل میں چونکہ دلیل کے اعتبار سے امام ابوحنیفہؒ کی رائے کو راجح سمجھتے ہیں اور اس کے مقابلہ میں اگر بالفرض کوئی ظاہری حدیث آ رہی ہو تو اس کا صحیح محمل تلاش کرتے ہیں اور دلائل کے تعارض کو ختم کرکے تطبیق کی صورتیں نکالتے ہیں، لہٰذا اصولی اعتبار سے علمائے احناف کا یہ عمل نہ تو شریعت کے خلاف ہے اور نہ امام ابوحنیفہؒ کی ہدایت کے خلاف ہے، غیر مقلدین کا اس طرز عمل کو کتاب وسنت کے خلاف قرار دینا بجائے خود ناواقفیت یا محض شر انگیزی پر مبنی ہے۔

کیا صحیح حدیثیں صرف صحاح ستہ میں ہیں؟

غیر مقلدین ایک نام نہاد پروپیگنڈہ یہ بھی کرتے ہیں کہ صحیح حدیثیں صرف صحاح ستہ بالخصوص بخاری ومسلم میں ہیں، اگر کوئی شخص اپنے مسلک پر ان کے خلاف کوئی ایسی حدیث پیش کرے جو صحاح ستہ کے علاوہ کسی معتبر کتاب میں ہو تو وہ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ اس کو قبول کرنے سے یہ کہکر انکار کردیتے ہیں کہ اس کا ذکر صحاح میں نہیں ہے، حالانکہ یہ بات واقعہ کے خلاف ہے، اتنی بات تو درست ہے کہ صحاح کی اکثر احادیث صحیح ہیں، مگر یہ بات قطعاً صحیح نہیں کہ تمام صحیح حدیثوں کا انحصار صرف صحیحین یا صحاح پر ہے، امام نوویؒ نے مقدمہ شرح مسلم میں لکھا ہے کہ جب امام مسلمؒ حضرت ابن وارہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے حضرت الامام کی یہ کہکر سرزنش کی کہ تمہاری اس کتاب مسلم کو دیکھ کر بدعتیوں کو یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ تمام صحیح حدیثیں بس مسلم میں ہی ہیں اور جو حدیث اس کے علاوہ ہو وہ قابل قبول نہیں ہے، تو اس پر امام مسلم نے معذرت پیش کرتے ہوئے یہ جواب دیا، کہ حضرت والا! میں نے اس کتاب کو تصنیف کرکے صرف یہ کہا ہے، کہ اس کی روایتیں صحیح ہیں میں نے ہرگز یہ دعویٰ نہیں کیا کہ جس حدیث کی میں نے اس کتاب میں تخریج نہیں کی وہ مطلقاً ضعیف ہے۔ میرا تو منشاء صرف یہ ہے کہ صحیح احادیث کا ایک مجموعہ میرے پاس اور میرے شاگردوں کے پاس مہیا ہو جائے تاکہ اس پر اعتماد ہو جائے، چنانچہ ابن وارہ نے آپ کے عذر کو قبول کیا اور تعریف فرمائی۔ (مقدمہ نووی علی مسلم/۱۶)

لہذا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ تمام صحیح احادیثوں کا انحصار صحیحین یا صحاح پر ہے، بلکہ دیگر کتب حدیث میں بھی صحیح اور مستند روایتوں کا معتبر ذخیرہ موجود ہے، اور ایسی صحیح روایتیں قابل استدلال اور لائق حجت ہیں اگر کوئی مجتہد ان سے اپنے مذہب پر استدلال کرے گا تو اسے یقیناً قبول کیا جائے گا۔

ضعیف احادیث کا طعنہ

غیر مقلدین کا یہ بھی وطیرہ ہے کہ اپنی غلط رائے کو اپنانے کے لئے تو کسی ضعیف حدیث کو بھی کھینچ تان کر اور محدثین کے یکطرفہ اقوال کو نقل کرکے اسے صحیح قرار دینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا

رکھتے، لیکن اگر اتفاق سے حنفیہ اپنے مذہب میں کوئی ایسی حدیث پیش کر دیں جسکی سند میں کوئی راوی ضعیف آ گیا ہو تو پھر غیر مقلدین غیظ و غضب میں زمین و آسمان ایک کر دیتے ہیں، یہاں یہ بھی واضح رہے کہ آج کل کے غیر مقلدین کا مبلغ علم مشہور غیر مقلد محدث علامہ ناصر الدین البانی کی تحقیقات ہیں، جنکا غیر مقلدیت میں تعصب روز روشن کی طرح آشکارا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی بھی متعصب شخص حدیث کی تضعیف و تصحیح میں جانب داری سے بچ نہیں سکتا، چنانچہ محققین علماء کی نظر میں علامہ البانی کی متعصّبانہ جرح اور تضعیف نا قابل قبول ہے، دوسری بات یہ بھی ملحوظ رہے کہ کسی راوی کے بارے میں جرح مبہم کافی نہیں ہے، بلکہ جرح مفصل ضروری ہے، نیز جس راوی کی جرح و تعدیل میں اقوال مختلف رہے ہوں، اس کو محض یکطرفہ طور پر مجروح کر کے مطلقاً ضعیف نہیں کہا جا سکتا، اور ان میں سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ جو روایت ضعیف قرار دی جا رہی ہے، اس میں ضعف کس زمانہ کے راوی کی وجہ سے آیا ہے، اگر ضعیف راوی امام ابو حنیفہؒ کے زمانہ کے بعد کا ہے (جیسا کہ اکثر ضعیف روایتوں کا حال ہے) تو اس راوی کے ضعف سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ امام صاحب تک بھی یہ راویت ضعیف طریقوں سے پہونچی ہو، بلکہ عین ممکن ہے کہ ان تک پہونچنے والی تمام روایتوں کے طرق معتبر اور قابل قبول ہوں اور انہیں پر حضرت امام نے اپنے مذہب کی بنیاد رکھی ہے، لہذا محض کسی راویت کے ضعیف ہونے سے مذہب ابو حنیفہؒ کا کمزور ہونا ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

صرف مختلف فیہ مسائل پر ہی بحث کیوں؟

غیر مقلدوں کی شرانگیزی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ ناواقف عوام کے سامنے صرف چند رٹے رٹائے اختلافی مسائل کی بحثیں کر کے علماء احناف کو مخالف سنت قرار دینے کا جھوٹا پروپیگنڈہ کرتے ہیں، تو سوال یہ ہے کہ اگر احناف مخالف سنت ہیں، اور بقول غیر مقلدین انھیں صحیح احادیث سے تنفر ہے تو پھر کہیں بھی ان کا کوئی بھی مسئلہ حدیث کے موافق نہ ہونا چاہئے، جبکہ واقعہ یہ ہے کہ کتاب الطہارت سے کتاب المیراث تک فقہ کی ہزاروں ہزار جزئیات میں بلا مبالغہ اسی پچاسی

فیصد مسائل نصوص ظاہرہ کے عین موافق ہیں، تو سوچنے کی بات یہ ہے کہ جو احناف اکثر مسائل میں نصوص ظاہرہ کی موافقت پر کار بند رہتے ہیں انھوں نے آخر ان چند مسائل میں ظاہر کے خلاف قول کیوں اپنایا، یقیناً انکے پاس کوئی ایسی دلیل ہوگی جسکی وجہ سے انہیں حدیث کے معنیٰ اور محمل صحیح انداز میں متعین کرنا پڑے، اب یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ معنی دوسرے مجتہدین کیلئے بھی قابل قبول ہو جائیں، امام اعظمؒ اور ان کے مسلک کے علماء نے اپنی اجتہادی ذمہ داری پوری کرتے ہوئے اگر کوئی ایسی رائے اپنالی جو دوسروں سے میل نہیں کھاتی تو آخر انھوں نے ایسا کون سا قصور کر لیا کہ ان کے خلاف پورا محاذ جنگ کھول دیا جائے؟ ہر مجتہد کو اپنے اجتہاد پر عمل کا حق ہے۔ لیکن وہ دوسرے شخص پر اپنی رائے زبردستی تھوپنے کا قطعا مجاز نہیں، آج کے زمانہ میں بھی اگر کوئی غیر مقلد شخص یہ کہے کہ میرے اندر اجتہاد مطلق کی صلاحیت ہے جیسا کہ بہت سے جامعہ کے طالب علموں اور آزادروی کے فیشن ایبل محققین کو اپنے بارے میں خوش گمانی ہوگئی ہے تو ہمیں ان سے کوئی واسطہ یا مطلب نہیں۔ وہ شوق سے اپنے اجتہاد پر عمل کریں اور اپنے ماننے والوں کو کرائیں، ہماری شکایت تو یہ ہے کہ امت مسلمہ کا ننانوے فیصدی طبقہ جو صدیوں سے معتبر ائمہ کے اوپر اعتماد کرتا چلا آرہا ہے۔ اور ان کی فقہ پر عمل پیرا ہے اس کو نئے مدعیان اجتہاد کے نام نہاد اجتہادی مسائل کے لئے تختۂ مشق بننے پر آخر کیوں مجبور کیا جارہا ہے؟ کیا ان چندروزہ غیر مقلدین کے وجود سے پہلے امت کا یہ عام طبقہ ضلالت وگمراہی میں پڑا رہا؟ اور لمبے عرصہ میں کسی کو فکر آخرت اور دیانت کا خیال نہ آیا؟ کتاب وسنت کو چھوڑ کر ائمہ کے اقوال امت میں رائج رہے اور صدیوں تک کوئی ایسا صاحب عزیمت پیدا نہ ہو سکا جو اس رواج پر نکیر کرتا؟ اس ذمہ داری کی ادائیگی کی توفیق صرف انہیں لامذہبوں کو نصیب ہوئی ہے۔

بہر حال اس وقت امت میں مذہبی اعتبار سے افتراق وانتشار کی یہ کوشش باعث صد مذمت ہے اور سبھی دردمندان امت کیلئے انتہائی تشویش کا سبب ہے۔ اگر اس تحریک پر مضبوط بند نہ لگایا گیا، تو اندیشہ ہے کہ کہیں یہ فتنہ گھر گھر میں اور بھائی بھائی میں نزاع وجدال اور قتل

وخونریزی کا ذریعہ نہ بن جائے۔ضرورت ہے کہ ان بےادب اور گستاخ غیر مقلدین کو لگام دینے کیلئے علماء اسی طرح کمر بستہ ہوں جیسے انھوں نے قادیانیت وغیرہ باطل طاقتوں کا تعاقب کر کے ان کے ضلال کو واضح کیا ہے،سعودی حکومت کو بھی ہوش کی آنکھوں سے صورت حال سمجھ کر حرمین شریفین میں تحریک لا مذہبیت کے فروغ پر پہلی فرصت میں پابندی لگانی چاہیئے ۔اوران مقدس مقامات کو گستا خان ائمہ سے جلد از جلد پاک کر دینا چاہیئے ۔ورنہ اگر یہ فتنہ انگیزی اسی انداز میں جاری رہی تو زیادہ دنوں تک اسے برداشت نہیں کیا جا سکے گا۔اور خدانخواستہ یہ شر انگیز سلسلہ حرمین کے امن وامان میں بھی مخل ہوسکتا ہے۔اللہ تعالیٰ امت مسلمہ کو انتشار سے محفوظ رکھے اور ہر قسم کے شرور وفتن سے بچائے۔(آمین)

(ندائے شاہی،مئی ۲۰۰۱ء)

تین طلاق کا مسئلہ: دلائل کی روشنی میں

’’تین طلاق‘‘ چاہے ایک مجلس میں دی جائیں یا متعدد اوقات میں وہ تین ہی واقع ہوتی ہیں، جمہور فقہاء اور ائمہ اربعہ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کا مسلک یہی ہے۔ اس کے برخلاف روافض، بعض اہل ظاہر اور آخری دَور کے علماء میں علامہ ابن تیمیہؒ کا مسلک یہ ہے کہ تین طلاقیں جو ایک ساتھ دی جائیں وہ صرف ایک طلاق رجعی کے حکم میں ہوتی ہیں۔ دورِ حاضر کے غیر مقلدین نے اس مسئلہ میں جمہور علمائے سلف کی رائے چھوڑ کر علامہ ابن تیمیہؒ کے مسلک کی شدت سے تقلید کر رکھی ہے اور اس مسئلہ کو اپنے مزعومہ اسلام کے شعائر میں شامل کرلیا ہے۔ موقع بموقع اس مسئلہ کو عورتوں کی حالتِ زار کی دُہائی دے کر اخبارات میں اُچھالا جاتا ہے۔ نادم اور شرمسار طلاق دینے والوں کی اشک شوئی کی جاتی ہے اور انھیں اس پر آمادہ کیا جاتا ہے کہ وہ غیر مقلدوں کے فتوے پر عمل کر کے اپنی ازدواجی زندگی دوبارہ استوار کرلیں۔ یہ مسئلہ بڑا نازک ہے، اس کا تعلق نہ صرف یہ کہ براہِ راست حلت وحرمت سے ہے بلکہ اس مسئلہ میں بے احتیاطی کے اثرات نسلوں تک پڑنے کا اندیشہ رہتا ہے اس لیے کہ جب ایسی عورت سے رجعت کو حلال کہا جائے گا جس کی حرمت پر تمام ائمہ عظام کا اتفاق ہے اور جس کو بلا حلالہ شرعیہ گھر میں رکھنا حرام کاری ہے تو پھر اس سے جو اولادیں پیدا ہوں گی ان میں صلاح وفلاح کا تصوّر کیسے ہوسکتا ہے۔ اسی موضوع پر کچھ آسان اشارات ذیل کے مضمون میں پیش کیے جارہے ہیں۔ امید ہے کہ ان مختصر گذارشات سے اصل مسئلہ کو سمجھنے اور جمہور کے مسلک کے حق ہونے کی طرف رہنمائی ملے گی۔ انشاءاللہ تعالیٰ!

(۱) اسلام میں طلاق ایک بامقصد عمل ہے، اس کے کچھ اصول وضوابط ایسے ہیں جو معاشرہ کو معتدل رکھنے میں معاون ہیں۔ مثلاً زوجین میں اختلاف کے وقت مصالحت کی ہر ممکن کوشش کرنا اور حرف آخری حربہ کے بطور طلاق کا استعمال کرنا، حالت ناپاکی میں طلاق نہ دینا، اور بیک وقت ایک ہی طلاق دینا وغیرہ۔ اور کچھ احکام ایسے ہیں جن کا تعلق طلاق کی قانونی اور اصولی حیثیت سے ہے جیسے دو طلاق تک رجعت کا حق رہنا[۱] اور تین طلاق کے بعد رجوع کا اختیار ختم ہو جانا[۲]

اوّل الذکر اصول وضوابط کو سامنے رکھ کر فقہاء نے طلاق کی تین قسمیں کی ہیں۔ (۱) طلاق احسن: ایسے زمانۂ پاکی میں طلاق جو جماع سے خالی ہو (۲) طلاق حسن: تین طہر میں تین طلاقیں (وغیرہ) (۳) طلاق بدعت: ایک طہر میں تین طلاقیں، حالتِ حیض یا جماع کے بعد اسی طہر میں طلاق [۳]

لیکن واضح رہے کہ ان تقسیمات سے طلاق کی اصولی اور قانونی حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس معاملہ میں تین طلاق کا مسئلہ ''ظہار'' یعنی اپنی بیوی کو ماں کی پیٹھ سے مشابہت دینے کے مسئلہ سے بہت زیادہ مشابہ ہے جس کا ذکر سورۂ مجادلہ کی ابتدائی آیتوں میں کیا گیا ہے۔ یعنی اگرچہ نفس ظہار حرام ہے مگر اس سے بیوی کفارہ کی ادائیگی تک حرام ہو جاتی ہے اور اس مشابہت کی بنیاد یہ ہے کہ جس طرح تین طلاقیں بیک وقت دینا شرعاً مبغوض ہے، اسی طرح اپنی بیوی سے ظہار کرنا بھی قرآن کی نظر میں سراسر جھوٹ اور برا قول ہے[۴] لیکن اس برائی کے باوجود ظہار کر لینے سے حکم ظہار

۱؎ الطلاق مرتان فامساک بمعروف او تسریح باحسان۔ (سورۂ بقرہ آیت نمبر ۲۲۹)

۲؎ فان طلقها فلا تحل له من بعد حتى تنكح زوجاً غيره۔ (سورۂ بقرہ، آیت ۲۳۰)

۳؎ واقسامه ثلاثه، حسن، احسن، و بدعي، ياثم به. (۱) طلقة رجعية فقط في طهر لا وطئ فيه وتركها حتى تمضي عدتها. احسن (۲) وطلقة لغير موطؤة ولو في حيض ولموطؤة تفريق الثلاث في ثلاثة اطهار لا وطئ فيها ولا في حيض قبلها ولا طلاق فيه فيمن تحيض وثلاثة اشهر في حق غيرها حسن (۳) والبدعي ثلاث متفرقة او اثنان بمرّة اومرتين في طهر واحد لارجعة فيه او واحدة في طهر وطئت فيه او واحدة في حيض موطؤة۔
(ردالمحتار ر۳/۲۳۳) کراچی، زکریا ۴/۴۳۱)

(۴) الّذينَ يُظاهرونَ منكم من نساء هم ماهنّ اُمّهاتهم ان امهاتهم الاّ اللائى ولدنهم وانهم ليقولون منكرا من القول وزوراً و ان الله لعفو غفور۔ (سورۃ مجادلہ آیت ۲)

یعنی غلام آزاد کرنا، ۶۰ دن کے متواتر روزے رکھنا، ۶۰ مسکینوں کو کھانا کھلانے تک بیوی کا حلال نہ ہونا مرتب ہوتا ہے[1] بعینہٖ یہی صورتِ حال مسئلہ طلاق میں ہے کہ ممانعت کے باوجود طلاق دینے پر اس کا حکم جاری ہوتا ہے۔ امام طحاویؒ نے شرح معانی الآثار میں اس کو واضح کیا ہے[2]

(۲) طلاق کی قانونی حیثیت کے بارے میں بھرپور رہنمائی ہمیں ایک روایت سے ملتی ہے جسے امام ابوداؤد سجستانی (المتوفی ۲۷۵ھ) نے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے حوالے سے اپنی ''سنن'' میں ذکر کیا ہے۔

''عکرمہ کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ نے آیت **والمطلّقٰت یتربصن** الخ کے تحت ارشاد فرمایا کہ ابتدا میں اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو اگرچہ تین طلاق دے دیتا پھر بھی اسے رجعت کا حق رہتا تھا تاآنکہ یہ حکم منسوخ ہوگیا، پھر آپؐ نے الطلاق مرتان الخ آیت تلاوت کی[3]''

معلوم ہوا کہ اب اسلام کا یہ قانون بنا دیا گیا کہ وہ طلاق جس کے بعد رجعت کا حق ہے وہ صرف دو ہے، اس کے بعد اگر ایک بھی طلاق دی جائے گی۔ (چاہے یہ سب ایک ساتھ ہوں یا

---

[1] والذین یظاهرون من نسائهم ثم یعودون لما قالوا فتحریر رقبة من قبل ان یتمآسّا، الآیه. فمن لم یجد فصیام شهرین متتابعین من قبل ان یتمآسّا. فمن لم یستطع فاطعام ستین مسکیناً، الآیه۔ (سورۂ مجادلہ، آیت ۳-۴)

[2] کان کذلک الطلاق المنهی عنه هو منکر من القول وزوراً حرمة واجبة وقد رأینا رسول الله ﷺ لما سأله عمر بن الخطاب عن طلاق عبد الله وامرأته وهی حائض أمره بمراجعتها وتواترت عنه بذلک الآثار وقد ذکرتها فی الباب الاوّل ولایجوز أن یؤمر بالمراجعة من لم یقع طلاقه فلما کان النبیؐ قد الزمه الطلاق فی الحیض وهو وقت لا یحل ایقاع الطلاق فیه کان کذلک ومن طلق اِمرأته ثلاثاً وقع کلا فی وقت الطلاق من ذلک ماألزم نفسه وان کان قد فعله علی خلاف ما أمر به۔ (شرح معانی الاثار ۲/۳۲)

[3] عن عکرمة عن بن عباس قال والمطلقات یتربصن بانفسهن ثلاثة قروء ولایحل لهن ان یکتمن ماخلق الله فی ارحامهن. الآیة، وذلک ان الرجل کان اذا طلق امرأته فهو احقّ برجعتها وان طلقها ثلاثاً فنسخ ذلک فقال الطلاق مرتان، الآیة۔ (ابوداؤد ا/ ۲۹۷)

الگ الگ، اس لیے کہ آیات قرآنیہ میں کہیں اس تفریق کی دلیل نہیں ہے[1] تو وہ عورت اپنے شوہر کے لیے حلال نہ رہے گی۔

حضرت ابن عباسؓ کے مذکورہ قول کے مطابق جس پس منظر میں اس قانون کی تشکیل ہوئی ہے وہ صاف طور پر اس کا متقاضی ہے کہ تین کے وقوع کے بعد شوہر کو رجعت کا حق حاصل نہ ہو، کیونکہ تین کے بعد بھی اگر ہم رجعت کا حق باقی رکھیں گے تو نسخ سے پہلے اور بعد کے حکم میں کوئی زیادہ فرق نہ رہے گا، جو صراحتاً آیت قرآنی کے منشاء کے خلاف ہے۔

(۳) یہی وجہ ہے کہ زمانہ نبوی میں کئی ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ آپ نے علی الاطلاق تین طلاقوں کو نافذ فرمایا ہے۔ امیر المؤمنین فی الحدیث امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری (المتوفی ۲۵۶ھ) نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''الجامع الصحیح'' میں ایک باب قائم فرمایا ہے ''تین طلاق کو نافذ کرنے کا بیان'' اور اس کے تحت مشہور صحابی حضرت عویمر عجلانیؓ کا واقعہ لکھا ہے کہ وہ جب اپنی بیوی کے ساتھ لعان کر کے فارغ ہوئے تو انھوں نے کہا۔

''میں اگر اب بھی اس عورت کو ساتھ رکھوں تو جھوٹا کہلاؤں گا، پھر انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم فرمانے سے قبل ہی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں[2]''

ابوداؤد شریف میں اس روایت کی مزید وضاحت اس طرح کی گئی ہے:

''پس انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تین طلاقیں دے دیں جنھیں آپ نے نافذ فرمایا اور جو کام آنحضرتؐ کے سامنے کیا جائے وہ سنت ہوتا ہے[3]''

---

[1] قال القرطبی: وحجة الجمهور فی اللزوم من حیث النظر ظاهرة جداً وهو ان المطلقة ثلاثاً لاتحل للمطلق حتی تنکح زوجاً غیره ولا فرق بین مجموعها ومفرقها لغة و شرعاً الخ۔ (قرطبی بحوالہ فتح الباری ۹/ ۳۶۵)

[2] فتلاعنا وانا مع الناس عند رسول الله ﷺ فلما فرغا من تلاعنهما قال عویمر کذبتُ علیها یا رسول الله ان امسکتها فطلقها ثلاثاً قبل ان یامره' رسول الله ﷺ۔ الحدیث
(بخاری شریف ۲/ ۷۹۹، حدیث نمبر ۵۱۰۷)

[3] قال فطلقها ثلٰث تطلیقات عند رسول اللهؐ فانفذه' رسول الله ﷺ وکان ماصنع عند النبیؐ سنّة. الحدیث۔ (ابوداؤد ۱/ ۳۰۶)

اس روایت سے پتہ چلا کہ :

(الف) حضرات صحابہؓ زمانہ نبوی میں تین طلاقیں دیتے تھے۔

(ب) اور خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین کو نافذ فرمایا، جبکہ واقعہ بیک وقت تین طلاق دینے کا تھا۔ یہاں یہ واضح رہے کہ اگرچہ ائمہ اربعہ کا مذہب یہی ہے کہ لعان میں طلاق کے ذریعے تفریق کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ خود لعان ہی سے تفریق ہو جاتی ہے لیکن یہاں ان صحابی کے اکٹھے تین طلاق کے الفاظ استعمال کرنے پر پیغمبر علیہ السلام کا نکیر نہ فرمانا اس بات پر دلیل ہے کہ تین طلاقوں کا وقوع صحابہ میں مشہور و معروف تھا۔ (فتح الباری ۹/ ۳۶۷)

(۴) امام بخاریؒ نے اسی باب میں ایک دوسرا واقعہ بھی لکھا ہے:

''حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں۔ عورت نے دوسرا نکاح کرلیا۔ دوسرے شوہر نے (جماع سے قبل) طلاق دے دی، اس نے پوچھا کہ وہ عورت کیا پہلے شوہر کے لیے حلال ہوگئی؟ آپ نے جواب دیا : نہیں[۱]۔''

یہ حدیث بھی تین طلاق کو تین ماننے پر صریح ہے، اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین کے بعد بلا حلالہ رجعت سے منع فرمایا ہے خواہ تین طلاقیں اکٹھی دی جائیں یا الگ الگ۔

(۵) اس کے علاوہ بھی کئی واقعات ذخیرۂ حدیث میں ملتے ہیں جن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین طلاقوں کو بائنہ قرار دیا ہے۔

''مصنف عبدالرزاق میں حضرت عبادہ بن الصامتؓ کی روایت ہے کہ ان کے والد نے اپنی اہلیہ کو ہزار طلاقیں دے دیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کا علم ہوا تو آپ نے تین کو نافذ فرمایا اور بقیہ نو سو ستانوے کو لغو اور ظلم قرار دیا[۲]۔''

---

[۱] عن عائشة ان رجلاً طلق امرأته ثلاثاً فتزوّجت فطلق فسئل النبی ﷺ أتحل للاوّل قال: لا۔ (بخاری شریف ۱/ ۷۹۱، حدیث نمبر ۵۰۶۰)

[۲] عن عبادة بن الصامت قال طلق جدّی امرأته ألف تطليقة فانطلق ابی الی رسول الله ﷺ فذكر ذلک له فقال النبیؐ أما اتّقى الله جدک، اما ثلاث فله وأما تسع مأة وسبعة وتسعون فعدوان وظلم، ان شاء الله تعالى عذّبه وان شاء غفرله۔ (مصنف عبدالرزاق ۶/ ۳۹۳، حدیث نمبر ۱۱۳۳۹)

''امام دارقطنی نے حضرت ابن عمرؓ کا واقعہ نقل کیا ہے کہ انھوں نے آنحضرتؐ سے دریافت کیا کہ اگر میں اپنی بیوی کو تین طلاق دے دیتا تو کیا مجھے رجوع کا حق رہتا؟ اس پر آپؐ نے جواب دیا: نہیں، اس وقت تمھاری بیوی بائنہ ہوجاتی اور یہ گناہ کا کام ہوتا۔[1]''

اسی طرح امام حسنؓ کا واقعہ ذکر کیا ہے کہ

''انھوں نے اپنی ایک بیوی کو تین طلاقیں دے دی تھیں۔ بعد میں ایسے احوال پیش آئے کہ عورت نے رجعت کی خواہش کی تو حضرت حسنؓ نے افسوس کے ساتھ فرمایا کہ اگر مجھے اپنے نانا (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) کی یہ حدیث نہ پہنچی ہوتی کہ تین طلاق کے بعد بیوی نہیں رہتی تو میں اس سے رجوع کرلیتا۔[2] (ملخصاً)''

حاصل یہ ہے کہ تین طلاق کے واقعات خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش آئے اور آپ نے انھیں تین ہی قرار دیا۔ اور آپ کے بعد اکابر صحابہ وتابعین یہی فتویٰ دیتے رہے۔ ابن عباسؓ جن کی رائے پہلے اس بارے میں مختلف تھی بعد میں شدت کے ساتھ تین طلاق کو تین ماننے کا فتویٰ دیتے تھے۔[3]

کچھ مغالطے

(۶) یہاں ایک دوسرا پہلو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے، جس کے بغیر بحث بالکل ناتمام رہے گی۔ وہ یہ کہ اس مسئلہ میں باقاعدہ بلکہ منصوبہ بند طریقہ پر ایسے مغالطوں کو فروغ دیا گیا ہے جنھیں دیکھ کر خالی الذہن شخص مبتلائے فریب ہوجاتا ہے۔ ان مغالطوں کی بنیادی وجہ احادیث کے متعدد طرق پر

---

[1] فقلت یا رسول اللہ لو أنّی طلقتها ثلاثاً أکان یحل لی ان اراجعها قال لا کانت تبین منها وتکون معصیة، الخ۔ (دارقطنی ۲/ ۴۳۸)

[2] وقال لولا انی ابنتُ الطلاق لها لراجعتها ولٰکِنّی سمعت رسول اللہ ﷺ یقول ایما رجل طلق امرأته ثلاثاً عند کل طهر تطلیقة اوعند رأس کل شهر تطلیقة او طلقها ثلاثاً جمیعاً لم تحل له حتی تنکح زوجاً غیره، الخ۔ (دارقطنی ۲/ ۴۳۸)

[3] عن ابن عباس و ابی هریرة وعبد اللہ بن عمرو بن العاص سئلوا عن البکر یطلقها زوجها ثلاثاً فکلهم قالوا: لاتحل له حتی تنکح زوجاً غیره الخ۔ (ابوداؤد ۱/ ۲۹۹)

نظر نہ رکھنا ہے جو ہر زمانہ میں جدت پسندوں کی ضلالت کی بنیاد رہی ہے۔[1]

اس سلسلے کا سب سے اہم مغالطہ حضرت رکانہ ابن عبد یزیدؓ کی روایت ہے جس میں یہ ذکر ہے کہ انھوں نے اپنی بیوی کو ایک مجلس میں تین طلاقیں دے دیں اور حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں صرف ایک طلاق رجعی قرار دیا۔ غیر مقلد حضرات بڑے زور وشور سے اس روایت کو اپنے استدلال میں پیش کرتے ہیں، حالانکہ اس روایت کے الفاظ میں اختلاف ہے۔ بعض روایات میں تین مرتبہ طلاق کا ذکر ہے اور بعض میں لفظ ''البتہ'' سے طلاق کا تذکرہ ہے۔ اور امام ابوداؤدؒ نے ''البتہ'' والی روایت ہی کی تصحیح فرمائی ہے۔ ابوداؤدؒ کی روایت یہ ہے:

''رکانہ کے پڑپوتے عبداللہ بن علی بن یزید بن رکانہ اپنے والد سے وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رکانہؓ نے اپنی زوجہ کو 'البتہ'' کے لفظ سے طلاق دی تھی (جس میں ایک اور تین دونوں مراد لینے کا احتمال تھا) پھر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے پوچھا تمھاری مراد اس سے کیا تھی؟ رکانہ نے جواب دیا ''ایک'' اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رکانہ کو قسم دلائی اور جب انھوں نے قسم کھالی تو آپ نے فرمایا وہی مراد ہے جو تم نے ارادہ کیا۔

اس روایت پر امام ابوداؤد نے درج ذیل محدثانہ تبصرہ کیا ہے:

یہ روایت ابن جریج کی اس رویت کے مقابلے میں اصح ہے جس میں ابورکانہ کے تین طلاق دینے کا ذکر ہے کیونکہ اس روایت کے نقل کرنے والے رکانہ کے اہل خانہ ہیں جو حقیقتِ حال کو زیادہ جاننے والے ہیں۔[2]

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اصل واقعہ ''البتہ'' سے طلاق دینے کا ہے۔ بعض راویوں نے غلطی سے تین طلاق نقل کردی ہے، اسی بنا پر حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا ہے:

---

[1] سألنی بعض اصحابنا من اهل العلم ان اصنع له كتاباً اذكر فيه الآثار الماثورة عن رسول الله ﷺ فی الاحكام التی يتوهم اهل الالحاد والضعفة من اهل الاسلام ان بعضها ما ينقض بعضاً لقلة علمهم بناسخها من منسوخها، الخ۔ (شرح معانی الآثار ۱/۲)

[2] عن عبد الله بن علی بن يزيد ابن ركانة عن ابيه عن جده انه طلق امرأته البتة فاتی رسول الله ﷺ فقال ما أردت، قال : واحدة قال والله قال والله قال هو علی ما اردت. قال ابوداؤد هذا اصح من حديث ابن جريج ان ركانة طلق امرأته ثلاثاً لانهم اهل بيته وهم اعلم به، الخ۔ (ابوداؤد، ۱/۳۰۱،۳۰۰)

اس نکتہ سے ابن عباسؓ کی حدیث (رکانہ) سے استدلال کا موقع ختم ہو جاتا[1]

اور صحیح اور راجح روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رکانہ کو قسم دلانا اس پر شاہد ہے کہ اگر رکانہ کی مراد تین کی ہوتی تو تین ہی واقع کی جاتیں، اور اس اعتبار سے یہ حدیث تین کو ایک ماننے کی نہیں بلکہ بیک وقت تین طلاق کے وقوع کی کھلی دلیل ہے۔

(۷) مسئلہ زیر بحث میں دوسرا بڑا مغالطہ فیصلۂ فاروقی کے بارے میں دیا جاتا ہے کہ خلیفۂ دوئم حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا تین طلاقوں کو تین قرار دینے کا فیصلہ محض وقتی استثناء اور انتظامی حکم (ایگزیکیٹیو آرڈر) تھا، اسی حیثیت سے حضرات صحابہؓ نے اس سے اتفاق کیا تھا۔ اس کی حیثیت شرعی حکم نہ تھی کہ اسے بہر حالت مانا جائے۔

اس اہم مسئلہ میں (جو اپنے اندر حلت وحرمت کے معنی رکھتا ہے) حضرت عمرؓ کے فیصلہ اور صحابہؓ کے اجماع کو محض انتظامیہ اور سیاسی تدبیر وتعزیر قرار دینا بہت بڑی جسارت اور نئے زمانہ کے جدت پسندوں کی دماغی ایجاد ہے جس کا کوئی سر پیر نہیں کیونکہ:

(الف) علماء سلف میں سے کسی نے اس فیصلہ کو وقتی استثناء کے درجہ میں نہیں رکھا۔

(ب) حلت وحرمت کے مسئلہ میں صاحبِ شریعت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کو اپنی طرف سے رائے قائم کرنے کی ہرگز اجازت نہیں ہے خواہ وہ وقتی استثناء ہو یا انتظامی حکم۔

(ج) جو واقعات خود دور نبوی میں پیش آچکے ہوں اور ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین طلاق کے نفاذ کا حکم دیا ہو انھیں جیسے واقعات میں حضرت عمرؓ کا تین قرار دینے کا فیصلہ حکم شرعی سے کیسے خارج ہوسکتا ہے؟۔

(۸) فیصلۂ فاروقی کے انتظامی ہونے پر یہ دلیل دی جاتی ہے کہ حضرت عمرؓ تین طلاق دینے والے کو کوڑے سے سزا دیتے تھے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ استدلال ناواقفیت پر مبنی ہے۔

احقر کے علم میں کم از کم دو اور واقعات حضرت فاروق اعظمؓ کے دور حکومت میں اس طرح کے پیش آئے ہیں کہ آپ نے تحقیق کر کے کوئی اعلان کیا ہے اور اس پر صحابہ کا اجماع ہو گیا ہے۔ پھر

---

[1] فبهٰذه النكتة يقف الاستدلال بحديث ابن عباس، الخ ۔ (فتح الباری ۹/۳۶۳، حدیث نمبر ۵۲۶۱)

آپ نے فرمان جاری کیا ہے کہ جو اس کے خلاف کرے گا وہ سزایاب ہوگا۔

(الف) ان میں ایک واقعہ متعہ کی حرمت کا ہے۔ امام مسلم نے حضرت جابرؓ کی روایت نقل کی ہے کہ دور نبوی، دور صدیقی اور ابتدائی دور فاروقی میں متعہ کیا جاتا رہا، پھر ہمیں حضرت عمرؓ نے روک دیا، پس ہم رُک گئے۔[1]

یہ بعینہٖ اسی طرح کے الفاظ ہیں جو حضرت ابن عباسؓ سے تین طلاق کو ایک ماننے کے متعلق نقل کیے جاتے ہیں۔ اور حضرت عمرؓ کا متعہ کی حرمت کے متعلق فیصلہ سبھی اہل سنت (بشمول اہل حدیث) کے نزدیک مسلم ہے، کسی نے اسے وقتی استثناء یا انتظامی حکم قرار نہیں دیا، کیونکہ سب کو معلوم ہے کہ حضرت عمرؓ کوئی ایسا حکم نہیں دے سکتے جو نصوص (قرآن و حدیث) کے خلاف ہو۔ واقعہ میں یہ متعہ کی منسوخی کے حکم کا اظہار تھا جو دورِ نبوی میں ہی طے ہو چکا تھا، مگر بعض صحابہؓ کو اس کی منسوخی کا علم نہ تھا۔ حضرت عمرؓ نے سب کو باخبر کر دیا۔

(ب) اسی سے ملتا جلتا دوسرا مسئلہ ''جماع بلا انزال'' (التقاء ختانین) سے غسل واجب ہونے کا ہے۔ صحابہؓ اس بارے میں مختلف تھے۔ حضرت عمرؓ نے تحقیق حال کے بعد یہ حکم جاری کیا:

''اگر آئندہ مجھے پتہ چلا کہ کسی نے جماع (بلا انزال) کے بعد غسل نہیں کیا تو میں اسے سخت ترین سزا دوں گا۔[2]''

حضرت عمرؓ کے اس حکم کو سب صحابہ نے حکم شرعی کے بطور قبول کر لیا۔ کسی نے اسے وقتی استثناء نہیں قرار دیا اس لیے کہ یہ حکم فاروقی نہ تھا بلکہ حکم سابق (عدم وجوب غسل) کی منسوخی کا اظہار تھا۔

(ج) تقریباً یہی نوعیت تین طلاق کے مسئلہ میں پیش آئی۔ تین طلاق کے بعد رجعت کا حکم منسوخ ہو چکا تھا جیسا کہ سنن ابی داؤد میں مذکور حدیث ابن عباسؓ سے معلوم ہوتا ہے۔ بعض صحابہ کو اس کی منسوخی کا علم نہ تھا تا آنکہ حضرت عمر فاروق اعظمؓ نے اس حکم کا باقاعدہ اعلان فرمایا ان کا یہ اعلان

---

[1] عن جابر بن عبد الله يقول كنا نستمتع على عهد رسول الله ﷺ وابى بكر حتى نهى عنه عمر. (وفى رواية عنه) ثم نهانا عنهما عمر فلم نعد لهما، الحديث الخ۔ (مسلم شریف ۱/۴۵۱)

[2] فقالت (عائشةؓ) اذا جاوز الختان الختان فقد وجب الغسل فقال عمر عند ذالك لااسمع احداً يقول الماء من الماء إلاجعلته نكالاً الخ۔ (شرح معانی الاثار ۱/۳۶)

اپنی طرف سے وقتی مصلحت یا استثناء کے بطور نہیں تھا بلکہ قرآن وحدیث سے ماخوذ تھا اور صحابہؓ نے اسی حیثیت سے اس سے اتفاق کیا تھا۔ وہ صحابہؓ جو حضرت عمرؓ کو ''مہر'' کی زیادتی پر پابندی کے ارادہ پر سختی سے ٹوکنے کی جرأت رکھتے تھے ان کے ساتھ یہ بڑی ناانصافی ہے کہ انھیں نعوذ باللہ خصوصی انتظام کی آڑ میں حضرت عمرؓ کے ایک غیر شرعی فیصلہ کی موافقت کا ملزم گردانا جائے۔

خود مشہور اہل حدیث عالم مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹوی (متوفی ۱۳۷۵ھ) نے فیصلہ فاروقی کو سیاسی ماننے کی سختی سے تردید کی ہے۔ (اخبار اہل حدیث ۱۵/نومبر ۱۹۲۹ء بحوالہ عمدۃ الاثاث، ص ۹۷)

(۹) فاروقی فیصلہ کے حکم شرعی ہونے کی تائید ابوداؤد کی ایک روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں صراحت ہے کہ حضرت عمرؓ کا فیصلہ غیر مدخولہ کے بارے میں تھا جو متعدد الفاظ سے طلاق کے وقت پہلے ہی لفظ سے بائنہ ہوجاتی ہے[1]۔ ایسی صورت میں مدخولہ وغیر مدخولہ کے درمیان حکم کی تفریق بلاشبہ شرعی حکم کے اعتبار سے ہوگی، کیونکہ انتظامی حیثیت سے مدخولہ وغیر مدخولہ کے معاملات یکساں ہیں۔

(۱۰) مصنف عبدالرزاق کی ایک روایت سے بھی اس فیصلہ کے خالص شرعی ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

''ابوالصہباء نے اس شخص کے بارے میں سوال کیا جو اپنی بیوی کو تین طلاق دے دے تو حضرت ابن عباسؓ نے جواب دیا کہ لوگ انھیں ایک کہتے تھے عہد نبوی، عہد صدیقی اور ابتدائی عہد فاروقی میں حتیٰ کہ حضرت عمرؓ نے خطبہ دیا کہ اے لوگو! تم نے طلاق پر بہت کثرت کردی، اب آئندہ جو شخص جیسا لفظ بولے گا ویسا ہی سمجھا جائے گا۔ **فمن قال شیئاً فهو علی ماتکلم**[2]''

---

[1] اذا طلق امرأته ثلاثاً قبل ان يدخل بها جعلوها واحدةً على عهد رسول الله ﷺ وابى بكر و صدراً من امارة عمرؓ فلما رأى الناس قد تتابعوا فيها قال اجيز وهن عليهم، الخ۔ (ابوداؤد شریف ۱/۲۹۹)

[2] فسأله ابو الصهباء عن الرجل يطلق امرأته ثلاثاً جميعها فقال ابن عباس كانوا يجعلونها واحدةً على عهد رسول الله ﷺ وابى بكر و ولاية عمر الا اقلها حتى خطب عمر الناس قد اكثرتم فى هذا الطلاق فمن قال شيئاً فهو على ماتكلم به۔
(مصنف عبدالرزاق ۶/۳۹۲-۳۹۳، حدیث ۱۱۳۳۸)

اس روایت نے دودھ کا دودھ پانی کا پانی کردیا کہ واقعہ یہ تھا کہ پہلے لوگ طلاق کا لفظ کئی مرتبہ بول کر تاکیداً ایک ہی مراد لیتے تھے اور چونکہ صدق وصلاح کا زمانہ تھا اس لیے نیت تاکید کی بنا پر طلاق بھی ایک ہی شمار ہوتی تھی۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں لوگ اس کا بکثرت استعمال کرنے لگے اور پوچھنے پر کہہ دیتے کہ ہماری مراد تو تاکید کی تھی، تو حضرت عمرؓ نے صاف اعلان کردیا کہ دلی مراد چونکہ معلوم نہیں، اور صدق وصلاح کا پہلا سا معیار باقی نہیں رہا لہٰذا اب آئندہ محض ظاہری الفاظ کا اعتبار ہوگا، نیت کا اعتبار نہ ہوگا۔ یہ حکم قضاء کے اصول شرعیہ کے مطابق تھا کیونکہ قضاء میں ظاہر پر فیصلہ کیا جاتا ہے، حنفیہ کا بھی یہی مذہب ہے کہ متعدد الفاظ طلاق استعمال کرتے وقت قضاء تاکید کی نیت معتبر نہیں ہوتی، دیانت کا معاملہ دوسرا ہے۔[۱]

الغرض کوئی ایسی معتبر دلیل نہیں ہے کہ فیصلہ فاروقی کو وقتی استثناء یا انتظامی حکم پر محمول کیا جائے۔

(۱۱) جب یہ حکم شرعی ہے تو اس پر عمل کے لیے یا فتویٰ دینے کے لیے کسی بااختیار حاکم کا ہونا ضروری نہیں بلکہ ہر مسلمان پر اس کی پابندی لازم ہے، جیسا کہ مسئلہ متعہ اور مسئلہ جماع بلا انزال میں یہی حکم ہے۔

کیا حضرت علیؓ اجماع کے خلاف تھے؟

(۱۲) امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اجماعِ فاروقی سے اختلاف کرنے والا بتایا جاتا ہے جو حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔ سلیمان اعمش کے نقل کردہ ایک واقعہ سے اس کی قلعی کھل جاتی ہے جسے حافظ ابن رجب حنبلی نے اپنی کتاب ''شرح مشکل الاحادیث الواردۃ'' میں لکھا ہے:

''اعمش کہتے ہیں کہ کوفہ میں ایک بوڑھا شخص حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے سماعاً یہ روایت نقل کرتا تھا کہ اگر کوئی شخص ایک مجلس میں تین طلاق دے دے تو وہ ایک ہی شمار ہوگی، اور لوگوں کا تانتا

---

[۱] کرّر لفظ الطلاق وقع الکل وان نوی التاکید دین، الخ۔ (رد المحتار کراچی ۳/۲۹۳، زکریا ۴/۵۲۱)

اس کے پاس بندھا ہوا تھا، لوگ آتے تھے اور یہ حدیث اس سے بغور سنتے تھے۔ (اعمش کہتے ہیں) میں بھی اس کے پاس گیا اور پوچھا کہ کیا آپ نے حضرت علیؓ سے حدیث سنی ہے، اس نے مجھے بھی مذکورہ بالا حدیث سنا دی، تو میں نے دریافت کیا کہ کہاں سنی؟ تو اس نے کہاں کہ میں آپ کو اپنی کاپی دِکھاتا ہوں۔ چنانچہ وہ کاپی نکال کر لایا، کاپی میں نے دیکھی تو اس میں یہ لکھا تھا: میں نے حضرت علیؓ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص ایک مجلس میں اپنی بیوی کو تین طلاق دے تو وہ اس سے بائنہ ہوجائے گی اور دوسرے شوہر سے نکاح کیے بغیر اس کے لیے حلال نہ ہوگی، اس پر میں نے سوال کیا کہ تعجب ہے، یہ روایت تو تمہاری زبانی روایت کے خلاف ہے، اس نے کہا صحیح یہی (کاپی کی) ہے، لیکن لوگ مجھ سے وہی کہلوانا چاہتے ہیں۔ (بحوالہ النجاۃ الکاملۃ ص۱۱-۱۲، ج۱)

روایت سے معلوم ہوگیا کہ حضرت علیؓ کا مسلک کیا تھا؟ دراصل ان کی طرف اجماع سے اختلاف کی نسبت روافض کے پروپیگنڈے کا جزو ہے، حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

قابل ذکر شہادت

(۱۳) اخیر میں ہم اس بحث سے متعلق مشہور غیر مقلد عالم مولانا ابوسعید شرف الدین دہلوی کی منصفانہ شہادت نقل کرتے ہیں جس سے مسئلہ کی حقیقت پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ ملاحظہ کریں:

’’یہ (تین طلاق کو ایک ماننے کا) مسلک صحابہ، تابعین و تبع تابعین وغیرہ ائمہ محدثین و متقدمین کا نہیں ہے، یہ مسلک سات سو سال بعد کے محدثین کا ہے جو شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے فتاویٰ کے پابند اور ان کے معتقد ہیں۔ یہ فتویٰ شیخ الاسلام نے ساتویں صدی کے آخر یا اوائل آٹھویں میں دیا تھا تو اس وقت کے علماء نے ان کی سخت مخالفت کی تھی۔ نواب صدیق حسن خاں صاحب نے ’’اتحاف النبلاء‘‘ میں جہاں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے تفردات لکھے ہیں۔ اس فہرست میں طلاق ثلاث کا مسئلہ بھی لکھا ہے کہ جب شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے تین طلاق کے ایک مجلس میں ایک طلاق ہونے کا فتویٰ دیا تو بہت شور ہوا۔ شیخ الاسلام اور ان کے شاگرد ابن قیم پر مصائب برپا ہوئے۔ ان

کواونٹ پر سوار کر کے درّے مار مار کر شہر میں پھرا کر توہین کی گئی۔ قید کیے گئے اس لیے کہ اس وقت یہ مسئلہ علامت روافض کی تھی۔ (اتحاف،ص ۳۱۸، بحوالہ عمدۃ الاثاث،۱۰۳)

سعودی عرب کے اکابر علماء کا فیصلہ

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ سعودی عرب کی اعلیٰ ترین فقہی مجلس ہیئۃ کبار العلماء نے ۱۳۹۳ھ میں پوری بحث وتمحیص کے بعد بالاتفاق یہ فیصلہ کیا ہے کہ ایک وقت میں دی گئی تین طلاقیں تین ہی شمار ہوں گی۔ یہ پوری بحث اور مفصل تجویز مجلۃ البحوث الاسلامیہ ۱۳۹۷ھ میں ۱۵۰ صفحات میں شائع ہوئی ہے جو اس موضوع پر ایک وقیع علمی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس فیصلہ میں سعودی عرب کے جو اکابر علماء شریک رہے ان کے اسماء گرامی ذیل میں درج ہیں۔ (۱) شیخ عبدالعزیز بن بازؒ (۲) شیخ عبداللہ بن حمیدؒ (۳) شیخ محمد امین الشنقیطی (۴) شیخ سلیمان بن عبید (۵) شیخ عبداللہ خیاط (۶) شیخ محمد حرکان (۷) شیخ ابراہیم بن محمد آل الشیخ (۸) شیخ عبدالرزاق عفیفی (۹) شیخ عبدالعزیز بن صالح (۱۰) شیخ صالح بن عضون (۱۱) شیخ محمد بن جبیر (۱۲) شیخ عبدالمجید حسن (۱۳) شیخ راشد بن حنین (۱۴) شیخ صالح بن لحیدان (۱۵) شیخ محضار عقیل (۱۶) شیخ عبداللہ ابن عذیان (۱۷) شیخ عبداللہ ابن منیع۔

تعجب ہے کہ غیر مقلّد حضرات جو ہر معاملہ میں حرمین کے علماء کا حوالہ دیتے ہیں اس مسئلہ میں علماء سعودی عرب کی رائے اور موقف کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں حالانکہ علامہ ابن تیمیہؒ سے حد درجہ متاثر ہونے کے باوجود علماء سعودی عرب کا اس مسئلہ میں ابن تیمیہؒ کے موقف سے عدول کرنا خود اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ ابن تیمیہؒ کے مسلک میں کوئی قوت نہیں ہے ورنہ سعودی علماء اس سے ہرگز صرف نظر نہ کرتے۔

فائدہ کیا ہے؟

(۱۴) یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری ہے۔ وہ یہ کہ تین طلاق کو ایک قرار دینے کے نظریہ کو اہم اصلاحی عمل کی حیثیت سے متعارف کرایا جاتا ہے جبکہ یہ نری خام خیالی ہے، غور کیا جائے تو یہ

نظریہ عورتوں کے ساتھ ناانصافی کا سبب ہے کیونکہ:

الف: اس کا سارا فائدہ اس مرد کو پہنچتا ہے جو انجام کا لحاظ کیے بغیر تین طلاقیں دے دے اور بعد میں پشیمان ہو۔

ب: یہ نظریہ عورت کو مجبور کرتا ہے کہ وہ پھر اسی ناقدرے کے ساتھ کڑوی زندگی گذارے۔

ج: اس نظریہ کی وجہ سے مرد طلاق دینے پر جری ہوجاتے ہیں۔

د: جو عورتیں شوہر کی زیادتیوں سے تنگ رہتی ہیں ان کی گلوخلاصی مشکل تر ہوجاتی ہے۔

ہ: تین طلاق کے بعد رجعت کرنے والا شخص جمہور کے نزدیک حرام کار قرار پاتا ہے۔

ہ: اجماع امت کو چھوڑنے کے رجحان سے غیروں اور دُشمنوں کو دیگر دینی مسائل میں دخل اندازی کا موقع مہیا ہوتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

اس کے برخلاف تین طلاق کو تین ماننے سے مذکورہ کوئی خرابی لازم نہیں آتی، زیادہ سے زیادہ دو باتیں کہی جاسکتی ہیں۔ اوّل یہ کہ مطلقہ عورت کی کفالت کا نظم کیسے ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ مشکل صرف تین کو تین ماننے کے ساتھ ہی خاص نہیں بلکہ تین کو ایک ماننے کی صورت میں بھی پیش آسکتی ہے جبکہ رجعت نہ ہو یا تین طہروں میں الگ الگ طلاق ہو۔ اصل میں یہ ایک معاشرتی مسئلہ ہے۔ اس کا حل صرف یہ ہے کہ عورت کا دوسرا نکاح ہو یا اہل خاندان اس کی کفالت کریں۔

دوسری مشکل یہ بتائی جاتی ہے کہ تین کو تین ماننے سے حلالہ کا حکم دینا لازم آتا ہے (جو بقول معترض بڑی بے شرمی کی بات ہے!) تو یہ اعتراض حلالہ کی شرعی کیفیت اور صورت سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ شریعت اسلامی میں حلالہ کوئی منصوبہ بند عمل نہیں بلکہ منصوبہ کے ساتھ حلالہ کرنے اور کرانے والے پر لعنت وارد ہوتی ہے۔[1] حلالہ کا مطلب صرف یہ ہے کہ مطلقہ اس وقت تک دوبارہ طلاق دینے والے کے نکاح میں نہ آئے جب تک کہ وہ دوسرے مرد سے نکاح نہ

[1] عن الحارث و عن علی قالا ان رسول اللہ صلعم لعن اللہ المحلّل والمحلل له، الحدیث۔ (ترمذی شریف ۱/۲۱۳)

کر لے پھر (اتفاقاً) اس سے جدائی ہو جائے۔ یہ حکم تین طلاق دینے والے کے لیے بڑی اہم نفسیاتی سزا ہے۔ حلالہ عورت کے لیے باعثِ عیب نہیں کیونکہ وہ اس کا دوسرا شرعی نکاح ہے اور بہت ممکن ہے کہ اس کا دوسرا رفیق حیات پہلے سے اچھا ہو، البتہ باغیرت مرد کے لیے یہ شرم کی بات ہے کہ اس کی بیوی دوسرے کے نکاح میں جائے، جو شخص اس حکم کو ذہن میں رکھے گا۔ وہ کبھی بھی تین طلاق کی جرأت نہ کرے گا۔

کرنے کا کام

(۱۵) بحث اس لیے لمبی ہوگئی کہ بزعم خود مفکرین و مجتہدین کے مغالطوں کی توضیح ضروری تھی۔ ورنہ کہنے کی بات صرف اتنی ہے کہ اس وقت جبکہ ملّی اتحاد اور معاشرتی اصلاح کی سخت ضرورت ہے ہمارے لیے طلاق کے مسئلے میں الجھنا چنداں مفید نہیں ہے، ہمیں اسلامی طریقۂ طلاق میں تبدیلی کی بحث میں پڑنے کے بجائے اپنی صلاحیتیں اور وسائل عوام کو سمجھانے اور اُنھیں صحیح راہ دِکھانے پر صرف کرنے چاہئیں۔ بیک وقت ایک طلاق دینا بالاتفاق مستحسن ہے۔ اسی نکتہ پر سب زور دیں اور اسی کو رائج کریں۔ اس طرح کثرت طلاق کی وبا بھی کم ہوگی اور ہمارا مقصود بھی حاصل ہوگا۔ اب بھی وقت ہے کہ ہم اپنے آپ کو سنبھالیں ورنہ یہ ہماری کج بحثی ایسے نت نئے مسائل کھڑے کرے گی کہ ہمیں ان سے نمٹنا مشکل ہو جائے گا۔

ناچ نہ آئے آنگن ٹیڑھا

(تین طلاق کی بحث)

تین طلاقوں کو ایک طلاق رجعی قرار دینے کے متعلق اہل حدیث کے فتویٰ کی آڑ میں ایک طرف قومی ذرائع ابلاغ اور میڈیا یا اسلامی شریعت پر طعن وتشنیع اور تنقید وتوہین کا بازار گرم کیے ہوئے ہے تو دوسری طرف نام نہاد مسلم دانشوروں اور جدت پسندوں کی بھی خوب بن آئی ہے اور وہ بھی جی بھر کر اخبارات ورسائل میں فقہ اسلامی پر اپنے سربستہ زہریلے خمار کو ظاہر کر کے اسلام دشمنوں کو مواد فراہم کرنے کا ''ملّی فریضہ'' انجام دے رہے ہیں۔

یہ صورتِ حال پوری ملّتِ اسلامیہ ہند کے لیے حد درجہ باعثِ تشویش ہے، سوچنا یہ ہے کہ آخر اس قومی پریس کو جو مسلمانوں سے متعلق ایک لائن کی خبر چھاپنے میں بھی بخل سے کام لیتا ہے، اسلامی طریقۂ طلاق سے اچانک اتنی دلچسپی کیوں پیدا ہوگئی ہے؟ اور مسلم عورتوں سے ہمدردی اور خیر خواہی کے لیے اس کے پاس اتنا وقت کہاں سے نکل آیا ہے؟ دراصل یہ ایک سازش ہے مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے اور ان کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے کی، اور نام نہاد یکساں سول کوڈ کے لیے راستہ ہموار کرنے کی، اور اس سازش کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اسے پانی دیا ہے غیر مقلدین کے اس موقف نے جو امت کے اجماعی مسلک کے خلاف ہے۔ اور جسے امت نہایت قوی دلائل سے بار بار رد کر چکی ہے۔ حتیٰ کہ سعودی عرب کی مجلس کبار العلماء نے بھی پوری تحقیق وتنقید کے بعد جمہور کے مسلک کی تائید کی ہے اور آج کل سعودی عرب کی عدالتوں میں یہی قانون رائج ہے حالانکہ حکومت سعودیہ بڑی حد تک علامہ ابن تیمیہؒ کی رائے کی پابند رہتی ہے، مگر اس مسئلہ میں اس

نے علامہؒ کی رائے کو چھوڑ دیا ہے جو صریح طور پر ان کے موقف کے کمزور ہونے کی دلیل ہے۔ میں اس بارے میں دلائل کی تفصیل بیان کرنا نہیں چاہتا اس لیے کہ اس موضوع پر ضخیم ضخیم کتابیں لکھی گئی ہیں اور غیر مقلدوں کی پیش کردہ دلیلوں کے ہر ہر جزو کا جواب دیا جا چکا ہے۔ اس لیے ان بحثوں کو اخبارات و رسائل کی زینت بنانا عوام کے لیے مفید نہیں بلکہ استدلال کی موشگافیاں انھیں مزید شکوک شبہات اور گمراہی میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ بریں بنا نقلی دلائل سے قطع نظر میں اس بحث سے پیدا ہونے والے بنیادی نکتوں کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا۔

دانشوروں اور پریس والوں کا یہ کہنا ہے کہ غیر مقلدین کے فتویٰ سے اسلامی طریقہ طلاق میں اصلاح کی امید پیدا ہوئی تھی مگر مولانا سیّد اسعد مدنی جیسے قدامت پسند علماء اور جمعیۃ علماء ہند اور دارالعلوم دیوبند جیسے تقلید پسند اداروں نے اس اصلاحی تحریک میں روڑے اٹکانے شروع کر دیئے۔ (دیکھئے انڈین ایکسپریس، ۹/جولائی ۱۹۹۳ء، مدراس ایڈیشن) یہاں سوال یہ ہے کہ جسے اصلاحی تحریک کہا جا رہا ہے وہ واقعتاً اصلاحی تحریک ہے یا اسے تخریبی کوشش کا نام دینا چاہیے کیونکہ اسے اصلاحی کوشش کا نام اسی وقت دیا جا سکتا ہے جب کہ وہ واقعتاً اپنے اندر ایسے ظاہر اور واضح فائدے رکھے جو دوسری صورت میں حاصل نہ ہو سکتے ہوں۔ یعنی اس امر پر غور کیا جائے کہ تین طلاق کو ایک ماننے سے آخر کیا ایسے واضح فائدے مسلمانوں کے بگڑے ہوئے معاشرے کو مل جائیں گے جو تین کو تین ماننے سے نہیں مل سکتے۔

۱۔ کیا اس کی وجہ سے طلاق کی وبا کم ہو جائے گی؟

۲۔ کیا اس کی بنیاد پر عورت کا حق واختیار کچھ بڑھ جائے گا؟

۳۔ کیا تین کو ایک طلاق رجعی مان لینے سے مرد کو رجعت پر مجبور کیا جا سکے گا؟

۴۔ کیا اس بنیاد پر مرد سے تین طہروں میں تین طلاقیں دینے کا اختیار چھین لیا جائے گا؟

۵۔ کیا اس موقف کو تسلیم کر لینے سے عورت بھی اختیار طلاق میں مرد کے ساتھ شریک ہو جائے گی؟

میرے خیال میں کوئی اہل حدیث اور غیر مقلد عالم بھی ان سوالات کا جواب اثبات میں دینے کی ہمت نہیں کرسکتا۔ اس لیے کہ شریعت میں یہ طے شدہ امر ہے کہ طلاق دینے کا اختیار صرف مرد کو ہے وہ اپنے اختیار کو ہر طرح استعمال کرسکتا ہے۔ وہ اگر ایک طلاق دے کر بھی رجعت نہ کرنا چاہے تو کوئی اسے رجعت پر مجبور نہیں کرسکتا اور نہ ہی اس پر عدت سے زیادہ مدت کا نان ونفقہ لازم کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح مرد کو تین طہروں میں تین طلاقیں دینے کا بالاتفاق حق حاصل ہے۔ کوئی اس سے اس حق کو نہیں چھین سکتا اس معاملے میں نہ وہ عورت کا پابند ہے نہ کسی اور شخص کا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنی بداخلاقی کا ثبوت دیتے ہوئے اس حق کا بے جا استعمال کرے تو اس کا گناہ اسے ملے گا لیکن اختیار شرعی سے وہ محروم نہ ہوگا۔ تو مآل کے اعتبار سے یہ نتیجہ نکلا کہ مرد اگر تین طلاق دینا چاہے تو اسے روکا نہیں جاسکتا۔ چاہے تین کو ایک قرار دیا جائے یا تین کو تین ہی مانا جائے۔ اس لیے اصلاح پسندی کے ڈھونگ رچانے والوں کو مطمئن رہنا چاہیے کہ وہ غیر مقلدین کے مسلک کے ذریعے طلاق کے اختیار میں مرد عورت کی بندر بانٹ کو ثابت نہیں کرسکتے جو ان کا اصل مقصود ہے۔ لہٰذا ان کے لیے اس بحث میں پڑنا قطعاً لاحاصل ہے۔ اس معاملہ میں غیر مقلدین بھی ان کا ساتھ نہیں دے سکتے۔

اب رہ گئی مسلم معاشرہ کی اصلاح کی بات یعنی معاشرہ میں بلاضرورت طلاق کے استعمال کا جو رواج چل پڑا ہے اور جس کے نتیجہ میں نت نئی خرابیاں اور مشکلات وجود میں آرہی ہیں ان کا مداوا کیسے ہو؟ تو اس میں واقعتاً اصلاح کی ضرورت ہے جس سے کوئی فرد انکار نہیں کرسکتا لیکن اس معاشرتی اصلاح کے لیے اصل حکم طلاق میں تبدیلی کرنے کا مشورہ دینا حق وانصاف کے قطعاً خلاف ہے اور دین کو بگڑے ہوئے معاشرے کے تابع کرنے کے مرادف ہے۔ خاص کر اس لیے بھی کہ غیر مقلدین کے جس موقف کو اصلاح کا عنوان دیا جارہا ہے وہ انجام کے اعتبار سے معاشرے کی اصلاح کا نہیں بلکہ اس میں مزید بگاڑ پیدا کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ اس لیے کہ اگر تین طلاقوں کو ایک طلاق رجعی قرار دیا جائے تو:

الف: مردوں کے دِلوں سے طلاق کا خوف نکل جائے گا اور وہ طلاق دینے پر اور جری ہوجائیں گے کیونکہ وہ سمجھیں گے کہ جتنی چاہیں طلاق دے دیں وہ ایک ہی مانی جائے گی۔

ب: وہ عورتیں جوشوہروں کی بداخلاقی اور بدمعاملگی کا شکار ہیں اوران سے گلوخلاصی چاہتی ہیں ان کے لیے اس مصیبت سے نکلنا دشوارتر ہوجائے گا۔

ج: تین کوایک ماننے سے حرام کاری کا دروازہ کھلنے کا قوی اندیشہ ہے بایں طور کہ شوہر کئی طہروں میں کئی مرتبہ متعدد الفاظ سے طلاق دے چکا ہوگا مگر ہر بار پچھلے واقعات بتائے بغیر مفتی سے ایک طلاق رجعی کا فتویٰ حاصل کرلے گا حالانکہ تیسری طلاق کے وقوع کے بعد کسی کے نزدیک رجعت کی گنجائش نہیں رہتی۔

د: تین طلاق کوایک قرار دینا امت کے اجماعی موقف میں دخل اندازی اور تغیر وتبدل کی نظیر بن جائے گا۔

ہ: یہ موقف صرف اپنی جگہ تک محدود نہیں رہے گا بلکہ اس بحث کی لپیٹ میں اسلام کا پورا عائلی نظام آئے گا جس کا کچھ اندازہ اس وقت جدت پسندوں کی تحریروں سے لگایا جاسکتا ہے۔

اس کے علاوہ اور بھی بہت سے مفاسد ہیں جواس مرجوح موقف کواپنانے سے پیدا ہوسکتے ہیں۔ظاہر ہے کہ ان مفاسد کی موجودگی میں مسلمانوں کا بگڑا ہوا معاشرہ ہرگز سدھرنہیں سکتا بلکہ اور بگڑ جائے گا اوراس کے مقابلے میں جمہور علماء اور فقہاء امت کے موقف کواپنا کر اگر سنجیدگی کے ساتھ معاشرہ کی اصلاح کے لیے جدوجہد کی جائے تو مفید ثمرہ نکلنے کی پوری توقع ہے اس لیے کہ تین طلاقوں کوتین ہی ماننے کی وجہ سے:

الف: مردوں کوطلاق پر بہت زیادہ جرأت نہیں ہوتی، بلکہ وہ طلاق دیتے ہوئے جھجکتے ہیں۔

ب: وہ عورتیں جوشوہر سے تنگ اور عاجز ہیں ان کی گلوخلاصی آسان ہوجاتی ہے۔

ج: آئندہ حرام کاری کا دروازہ بند ہوجاتا ہے۔اس لیے ایک ہی مرتبہ کی تین طلاقوں میں عورت مغلظہ قرار پاتی ہے۔

د: وہ ناعاقبت اندیش مرد جو غصہ میں آ کر تین طلاقیں دے بیٹھے ہیں انھیں بعد میں سخت ترین اذیت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔اس کا اندازہ وہی شخص لگا سکتا ہے جسے اس طرح کے واقعہ سے دوچار ہونا پڑا ہو۔

ہ: اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ امت کے اجماعی مسلک سے انحراف نہ کرنے کی بنا پر غیروں کو دیگر مسائل میں دخل اندازی کا موقع نہیں ملتا۔

یہ تو چند مثالیں ہیں ورنہ غور کیا جائے تو ہر موقع پر یہی اجماعی مسلک واقعتاً معاشرہ کی اصلاح کا ذریعہ منشاء شریعت کے مطابق اور نہایت احتیاط پر مبنی ہے۔ نئے زمانہ کے اصلاح پسند اگر واقعتاً اصلاح کے جذبہ میں مخلص ہیں تو انھیں اسی اجماعی مسلک کی پیروی کر کے معاشرتی خرابیوں کو دُور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اس اصلاح کی آڑ میں اصل حکم شریعت کو بدلنے کی روش چھوڑ دینی چاہیے معاملہ قدامت پسندی یا تقلید وعدم تقلید کا نہیں بلکہ معاشرہ کے لیے مفید ہونے یا نہ ہونے کا ہے جو موقف مآل کے اعتبار سے مفید ہو اسے اپنایا جائے اور جو عقل وشریعت ہر اعتبار سے مضر ہے اسے بہر حال ترک کیا جائے۔ ملت کے ساتھ سچی خیر خواہی یہی ہے۔

اس وقت بعض ایسے واقعات بھی بہت اچھالے جا رہے ہیں جن میں یہ ذکر ہوتا ہے کہ کسی مرد نے کسی عورت کو اچانک تین طلاقیں دے دیں جس کے نتیجہ میں عورت بے سہارا ہوگئی اور معاشرہ اسے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوا۔ اس طرح کے واقعات بیان کر کے تین طلاق کو ایک قرار دینے کی دلیل مہیا کی جاتی ہے۔

قطع نظر اس حقیقت کے کہ یہ واقعات اسلامی طریقہ طلاق کی خرابی کا مظہر نہیں بلکہ معاشرہ کے بگاڑ کی تصویر ہیں اور ان کی وجہ سے اصل حکم میں تبدیلی بالکل بے معنی ہے۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر تین کو ایک ہی طلاق دیا جائے تو کیا شوہر کو رجعت پر مجبور کیا جا سکتا ہے کہ ایسی عورتوں کی مشکل آسان ہو جائے؟ اگر وہ رجعت نہ کرے تو حکم کے اعتبار سے عورت کو کیا فائدہ ہوگا؟ کیا اسے عدت کے بعد بھی نان نفقہ شوہر کی جانب سے دلایا جا سکے گا؟ اور فرض کیجیے وہ رجعت بھی کر لے تو اس مرد کو

جس نے انجام سے بے خبر ہو کر تین طلاق دینے کے عظیم جرم کا ارتکاب کرلیا ہے اسے اپنے جرم کی کیا سزا ملی؟ اسے تو طلاق رجعی کے ذریعے مزید ہوس رانی کا موقع دے دیا گیا اور عورت کو مجبور کر دیا گیا کہ وہ اسی ناقدرے شوہر کے ساتھ پھر زندگی گذارے۔ عجیب بات ہے ایک طرف تو آپ تین طلاقوں کے مرتکب کو سزا دینا چاہتے ہیں دوسری طرف اس کی تین طلاقوں کو ایک قرار دے کر اسے مزید شہوت رانی کا موقع دے رہے ہیں یہ کہاں کا انصاف ہے؟ اسے تو سزا جبھی مل سکتی ہے جب کہ اس کی تین طلاقوں کو تین ہی مانا جائے اور اسے ہرگز رجعت کا موقع نہ دیا جائے تاکہ اسے اپنی بھیانک غلطی کا احساس ہو سکے، نہ یہ کہ تین طلاقوں کو ایک مان کر اس کی مزید حوصلہ افزائی کی جائے۔

اور ساتھ ہی یہاں واقعات کا دوسرا پہلو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ہمارے معاشرہ میں جہاں ایسے واقعات پیش آتے ہیں جن میں طلاق دے کر عورت کو بے سہارا کر دیا جاتا ہے وہیں ایسے واقعات کو بھی کمی نہیں ہے جن میں خود عورت کسی وجہ سے مرد سے چھٹکارا پانا چاہتی ہے اگر دیکھا جائے تو ایسے واقعات زیادہ پیش آتے ہیں۔ امارت شرعیہ کے زیر اہتمام جابجا قائم محکمہ شرعیہ میں ایسے ہی مقدمات عموماً دائر کیے جاتے ہیں تو اب تین طلاقوں کو ایک قرار دینا کیا ایسی عورتوں کے ساتھ ناانصافی نہ ہوگی؟ وہ جدت پسند جنھیں مسلم عورتوں کی حالت زار پر مگرمچھ کے آنسو بہانے آتے ہیں وہ اس پہلو پر غور کیوں نہیں کرتے کیا یہ ان کے نزدیک ناانصافی نہیں ہے؟۔

یہ بات بھی بڑی شد و مد کے ساتھ کہی جاتی ہے کہ ایک ساتھ تین طلاق دینا چونکہ ناجائز اور حرام ہے لہٰذا اسے واقع نہ کیا جائے حالانکہ یہ کہنا احکامِ شریعت سے ناواقفیت اور کم علمی پر مبنی ہے۔ اس لیے کہ شریعت میں بہت سی ایسی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جن میں اصل کام اگرچہ ناجائز ہے مگر ان پر شرعی احکامات مرتب ہوتے ہیں مثلاً:

۱۔ حالت حیض میں طلاق دینا ممنوع ہے لیکن اگر کوئی طلاق دے دے تو وہ واقع ہو جاتی ہے۔

۲۔ زنا کرنا حرام ہے اگر کوئی زنا کر لے تو اس پر حد شرعی جاری ہوتی ہے۔

۳۔ قتل کرنا حرام ہے مگر اس کی بنا پر قصاص یا دیت کا حکم دیا جاتا ہے۔

یعنی عمل کا حرام ہونا الگ چیز ہے اور اس عمل پر کسی حکم کا مرتب ہونا الگ ہے۔ حرام کے ارتکاب سے گناہ ہوتا ہے جس کا تعلق آخرت سے ہے اور حکم کا ترتب دنیوی اعتبار سے ہے۔ لہٰذا تین طلاقوں کو ایک قرار دینے کے لیے طلاقوں کی حرمت کو دلیل بنانا قابل تسلیم ہے اور شریعت میں ایسے دلائل اور تاویلات کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

بعض نام نہاد دانشور طلاق کے بارے میں براہِ راست قرآن کریم سے استدلال واستنباط کی جرأت کرتے ہوئے سورۂ طلاق کی آیتوں کی ایسی محرف تفسیر کرتے ہیں جو کسی بھی حدیث یا قول سلف سے ثابت نہیں ہے اور ساتھ میں علماء پر طنز بھی کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے کو دین کا ٹھیکیدار سمجھ رکھا ہے یہ بڑی خطرناک روش ہے۔ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ جو شخص قرآن کریم کی اپنی رائے سے تفسیر کرے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔ علماء دین کے ٹھیکیدار نہیں بلکہ وہ اسلامی ورثہ کے محافظ ہیں، وہ کسی کو قرآن میں غور وفکر سے نہیں روکتے بشرطیکہ صحیح علم اور صحیح مواد کے ساتھ قرآن کریم سے استفادہ اور غور وتدبر کیا جائے۔ اگر قرآن کریم سے اجتہاد واستنباط میں یہ پابندی نہ لگائی جاتی تو یہ دین کب کا بازیچۂ اطفال بن گیا ہوتا اور اس کی روح فنا ہوگئی ہوتی۔ اس لیے ان دانشوروں کو سنجیدگی کے ساتھ اپنے قول وعمل کا جائزہ لینا چاہیے وہ براہِ راست کتاب اللہ کی من مانی تفسیر کر کے گمراہی کے خطرناک دروازہ کو کھول رہے ہیں جس کے بھیانک قومی وملّی نتائج نکل سکتے ہیں۔

اسی طرح بعض نئی روشنی کے حامل تین طلاق کی آڑ میں حلالہ کے شرعی حکم کا مذاق اُڑاتے ہیں اور ساتھ میں علماء ومفتیان پر کیچڑ اُچھالتے ہیں جبکہ یہ علماء کے ساتھ مذاق نہیں بلکہ صریح طور پر قرآن وحدیث کی نصوص کے ساتھ استہزا اور استخفاف ہے جو کسی مسلمان کے لیے ہرگز جائز نہیں ہے۔ اس طرح کا استخفاف بسا اوقات آدمی کو کفر کے دروازے تک پہنچادیتا ہے۔ اس لیے نئی روشنی کے حاملوں کو چاہیے کہ وہ علماء کی اندھی دشمنی میں کم از کم اپنے ایمان کا تو سودا نہ کریں۔ تفصیل کا موقع نہیں صرف اتنا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ تین طلاق دینے والے کے لیے حلالہ کی شرط لگا کر شریعت نے اس کے لیے ایسی نفسیاتی سزا مقرر کی ہے کہ اس کا تصور کر کے کوئی بھی باغیرت اور

باشرم شخص بلاضرورت تین طلاق دینے کی زندگی بھر جرأت نہیں کرسکتا اس میں عورت کے لیے سزا نہیں بلکہ مرد کے لیے سزا ہے۔ عقل والے اسے بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

تین طلاق کی موجودہ لا حاصل بحث سے ہندوستان میں یکساں سول کوڈ کے حامیوں نے نقد فائدہ اُٹھانا شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ پچھلے دِنوں مدراس میں منعقدہ فقہی اجتماع میں آسام کے ایک بڑے مفتی صاحب نے انکشاف کیا کہ حال ہی میں گوہاٹی ہائی کورٹ نے کم از کم تین مقدمات میں تین طلاقوں کو ایک قرار دینے کا فیصلہ کر کے مرد پر نان ونفقہ کا حکم نافذ کر دیا ہے۔

ظاہر ہے کہ مقدمہ کی نوبت اسی وقت پیش آئے گی جب کہ مرد رجعت نہ کرنا چاہتا ہو تو کیا رجعت کے بغیر عدت کے بعد تک مرد پر نان ونفقہ کا وجوب جاری رکھنے کا حکم صراحتاً شریعت کے خلاف نہیں ہے۔ یہ تو ابتداء ہے، آگے اس کے کیا غلط اثرات مرتب ہوں گے ان کی سنگینی کا ہمارے دانشوروں اور علماء غیر مقلدین کو احساس نہیں، انھیں تو بس قدامت پرستی اور تقلید کے نام سے نفرت ہے اور تقلید سلف کو نشانہ بنانا ہی وہ اپنے لیے سب سے بڑی اسلامی خدمت سمجھتے ہیں خواہ اس کی بنا پر انھیں اپنے تشخص ہی سے محروم ہونا پڑے۔

اس طویل تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ اس وقت اسلامی طریقہ طلاق میں اصلاح ہرگز ضرورت نہیں بلکہ صرف مسلم معاشرہ میں اصلاح کی ضرورت ہے۔ عوام کو سمجھایا جائے کہ طلاق دینے کا شرعی طریقہ کیا ہے اور خاص کر اس غلط فہمی کو دُور کیا جائے کہ جب تک تین طلاق نہ دیں طلاق ہی نہیں پڑتی۔ یہ غلط فہمی ہی اس زمانہ میں تین طلاقوں کی کثرت کی بنیادی وجہ ہے۔ اس غلط فہمی کو ضرور دُور ہونا چاہیے۔ نیز اصلاح کے علمبرداروں پر لازم ہے کہ دینی احکامات میں تبدیلی کی بحث میں الجھنے کے بجائے عملی میدان میں آکر معاشرہ کو ضرورت کے وقت صرف ایک ہی طلاق دینے کا عادی بنائیں تاکہ بلا کسی اختلاف کے طلاق کی ضرورت پوری ہوسکے۔ میں غیر مقلد علماء کو بھی توجہ دلاؤں

گا کہ وہ اپنے خاص موقف کو ساری امت پر زبردستی تھوپنے کی کوشش نہ کر کے صرف ایک طلاق کا رواج دینے پر اپنے وسائل صرف کریں۔ کیونکہ اب بحث کا دائرہ مقلدین و غیر مقلدین کے درمیان نہیں رہا بلکہ اسلام اور دشمنانِ اسلام کے درمیان معرکہ آرائی ہو رہی ہے۔ ایسے میں عملی جدوجہد کے لیے اتفاقی شکل تلاش کرنا اور اس کو رہنما بنانا ضروری ہے۔ یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کر لی جائے کہ تین طلاق کو ایک قرار دینے سے ہرگز معاشرہ کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اصلاح کا راستہ صرف اور صرف یہ ہے کہ معاشرہ میں طلاق کی پھیلتی ہوئی وبا پر روک لگائی جائے اور شریعت کے مطابق طریقہ طلاق کا رواج دیا جائے۔

ان ارید الا الاصلاح مااستطعت وماتوفیقی الا باللہ

(ندائے شاہی، اگست ۱۹۹۳ء)

شیعیت اور ماہ محرم

شیعیت سے اسلام کو جتنا عظیم نقصان پہنچا ہے وہ کسی بھی صاحب نظر وفکر سے مخفی نہیں ہے۔ یہی وہ منافقانہ تحریک ہے جس کی کوکھ سے بے شمار دشمنان اسلام نے جنم لیا۔ مذہب شیعیت علمی اور عملی اعتبار سے دین محمدی کے متوازی ایک الگ دین اور مذہب ہے جس کی بنیاد ہی بغض صحابہ، تحریف قرآن اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی نبوت کا مفہوم جاری ہونے جیسے عقائد اور نظریات پر رکھی گئی ہے گویا کہ اس مذہب کا کل سرمایہ موضوع احادیث، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر تبرا بازی اور قرآن کریم کے انکار پر مشتمل ہے۔ اس بنا پر آج تمام ہی علماء اہل السنۃ والجماعۃ کا اتفاق ہے کہ ایسے عقائد رکھنے والے شیعہ جنھیں امامیہ اور اثنا عشریہ کہا جاتا ہے، دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ ان کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین اور شریعت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ (اس سلسلہ کا اہم فتویٰ چند سال قبل ادارہ الفرقان لکھنؤ کی جانب سے شائع ہو چکا ہے)

کسی بھی فکر اور نظریہ کو لوگوں میں رائج کرنے کے لئے ایسے عنوان کی ضرورت ہوتی ہے جو عوام کو اپیل کر سکے اور ان کی توجہ کا محور بن سکے۔ اسلام کے در پردہ دشمن بھی اپنے غلط فکر اور رسومات کو عوام میں شائع و ذائع کرنے کے لئے یہی حربہ استعمال کرتے رہے ہیں۔ تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ جو بھی باطل تحریک سامنے آئی اس نے اپنے غلط مسلک کی ترویج واشاعت کے لئے کوئی نہ کوئی دل پذیر نعرہ دیا۔ تا کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو دام فریب میں پھنسایا جا سکے۔ حضرت علیؓ سے خروج کرنے والوں نے ''ان الحکم الاللہ'' کا نعرہ دیا۔ باطنیوں نے ''عقل'' کو نقل پر مسلط کیا۔ معتزلہ نے خلاف عقل کو ناممکن قرار دینے میں عمریں گنوا دیں۔ اہل قرآن نے

دین کو ''فوجی پریڈ'' بتا دیا اور قادیانی نے عیسائیوں اور آریوں سے مناظرہ کا ڈھکوسلہ کر کے رنگ جمانے کی کوشش کی۔ اسی طرح شیعوں نے بھی ابتدا ہی سے ایک نہایت جذباتی نعرے یعنی ''حب اہلِ بیت'' کے پردے میں دین حقانی کے بیخ و بن اکھاڑ دینے کی کوششیں کی ہیں اور مسلسل کر رہے ہیں۔

کچھ زیادہ افسوس اور تشویش کی بات نہیں تھی اگر مذہب تشیع کی بیہودہ رسومات اور واہیات عقائد و خیالات صرف اہل تشیع ہی تک محدود رہتے۔ مگر افسوس کا مقام یہ ہے کہ شیعیت کے جراثیم دانستہ اور نادانستہ طور پر اور کچھ حالات کی نامساعدت سے ہمارے اندر جگہ پکڑے ہوئے ہیں اور ان کی جڑیں اتنی گہری ہو چکی ہیں کہ عام لوگ تو کیا خواص بھی ان جراثیم کا ادراک اور شناخت بمشکل ہی کر پاتے ہیں۔ اور جب بات بحث کی یا عملی مقاطعہ کی آتی ہے تو اسلامی اخوت و بھائی چارگی کے خوشنما عنوان میں لپیٹ کر احقاقِ حق کی روایت کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے۔

عشرہ ماہ محرم الحرام تو شیعیت کی نشو و نما اور اس کے زہریلے جراثیم کے پھیلاؤ کا سالانہ سیزن اور موسم ہے۔ جس میں اپنے کو سنی کہنے والے بیشتر مسلمان شیعیت کی تحریک میں عملاً شریک ہو کر گناہ بے لذت کا ارتکاب کرتے ہیں اور بیہودہ خلافِ عقل و نقل نظریات و رسومات کو عبادت سمجھ کر اپنی جہالت و نادانی کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ اور پھر طرہ یہ کہ ان رسومات پر عمل اور اصرار وہ گروہ سب سے زیادہ کرتا ہے جو اپنے آپ کو سنیت کا ٹھیکیدار ثابت کرنے میں دن و رات آسمان و زمین کے قلابے ملاتا رہتا ہے۔ ان کھلی ہوئی بدعات و منکرات اور اعمال شرکیہ پر نہ اس کی رگِ حمیت پھڑکتی ہے۔ اور نہ ہی تکفیری توپ گولہ زن ہوتی ہے۔ تعزیوں کی بناوٹ ہوتی ہے۔ ان سے منتیں باندھی جاتی ہیں۔ ان کا طواف کیا جاتا ہے۔ تعزیہ کے نیچے سے نکلنا باعث سعادت سمجھا جاتا ہے۔ کربلا میں پانی کی مشکیں ڈلوائی جاتی ہیں۔ محرم کا کڑا پہنا جاتا ہے محرم کے مہینہ میں شادی اور خوشی کی تقریبات ناجائز سمجھی جاتی ہیں۔ کالا لباس زیب تن کیا جاتا ہے۔ اور جاہل عوام کو یہی باور کرایا جاتا ہے کہ دین انہی خرافات کا نام ہے۔ نماز پڑھیں یا نہ پڑھیں، روزہ رکھیں یا نہ رکھیں کوئی اور

دین کا کام ہو یا نہ ہو مگر محرم ضرور ضرور وشور سے منایا جائے۔ یہ ایک عام رجحان بن گیا ہے۔ علماء سوء کا ایک طبقہ در پردہ شیعیت سے گٹھ جوڑ کر کے ان رسومات کی اشاعت میں مثالی کردار ادا کرتا رہا ہے۔ جس سے شیعیت کے مردہ اور مستور بدن میں کچھ نہ کچھ جان اور رمق پڑتی رہتی ہے۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ امت نے جس طرح قادیانیت کو خارج اسلام سمجھ کر اس سے مقاطعہ کر رکھا ہے۔ اسی طرح شیعیت کو بھی اپنے باطل عقائد کی پاداش میں اسی انجام سے دوچار نہ ہونا پڑتا۔ یہی مداہنت اور ڈھیل شیعیت کے پنپنے کا ذریعہ بنی ہے۔ اور اسی لاپرواہی نے نوبت یہاں تک پہنچائی ہے کہ آج اگر کوئی عوام میں تکفیر شیعہ کا اظہار کرتا ہے تو اسے متشدد قرار دے کر اس کی بات سنی اَن سنی کر دی جاتی ہے۔

ماہ محرم میں شیعوں کی جانب سے سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت پر ماتم کا جو ڈھونگ رچایا جاتا ہے وہ بھی درحقیقت اپنے مکروہ چہرے کو چھپانے کا ایک حربہ ہے۔ حضرت حسینؓ کی رفعت وعظمت کا کوئی منکر نہیں۔ وہ نواسۂ رسولؐ ہیں۔ وہ نوجوانان جنت کے سردار ہیں۔ وہ جگر گوشۂ فاطمہؓ وعلیؓ ہیں۔ انھوں نے عزیمت پر عمل کے وہ تابندہ نقوش تاریخ کے صفحات پر ثبت کیے ہیں جن کی مثال پیش کرنے سے دنیا عاجز ہے۔ ان کی شہادت کا واقعہ یقیناً المناک بھی ہے، دردناک بھی ہے، ظلم کی بدترین مثال بھی ہے اور تعصب وہٹ دھرمی اور نشۂ اقتدار کا بدترین مظاہرہ بھی۔ مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس واقعہ پر مروّجہ ماتم اور سینہ کوبی کیا اسلام کی تعلیم ہے؟ اور کیا تاریخ اسلام میں اس سے بھیانک اور دردناک واقعہ کوئی اور پیش نہیں آیا؟ بعد کے لوگوں کو چھوڑیئے کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایسے واقعات پیش نہیں آئے جن کو ماتم کے لئے یادگار بنایا جائے؟ طائف میں آپ کے اقدام مبارکہ کا لہولہان ہونا، احد میں آپ کے دندان مبارکہ کا شہید ہونا۔ آپ کے چہرۂ انور کا زخمی ہونا اور ان کے خون سے زمین کا رنگین ہونا، کیا مومن کے لئے باعث رنج والم نہیں ہے؟ پھر آپ کا اس دنیا سے پردہ فرمالینا کیا ماتم کا سبب نہیں ہے؟ کیا

اس سے بھی بڑھ کر امت کے لئے کوئی حادثہ ہوسکتا ہے کہ نبی اس کے درمیان سے تشریف لے جائیں؟ حضرت پیرانِ پیر سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں:

> ''اگر حضرت حسینؓ کی شہادت والے دن کو غم واندوہ کا دن بنانا جائز ہوتا تو اس سے کہیں زیادہ حقدار دوشنبہ کا دن ہے کہ اس روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے وفات پائی۔'' (غنیۃ الطالبین مترجم ص ۵۰۷)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی اسلامی تاریخ وقتاً فوقتاً ایسے المناک حادثوں سے دو چار ہوتی رہی جنھوں نے پوری امت کو ہلا ڈالا۔ چلتی زندگی کی نبضیں رُک گئیں۔ اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ کیا عین زمانۂ تعمیر دین میں خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات کا صدمہ اس لائق نہ تھا کہ امت اس فرزند اسلام کی یاد میں ماتم کر کے گرم گرم آنسوؤں سے ہر سال اس کو عقیدت کے پھول پیش کرتی۔ اسی طرح کیا اسی ماہ محرم ۲۴ھ کی وہ سیاہ تاریخ (یکم محرم) غم واندوہ کے اظہار کا سبب نہیں جب مجوسی شقی ابولولو نے اپنا زہریلا خنجر سیدنا حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے جسم مبارک میں پیوست کر کے ملت اسلامیہ پر آزمائش کے دروازے کھول دیئے تھے۔

کیا امیر المومنین سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی دردناک شہادت ایسی تھی کہ اسے فراموش کر دیا جائے؟ کیا ان کو قتل کرنے والے شقی اور بدنصیب یزید کی فوج سے کم ظالم تھے؟ کیا ان کا محاصرہ اور ان کی بے چارگی سیدنا حضرت حسینؓ سے کم درجہ کی تھی؟ الغرض کس کس حادثہ اور صدمہ کا نام گنایا جائے جو امتِ مسلمہ کے ساتھ پیش آتے رہے؟ ۷۰ صحابہؓ کا یکبارگی بہیمانہ قتل، سید الشہداء حضرت حمزہؓ کی شہادت، امیر المومنین حضرت علیؓ کی شہادت وغیرہ۔ مگر سلف صالحین اور حقیقی غم گساروں نے کبھی ان کے غم کے لئے مجلس منعقد نہیں کی، سینہ کوبی نہیں کی، ہائے واویلا نہیں مچائی۔ اس لئے کہ دین کی تعلیم میں اس طرح کی لغویات کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ کیونکہ دین کی نظر میں اور قرآن کے الفاظ میں شہادت زندگی ہے اس سعادت کے حصول پر غم کرنا دین کی تعلیمات کا

مذاق اڑانا ہے اور کسی کی شہادت پر ماتم اس کی تعظیم نہیں بلکہ کھلی ہوئی توہین اور اس کی روح کے لئے حد درجہ اذیت کا باعث ہے۔

اس مضمون کے مخاطب شیعہ نہیں ہیں بلکہ وہ سادہ لوح مسلمان ہیں جو اپنی لاعلمی کے باعث شیعیت کے دام تزویر میں پھنس کر ان باطلانہ رسومات کو اختیار کئے ہوئے ہیں جن کا دین اور شریعت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آج ضرورت ہے کہ ہم اپنی ڈگر بدلیں، عقیدے میں تصلب پیدا کریں اور سلف صالحین کے مطابق اپنی زندگی اپنائیں اللہ تعالیٰ سے رشتہ جوڑیں۔ تعزیہ پرستی اور قبر پرستی کے جالوں سے نکل کر وحدہٗ لاشریک لہٗ کی احد اور صمد ذات پر توکل اور اعتماد کریں اور ماہ محرم میں خاص کر درجِ ذیل امور کا التزام کریں۔

(۱) شیعوں کی یا ان کے ہمنواؤں کی کسی مجلس شہادت وغیرہ میں ہرگز ہرگز شرکت نہ کریں۔ ان میں شرکت بھی گناہ کے کاموں کی اعانت کرنا ہے اور مجالس کی رونق بڑھانا ہے۔

(۲) ماتمی جلسوں اور تعزیوں میں شرکت کر کے غیر اسلامی فرقہ کی رونق بڑھانے کا ذریعہ نہ بنیں۔

(۳) معمول کے مطابق کپڑے پہنیں، کالے رنگ کا التزام نہ کریں۔

(۴) بااثر افراد اس مہینہ میں تقریبات کا اہتمام کرنے سے گریز نہ کریں۔ تاکہ ان دنوں کی جو نحوست عوام میں مشہور ہوگئی ہے اس کی تردید ہو سکے۔

(۵) ایصال ثواب کے لئے نہ تو کوئی طریقہ متعین ہے اور نہ کوئی خاص دن لہٰذا سال میں صرف محرم کی ۸/۹/۱۰ تاریخ کو حضرت حسینؓ کے ایصال ثواب کے لئے خاص کر لینا اور ان ایام میں ریا و نمود کے لئے بیش از بیش کھانا پکانا بدعت ہے اس سے اجتناب کریں۔

(۶) دسویں محرم کو کھچڑا پکانا شرعاً بے اصل ہے۔ اس تاریخ کو صرف دو عمل سنت سے ثابت ہیں۔ ایک روزہ، دوسرے وسعتِ طعام۔ لہٰذا اس مقررہ تاریخ کو عبادت سمجھ کر نہ تو کھچڑا پکانا چاہئے اور نہ اسے دوسرے سے قبول کرنا چاہئے۔

(۷) عشرہ محرم میں شیعوں کے پروگرام کے برخلاف سیرت صحابہؓ کے عنوانات پر علماء کرام سے تقریریں کرائیں اور شیعیت کے چھپے ہوئے مکروہ چہرے کی نقاب کشائی کریں۔

دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری اصلاح فرمائے اور ہر طرح کے فتنوں سے ہماری حفاظت فرمائے۔آمین۔

(ندائے شاہی، جولائی ۱۹۹۲ء)

عزاداری پر اصرار کیوں؟

لکھنؤ میں بیس سال سے عزاداری کے جلوس پر لگی پابندی کے خلاف شیعہ فرقہ کی تحریک کی تائید میں بہت سے سنی عوام وخواص بھی دانستہ یا نادانستہ طور پر میدان میں آ گئے ہیں اور ہر طرف سے یہ آواز آ رہی ہے کہ عزاداری مسلم اقلیت کا قومی حق ہے۔ اور لکھنؤ میں اس پر پابندی سے بنیادی حقوق کی پامالی ہو رہی ہے۔ لہٰذا عزاداری کے جلوس پر سے پابندی ہٹا دینی چاہئے۔ لکھنؤ کے علاوہ دیگر شہروں میں بھی شیعہ سنی یکجہتی کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے۔ اور یہ تاثر دیا جا رہا ہے کہ پابندی نہ ہٹی تو پورے ملک کے مسلمان سراپا احتجاج بن جائیں گے۔ مگر اس معاملہ میں کوئی حتمی رائے قائم کرنے سے قبل چند قابل غور امور پر توجہ دینی ضروری ہے:

عزاداری گناہ ھے :

(الف) عزاداری کی مروجہ جلوس نہ صرف اہلِ دیو بند بلکہ فرقۂ بریلویہ کے نزدیک بھی ناجائز اور گناہ ہیں۔ (دیکھئے فتاویٰ رضویہ اعلیٰ حضرت، و بہار شریعت ۱۶/ ۲۴۷ مصنفہ مولوی امجد علی بریلوی) اور خود مذہب شیعہ میں بھی محققین کے نزدیک ان جلوسوں کی ایجاد کھلی ہوئی بدعت اور شیعیت کے لئے باعث عار ہے۔ (دیکھئے مشہور شیعہ عالم ڈاکٹر موسیٰ موسوی کی کتاب ''الشیعۃ والتصحیح'' ترجمہ اُردو ۱۳۰) بلکہ شیعیت کی معتبر کتابوں ''فروع کافی'' اور ''جلاء العیون'' وغیرہ میں امام محمد باقرؒ اور امام جعفر صادقؒ کے حوالہ سے صاف طور پر نوحہ اور گریہ وغیرہ کی ممانعت منقول ہے۔ اس لئے اس معاملہ میں اولاً قابل غور بات یہ ہے کہ جو جلوس اور ماتم تینوں مکاتب فکر کی نظر میں قابل اعتراض ہے اس کے نکلوانے پر آخر اتنا اصرار کیوں کیا جا رہا ہے؟ کہیں اس کے پس پردہ کوئی اور مقصد تو

کارفرما نہیں؟ دراصل یہ جلوس شیعی سیاست کا جزو ہیں تاکہ محبت اہل بیتؓ کے خوبصورت عنوان پر سنّیوں کو اپنے ساتھ ملا کر ان میں رافضیت کے زہریلے جراثیم کی پرورش کی جائے۔ چنانچہ ایرانی انقلاب کے بعد شیعوں کے روحانی پیشوا آیت اللہ خمینی نے ایک خطبہ میں اعلان کیا تھا کہ ''ہمارا یہ گریہ (رونا دھونا) سیاسی، اجتماعی اور نفسیاتی مسئلہ ہے۔ یہ صرف اس لئے ہے کہ یہ گریہ کے اجتماعات ہمارے مذہب کی حفاظت کرتے ہیں۔

(ہفت روزہ شیعہ لاہور اربعین نمبر یکم تا ۸؍جون ۱۹۸۰ء بحوالہ ماہنامہ ''حق چاریار'' مئی ۱۹۹۷ء)

خمینی صاحب کے اس بیان سے صاف معلوم ہوا کہ ان جلوس کے پیچھے شیعیت کی تبلیغی سیاست کارفرما ہے۔ اسی وجہ سے برسرعام عزاداری پر اصرار کیا جارہا ہے۔ اب شیعوں کی ہاں میں ہاں ملانے والے مصلحت کیش سنی حضرات خود ہی غور کریں کہ اس رافضی سیاست کی تائید کہاں تک مناسب ہے۔

تحقیق ضروری ہے :

(ب) اس معاملہ میں شیعوں کی یکطرفہ تائید سے قبل یہ تحقیق بھی ضروری ہے کہ آخران جلوسوں پر پابندی کیوں لگائی گئی تھی؟ اس کی کیا وجوہات تھیں؟ اور کیا اب وہ وجوہات ختم ہوگئیں؟ جس کی وجہ سے پابندی ہٹانے کی بات کی جارہی ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ عرصہ دراز سے لکھنؤ میں عزاداری کے جلوس میں شیعہ عقیدہ کی بنیاد پر شہادت نامہ وغیرہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ حضرات صحابہؓ پر برسرعام تبرا بھی پڑھا جاتا تھا۔ اور سیدنا حضرت معاویہؓ، ام المومنین حضرت عائشہؓ اور خلفاء ثلٰثہؓ کے بارے میں نہایت مغلظات بکی جاتی تھیں۔ ان جلوسوں میں سنّی عوام بھی بہت بڑی تعداد میں شرکت کرتے تھے اور ناواقفیت کی وجہ سے حضرات صحابہؓ پر تبّرا میں شریک ہوجاتے تھے۔ اور رفتہ رفتہ غیر محسوس طور پر شیعیت کے زہریلے جراثیم سنیوں میں سرایت کرتے جاتے تھے۔ علماء اہل سنّت والجماعۃ بالخصوص امام اہل سنّت حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنویؒ اور ان کے رفقاء نے اس سازش کا بروقت احساس کیا۔ اور اپنے سنّی بھائیوں کو تبّرا کے جرم عظیم سے بچانے اور ان کے دین وایمان کی

حفاظت کے لئے مدح صحابہ کے جلسوں اور جلوسوں کا اہتمام کیا۔ تا کہ سنّی عوام تبرا کی مجلسوں سے دور ہیں۔ اور مدح صحابہ کے پروگراموں میں شریک ہو کر حضرات صحابہؓ سے سچی محبت کا ثبوت دیں۔ مگر وہ تبرائی شیعہ جو سالہا سال سے لکھنؤ کی سڑکوں اور شاہراہوں پر حضرات صحابہؓ کی عظمت کو داغدار کرتے آئے تھے۔ وہ بھلا مدح صحابہؓ کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ چنانچہ انگریز گورنمنٹ سے مدحِ صحابہؓ کے جلوس پر پابندی لگوادی۔ ظاہر ہے کہ یہ بات قطعاً غیر معقول اور غیر آئینی تھی۔ اس لئے سنیوں کے مسلسل احتجاج کے بعد ۱۹۳۹ء میں مجبور ہو کر حکومت نے مدح صحابہؓ پر سے پابندی اٹھالی اور سنّیوں کا منصفانہ حق تسلیم کرلیا۔ لیکن حکومت کی اس اجازت کے ردِ عمل میں شیعوں نے جس رذالت کا ثبوت دیا ہے وہ خود شیعیت کی تاریخ کا سیاہ باب ہے۔ ہفتوں تک شیعہ فرقہ کے لوگ لکھنؤ کی سڑکوں پر خلفائے ثلٰثہ رضی اللہ عنہم کو برملا گالیاں دے کر گرفتاریاں دیتے رہے۔ اور مدح صحابہؓ پر پابندی لگوانے کا مطالبہ کرتے رہے، بہرحال ان کی تحریک کامیاب نہ ہوسکی اور حکومت نے مدح صحابہؓ پر روک نہیں لگائی۔ حکومتی سطح پر ناکامی کے بعد بغض صحابہؓ کے جوش میں شیعوں نے تشدد کا راستہ اپنایا۔ اور شیعہ اور سنّیوں کے درمیان بار بار ٹکراؤ کی نوبت آتی رہی۔ بھیانک فسادات ہوئے اور سالوں محرم کے موقع پر سخت کشیدگی کے حالات پیدا ہوتے رہے۔ جس سے تنگ آ کر حکومت کی نگرانی میں آج سے بیس سال قبل شیعہ اور سنّی بااثر علماء نے مل کر یہ معاہدہ طے کیا کہ:

> ''اب یہاں عزاداری یا مدح صحابہؓ کسی طرح کے جلوس نہیں نکلیں گے البتہ شیعہ اپنے امام باڑوں میں مجالس منعقد کریں یا سنّی کسی جگہ مدح صحابہؓ کے جلسے کرلیا کریں تا کہ ٹکراؤ کی نوبت نہ آئے۔''

اس معاہدہ کے ذریعہ شیعہ سنّی خون خرابہ بند ہوا اور پھر ان دونوں فرقوں میں کسی بڑے فساد کی نوبت نہیں آئی۔ اس پس منظر میں یہ کہنا کہ حکومت نے عزاداری پر پابندی لگا کر مسلمانوں کا کوئی قانونی حق چھین لیا ہے۔ بالکل بے معنی ہے۔ کیونکہ یہ پابندی حکومت کی طرف سے نہیں بلکہ لکھنؤ

کے امن پسند شہریوں نے نقض امن کے اندیشہ سے لگائی ہے۔ اور یہ اندیشہ آج بھی اسی طرح موجود ہے جس طرح آج سے بیس سال قبل تھا۔ کیونکہ شیعہ اپنی جبلت کے مطابق نہ تو تبرا سے باز آسکتے ہیں اور نہ ہی وہ اتنے وسیع الظرف ہیں کہ آسانی سے مدح صحابہؓ کو برداشت کرلیں اور جب تک یہ بات رہے گی ٹکراؤ بدستور موجود رہے گا۔ اس لئے فساد کی بنیاد باقی رہتے ہوئے جلوسوں پر سے پابندی ہٹانے کا مطالبہ کرنا امن کی نہیں بلکہ فساد انگیزی کی دلیل ہوگا اور کسی طرح بھی مناسب نہ ہوگا۔

یہ تفریق کیوں ؟ :

(ج) تیسری انتہائی قابل غور بات یہ ہے کہ جلوس عزاداری کی وکالت کرنے والے یہ یوں کہہ رہے کہ عزاداری کی تو اجازت دی جائے مگر مدح صحابہؓ کے جلوسوں کی بالکل اجازت نہ ہو۔'' ان دونوں میں تفریق کی کیا وجہ ہے؟ اگر تعزیہ پر پابندی خلاف قانون ہے تو کیا مدح صحابہؓ پر پابندی جاری رہنا خلاف آئین نہیں ہے؟ اس پر یہ کہا جاتا ہے کہ مدح صحابہؓ کے جلوس خود سنیوں کے نزدیک ممنوع ہیں۔ حالانکہ یہ بات اس عموم کے ساتھ صحیح نہیں ہے۔ محبتِ صحابہؓ ایمان کی اہم ترین علامت ہے اور جب برسر راہ بغضِ صحابہؓ کا اظہار کیا جائے تو پھر اسی انداز میں مدح صحابہؓ کر کے ایمانی حمیت کا اعلان بھی ضروری ہوجاتا ہے۔ اس لئے لکھنؤ کے مخصوص حالات کے تناظر میں یہ کہنا کہ یہ جلوس ممنوع ہیں محض تلبیس ہے۔ اور یہ شوشہ صرف اس لئے چھوڑا گیا ہے تاکہ سنی عوام کو اپنی عزاداری اور تبرا میں شرکت پر آمادہ کیا جاسکے۔

اجازت کا بھانہ :

(د) بعض شیعہ مجتہدین نے اعلان کیا ہے کہ تبرا کرنا حرام ہے اس لئے اس شرط پر عزاداری کی اجازت دی جائے کہ اس میں تبرا بازی نہیں ہوگی۔ لیکن یہ اعلان قطعاً نا قابل اعتبار اور جلوس کی اجازت حاصل کرنے کے لئے محض تقیہ پر مبنی ہے۔ اس لئے کہ بغض صحابہ اور تبرا ہی پر تو مذہب شیعہ کا مدار ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو اس مذہب کی پوری عمارت ہی زمین پر آرہے۔ کسی بھی شیعہ مجتہد کو اپنے

مذہب کی رو سے تبّرا کو ممنوع قرار دینے کا حق ہی نہیں ہے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو اپنے مذہب کی تکذیب کرنے والا ہوگا۔ چنانچہ تحریک تبرا، ۳۹ء کے زمانہ میں شیعوں کے ترجمان اخبار ''اسد'' نے لکھا تھا۔ جس طرح کلمۂ توحید کے بغیر کوئی مسلمان نہیں ہوسکتا اسی طرح بغیر تبرّے کے کوئی شیعہ نہیں ہوسکتا۔'' (اخبار اسد ۱۳/اپریل ۳۹ء) تو جو چیز شیعوں کی نظر میں کلمہ اسلام کے درجہ میں ہو اسے بھلا کوئی مجتہد کیسے منع کرسکتا ہے۔ علاوہ ازیں شیعوں کی مذہبی کتابیں صحابہؓ پر کذب وافتراء اور مغلظات سے بھری ہوئی ہیں۔ خاص کر حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کے متعلق ان کی غلیظ ذہنیت کیا ہے؟ اس کا کچھ اندازہ دریدہ دہن مصنف ملا باقر مجلسی، اور اتحاد اسلامی کے نام نہاد علمبر دار آیت اللہ خمینی کی تصانیف سے لگایا جاسکتا ہے۔ اس لئے بظاہر ناممکن ہے کہ شیعہ عزاداری کا جلوس نکالیں اور اس میں کسی نہ کسی طرح تبّرا بازی نہ ہو۔ ہوسکتا ہے کہ جلوس کے قائدین بطور تقیہ اس بارے میں احتیاط کرلیں لیکن شیعہ عوام جن کی گھٹی میں ''بغض صحابہؓ'' پڑا ہوا ہے۔ وہ بغیر تبّرا کے کیسے رہ سکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ اگر ایسا ہوتا ہے تو پھر سنّی عوام بھی خاموش نہیں رہ سکتے۔ سنیوں کی ایمانی حمیت ابھی اتنی مردہ نہیں ہوئی ہے کہ وہ اپنے جلیل القدر اور عظیم المرتبت رہنمایانِ دین کی شان اقدس میں گستاخیوں کو سن کر اَن سنی کرتے رہیں، بلکہ دین کے ان باعظمت ستونوں کی عزت کے دفاع میں ہر صاحبِ ایمان ہر طرح کی قربانی دینے کے لئے تیار رہے گا۔ اس صورت حال میں خود ہی غور فرمائیں کہ کیا عزاداری کے جلوس نکلوانے کا مطالبہ لکھنؤ کے بیس سالہ امن کو غارت کرنے کا عنوان نہیں ہے؟ تو پھر اس کی حمایت کے کیا معنی؟

افسوسناک رویّہ :

(ہ) ''ملی اتحاد'' اور ''قومی یکجہتی'' کے پرفریب نعروں کا سہارا لے کر جو سنی عوام وخواص اس معاملہ میں یکطرفہ طور پر شیعوں کی سُر میں سر ملا رہے ہیں، ان کا یہ رویہ سخت افسوسناک اور سمجھ سے بالا تر ہے۔ کیا انھیں معلوم نہیں کہ حضرات صحابہؓ سے محبت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا عنوان ہے۔ اور حضرات صحابہؓ سے بغض وعداوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دشمنی کی دلیل ہے۔ اور

شیعوں کی صحابہ دشمنی دو اور دو چار کی طرح واضح ہے۔ پھر بھی دشمنان صحابہ کا محض مصلحت کا خیال کرتے ہوئے ساتھ دینا ''ملی اتحاد'' نہیں، بلکہ ''ملی انتشار'' کا ذریعہ ہے۔ اگر انھیں واقعی دین سے محبت تھی تو اولاً نہ صرف لکھنؤ بلکہ پورے ملک سے تعزیہ داری کی نامعقول اور بے اصل رسومات کو ختم کرنے کے لئے میدان میں آتے۔ چہ جائیکہ جہاں نقض امن کے اندیشہ سے تعزیوں پر پابندی لگی ہوئی ہے اسے ہٹانے کے لئے ہاہا کار مچانے کی تائید کی جائے؟ یا کم از کم انصاف کی رمق ہوتی تو یہ کہتے کہ ہر طرح کے جلوس پر سے پابندی اٹھالیں چاہے عزاداری کا ہو یا مدح صحابہ کا، پھر چاہے جو انجام ہوتا۔ لیکن مدح صحابہؓ کے جلوسوں کا انکار اور تعزیہ کی تائید دین کے معاملہ میں ان کی کھلی ہوئی مداہنت کی دلیل ہے۔ ایسے لوگوں کو اپنی عاقبت کی فکر کرنی چاہیئے۔ کہیں اس ضلالت و گمراہی کی پاداش میں انھیں اللہ کے فرشتے حوضِ کوثر پر حاضری سے محروم نہ کردیں۔ (**اعاذنا اللّٰہ منه**) اب بھی وقت ہے ایسے صلح کل قسم کے لوگ ہوش میں آئیں۔ اور اہل حق کے ایمان کا امتحان نہ لیں۔ اللہ تعالیٰ ہر کفر و ضلال سے ہماری حفاظت فرمائے۔ آمین۔

(ندائے شاہی، اگست ۱۹۹۷ء)

ایمان کا تحفظ

آج سے آٹھ سال قبل ۱۹۸۶ء میں جب دارالعلوم دیوبند میں کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت کی داغ بیل ڈالی گئی تھی تو بہت سے لوگوں نے اسے ''ایک بے ضرورت اقدام'' سے تعبیر کیا تھا۔ لیکن جوں جوں وقت گذرتا گیا اکابر کی مخلصانہ دوراندیشی پر مہر تصدیق ثبت ہوتی گئی لوگ سمجھتے تھے کہ تقسیم ہند کے بعد قادیانی نبوت کا زہریلا پٹارہ اپنے سنپولیوں سمیت ہندوستانی سرزمین کو اپنے وجود سے پاک کر گیا ہے اور ''ربوہ'' جیسے ''مقدس دارالہجرۃ'' سے اب کبھی اس کی ہندوستان واپسی نہ ہوگی۔ مگر بعد کے حالات نے لوگوں کے خیال کو ''خام خیالی'' ثابت کر دکھایا اور جب ۱۹۸۴ء میں جنرل ضیاءالحق کے صدارتی آرڈیننس نے پاکستان میں قادیانیوں (احمدیوں) کی آزادی پر قدغن لگایا اور ان کے چوتھے پیشوا مرزا طاہر نے دیرینہ آقائے قادیانیت ''برطانیہ'' کی گود میں جا کر پناہ لی اور اسلام دشمن دسیسہ کاریوں کی مدد سے لندن میں اپنا ہیڈ آفس قائم کیا تو اس فرقہ نے دیگر ملکوں کے علاوہ خاص طور پر ہندوستان میں بھی اپنے بال و پر پھیلانے شروع کر دیئے۔ صرف ہندوستان میں کام کرنے کے لئے کروڑوں روپیہ کا بجٹ بنایا گیا، پلان منظور گئے۔ منصوبے بنائے گئے۔ بڑے بڑے شہروں میں شاندار مراکز قائم کئے گئے۔ ہر زبان میں لٹریچروں کا انبار لگا دیا گیا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ایک رپورٹ کے مطابق آج ملک کے طول وعرض میں قادیان کی جھوٹی نبوت کے ایک سو ساٹھ مراکز قائم ہیں۔ ایک لاکھ سے زائد مسلمان قادیانیوں کے دامِ فریب میں آچکے ہیں۔ اور ملک کی مختلف زبانوں میں تقریباً پندرہ رسالے اور جریدے احمدیت کی تبلیغ و اشاعت کے لئے وقف ہیں۔ عیسائی مشنریوں کی طرح احمدیوں نے بھی اپنی تبلیغ کا نشانہ علم سے ناآشنا آبادیوں کو بنا رکھا ہے اور ساتھ میں غریبوں کی غربت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دنیوی مال و

دولت کا لالچ دے کر سادہ لوح مسلمانوں کے ایمان کو لوٹا جا رہا ہے۔ پنجاب، ہریانہ، راجستھان، یوپی کے بعض پسماندہ علاقے، بہار، بنگال، آسام، اور جنوبی ہند کے وہ علاقے جہاں علماء کی آمدورفت کم ہے، اسی طرح مہاراشٹر کے دور دراز علاقے اس وقت خاص طور پر قادیانیت کی زد میں ہیں اور ان کی سرگرمیاں برابر بڑھتی جا رہی ہیں اور میدانی علاقوں میں بھی در پردہ ان کی تبلیغ مختلف عنوانوں سے جاری ہے۔

جنوری ۱۹۹۴ء سے قادیانیوں نے لندن میں ''مسلم ٹیلی ویژن'' کے نام سے ایک سیٹیلائٹ اسٹیشن قائم کیا ہے جس سے ڈش انٹینا کے ذریعہ دنیا بھر میں قادیانی پروگرام نشر کئے جاتے ہیں۔ ۱۳۷ ملکوں میں اس جماعت کے مراکز قائم ہیں جن سے ڈیڑھ کروڑ افراد وابستہ ہیں۔ متعدد ممالک میں قادیانی مذہبی اسکولوں کی تعداد ۳۰۶ تک پہنچ گئی ہے جن کے ذریعہ معصوم بچوں کی ''برین واشنگ'' (دماغ کی صفائی) کا کام انجام دیا جا رہا ہے۔ اور تو اور احمدیوں نے دنیا کی تقریباً سو زبانوں میں قرآن کریم کا من گھڑت ترجمہ شائع کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ جن میں سے پچاس زبانوں کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے اور بقیہ پر کام جاری ہے۔ الغرض سیدھے سادے مسلمانوں کو دام تزویر میں پھنسانے کے لئے قادیانی وہ تمام وسائل اور ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں جو اس وقت جدید دنیا میں متصور ہیں حقوق انسانی کی نام نہاد محافظ بین الاقوامی تنظیمیں برابر اپنی رپورٹوں میں قادیانیوں پر مظالم اور مذہبی افتراق کی دہائی دیتی رہتی ہیں۔ آئے دن اخبارات میں ایسی خبریں شہ سرخیوں کے ساتھ شائع کی جاتی ہیں کہ مسلم معاشرہ اور خاص کر پاکستان میں ''احمدی جماعت'' پر ظلم ہوتا ہے اور ان کے ساتھ امتیاز برتا جاتا ہے۔ یہ جھوٹا پروپیگنڈہ بھی دراصل قادیانی شعبۂ تبلیغ کا ایک ہتھکنڈا ہے تاکہ عوام کے سامنے مظلومیت ثابت کر کے اپنے لئے نرم جذبات ان کے دل میں پیدا کئے جا سکیں۔

قادیانیت یا احمدیت اب صرف ایک فرقہ ہی کا نام نہیں رہ گیا بلکہ یہ دراصل اسلام دشمنی کا ایک پلیٹ فارم بھی بن گیا ہے۔ دنیا کی ہر اسلام دشمن طاقت اور تنظیم قادیانیوں کی پشت پناہی کرتی ہے۔ اسی بنا پر ان کے لئے تبلیغ کے سبھی راستے بلا کسی روک ٹوک کے کھلے ہوئے ہیں۔ ان کا خلیفہ جب کسی غیر مسلم ملک کا دورہ کرتا ہے تو حکومتی سطح پر اس کا اعزاز کیا جاتا ہے۔ اس کی حفاظت کے لئے مسلح کمانڈو دیئے جاتے ہیں۔ چنانچہ دو سال قبل مرزا طاہر کے ہندوستان آمد کے موقع پر یہی سب کچھ ہوا۔ یہ لوگ پوری قوت کے ساتھ اسلام دشمنی کے بیج بوتے ہیں۔ قرآن کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ احادیث شریفہ کے ساتھ استہزاء کرتے ہیں۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کے ساتھ گستاخی کو روا رکھتے ہیں۔ صحابہؓ کی عظمت پر بٹہ لگاتے ہیں۔ اور اس کے برخلاف دجالِ قادیان مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت مسیحیت اور مہدویت کا ڈنکا پیٹتے ہیں۔ قادیان کے سالانہ جلسے کی شرکت کو حج کا نام دیتے ہیں۔ قادیانی کے راست مریدوں کو نعوذ باللہ صحابہ اور اس کی بیویوں کو ام المومنین کا لقب دیتے ہیں۔ قادیانیوں کے نزدیک دنیا کے وہ تمام مسلمان پکے کافر ہیں جو قادیانی کذاب کے دام فریب میں نہیں آسکے۔ اور پھر طرہ یہ کہ اپنے آپ کو "سچا مسلمان" بھی کہتے ہیں۔

ہمارے نزدیک اس تحریک کی سب سے بڑی زہرناکی یہ ہے کہ یہ لوگ دیکھنے میں بالکل مسلمانوں کی طرح رہتے ہیں اور ان کے طرز معاشرت کو دیکھ کر عام آدمی یہی یہی سمجھتا ہے کہ یہ بھی کسی اسلامی فرقے سے ہی متعلق ہیں۔ یہی چیز فتنہ میں پڑنے کا سبب بنتی ہے۔ ہماری سب سے بڑی لڑائی قادیانیوں سے یہ ہے کہ جب وہ ہمیں مسلمان نہیں سمجھتے اور ہم بھی انھیں مسلمان نہیں کہتے تو وہ زبردستی کیوں ہم جیسے مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں؟ اور ہمارے کلمہ طیبہ کا کیوں خواہ مخواہ استعمال کرتے ہیں؟ انھیں کیا حق پہنچتا ہے کہ اپنے آپ کو مسلمان ثابت کریں جبکہ وہ اسلام کے بنیادی عقائد سے روگردانی کرنے والے ہیں۔ اگر وہ اپنے کو غیر مسلم کہنے لگیں اور مسلمانوں کے ایمان پر ڈاکہ زنی سے باز آئیں۔ تو ہمیں ہرگز ان سے کسی قسم کا تعرض کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔

جس طرح ہندوؤں، بدھشٹوں سکھوں اور یہود و نصاریٰ سے ہم تعرض نہیں کرتے۔ اسی طرح قادیانیوں کو بھی ہم منہ نہ لگائیں گے۔ ہم درحقیقت ردِ قادیانیت میں سرگرمیاں دکھا کر اپنے ایمان اور عقیدے کا تحفظ چاہتے ہیں۔ ہمیں قادیانیوں کو جہنم رسیدگی سے اتنا سروکار نہیں جتنا اپنے مسلمان بھائیوں کے ایمانی تحفظ کا خیال ہے۔ اور اس تحفظ کا خیال ہر مسلمان کو ہونا چاہئے۔ عقیدۂ ختم نبوت تمام ہی مسلم فرقوں کا بنیادی اور متفقہ عقیدہ ہے کہ اس عقیدہ کی حفاظت میں سر مو کوتاہی کی بھی گنجائش نہیں ہے۔ دنیا کی ہر مصلحت کو اس عقیدہ کے تحفظ پر قربان کیا جاسکتا ہے۔ اور آج فروعی اختلافات اور مسلکی تعصب سے اوپر اُٹھ کر تحفظ ختم نبوت کے لئے میدان میں آنا وقت کی اولین ضرورت ہے۔

الحمد للہ دارالعلوم دیوبند کی کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت نے ایمان کے تحفظ کے سلسلہ میں نمایاں پیش رفت کی ہے اب اس کی خدمات رقیبوں کی نظر میں بھی قابل قدر ہوگئی ہیں اس باطل تحریک سے ٹکرانے اور لوہا لینے کی صلاحیت پیدا کرنے کے لئے ملک کے مختلف متاثرہ علاقوں میں افراد سازی اور علماء اور ائمہ مساجد کی تربیت کا جو عظیم کام مجلس تحفظ ختم نبوت نے ''رد قادیانیت تربیتی کیمپ'' کی صورت میں شروع کیا ہے وہ ماحول کو سازگار بنانے میں نہایت موثر ثابت ہورہا ہے۔ ابھی بھاگلپور کے تاریخی کیمپ اور عدیم المثال اجتماعات کی گونج باقی تھی کہ ابتدائے ستمبر ۹۴ء میں بنگلور میں منعقد ہونے والے شاندار رد قادیانیت کیمپ نے مجلس کی خدمات میں چار چاند لگادیئے۔ یہ بات بڑی خوش آئند رہی ہے کہ اس طرح کے پروگراموں میں سبھی مکتب فکر کے مسلمانوں نے مسلکی تعصّبات سے اوپر اُٹھ کر پورے ذوق وشوق کے ساتھ حصہ لیا ہے۔ بنگلور کے تحفظ ختم نبوت کے کھلے اجلاس میں مؤرخ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا ہوگا کہ ایسے وسیع اسٹیج پر جہاں دارالعلوم دیوبند اور جمعیۃ علماء ہند کے چوٹی کے علماء منصب قیادت پر فائز تھے۔ وہیں رضا خانی تنظیم سنی جمعیۃ العلماء کے سیکریٹری جنرل اور جماعت اہل حدیث کے مقامی سربراہ نیز دیگر فکری

اختلاف رکھنے والوں کے نمائندے بھی ایمان کے تحفظ کے لئے ایک دوسرے کے شانہ سے شانہ ملائے ہوئے بیٹھے تھے اور نہایت جوش وخروش کے ساتھ تحریک کی تائید کررہے تھے۔ اب قادیانیوں کو بھی سمجھ لینا چاہئے کہ مسلمانوں کا یہ بے مثال اتحاد ہندوستان میں ان کی موت کا پیش خیمہ ہے۔ تحفظ ناموس رسالت کے لئے مسلمان ہمیشہ سے بیدار رہے ہیں اور بیدار رہیں گے۔ وہ دن دور نہیں جب ایمان کے لٹیروں کا اور جھوٹی نبوت کے دجل کاروں کا ملک کے قریہ قریہ اور بستی بستی میں تعاقب کیا جائے گا اور ہر صاحب ایمان کے دل میں پوری وضاحت کے ساتھ یہ بات جاگزیں کردی جائے گی کہ قادیانی نبی کے پیروکار، ایمان کے لٹیرے، اسلام دشمنوں کے آلۂ کار، انگریزوں کے سدابہار ایجنٹ، اور دنیا کے بدترین کافر ہیں، تاکہ پھر کبھی کوئی احمدیہ مشن مسلمانوں کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر انھیں گمراہ نہ کرسکے۔ انشاءاللہ العزیز۔

ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ هديتنا وهب لنا من لدنك رحمة.

(ندائے شاہی، اکتوبر ۱۹۹۴ء)

دامن کو ذرا دیکھ

ہندی اخبار ''دینک جاگرن'' ۱۵ ستمبر ۹۵ء میں ملک کے مشہور فرقہ پرست کالم نگار ''ارون شوری'' کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں اسلام کے معاشرتی قوانین اور خواتین کے حقوق پر بحث کرتے ہوئے قرآن و حدیث کے حوالہ سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مذہبِ اسلام عورتوں کے حقوق کو پامال کرنے اور انھیں دوسرے درجہ کا انسان سمجھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ ''ارون شوری'' کی تحریروں کا خاص موضوع اسلام اور مسلمانوں پر کسی نہ کسی انداز سے کیچڑ اچھالنا ہوتا ہے اسی وجہ سے اس کے مضامین ملک کے کثیر الاشاعت ہندی، اُردو اور انگریزی اخبارات میں نہایت اہتمام کے ساتھ شائع ہوتے ہیں۔ ان مضامین سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مضمون نگار کا اسلام اور اسلامی قوانین کے ماخذ پر گہرا مطالعہ ہے۔ چنانچہ اس کی تحریروں میں نہ صرف قرآن وحدیث بلکہ فقہ وفتاویٰ کی اہم کتابوں کے حوالہ جات کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اور وہ ان چیزوں کو ناواقف اور دین سے بے گانہ لوگوں کے سامنے اس انداز سے پیش کرتا ہے کہ گویا اس نے ان تصریحات کے سیاق وسباق اور پس منظر کو اچھی طرح سمجھ کر ہی اسلام کو موردِ الزام ٹھہرایا ہے — حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ کالم نگار کے پیش کردہ ''حقائق، کی بنیاد نصوص شرعیہ میں کتر بیونت اور واقعی صورتحال سے آنکھیں موندنے پر ہوتی ہے۔ کالم نگار قصداً واقعہ کو توڑ مروڑ کر اور آیات واحادیث کو اصل معنیٰ سے ہٹا کر اپنے وضع کردہ معنیٰ کے تناظر میں پیش کر کے غلط فہمی پیدا کرتا ہے اَرون شوری کے مضامین دیکھ کر یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں ہے کہ اس کی پالیسی یہ ہے کہ جھوٹ کو بار بار اتنی کثرت سے بولا جائے کہ لوگ جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ سمجھنے لگیں۔ اس کے

تمام مضامین کی تان انھیں گھسے پٹے اعتراضات پر آ کر ٹوٹتی ہے جو عرصہ دراز سے یوروپ کے مستشرقین اور نام نہاد روشن خیال ملحدین اسلام کے بارے میں پیش کرتے رہے ہیں۔

پیش نظر مضمون میں سب سے پہلے کالم نگار نے اس پر سخت حیرت واستعجاب کا اظہار کیا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق جب طلاق سب سے زیادہ مبغوض چیز ہے تو اسے اس قدر آسان کیوں بنا دیا گیا ہے؟ اور اس کا حق صرف مرد ہی کو کیوں دیا گیا ہے؟ اور اسے مبغوض ہونے کے باوجود نافذ کیسے مانا جاتا رہا ہے؟ اور جب تین طلاق نا قابل نفاذ قرار دینے کی آواز اٹھتی ہے تو یہ شریعت کے حامی کیوں اتنا واویلا مچاتے ہیں؟

طلاق کے بارے میں یہ اعتراضات بالکل سطحی قسم کے ہیں اور صرف اس لئے پیدا ہوئے ہیں کہ کالم نگار نے آنکھوں پر اسلام دشمنی کی پٹی باندھ کر اسلام کے نظام طلاق کا مطالعہ کیا ہے۔ ورنہ کوئی بھی انصاف پسند اور واقعی صورتحال پر نظر رکھنے والا شخص اسلام کے بتائے ہوئے طریقہ پر انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ طلاق کے سلسلہ میں عقلی طور پر پانچ طرح کے قوانین بنانے ممکن ہیں۔

(۱) طلاق کا حق شوہر یا بیوی کسی کو نہ ہو۔ جیسا کہ ماضی قریب تک ہندو مذہب میں اور عیسائی مذہب میں یہ طریقہ اور قانون رائج رہا۔ ظاہر ہے کہ یہ قانون بالکل عمل ہے اور عقل و انصاف سے بعید ہے اس لئے کہ کبھی طلاق ناگزیر ضرورت بن جاتی ہے۔

(۲) دوسرا طریقہ یہ ہے کہ طلاق کا حق شوہر اور بیوی دونوں کو دیا جائے۔ یعنی جب تک دونوں راضی نہ ہوں اس وقت تک طلاق کا وقوع ہی نہ ہو۔ جیسا کہ آج کل ہمارے یہاں کورٹ کی طلاق میں ہوتا ہے کہ اسٹامپ پر دونوں فریق اپنی طلاق کا اقرار کرتے ہیں اس کے بعد ہی طلاق ہوتی ہے اس طریقہ میں ایک بھیانک خرابی یہ ہے کہ جو بھی فریق ظالم ہوگا وہ طلاق کا انکار کر دے گا اور طلاق کا مقصد یعنی مصیبت سے چھٹکارا حاصل نہ ہو سکے گا۔ اور طلاق کا منشا ہی فوت ہو کر رہ جائے گا۔

(۳) تیسرا طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ صرف عورت کو طلاق کا اختیار دیا جائے اور مرد کو محروم رکھا جائے تو اولاً اس میں مرد کو محروم رکھنے کی وجہ کوئی نہیں۔ دوسرے یہ کہ عورت اپنی شتابی طبیعت اور منفعل المزاجی کے سبب اس اختیار کو ایسی بے دردی سے استعمال کرے گی کہ کوئی بھی عقدِ نکاح برقرار ہی نہ رہ سکے گا جیسا کہ یورپ میں جب کسی بیوی صاحبہ کا جی چاہتا ہے شوہر صاحب کو داغ مفارقت دی جاتی ہیں۔

(۴) چوتھا طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ عورت اور مرد دونوں کو علی الاطلاق اختیار دیا جائے۔ تو اس میں بھی طریقہ تین کی خرابی پائی جاتی ہے۔

(۵) پانچواں عقلی طریقہ یہ ہے کہ طلاق کا اختیار مرد کو دے کر اسے اخلاقی طور پر کچھ پابند بنا دیا جائے یہ طریقہ عملی طور پر زیادہ موثر دیرپا اور مفید ثابت ہوا ہے۔ اس لئے کہ مرد نسبتاً عورت سے زیادہ دُور اندیش ہوتا ہے وہ اتنی جلدی حالات سے متاثر نہیں ہوتا۔ جتنی جلدی عورت متاثر ہوجاتی ہے۔ اسلامی شریعت نے صرف عورت ہی نہیں بلکہ مرد کی ضروریات کو بھی مدّ نظر رکھ کر اسی پانچویں طریقہ کو اپنایا ہے جبکہ اسلام پر اعتراض کرنے والے دانستہ یا نادانستہ طور پر طلاق وغیرہ معاشرتی مسائل پر بحث کرتے ہوئے مردوں کی ضروریات اور ان کے حقوق سے بالکل صرف نظر کر جاتے ہیں۔ اور یہی تنگ نظری اور عورت کی بیجا حمایت طرح طرح کے اعتراضات کا سبب بنتی ہے۔ آپ کسی بھی معاشرہ پر نظر ڈال کر دیکھیں ہر جگہ دونوں باتیں نظر آئیں گی۔ کہیں شوہر ظالم اور بیوی مظلوم ہوگی اور کہیں بیوی ظالمہ اور شوہر مظلوم ہوگا۔ اسلام دشمنوں کا سارا واویلا اسی صورت کو فرض کر کے ہوتا ہے جبکہ شوہر ظالم اور بیوی مظلوم ہو۔ اور اسلام دونوں صورتوں کو سامنے رکھتا ہے اسلام کو نہ مرد کی مظلومیت برداشت ہے اور نہ عورت پر ظلم، اسی وجہ سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طلاق کو مبغوض قرار دیا تاکہ انتہائی ناگزیر حالات میں مرد اپنے حق کا استعمال کرے۔ اور خواہ مخواہ عورت پر ظلم کی جسارت نہ کرے اور طلاق کو مبغوض کہنے سے اس کا ناقابل نفاذ ہونا بالکل ثابت نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ الفاظ نبوی یہ ہیں اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَى اللّٰهِ الطَّلَاقُ. (مشکوۃ شریف ص ۲۸۳، ابوداؤد ۱/ ۲۹۶)

یعنی حلال چیزوں میں سب سے ناپسند چیز طلاق ہے معلوم ہوا کہ اصل میں طلاق حلال چیزوں ہی کا ایک فرد ہے اس کے نفاذ یا عدم نفاذ سے یہاں بحث نہیں بلکہ پسندیدہ ہونے یا نہ ہونے سے بحث ہے۔ اور یہ ناپسندیدگی اس لئے ہے تاکہ عورتوں پر مظالم کا سدِباب ہوسکے۔ پھر طلاق خواہ ایک ہو یا تین دونوں ناپسندیدہ ہیں۔ جو لوگ طلاق کو مبغوض قرار دے کر تین طلاقوں کے نفاذ پر اعتراض کرتے ہیں وہ درحقیقت مغالطہ میں مبتلا ہیں اس لئے کہ اگر نفس ناپسندیدگی طلاق کے نفاذ میں مانع ہے تو ایک طلاق بھی نافذ نہ ہونی چاہئے حالانکہ کوئی شخص اس کا قائل نہیں ہے۔ تو جس طرح ناپسندیدگی کے باوجود ایک طلاق واقع ہوجاتی ہے اسی طرح مبغوض اور ممنوع ہونے کے باوجود تین طلاقیں بھی خواہ بیک وقت دی جائیں یا متفرق اوقات میں دی جائیں ہر طرح نافذ ہوجاتی ہیں۔ طلاق کے اسلامی قوانین کسی خاص ملک اور نسل کے لئے نہیں بلکہ آفاقی اور عالمی حیثیت رکھتے ہیں، اور ان میں مرد وعورت کی فطری ساخت اور طبعی تقاضوں کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج بھی مسلم معاشرہ میں (ہزار خرابیوں کے باوجود) دیگر اقوام کے مقابلہ میں طلاق کا تناسب بہت کم ہے۔ اور طلاق دی بھی جاتی ہے تو عورت عزت کے ساتھ میکے جاتی ہے اور پھر اس کی دوسری شادی کا انتظام کیا جاتا ہے جبکہ ''ارون شوری'' اور ان کے ہمنواؤں کی مائیں بہنیں ایسے ہی حالات میں معاشرہ کی ناموافقت کی بنیاد پر یا تو مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگالیتی ہیں یا بددل ہوکر اپنے مذہب ہی کو خیرآباد کہہ دیتی ہیں، کالم نگار پہلے ان کی خبرلیں اس کے بعد آکر ہماری ماؤں اور بہنوں کے بارے میں ٹسوئے بہائیں اپنوں کی حالت زار پر خاموش رہنا اور دوسروں کی حالت پر مگرمچھ کے آنسو بہانا عقلمندی کی دلیل نہیں ہے۔

آگے چل کر کالم نگار جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عظیم محسن خواتین قرار دینے پر اس طرح تبصرہ کرتا ہے۔

''اسلام میں عورتوں کی کل حالت کے سوال پر بھی اسی قسم کا خود ساختہ ردّعمل ہوتا ہے۔ اور ایسے ہی جھوٹ اور نیم سچ باتوں کا سہارا لیا جاتا ہے جیسے ہی اس سوال پر بحث

چھیڑتی ہے حمایتی شور مچانے لگتے ہیں لیکن کسی مذہب نے عورتوں کو اتنا بلند درجہ نہیں دیا ہے جتنا اسلام نے دیا ہے۔ حال ہی میں ایک مصنف نے تو پیغمبر صاحب کو ابھی تک عورتوں کا عظیم ترین حمایتی قرار دیا ہے۔''

اس کے بعد بحث کرتے ہوئے کالم نگار یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ (۱) دورِ جاہلیت میں عورتوں کی بھیانک تصویر چونکہ اسلامی ذرائع ہی سے حاصل ہوئی ہے لہٰذا اس شہادت کا اعتبار نہیں بلکہ اس کے خلاف خود اسلامی لٹریچر میں شہادتیں موجود ہیں مثلاً حضرت خدیجہؓ کا صاحبِ ثروت ہونا اور خود پیغمبر کا ان کے لئے تجارت کرنا۔ (۲) دوسرے یہ کہ اگر پیغمبر اسلام نے بعض حدیثوں میں عورتوں سے اچھائی کا حکم دیا ہے تو بہت سی حدیثوں میں عورتوں کو قیدی، شوہر کی اطاعت گذار اور جہنمی، احسان فراموش اور کم عقل بھی بتایا ہے اس لئے مجموعی طور پر اسلامی تعلیمات سے عورت پر مرد کی برتری ثابت ہوتی ہے۔ اور عورت کو اسلام نے اس کا حق واقعی نہیں دیا ہے۔ اور شریعت کے حمایتی اپنے مخالف دلائل کو چھپا کر حدیثوں کا کچھ ہی حصّہ لوگوں کے سامنے رکھتے ہیں۔ لہٰذا:

''ان ابتدائی سوالات پر کوئی تھوڑا بہت بھی غور کرے گا تو وہ اس قسم کے دعوے کرنے سے پہلے چار بار سوچے گا کہ کوئی اور مذہب عورتوں کو اسلام کے مقابلہ میں اونچا درجہ نہیں دیتا اور پیغمبر صاحب دنیا میں اب تک ہوئے عظیم ترین عورتوں کے حمایتی تھے۔ (دینک جاگرن مراد آباد و ہندسماچار جالندھر ۱۵ ؍ستمبر ۹۵ء)

مسٹر ارون شوری کا یہ فلسفہ سراسر نفرت اور تعصب پر مبنی ہے۔ جس کی وجہ سے اسلام قوانین کی اچھائیاں ان کی نظروں سے اوجھل ہوگئی ہیں اول یہ کہ عرب کے دورِ جاہلیت کے حالات مسلمانوں نے اپنی طرف سے نہیں گڑھے بلکہ خود مشرکین مکّہ کے قصائد اور زمانہ جاہلیت کے اشعار وغیرہ سے وہ تمام حالات ماخوذ ہیں۔ پھر جو لوگ اسلام لائے انھوں نے بھی اپنے زمانے کے اور خود اپنے حالات سنائے۔ ایک موقع پر ایک صحابیؓ نے اپنی بچی کو اپنے ہاتھ سے زندہ درگور کرنے کا واقعہ

سنایا تو رحمت عالم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنسو چھلک آئے اور آپ انتہائی غمگین ہوئے اور اسلامی تاریخ میں جہاں جاہلیت کی ان مذموم اور قابل نفرت رسومات کا ذکر ملتا ہے وہیں یہ بھی ذکر کیا جاتا ہے کہ یہ طریقہ سارے عرب میں نہیں تھا بلکہ بعض اقوام میں تھا۔ اور کچھ شرفا ایسے بھی تھے جو اس طریقہ کو روکا کرتے تھے چنانچہ بعض لوگوں نے فدیہ دے کر زندہ درگور کے لئے مقرر کردہ لڑکیوں کو آزاد بھی کروایا تھا۔ اگر اسلام مؤرخین کے دل میں کھوٹ ہوتا اور وہ جھوٹ بول کر ہی نبی اکرم صلی اللہ علیہ سلم کی عظمت ثابت کرنا چاہتے تو وہ دوسری روایتوں کی ہوا بھی بعد کے مؤرخین کو نہ لگنے دیتے، تیسرے یہاں یہ بھی پیشِ نظر رکھنا چاہئے کہ عرب کے دور جاہلیت اور ہندوستان کے عہدِ قدیم دونوں اسلام سے پہلے کے زمانے میں اگر کالم نگار کو اسلامی ذرائع پر بھروسہ نہیں تو وہ اپنے ذرائع سے ہندوستانی معاشرہ میں عورت کی حیثیت پر نظر ڈالے۔ اگر وہ تلاش کرے گا تو اسے اپنی ہی مذہبی کتابوں میں عورتوں کے متعلق ایسی ذلت آمیز باتیں ملیں گی کہ اس کی ساری اسلام دُشمنی اور اسلام پر تبرّا بازی ہرن ہو جائے گی۔ مثال کے طور پر:

(الف) رگ وید میں اندر لکھتا ہے: عورت کے ذہن و دل کو تعلیم و تربیت یافتہ نہیں بنایا جا سکتا ہے کیونکہ اس کی عقل چھوٹی ہوتی ہے۔ (رِگ وید ۱۷/۳۳/۸ بحوالہ عورت اور مذاہب عالم)

(ب) اندر نے عورت کے دل کو لکڑ بگھ کے دل سے تشبیہ دی ہے۔ (رگ وید منڈل-۱۰-۱۵-۹۵)

(ج) یجر وید میں ہے۔ لڑکا نہ پیدا کرنے والی عورت بدنصیب ہے۔ (یجر وید ۲-۲-۳-۱۰)

(د) عورت، شودر، کتے اور کوے میں جھوٹ پاپ اور تاریکی ہوتی ہے۔ (یجر وید ۲۱-۱-۱۴۱)

(ہ) یجر وید میں عورت کے شوہر کے ساتھ ستی ہونے کی تحسین کی گئی ہے۔
(یجر وید بحوالہ عورت اور مذاہب عالم عبدالحمید نعمانی)

(و) نیوگ یعنی بے اولاد ہونے کی صورت میں غیر مرد سے مجامعت ہندو مذہب میں رائج رہی ہے۔ (۱۰ احوالہ بالا ص ۱۳)

(ز) ڈاکٹر امبیڈکر نے اپنی کتاب دی پوزیشن آف دو ومین ان ہندوسومليزیشن میں لکھا ہے کہ

عورت کی شادی ایک آدمی سے ہوتی تھی لیکن وہ پورے خاندان کی جائیداد سمجھی جاتی تھی۔ اسے شوہر کی جائیداد میں حصّہ نہیں ملتا تھا۔ (حوالہ بالا ص۱۴)

(ح) ہندو شاستروں میں لکھا ہے کہ نکاح کی پانچویں، ساتویں قسم یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کی لڑکی پر زبردستی قبضہ کرکے اسے اپنی بیوی بنالے چنانچہ اسی بنیاد پر بھیکم پناسہ بنارس کے راجہ کی لڑکیاں پکڑ لایا تھا۔ (شاستر بحوالہ سیف اللہ القہار علی رؤس الکفار ص۲۷)

(ط) ہندوؤں کی مشہور کتاب اسکند پوران کاشی کھنڈ کے ادھیا ۵۸ میں لکھا ہے۔ ایش بھگوان نے فرمایا کہ جو لوگ زوجہ، ہمشیرہ اور بیٹی میں تفاوت سمجھتے ہیں محض بے وقوف ہیں سب عورتیں یکساں سمجھنی چاہئیں جس عورت سے رغبت کرے بفراغت حظ نفسانی اُٹھائے۔ (سوط اللہ الجبار ص۵۱) وغیرہ وغیرہ۔

عورت کے بارے میں یہ رسم ورواج تقریباً وہی ہیں جن کا اثبات مؤرخین اسلام دور جاہلیت میں کرتے ہیں۔ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ صرف عرب کے ہی نبی نہ تھے بلکہ پورے عالم کے پیغمبر تھے اس لئے وہ عرب کے جاہلیت کی بدترین رسمیں مٹانے ہی نہیں آئے بلکہ ہندوستان کی اِن خلاف انسانیت نقوش کو بھی مٹانے تشریف لائے تھے اگر کالم نگار کو ہمارے ذرائع پر بھروسہ نہیں ہے تو خود ان کے ذرائع سے حاصل شدہ ان حقائق سے بھی آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا محسن خواتین ہونا پوری طرح ثابت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت پر مظالم کے اس گھٹا ٹوپ اندھیر میں مرد وعورت کے درمیان ان کی فطری صلاحیتوں کے اعتبار انصاف کے ساتھ الگ الگ ذمہ داریاں نبھانے کا اعلان کیا۔ عورتوں کو ان کے حقوق دیئے۔ مردوں کو ہدایت کی کہ وہ اپنی بیویوں کے ساتھ حسن اخلاق کا ثبوت دیں۔ ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہونے کا اعلاج کیا، بیٹی کی پیدائش اوراس کی پرورش پر جنت کی خوشخبریاں سنائیں، اچھی بیوی کو دنیا کا سب سے بہتر متاع قرار دیا، الغرض وہ ساری ہدایتیں دیں جن سے عورت باعزت اور باعصمت زندگی گذار سکے۔ اور معاشرہ میں اسے احترام کی نظروں سے دیکھا جانے لگے۔ عصمت دری کرکے

عورتوں کی عزت پر بٹہ لگانے والوں اور پاک دامن عورتوں پر بُری تہمت لگانے والوں پر سخت سزائیں مقرر کیں وغیرہ وغیرہ ان سب احکامات پر جب عمل شروع ہوا تو عرب کا وہی معاشرہ جو عورتوں کو ذاتی ملکیت سمجھتا تھا اس میں عورت ایک احترام کی شئی سمجھی جانے لگی۔ اور تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی اور جہاں ان ہدایات پر عمل ہوا وہاں عورتوں کو وہ احترام اور سکون ملا ہے جس کی نظیر کسی اور مذہب اور تہذیب میں پیش نہیں کی جا سکتی، ارون شوری جیسے سیکڑوں لوگ بھی اگر اس حقیقت کو جھٹلانا چاہیں تو یہ حقیقت دفن نہیں کی جا سکتی جس طرح سورج پر تھوکنے سے سورج کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔

رہ گئی یہ بات کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو کم عقل قرار دیا ہے۔ تو اس سے ہرگز عورت کی تحقیر مقصود نہیں بلکہ ایک واقعہ کا اظہار ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص کسی ۱۰/سالہ بچے کے بارے میں کہے کہ اس کی عقل مکمل نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ یہ بچہ کی توہین وتذلیل نہیں بلکہ ایک حقیقت کا اظہار کہلائے گا اسی طرح فطرۃً عورت مرد کے مقابلہ میں کمزور واقع ہوئی ہے اس میں وہ دوراندیشی نہیں ہوتی جو عموماً مردوں میں ہوتی ہے۔ دوسرے وہ ذمہ داری کے پورے احساس نہ ہونے کی وجہ سے بھولنے میں بھی عموماً مردوں سے آگے ہوتی ہے اس لئے گواہی میں دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر قرار دی گئی۔ تاکہ ایک دوسرے سے مدد حاصل کر کے گواہی کا کام انجام دیں علاوہ ازیں بعض مخصوص معاملات میں ایک عورت کی گواہی بھی اسلام نے معتبر مانی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کہ ’’میں نے اپنے بعد عورتوں سے بڑا فتنہ کوئی نہیں چھوڑا‘‘ پر بھی کالم نگار بڑا چیں بجبیں ہے حالانکہ یہ ایسی سچائی ہے جس کے ثبوت میں گذشتہ ۱۴سو سالہ تاریخ کا ورق ورق پیش کیا جاتا ہے اسی عورت نے آج دنیا کو روحانی اعتبار سے تباہی کے دھانے پر پہنچا دیا ہے۔ اسی عورت کے فتنہ سے کوئی ہیرو سے زیرو اور کوئی زیرو سے ہیرو بن جاتا ہے اور اکثر آشرموں میں رہنے والے سوامی اسی عورت کے دام زلف میں پھنس کر جیل کی ہوا کھانے چلے جاتے ہیں۔ (حال ہی میں پولیس نے سوامی رامیشوانند جو رشی کیش کا مشہور کروڑ پتی مذہبی

پیشوا ہے) کو دہلی سے گرفتار کیا ہے جس نے اپنی ایک نو بیاہتا مریدہ کے شوہر کو کرائے کے قاتلوں کے ذریعہ سے مروا دیا تھا۔اس واقعہ کی مکمل تفصیل قومی آواز ۱۵ر ستمبر ۱۹۹۵ءاور بعض دیگر اخبارات میں شائع ہوئی ہے اور ہندوستان میں اس طرح کے واقعات اکثر پیش آتے رہتے ہیں۔ابھی پچھلے دنوں مہاراشٹر کے ایک شہر میں ایک سوامی کے آشرم میں منظّم طور پر کئی سولڑکیوں کی عصمت دری کے واقعہ کا انکشاف ہوا تھا۔ یہ سب عورت کے فتنہ ہونے کی دلیلیں ہیں اور اس طرح کا ہر واقعہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی صداقت کا اعلان کرتا ہے) تو خود ہی سوچئے اس سے بڑا فتنہ اور کیا ہوسکتا ہے۔

جن احادیث میں آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زیادہ تر عورتوں کو جہنمی قرار دیا ہے وہ بھی تحقیر کی بات نہیں بلکہ ایک واقعہ کا اظہار ہے، اور اس طرح کی احادیث کا مقصود یہ ہے کہ عورتیں ہوش میں آئیں اور جہنم میں جانے والے کام کرنے سے بچ جائیں۔حضور علیہ السلام نے جہنم میں جانے والے جن اسباب کے اعتبار سے انھیں جہنمی قرار دیا ہے آج کوئی بھی منصف اس سے انکار نہیں کرسکتا ہے کہ زیادہ تر ان اسباب کی مرتکب عورتیں ہی ہیں۔آج دنیا میں کروڑوں کی تعداد میں عورتیں طوائف کا پیشہ اپنا کر حرام کی کمائی کر رہی ہیں، باقاعدہ ان اڈوں کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہے۔ سیاحت کے نام پر عورتوں کی عصمت فروشی اور فائیو اسٹار ہوٹلوں میں عورتوں کی خرید و فروخت۔نئی تہذیب وتمدن کا ''مہذب حصّہ'' بن گئی ہے۔اور معاشرہ کی گراوٹ کا حال یہ ہے کہ کل جن بدچلن اور بدکار عورتوں کے سایہ سے بھی شرفا اپنے آپ کو بچاتے تھے آج اس سے زیادہ بدچلن عورتیں فلموں کے پردوں پر آکر لوگوں کے دلوں کی دھڑکن بن گئی ہیں آج عورتوں کے حسن کے مقابلے ہوتے ہیں اور مس ورلڈ اور ''مس یونیورس'' کا انتخاب ہوتا ہے تاکہ ان کی قیمت بین الاقوامی بازارِ حسن اور امراء و وزراء کے درباروں میں زیادہ سے زیادہ لگ سکے۔ یہ ہیں وہ عورت کے کام جن کی وجہ سے آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے جہنم میں سب سے زیادہ جانے والا بتایا

ہے۔ اور یہ تو حضور کی عورت سے انتہائی خیر خواہی ہے کہ اسے آگاہ فرمادیا کہ اگر اپنے حالات درست نہ کیئے تو انجام ٹھیک نہیں ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیوی کو بہرحال اپنے شوہر کی اطاعت کا حکم دیا۔ یہاں ایک خاص بات یہ ہے جس کی طرف عموماً لوگوں کا ذہن نہیں جاتا کہ محض عورت ہونے کے اعتبار سے عورت مرد کی پابند نہیں بلکہ صرف بیوی کی حیثیت سے شوہر کی تابعدار ہے۔ اگر صرف عورت ہونا ہی شریعت کی نظر میں اطاعت گزاری کی بنیاد ہوتا تو مرد کو اپنی ماں کی اطاعت گذاری کا حکم نہ دیا جاتا۔ تو معلوم ہوا کہ یہ بات غلط ہے کہ اسلام نے عورت کو مطلقاً مرد کا پابند بنایا ہے بلکہ دونوں باتیں ہیں کسی حیثیت سے مرد عورت کا پابند ہے اور کسی حیثیت سے عورت مرد کی پابند ہے آخر ماں بھی تو عورت ہے مگر اس کی حکم عدولی شریعت میں بالکل جائز نہیں ہے۔ اسلام میں اگر عورت کا عورت ہونے کی حیثیت سے مرتبہ فروتر ہوتا تو ماں کو ہرگز ہرگز قابلِ اطاعت نہ بنایا جاتا۔ ماں کو مطاع قرار دینے کا صاف مطلب یہ ہے کہ عورت ہونا کوئی باعث تحقیر چیز نہیں ہے۔ کالم نگار ارون شوری کا بیوی کے شوہر کی اطاعت کے حکم سے اسلام میں عورتوں کی تذلیل پر استدلال کرنا سراسر مغالطہ ہے۔ اور اسلام نے بیوی کو بھی جو پابندی کرنے کا حکم دیا ہے وہ نظام کو برقرار رکھنے کے لئے ہے۔ اس دنیا میں ہر کوئی حاکم نہیں ہوسکتا۔ ملک میں ہر شخص وزیر اعظم نہیں ہوسکتا، بلکہ ایک وزیر اعظم ہوگا اور بقیہ اس کی رعایا ہوں گے۔ اگر ہر ایک اپنے کو وزیر اعظم کے اختیارات دینے لگے تو ہرگز نظام نہیں چل سکتا اسی طرح ہر انسان کا گھر ایک اسٹیٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں ایک وزیر اعظم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس اسٹیٹ میں رہنے والے دو ہیں ایک مرد اور ایک عورت دونوں کو اگر بالکل برابر کے اختیار دیئے جائیں تو یہ اسٹیٹ تباہ ہوجائے گا۔ اس لئے فطری تقاضوں کے تحت ایک کی برتری ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت و مصلحت کے پیش نظر یہ برتری مرد کو عطا کی ہے اسی وجہ فرمایا گیا۔ اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ. ''مرد (شوہر) عورتوں (بیویوں) پر نگراں ہیں۔ اگر اس نظام کو کوئی شخص عدم مساوات کہنے لگے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ دنیا میں کہیں بھی مردوں اور

عورتوں میں تو کیا مردوں اور مردوں میں بھی مساوات باقی نہ رہے گی۔ اور خود ارون شوری کا گھر بھی اس عدم مساوات سے محفوظ نہ رہے گا۔ اس لئے کہ عقلاً اس کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایک آدمی تو ٹھاٹ سے ائیر کنڈیشن کمروں میں گدوں پر دراز ہو اور دوسرا اسی جیسا آدمی اس کے دروازے پر سنتری بنا کھڑا رہے۔ اور اس کے چشم ابرو پر ناچتا پھرتا رہے۔ اگر مہذب سماج میں اس کھلی ہوئی نابرابری کی گنجائش ہے تو پھر بیوی اور شوہر میں جو شریعت نے فرق قائم کیا ہے اور جو موجودہ نابرابری سے کہیں زیادہ برابر ہے وہ بھلا کیسے ناموافق قرار دیا جاسکتا ہے۔

اس لئے ارون شوری اور ان کیسے دریدہ دہن ذرا عقل کے ناخن لیں۔ اور انصاف کا دامن تھامیں۔ شریعت اسلامی پر کیچڑ اچھالنا بند کریں اور اگر ان میں ہمّت ہے تو اس ہرزہ سرائی کے بجائے اپنے مذہب کے بدترین، شرمناک اور عقل وقیاس سے کوسوں دور آثار و باقیات کو مٹانے کے لئے میدان میں آئیں۔ اسلام کے خلاف اِدھر اُدھر سے لکھ دینا تو آسان ہے مگر سچائیوں سے اسے ثابت کرنا جوئے شیر لانے کے مرادف ہے۔ ارون شوری کی تو حیثیت کیا ہے۔ اُن کے آباؤ واجداد، پنڈت دیانند، پنڈت اندرمل اور ان جیسے سیکڑوں مہاشے ان مغلطات کو دہرا چکے ہیں۔ اور اسلام کے محافظ ان کے گڑھ میں ان کے دانت کھٹّے کر چکے ہیں۔ آج بھی مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا محمد علی بچھرایونیؒ، مولانا اسعد اللہ رامپوریؒ، کے نام لیوا اس ملک میں موجود ہیں اور جب تک موجود رہیں گے اسلام دشمنوں کے سینے پر مونگ دلتے رہیں گے۔ بقول مولانا ظفر علی خاں:

کفر ناچا جن کے آگے بارہا تگنی کا ناچ ❖ جس طرح جلتے توَے پر رقص کرتا ہے سپند
جان کر دیں گے جو ناموسِ محمد پر فدا ❖ حق کے رستے پر کٹا دیں گے جو اپنا بند بند

واللہ الموفق وھو یھدی السبیل

(ندائے شاہی، اکتوبر ۱۹۹۵ء)

❍❖❍

وندے ماترم
مسلمانوں کو کیوں قبول نہیں؟

حکومت اتر پردیش نے ایک حکم نامہ جاری کر کے ریاست کے سبھی منظور شدہ اسکولوں میں ہر صبح ہندوستان کی تصویر پر مالا چڑھانا اور ''وندے ماترم'' گیت پڑھنا لازم قرار دیا ہے۔ اس گیت میں مادرِ وطن ''ہندوستان کو ایک دیوی تصور کر کے اس کے لئے وہ صفات ثابت کی گئی ہیں، جو صرف معبود حقیقی ہی کو زیب دیتی ہیں۔ اور پھر اس کی عبادت اور بندگی کا اقرار کیا گیا ہے۔ جب سے یہ بات سامنے آئی ہے۔ مسلمانوں کی مختلف جماعتیں اور ادارے اس کی مخالفت کر رہے ہیں۔ جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے بھی تحریری اور عملی احتجاج کا سلسلہ جاری ہے۔ مسلمانوں کے اس ردعمل پر کچھ برادرانِ وطن کی طرف سے یہ تاثر دینے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ وندے ماترم گیت کی مخالفت اور ''بھارت ماتا'' کی تصویر پر مالا چڑھانے سے انکار ملک وقوم سے غداری کے مرادف ہے۔ اور یہ کہ علماء اس بارے میں اشتعال دلا کر مسلمانوں کو ملک کا غدار بنا رہے ہیں۔ (ہفت روزہ وقت کا سامنا دہلی ۱۱ر جون ۱۹۹۸ء) ہمارے کچھ دانشور بھی اپنی ''سیکولر امیج'' بنائے رکھنے کے خاطر مسلمانوں سے اپیل کر رہے ہیں کہ وہ ''وندے ماترم'' کی مخالفت نہ کریں۔ اور اپنے آپ کو قومی دھارے میں شامل رکھیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ اس مسئلہ کا سنجیدگی سے جائز لیا جائے۔ اور صحیح صورتِ حال اور مسلمانوں کا دستوری اور قانونی موقف سامنے لایا جائے، تاکہ منصف مزاج عوام و خواص کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔

اسلامی نظریہ :

اسلام کی بنیاد عقیدۂ توحید پر ہے۔قرآن کریم اور احادیث طیبہ میں اس عقیدہ کی اہمیت بہت تاکید سے بیان کی گئی ہے۔اور تمام انسانوں کو صرف ایک خدا کی عبادت کی تلقین کی گئی ہے۔ اسلام میں اللہ کے علاوہ کسی بھی چیز کو خواہ وہ مورت ہو، کاغذ کی تصویر ہو، ندی، نالا، پہاڑ یا درخت ہو، پتھر ہو یا پھول ہو یا جاندار ہو یا غیر جاندار، مردہ ہو یا زندہ۔الغرض کسی بھی چیز کو پوجنا اور اس میں اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفات کو ثابت کرنا قطعاً حرام ہے۔اس کو اسلام کی اصطلاح میں ''شرک'' کہا جاتا ہے جو اللہ رب العزت کی نظر میں ناقابلِ معانی جرم ہے۔اس بارے میں اسلام کا کہنا یہ ہے کہ جو چیز خود مخلوق ہو یعنی جو عدم سے وجود میں آئی ہو اور خود اس کا وجود کسی دوسرے کا مرہونِ منت ہو۔ اسے ''خالق'' یعنی جو سب کو وجود بخشنے والا ہے اور وہ خود بخود ہمیشہ سے موجود ہے اور اسے کسی نے وجود نہیں بخشا ہے۔کے درجے میں نہیں رکھا جاسکتا۔قرآن کہتا ہے۔

اَفَمَنْ یَّخْلُقُ کَمَنْ لَّایَخْلُقُ، اَفَلَا تَذَکَّرُوْنَ. (سورۂ نمل ۱۷)

بھلا جو پیدا کرے برابر ہے اس کے جو کچھ نہ پیدا کرے کیا تمھیں سمجھ نہیں ہے۔

خالق صرف الله هے :

اسلام کی نظر میں کائنات کی چھوٹی بڑی، کمزور اور طاقتور ہر چیز کا خالق اور پیدا کرنے والا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

قرآن کریم میں فرمایا گیا :

- وَلِلّٰہِ مُلْکُ السَّمٰوٰاتِ وَالْاَرْضِ وَمَابَیْنَھُمَا، یَخْلُقُ مَایَشَاءُ وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَيْءٍ قَدِیْرٌ. (المائدہ ۱۷)
- وَخَلَقَ کُلَّ شَيْءٍ وَھُوَ بِکُلِّ شَيْءٍ عَلِیْمٌ. (الانعام ۱۰۱)
- ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمْ، لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ، خَالِقُ کُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْہُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَيْءٍ وَّکِیْلٌ۔(الانعام ۱۰۲)

- اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ۔(ابراہیم آیت ۱۹)
- اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَکُمْ مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَائِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ مَاکَانَ لَکُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا. ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ. (سورۃ النحل ۶۰)
- اور اللہ ہی کے لئے ہے سلطنت آسمانوں اور زمین کی اور جو کچھ درمیان ان دونوں کے ہے۔ پیدا کرتا ہے جو چاہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔
- اور اس نے بنائی ہر چیز اور وہ ہر چیز سے واقف ہے۔
- یہی اللہ تمھارا رب ہے۔ نہیں ہے کوئی معبود سوا اس کے، پیدا کرنے والا ہر چیز کا، سو تم اسی کی عبادت کرو اور وہ ہر چیز پر کارساز ہے۔
- کیا نہیں دیکھتے اللہ نے بنائے آسمان اور زمین جیسے چاہیں۔
- بھلا کس نے بنائے آسمان اور زمین اور اتار دیا آسمان سے تمھارے لئے پانی، پھر اُگائے ہم نے اس سے باغ رونق والے، تمھارا کام نہ تھا کہ اُگاتے ان کے درخت، اب کوئی اور حاکم ہے اللہ کے ساتھ، کوئی نہیں، وہ لوگ راہ سے مڑتے ہیں۔

ان آیات سے معلوم ہو گیا کہ مذہب اسلام کسی بھی مخلوق کو خالق کے مقام پر ہرگز دیکھنا نہیں چاہتا۔ مخلوق خواہ کتنی ہی قابل احترام ہو حتی کہ نبی، ولی یا قطب ہی کیوں نہ ہو اس کے ساتھ خالق والا معاملہ روا نہیں رکھا جا سکتا۔

نبی بھی خدا نہیں :

اسلام میں اللہ کے بعد سب سے مقدس اور معزز مقام حضرت خاتم النبیین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی خدا کیا معاملہ نہیں کیا جا سکتا۔ نہ آپ کی عبادت کی جائے گی، نہ آپ کو سجدہ کیا جائے گا خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو اس سے منع فرما دیا ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک سرکش اونٹ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے

سامنے سجدہ ریز ہوا اور اپنے مالک کی شکایت کرنے لگا تو حضرات صحابہؓ نے عرض کیا کہ جب یہ جانور ہو کر رَب کو سجدہ کر رہا ہے تو ہمیں بدرجہ اولیٰ آپ کے سامنے سجدہ کرنا چاہئے۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لَا يَنْبَغِيُ لِبَشَرٍ اَنْ يَّسْجُدَ لِبَشَرٍ . (دلائل النبوۃ ۶/۱۹)

''کسی انسان کے لئے دوسرے انسان کو سجدہ کرنا جائز نہیں۔''

اب غور فرمائیے کہ جب اسلام میں پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام جیسی مقدس ترین ذات کی عبادت کی گنجائش نہیں ہے تو دنیا کی کسی اور چیز کی بندگی مسلمان کے لئے کیسے جائز ہوسکتی ہے؟

والدین کا معاملہ:

اسی طرح اسلام میں والدین (ماں باپ) کا بڑا اونچا درجہ ہے۔ قرآن وحدیث میں جگہ جگہ ان کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی فرمانبرداری کی تاکید کی گئی ہے۔ اور ان کی نافرمانی سے شدت کے ساتھ روکا گیا ہے۔ لیکن ساتھ میں یہ بھی بتلا دیا گیا کہ اگر وہ والدین اپنی اولاد کو اللہ کے ساتھ شرک کرنے کا حکم دیں تو اب ان کی بالکل اطاعت نہیں کی جائے گی۔ قرآن میں ارشاد ہے:

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْناً وَاِنْ جَاهَدَاكَ عَلٰى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلاَ تُطِعْهُمَا. (العنکبوت ۸)

''اور ہم نے تاکید کردی انسان کو اپنے ماں باپ سے بھلائی سے رہنے کی، اور اگر وہ زور کریں کہ تو شرک کرے میرا جس کی تجھ کو خبر نہیں، تو ان کا کہنا مت مان۔''

اس حکم سے معلوم ہوگیا کہ اسلام اپنی حقیقی ماں۔ جس کی کوکھ سے انسان جنم لیتا ہے۔ کو بھی خالق حقیقی (خدائے وحدہٗ) کے ہم پلہ قرار دینا صحیح نہیں سمجھتا۔ اور اپنے ماننے والے کو حکم دیتا ہے کہ وہ شرک کے متعلق اپنے سگے ماں باپ کے حکم کو ہرگز تسلیم نہ کریں۔

مادرِ وطن معبود نہیں ہے:

تو اب غور فرمائیے کہ جب قرآن کریم نے شرک کے متعلق اپنی سگی اور حقیقی ماں کے حکم کو نظر انداز کردیا ہے تو ''مادرِ وطن'' اور بھارت ماتا جیسی مجازی ماؤں اور خیالی دیویوں کے ساتھ خالق

حقیقی جیسا برتاؤ اسلام کیسے گوارا کرسکتا ہے۔ ماں کا احترام اوراس سے محبت الگ چیز ہے اوراس کو معبود بنالینا اور خالق کے درجہ میں رکھ دینا الگ معاملہ ہے۔ محبت اور وفاداری کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہم جس سے محبت کریں اسے پوجنے بھی لگیں۔ ہم اپنے والدین سے محبت کرتے ہیں، بھائی بہنوں سے پیار کرتے ہیں اور رشتہ داروں سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر انھیں پوجتے نہیں ہیں تو کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ نہ پوجنے کی وجہ سے ہماری محبت میں کمی آ گئی۔ اسی طرح جو مسلمان یہ کہے کہ ہم ملک سے محبت تو کرتے ہیں مگر اس کی بندگی نہیں کرتے۔ اور اس کو خدا کے درجہ میں نہیں رکھتے تو اسے ملک کا غدار یا قوم کا غدار یا قوم کا دشمن ہرگز نہیں کہا جاسکتا۔ ہندوستان ہمارا وطن ہے۔ اور وطن ہونے کی حیثیت سے ہمیں اس سے فطری تعلق بھی ہے۔ اس کے چپہ چپہ پر ہماری روشن تاریخ کے ان مٹ نقوش ثبت ہیں۔ اور وطن کی بھلائی اور ترقی کے لئے ہم دل سے کوشاں رہے ہیں اور رہیں گے۔ لیکن اس محبت اور تعلق کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ ہم اسے معبود بنا ڈالیں۔ ہمیں عقلاً یا قانوناً کسی طرح بھی وطن کی عبادت اور بندگی پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارے وطن نے ہمیں دستوری طور پر یہ حق دیا ہے کہ یہاں کے کسی بھی بسنے والے پر ایسا حکم لاگو نہ کیا جائے جو اس کے مذہبی عقیدہ کے خلاف ہو اور جس سے اس کی مذہبی آزادی پر زد پڑتی ہو۔ مادرِ وطن کے سپوت ہونے میں ہندو مسلم سب برابر ہیں۔ یہاں جس طرح ایک ہندو کو مورتی کی پوجا سے نہیں روکا جاسکتا۔ اسی طرح کسی مسلمان کو بھی اللہ کے علاوہ کسی دوسری چیز کی عبادت پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ جو لوگ اکثریت کے زعم میں ملک کے تمام باشندوں کو اپنے عقیدے اور عمل کا پابند بنانے کی کوشش کررہے ہیں وہ درحقیقت مادرِ وطن کے خیر خواہ نہیں بلکہ اس کی جڑوں کو کمزور کرنے والے ہیں۔ اس لئے کہ ہمارے وطن کی بقا اور سالمیت کا مدار صرف اس پر ہے کہ یہاں بسنے والے ہر فرقہ کے جذبات کا احترام کیا جائے اور کسی کی دل آزاری نہ کی جائے۔

یہ وطن سے غداری نہیں :

مسلمان ہندوستان کی تعریف اوراس کی واقعی خوبیوں پر مشتمل کسی ترانہ یا گیت کے مخالف نہیں ہیں۔ بلکہ ایسے ترانوں کو بصد شوق پڑھتے اور گنگناتے ہیں۔ یہاں کا قومی ترانہ ''سارے جہاں

سے اچھا ہندوستان ہمارا‘‘ ہندوستان کے بارے میں ہمارے حقیقی جذبات کا عکاس ہے۔ اس طرح کے ترانے پڑھنے میں نہ ہمیں کبھی اعتراض ہوا ہے اور نہ ہوسکتا ہے۔ ہمارا تو صرف یہ کہنا ہے کہ ہماری زبان سے اس سلسلہ میں ایسے الفاظ نہ کہلوائے جائیں اور ہمیں ایسے عمل پر مجبور نہ کیا جائے جو ہمارے عقیدۂ توحید کے خلاف ہو۔ ’’وندے ماترم‘‘ گیت میں چونکہ خالص مشرکانہ الفاظ ہیں اس لئے ہمیں اس کے پڑھنے پر اعتراض ہے۔ اور اعتراض کی وجہ یہ ہرگز نہیں کہ ہمیں اپنے وطن سے محبت نہیں یا ہم اس کے وفادار نہیں بلکہ یہ احتجاج صرف اس بنا پر ہے کہ یہ ہمیں دستور سے ملی ہوئی مذہبی آزادی کے منافی ہے۔ ہمیں اپنی مذہبی آزادی بہرحال عزیز تر ہے۔ ہم کسی بھی قیمت پر اس آزادی کا سودا نہیں کرسکتے اس لئے حکومت، برادرانِ وطن، اور ہمارے روشن خیال دانشوروں کو چاہئے کہ وہ مسلمانوں کی بے چینی کو وطن کی مخالفت پر محمول نہ کریں۔ بلکہ سنجیدگی کے ساتھ ان کی بجا شکایت کے ازالہ کی کوشش کریں۔ اس طرح کے جبری احکام کو واپس لینے پر زور دیں۔ ورنہ اس کے عواقب ونتائج ملک کے لئے بہت خطرناک ثابت ہوسکتے ہیں۔

مسلمانوں سے اپیل :

اس موقع پر ہم عام مسلمانوں سے بھی اپیل کرتے ہیں وہ اپنی نسلوں کے ایمان کے تحفظ کے سلسلہ میں پوری طرح حساس رہیں اور مکمل بیداری کا ثبوت دیں۔ اپنے بچوں کو تاکید کریں کہ وہ کوئی بھی شرکیہ لفظ اپنی زبان سے نہ نکالیں۔ اور اللہ کے علاوہ کسی کے ساتھ معبود جیسا معاملہ نہ کریں۔ ایمان اور اسلام کے سلسلہ میں ہمارے جذبات بالکل واضح ہونے چاہئیں کہ ہم دنیا جہاں کا ہر نقصان برداشت کرسکتے ہیں لیکن اپنے دین واسلام پر کسی آنچ کو ایک لمحہ کے لئے برداشت نہیں کرسکتے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے دین پر مکمل استقامت کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

(ندائے شاہی، اگست ۱۹۹۸ء)

نوٹ: مسلمانوں کے مؤثر احتجاج کے بعد ’’وندے ماترم‘‘ سے متعلق فرمان حکومت نے واپس لے لیا تھا۔ (مرتب)

○❖○

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن

گذشتہ کئی مہینوں سے آر، ایس، ایس اور اس کی بغل بچہ فسطائی تنظیموں کے ذمہ دار اپنے بیانات اور تحریروں میں قرآن کریم کو نشانہ بنا کر برسر عام اشتعال انگیزی کررہے ہیں۔ یہ لوگ قرآنی آیات کی ایک فہرست پیش کرتے ہیں اور مسلمانوں سے مطالبہ کرتے ہیں کہ ان آیات کو قرآن کریم سے نکال دیں کیونکہ یہ آیات انکے بقول غیر مسلموں سے نفرت اور جنگ کی تعلیم دیتی ہیں، اور ساتھ میں توازن برقرار رکھنے کے لئے یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر مسلمان ہمارے ویدوں اور گرنتھوں میں کسی قابل اعتراض ''اشلوک'' کی نشاندہی کریں گے تو بدلہ میں ہم اسے بھی اپنی کتابوں سے خارج کردیں گے۔ قرآن کریم کی جن ۲۴ آیتوں کو یہ لوگ موجب اعتراض سمجھتے ہیں ان کے ترجمے اخبارات میں شائع ہوچکے ہیں، اور پھر آر، ایس، ایس اور وشو ہندو پریشد کی طرف سے انھیں چھپوا کر جا بجا تقسیم کیا جارہا ہے۔ جس سے غیر مسلموں میں اسلام اور مسلمانوں سے نفرت بڑھتی جاری ہے ساتھ میں ان آیات کے تراجم دیکھ کر بعض مغربیت زدہ، ماڈرن اور بے ضمیر مسلمان بھی خواہ مخواہ مرعوب ہورہے ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ ''واقعتہً اسلام اپنے مخالفین کے خلاف جارحانہ نظریہ رکھتا ہے، لہذا موجودہ زمانہ میں ''صلح کل'' کا راستہ اپنانا چاہئے'' بریں بنا ضرورت ہے کہ اس وقت فرقہ پرستوں کی طرف سے قرآن مقدس کے خلاف اٹھائے جانے والے ''طوفان بدتمیزی'' کا مضبوط جواب دیا جائے۔ اور اسلام کے بارے میں پھیلائی جانے والی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جائے۔ اور اقوام عالم کو بتایا جائے کہ اسلام امنِ عالم کے لئے ہرگز خطرہ نہیں بلکہ حقیقی خطرہ وہ لوگ ہیں جو آج اسلام کے خلاف برسر پیکار ہیں، دنیا میں بدامنی آج مخالفین اسلام نے ہی پھیلا رکھی

ہے، اور ہمارے ملک کے امن کو بھی یہی فسطائی ذہنیت کے لوگ تباہ کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ اگر ان بے لگام اور اکثریت کے غرور میں مدہوش بدزبان افراد کو لگام نہ لگائی گئی اور انھیں کھلے مہار دوسروں کے مذہب پر تنقیدیں اور تبرے کرنے کی کھلی چھوٹ ملی رہی تو یہ ملک جلد ہی خانہ جنگی میں مبتلا ہوکر تباہ و برباد ہوجائے گا۔ اس لئے کہ انسان سب کچھ برداشت کرلیتا ہے مگر اپنے مذہب اور عقیدہ کے خلاف جارحیت کو برداشت نہیں کرتا اور ایک حد سے گذرنے کے بعد مذہب کے دفاع کے لئے ہر ممکن قربانی دینے پر آمادہ ہوجاتا ہے۔ اس لئے خود ملک کو بچانے کے لئے بھی لازم ہے کہ منصف محبان وطن میدان میں آئیں اور ان چند سرپھرے نفرت کے سوداگروں کو خاموش کریں ورنہ ان کی لگائی ہوئی آگ جب پھیلے گی تو سب ہی کو خاکستر کرکے دم لے گی۔

قرآن کریم ناقابل ترمیم ہے

یہ بات ساری دنیا پر آشکارا رہنی چاہئے کہ قرآن کریم سچی آسمانی کتاب ہے اور اللہ رب العالمین کا کلام ہے۔ اس میں تا قیامت کسی تبدیلی اور تغیر کا نہ تو امکان ہے اور نہ کسی کو اختیار ہے۔ اس کے زیر، زبر، نقطے اور اعراب تک جوں کے توں محفوظ ہیں، یہ کسی انسان کی تصنیف نہیں ہے کہ ہر نئے ایڈیشن میں زمانہ اور حالات کے اعتبار سے کتر بیونت کردیجائے بلکہ یہ حي وقیوم ذات برحق کا دائمی کلام ہے جس میں دخل دینے کا کسی انسان کو ذرہ برابر حق نہیں ہے۔ یہ کلام لوح محفوظ سے بحفاظت پیغمبر آخرالزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر پر اتارا گیا اور پھر اسکی مکمل حفاظت کا خدائی انتظام کیا گیا۔ قرآن کا تعارف کراتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ، عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ. بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ. (الشعراء ۱۹۲- ۱۹۵)

اور قرآن رب العالمین کا بھیجا ہوا ہے، اس کو امانت دار فرشتہ لیکر آیا ہے، آپ کے قلب پر، صاف عربی زبان میں، تاکہ آپ بھی منجملہ ڈرانے والوں کے ہوں۔

قرآن کریم کے برحق، دائمی اور اٹل ہونے کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ امتی تو درکنار خود صاحب قرآن حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اپنی طرف سے اس میں اضافہ یا کمی کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ ایک جگہ قرآن کریم میں نہایت زوردار انداز میں اعلان فرمایا گیا:

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَ قَاوِيْلِ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ، ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ، فَمَامِنْكُمْ مِنْ اَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِيْنَ، وَاِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ. وَاِنَّا لَنَعْلَمُ اَنَّ مِنْكُمْ مُكَذِّبِيْنَ، وَاِنَّهٗ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكَافِرِيْنَ، وَاِنَّهٗ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ.
(الحاقة ٤٤-٥١)

اور اگر یہ پیغمبر ہمارے ذمہ کچھ جھوٹی باتیں لگا دیتے، تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑتے پھر ان کی شہ رگ کاٹ ڈالتے، پھر تم میں کوئی ان کا اس سزا سے بچانے والا بھی نہ ہوتا، اور بلاشبہ یہ قرآن متقیوں کیلئے نصیحت ہے اور ہم کو معلوم ہے کہ تم میں بعض تکذیب کرنے والے بھی ہیں (پس ہم ان کو اس کی سزا دیں گے) اور یہ قرآن کافروں کے حق میں موجب حسرت ہے۔ اور یہ قرآن تحقیقی یقینی بات ہے۔

دشمنان اسلام اور کفار کی طرف سے قرآن میں تبدیلی کا مطالبہ کوئی نیا نہیں بلکہ دور نبوت میں بھی کفار نے اسی طرح کا مطالبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تھا، اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس طرح دیا:

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ لَايَرْجُوْنَ لِقَاءَ نَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَا اَوْبَدِّلْهُ. قُلْ مَايَكُوْنُ لِيْ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَائِيْ نَفْسِيْ. اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَايُوْحٰى اِلَيَّ اِنِّيْ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ. (يونس ١٥)

اور جب ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں جو بالکل صاف صاف ہیں تو یہ لوگ جن کو ہمارے پاس آنے کا کھٹکا نہیں ہے آپ سے یہ کہتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی دوسرا قرآن لائیے یا اس میں کچھ ترمیم کر دیجئے۔ آپ کہہ دیجئے کہ: مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ میں اپنی طرف سے اس میں ترمیم کر دوں۔ بس میں تو اسی کا اتباع کروں گا جو میرے پاس وحی کے ذریعہ

پہنچا ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں ایک بڑے بھاری دن کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں۔

ان واضح آیات اور قرآنی اعلانات کے بعد قرآن مقدس میں ادنیٰ سی تبدیلی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، مسلمانوں کے مذہبی نقطۂ نظر سے قرآن میں تبدیلی کا مطالبہ سرے سے بحث ہی سے خارج ہے۔ اس موضوع پر تو گفتگو کی کوئی گنجائش ہے ہی نہیں، بھلے سے کوئی شخص قرآن کی کسی آیت کو اپنے خلاف سمجھا کرے یا اسے موجودہ زمانے کے مزعومہ قوانین کے خلاف سمجھتا رہے مگر یہ خیال دل سے بالکل نکال دے کہ قرآن میں کوئی ترمیم یا تبدیلی ممکن ہے۔ قرآن کریم کے متعلق یہی بے لاگ نظریہ اور دوٹوک موقف اسکی حقانیت کی کھلی دلیل ہے، اس کے برخلاف جو لوگ خود ہی اپنی کتابوں میں تبدیلی کی پیش کش کر رہے ہیں وہ اپنی ہی زبانوں سے اپنے مذہب کی جڑ کاٹ رہے ہیں۔ کیونکہ جس مذہب کی کتابوں میں ہر کس و ناکس کو تبدیلی کا حق حاصل ہو وہ مذہب پختہ اور حتمی ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کی مثال اس ''گھروندے'' کے زیادہ مشابہ ہوگی جو ذرا سی پانی کی دھار یا ہوا کے تھپیڑوں سے زمین کے برابر ہو جاتا ہے۔ پھر بھی ہماری جانب سے کھلی اجازت ہے کسی کو اپنے مذہب یا اسکی کتابوں میں تبدیلی کا شوق ہو تو وہ اپنی مرضی سے اپنا شوق پورا کرے، چاہے تو مذہب ہی بدل کر مذہب کا نیا ایڈیشن شائع کر دے، لیکن مسلمانوں سے مذہب میں تبدیلی کی توقع محض فضول ہوگی۔ اور دشمنوں کا یہ خواب نہ کبھی شرمندۂ تعبیر ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

آیات قرآنیہ کی تشریح کا حق کس کو؟

وشو ہند پریشد کے دریدہ دہن لیڈروں نے قرآن کریم کی جن ۲۴ آیات کو اپنے خلاف باور کیا ہے سوال یہ ہے کہ ان آیات کا جو مطلب انھوں نے سمجھا ہے وہ صحیح بھی ہے یا نہیں؟ محض ان لیڈروں کی رائے زنی سے یہ نہیں مانا جا سکتا کہ انکا بیان کردہ مطلب صحیح ہے۔ اس لئے کہ قرآن کریم کی تشریح کا ہما شما کو حق حاصل نہیں غیر مسلم تو دور ہے خود ان مسلمانوں کو بھی قرآن کی تفسیر وتشریح کا اختیار نہیں ہے جو دینی علوم سے بے بہرہ ہوں، بلکہ یہ اختیار صرف ان علماء بارعین

کوحاصل ہے جو احادیث طیبہ اور اقوال صحابہؓ کی روشنی میں آیات کے شان نزول، سیاق وسباق اور معانی کا مکمل ادراک رکھتے ہوں۔ ایسے حضرات جو تفسیر بیان کریں گے وہ قبول ہوگی، اور جو شخص صرف ترجمہ دیکھ کر مطلب بیان کریگا اسے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔ جس طرح قانون کی تشریح کا حق ایک قانون داں ہی کو حاصل ہوتا ہے ہر ایک کی رائے زنی قبول نہیں کی جاتی بعینہ اسی طرح قرآن کی تشریح کا حق بھی صرف علماء اسلام کو حاصل ہے۔ لہذا یہ دشمنان دین آیات مذکورہ کا جو مطلب بیان کررہے ہیں وہ ہرگز قابل اعتبار نہیں، آخر وہ کون ہوتے ہیں قرآن کی تشریح کرنے والے؟ اور انہیں اس خامۂ فرسائی کا آخر کس نے حق دیا ہے؟ جس طرح ایک مسلمان اور عیسائی کی بات وید کے کسی اشلوک کی تشریح میں قبول نہیں کی جاسکتی اسی طرح قرآن کی کسی آیت کے معنی کی تعیین اور تشریح میں بھی کسی غیر مسلم کی رائے کا کوئی اعتبار ہے ہی نہیں ہے۔ لہذا ان فتنہ پرور لیڈروں کی قرآن کریم کے متعلق رائے زنی ''احمقانہ بکواس سے'' زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ اور اسے اسلام کے متعلق نفرت پھیلانے کی ''ایک مذموم اور اشتعال انگیز'' کوشش کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

اسلام میں غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات کی نوعیت

اسلام ایک خالص امن پسند مذہب ہے۔ اس سے یہ تصور ہی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ خواہ مخواہ کسی انسان کو قتل کرنے یا ستانے کا حکم دے، اس کی تعلیمات تو سراسر رحم دلی، خیر خواہی اور امن پسندی پر مبنی ہیں، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اَلرَّاحِمُوْنَ یَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ (تَبَارَکَ وَتَعَالٰی) اِرْحَمُوْا اَهْلَ الْاَرْضِ یَرْحَمُکُمْ مَنْ فِی السَّمَاءِ.

مہربانوں پر خدائے مہربان مہربانی کرتا ہے۔ تم زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم فرمائے گا۔

(ابوداؤد شریف ۲/۶۷۵)

حتی کہ اسلام میں جانوروں تک کو ستانے سے منع کیا گیا ہے لہذا کسی انسان کو بلا وجہ محض اس کے غیر مسلم ہونیکی بنا پر فنا کے گھاٹ اتار دینے کا مطلق حکم اسلام میں متصور ہی نہیں ہے۔ اگر کوئی غیر مسلم مسلمانوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے۔ ان کے خلاف دشمنی کا اظہار نہ کرے، ان کو ستانے کے منصوبے نہ بنائے، اور ان کے دینی معاملات میں دخل اندازی نہ کرے تو شریعت میں ایسے غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی کوئی ممانعت نہیں بلکہ اس کی ترغیب وارد ہوئی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے :

لَايَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يَقَاتِلُوْكُمْ فِى الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْا اِلَيْهِمْ، اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (الممتحنة : ۸)	اللہ تعالی تم کو ان لوگوں کیساتھ احسان اور انصاف کا برتاؤ کرنے سے منع نہیں کرتا جو تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے، اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا، اللہ تعالی انصاف کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں،

اسی طرح قرآن وحدیث میں غیر مسلم پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی گئی ہے۔ لہذا یہ دعوی محض شر انگیزی پر مبنی ہے کہ اسلام مطلقاً غیر مسلموں سے عدم رواداری کی تعلیم دیتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ مسلمان کو یہ حکم نہیں ہے کہ وہ خاموش ظلم سہتا رہے اور اپنے دین وایمان اور جان ومال کا دفاع نہ کرے۔ اسلام ایسی ذلت کی زندگی کو ہرگز گوارا نہیں کرتا۔ لہذا اگر کوئی فرد، قوم یا جماعت مسلمانوں کو مظالم کا تختۂ مشق بنائے گی تو مسلمانوں کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ اپنے دفاع اور تحفظ کیلئے جو بھی صورت ممکن ہو اسے اپنانے سے دریغ نہ کریں۔ اور ایسے ظالم کفار سے کسی طرح کا تعلق نہ رکھیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا:

اِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِى الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰى	صرف ان لوگوں سے ساتھ دوستی کرنے سے اللہ منع کرتا ہے جو تم سے دین کے بارے میں لڑتے ہوں، اور اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالا ہو،

اِخْـرَاجِـكُمْ اَنْ تَـوَلَّـوْهُمْ، وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ. اور تمہارے نکالنے میں مدد کی ہو، اور جو شخص ایسوں سے دوستی کریگا سو وہ لوگ گنہ گار ہونگے۔

(الممتحنه ۹۰)

اس واضح آیت سے معلوم ہوگیا کہ اسلام میں ہر کافر کے ساتھ یکساں معاملہ کا حکم نہیں ہے بلکہ حالات دیکھ کر احکامات کا تعین ہوگا. اگر امن وامان اور انصاف کے حالات ہیں تو خواہ مخواہ لڑنے کی کوئی وجہ نہیں، اور اگر ظلم وتعدی اور ایذارسانی کے حالات ہیں تو پھر ان حالات کا مقابلہ کرنا اور ایسے ظالموں کی خبر لینا نہ صرف مذہب بلکہ عقل وانصاف کی رو سے بھی ضروری اور فرض ہو جاتا ہے۔ کوئی بھی عقل منداس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا۔

اسلام میں جہاد کا تصور

عرصۂ دراز سے اسلام کے ایک مقدس ترین عمل ''جہاد'' کو بدنام کرنے کی تحریک جاری ہے. اور گذشتہ سالوں کے عالمی حالات کے تناظر میں تو اسے ''ایک گالی'' کے مرادف قرار دیا جانے لگا ہے۔ اور منظّم انداز میں اس کی غلط تشریح کر کے دنیا کو گمراہ کیا جا رہا ہے۔ اس لئے اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ ظلم وعدوان اور قتل وغارت گری کا نام ہرگز جہاد نہیں بلکہ ''روئے زمین سے ظلم ونا انصافی ختم کر کے خالق ارض وسماء رب العالمین کے حکم کو جاری کرنے کے لئے جدوجہد کرنے کا نام جہاد ہے''۔ (تکملۂ فتح الملہم ۳/۴)

اسلام میں جب بھی جہاد کیا جاتا ہے تو اس کے پیچھے صرف اور صرف ظلم کا خاتمہ اور اعلاء کلمۃ اللہ کا مقصد کارفرما ہوتا ہے۔ محض خونریزی اور ملک گیری کیلئے قتل وقتال کو شریعت کی اصطلاح میں جہاد نہیں کہا جاسکتا۔ شریعت اسلامی نے اپنے ماننے والوں کو جہاد کا حکم دیکر دراصل انکے تحفظ کا واقعی انتظام فراہم کیا ہے۔ اگر جہاد کا حکم اسلام میں نہ ہوتا تو دیگر قومیں نہ جانے کب کی مسلمانوں کو نوالۂ تر بنا چکی ہوتیں۔ اور اسلام کا تشخص فنا ہو جاتا، اس حکم کی تاثیر یہ ہے کہ آج بھی جبکہ بڑی تعداد میں مسلم حکومتیں اس فریضہ سے غافل ہیں جہاد کا نام سنکر وقت کے فرعونوں کی روح فنا ہو جاتی ہے۔ اور محض جہاد کے تصور ہی سے دشمنوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

حالات کے اعتبار سے جہاد کے احکام میں فرق

اسلامی تاریخ اور احکام کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ حالات اور تقاضوں کے اعتبار سے جہاد کے احکامات میں فرق ہے اور ان سب حالات کے نظائر دورِ نبوت میں پائے جاتے ہیں لہٰذا دنیا میں جہاں بھی جس طرح کے حالات پیش آئیں گے ان کا دور نبوت کے تدریجی حالات سے موازنہ کر کے حکم متعین کیا جائے گا اب یہ حالات اجمالی طور پر چار طرح کے ہو سکتے ہیں :

حالت (۱) : کسی جگہ کے مسلمان نہایت کمزور ہوں ان کے پاس مقابلہ کی بالکل طاقت نہ ہو اور ملک کا اقتدارِ اعلیٰ غیروں کے ہاتھ میں ہو ایسی صورت میں ان کے لئے صبر کرنا یا اس جگہ کو چھوڑ کر دوسری جگہ ہجرت کرنے کا حکم ہے جہاد کرنے یا لڑنے کا حکم نہیں ہے جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب تک مکہ معظّمہ میں رہے آپ کو جہاد کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ صبر اور درگذر کرنے کی تعلیم دی گئی۔

حالت (۲) : اگر کسی جگہ مسلمانوں کو کچھ طاقت حاصل ہو اور وہ اس پوزیشن میں ہوں کہ اپنے ظالم دشمنوں سے مظالم کا بدلہ لے سکیں اور پیشگی طور پر ان کی طرف سے پیش آمدہ خطرات کا دفاع کر سکیں تو انہیں اجازت ہے کہ وہ حسبِ مصلحت ظالموں کی گھیرا بندی کریں اور ان کو نقصان پہنچائیں لیکن ایسا کرنا صرف جائز ہے ضروری نہیں، جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمانے کے بعد جب مدینہ منورہ میں اسلامی مرکز کی تشکیل ہوگئی تو آپ نے ان کفارِ مکہ کو سبق سکھانے کیلئے جنہوں نے تیرہ سال تک مسلمانوں کو ظلم وستم کا تختۂ مشق بنایا تھا بدر کے میدان میں مقابلہ کیا اور فتح حاصل کی۔ یہ جہاد کی مشروعیت کا پہلا مرحلہ ہے۔

حالت (۳) : اگر مسلمانوں کا اپنا مرکز قائم ہو اور ان کے پاس معتد بہ طاقت بھی ہو تو اب اگر کوئی ان پر حملہ کی ابتدا کرے اور ظلم پر اتارو ہو جائے اور عدل وانصاف کو بالائے طاق رکھ دے تو ایسی صورت میں ان مسلمانوں پر شرعاً یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ دشمن کے ظلم پر خاموش نہ رہیں بلکہ اپنی طاقت کے بقدر ظالموں کا مقابلہ کرنے کے لئے میدان میں آئیں یہ ان کی شرعی ذمہ داری ہے اسی کو دفاعی جہاد کہا جاتا ہے۔

حالت (۴) : اگر واضح طور پر کسی ملک میں اسلام کو غلبہ حاصل ہو جائے اور کفار بالکل مغلوب ہو جائیں تو ایسی صورت میں اسلامی سلطنت کے استحکام کی ہر ممکن کوشش کی جائیگی اور کفار سے اس وقت تک جہاد کیا جاتا رہے گا تا آنکہ وہ اسلامی نظام قبول کر لیں یا جزیہ دینے پر راضی ہو جائیں، تاہم اس کا منشا لوگوں کو جبراً مسلمان بنانا ہرگز نہیں بلکہ اللہ کی زمین پر اللہ کے قانون کو جاری کرنا ہے یہ وہ مرحلہ ہے جو دورِ نبوت میں فتح مکہ کے بعد جزیرۃ العرب میں مسلمانوں کو حاصل ہوا۔ (تلخیص تکملۂ فتح الملہم ۳/ ۵-۸)

اس تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ اسلام میں مسلمانوں کو یہ حکم ہرگز نہیں دیا گیا کہ جس کافر کو جہاں پائیں قتل کر ڈالیں بلکہ ان کو اصول وقانون کا پابند بنایا گیا ہے اس سے تجاوز کرنا کسی شخص کیلئے جائز نہیں ہے اگر کوئی بے اصولی کرے گا تو سخت سزا کا مستحق ہو گا چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی ذمی (یعنی اسلامی حکومت میں امن لیکر رہنے والے غیر مسلم شہری) کو خواہ مخواہ قتل کر دے تو وہ جنت کی خوشبو بھی نہ سونگھ پائیگا اگر چہ جنت کی خوشبو چالیس سال کی مسافت سے آنے لگتی ہے۔ (مشکوٰۃ شریف/۲۹۹) لہٰذا جہاد اور غیر مسلموں کے حقوق کے بارے میں حکم عدولی کی کسی کو اجازت نہیں ہے۔

جہاد کے حکم کا پس منظر

پھر یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہئے کہ کس تکلیف دہ صورت حال اور اندوہ ناک، نا قابل تصور اذیتوں کے تحمل کے بعد اسلام میں جہاد کی اجازت اور اس کا حکم دیا گیا؟ مکہ کے مشرکین نے اسلام لانے والوں پر ابتداء میں کس طرح کے مظالم ڈھائے کس طرح ان پر عرصۂ حیات تنگ کیا گیا، راہ میں کانٹے بچھائے گئے، زدوکوب کیا گیا، بدن پر غلاظتیں ڈالیں گئیں، طعن وتشنیع اور ہرزہ سرائیوں کی حد کر دی گئی، حتی کہ لوگوں کو جان بچانے کیلئے مکہ سے ہجرت کر کے جانا پڑا۔ اور دین کے تحفظ کیلئے اپنے وطن کو قربان کرنا پڑا۔ یہ وہ سنگین حالات تھے جن کے پس منظر میں ہجرت مدینہ کے بعد ظالموں سے جہاد کا حکم دیا گیا۔ کیوں کہ یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ اگر ظالموں کی قوت کو

توڑا نہ گیا تو یہ کہیں بھی دنیا میں مسلمانوں کو امن وسکون سے رہنے نہ دیں گے اور ہر جگہ فتنہ انگیزی پر آمادہ رہیں گے اس لئے ضروری تھا کہ اپنے وجود کے تحفظ کے لئے ظالموں کو نیست ونابود کیا جائے۔

وشو ہندو پریشد کے دریدہ دہن لیڈروں کو وہ آیتیں تو خوب یاد رہیں جن میں ظالم کفاّر کو پکڑ پکڑ کر مارنے کا حکم ہے اور ان ظالموں نے تیرہ سال تک مکہ میں مسلمانوں کے ساتھ جو انسانیت سوز حرکتیں کیں وہ بھول گئے؟ ظالموں کی طرف سے یہ چشم پوشی وہی کر سکتا ہے جس کے ہاتھ خود ظلم وتشدد میں لت پت ہوں اور جو خود دنیا میں ظلم وناانصافی اور حق تلفی کا سنگین مجرم ہو، ورنہ کوئی بھی عدل وانصاف کے جذبات رکھنے والا شخص ظالموں کی بیخ کنی کی کسی سخت سے سخت کارروائی کو بھی خلاف انسانیت قرار نہیں دے سکتا۔

مسلمان پر کفار مکہ کے بدترین مظالم کی چند جھلکیاں

اسلام کی ابتداء میں مکہ معظّمہ میں تیرہ سال کا طویل عرصہ اس طرح گذرا کہ دشمنوں کی طرف سے کسی دن بھی انہیں چین نصیب نہ ہوا، قدم قدم پر روڑے اٹکائے گئے اور زندگی اجیرن کر دی گئی۔ ان انسانیت سوز مظالم کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا، اور نہ اس دور کے ایک ایک واقعہ کو یاد کرنے کا کوئی خاص اہتمام رکھا گیا لیکن پھر بھی جو اِکّا دُکّا واقعات تاریخ وسیر کی کتابوں میں محفوظ ہو گئے وہ انتہائی روح فرسا اور رونگٹے کھڑے کرنے والے ہیں۔ ایسے ہی چند واقعات کی طرف اشارات ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں:

- پیغمبر علیہ السلام پر کوڑا اکرکٹ ڈالا جاتا تھا۔ (الروض الانف ۲/۴۰، حیاۃ الصحابہ ۱/۲۸۰)
- آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے دروازے پر غلاظتیں اور خون آلودہ کپڑے ڈالے جاتے تھے۔ (الروض الانف ۲/۴۰)
- ایک مرتبہ مکہ کے سردار امیہ بن خلف کے کہنے پر ایک کافر عقبہ نے آپ کے چہرۂ انور پر اپنا تھوک ڈال کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت پہنچائی۔ (الروض الانف ۲/۴۰)

- ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ شریف کے قریب نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک بدترین کافر عقبہ ابن ابی معیط نے سجدہ کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گردن پر اس زور سے اپنا قدم رکھا کہ آپؐ کی آنکھیں باہر نکلنے کو ہو گئیں۔ (الروض الانف ۲/۴۰)
- ایک مرتبہ نماز کے دوران جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں تشریف لے گئے تو شقی القلب عقبہ ابن ابی معیط نے ابوجہل کے حکم پر اونٹ کا غلیظ اوجھ آپ کی کمر پر رکھ دیا کہ آپؐ سر نہ اٹھا سکے اور یہ منظر دیکھ کر مکہ کے بڑے بڑے کفار سامنے کھڑے کھڑے ٹھٹھول کرتے رہے۔ (مسلم شریف ۲/ ۱۰۸)
- ایک مرتبہ اسی لعین عقبہ ابن ابی معیط نے نماز پڑھتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گلے میں کپڑا ڈال کر اتنی زور سے کھینچا کہ آپ کا دم گھٹنے لگا اور بمشکل تمام حضرت ابوبکرؓ نے دھکا کر عقبہ کو ہٹایا تو وہ کفار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر حضرت ابوبکرؓ پر لپٹ گئے اور ان کے سر اور داڑھی کے بال اکھیڑ ڈالے۔ (الروض الانف ۲/۴۰)
- ایک مرتبہ کفار نے آپ ﷺ کو اس قدر زدوکوب کیا کہ آپ بے ہوش ہو گئے۔ (حیاۃ الصحابہ ۱/ ۲۸۴)
- شعب ابی طالب میں آپ کا پورے خاندان سمیت سخت ترین بائیکاٹ کیا گیا اور تین سال تک نہایت تنگی اور تکلیف میں وقت گذارا۔ (البدایۃ والنہایۃ ۳/ ۹۱)
- طائف میں آپؐ کے ساتھ نہایت وحشیانہ اور انسانیت سوز حرکتیں کی گئیں۔ اور آپؐ پر اس قدر پتھراؤ کیا گیا جس سے آپؐ کا پورا بدن لہولہان ہو گیا۔ (بخاری شریف ۱/ ۴۵۸، حیاۃ الصحابہ ۱/ ۲۹۱)
- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا پختہ منصوبہ بنایا گیا اور طے کیا گیا کہ سب قبائل کے نمائندے مل کر آپ کو شہید کریں گے، لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ محفوظ رکھا اور آپ بحفاظت ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ (الانفال: ۳۰)
- سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جب سب سے پہلے اسلام کی دعوت دی تو کفار نے انھیں مار مار کر بے ہوش کر دیا، ایک کافر عتبہ بن ربیعہ آپ کے پیٹ پر چڑھ کر کودتا رہا اور

اپنے جوتے سے آپ کے چہرے پر وار کرتا رہا، جب آپ کے خاندان والے آپ کو اٹھا کر گھر لے گئے تو سخت ضرب کی وجہ سے سب یہی سمجھ رہے تھے کہ اب آپ زندہ نہ بچیں گے۔ (البدایۃ والنہایہ ۳/۵۳)

- سیدنا حضرت بلال حبشیؓ کو محض اسلام لانے پر امیہ ابن خلف نے یہ سزا دی کہ مکہ کی سخت تپتی ہوئی دھوپ میں گرم زمین پر لٹا کر سینے پر بھاری پتھر رکھدیتا اور کہتا ''کہ یا تو دوبارہ کفر قبول کرو ورنہ اسی طرح تمہاری موت آجائے گی'' اور حضرت بلالؓ پوری استقامت سے وحدانیت کا نعرہ بلند فرماتے رہتے۔ (البدایۃ والنہایہ ۳/۶۴) اور کبھی مکہ کے اوباش لڑکوں کے حوالے کر دیا جاتا وہ آپ کو مکہ کی گلیوں میں گھسیٹتے پھرتے تھے۔ (حیاۃ الصحابہ ۳/۳۰۶)
- سیدنا حضرت عثمان غنیؓ نے جب اسلام قبول کیا تو آپ کے چچا حکم بن العاص نے آپ کو ایک ستون سے باندھ دیا کہ جب تک اسلام نہ چھوڑو گے تمہیں نہ کھولونگا مگر حضرت عثمانؓ کی استقامت دیکھ کر اسے کھولنا پڑا۔ (حیاۃ الصحابہ ۱/۳۰۳)
- ایک مرتبہ کفار نے محض قرآن کریم بلند آواز سے پڑھنے پر سیدنا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو اس قدر مارا کہ آپ کے چہرے پر نشانات پڑ گئے۔ (الروض الانف ۲/۸۰)
- حضرت عمار بن یاسرؓ، ان کے والد حضرت یاسرؓ، اور ان کی والدہ حضرت سمیہؓ کو کفار انگاروں پر لٹاتے تھے جس سے ان کے کمر کی چربی تک پگھل جاتی اور یہ لوگ بے ہوش ہوجاتے، حضرت یاسرؓ انہی مصائب کی بنا پر وفات پاگئے، اور حضرت سمیہؓ کی شرم گاہ میں ابوجہل نے برچھی ماری جس سے آپ شہید ہوگئیں، حالانکہ آپ اس وقت نہایت بوڑھی اور ضعیفہ تھیں، ملعون ظالم نے بڑھاپے پر بھی ترس نہ کھایا۔ (حیاۃ الصحابہ ۱/۳۰۸، سیرت المصطفی ۱/۲۲۷)
- حضرت خبابؓ کو دہکتے انگاروں پر لٹا کر سینے پر پیر رکھدیا جاتا تا کہ ہل جل نہ سکیں اور وہ انگارے بدن کی چربی پگھلنے سے بجھ جاتے تھے اسی بنا پر آپ کی پیٹھ پر سفید داغ ہوگئے تھے۔ (حیاۃ الصحابہ ۱/۳۰۹)

- حضرت زبیر بن العوامؓ کو اسلام لانے پر ان کے چچا چٹائی میں لپیٹ کر دھواں چھوڑ دیتے تھے۔(سیرۃ المصطفی ۱/ ۲۳۶)
- لعین ابوجہل کی اسلام دشمنی کا حال یہ تھا کہ اسے جب یہ پتہ چلتا کہ مکہ کا کوئی شخص مسلمان ہو گیا ہے تو اگر وہ اسلام لانے والا شخص عزت دار ہوتا تو جا کر اس کی ڈانٹ ڈپٹ کرتا اور اس کی عزت خراب کرنے کی کوشش کرتا، اور اگر تاجر ہوتا تو کہتا کہ میں تیری تجارت چلنے نہ دوں گا اور تیرا کاروبار تباہ کر دوں گا، اور اگر اسلام لانے والا شخص کمزور ہوتا تو اس کی پٹائی کرتا اور دھمکیاں دیتا تھا۔(الروض الانف ۲/ ۸۷)
- انہی تنگیوں اور ایذا رسانیوں سے تنگ آ کر بہت سے مسلمان حبشہ کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے، مگر کفار مکہ نے حبشہ تک ان لوگوں پیچھا کیا اور شاہ حبشہ سے مطالبہ کہ وہ ان مسلمانوں کو اپنے یہاں پناہ نہ دیں۔(سیرت ابن ہشام ۱/ ۹۰)

یہ تو چند نمونے تھے جو کسی طرح تاریخ میں محفوظ رہ گئے ورنہ اس سے بھی زیادہ سنگین مظالم مسلمانوں پر روا رکھے گئے، اور مکہ معظّمہ میں ان کا ناطقہ بند کر دیا گیا۔

آخر مسلمانوں کا قصور کیا تھا ؟

مہذّب دنیا میں ہر شخص کو نظریاتی اعتبار سے فکری آزادی حاصل ہوتی ہے اور کسی شخص کو محض اس کے ذاتی نظریہ اور عقیدہ کی بنا پر مستوجب سزا نہیں سمجھا جاتا، اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ ان مسلمانوں کو کفار مکہ نے جن مظالم کا تختۂ مشق بنایا اس کی بنیاد کیا تھی؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ہاتھ پر ایمان لانے والوں نے مکہ والوں کا آخر کیا بگاڑا تھا؟ یہ حضرات نہ تو وہاں کے سرداروں کی حکومت میں کوئی خلل ڈال رہے تھے، نہ مالداروں کے مال و دولت میں کسی حصہ کے طالب تھے، وہ تو محض ایک نظریہ کو لیکر اُٹھے تھے اور وہ نظریہ یہ تھا کہ ’’ایک خدائے واحد کی پرستش کی جائے اور اس کا ہمسر کسی کو قرار نہ دیا جائے‘‘ اس نظریہ کو قبول کر لینے سے کسی کا کوئی نقصان لازم نہیں آ رہا تھا اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کوئی جبر بھی نہیں تھا آپ دعوت پیش فرماتے جو مان لیتا اُسے قبول کر لیتے اور جو نہ مانتا اس کے پیچھے نہ پڑتے تھے۔

لیکن یہ سیدھا سادہ سچا نظریہ کفار مکہ سے ہضم نہ ہوسکا، اور پیغمبر ﷺ کے دلائل کا کوئی معقول جواب تو ان کے پاس تھا نہیں لہذا سنجیدگی سے گفتگو کے بجائے ہٹ دھرمی اور کمینہ پن پر اتر آئے، جیسا کہ ہر زمانہ کے فسطائیت پسند لوگوں کا یہی وطیرہ رہا ہے کہ جب وہ دلائل اور معقولیت میں ہار جاتے ہیں تو ''جوتم پیدار'' پر اتر آتے ہیں موجودہ دور میں بھی دشمنان اسلام کے کرتوت کچھ اسی طرح کے ہیں، اب خود ہی عقل وانصاف سے غور کیا جائے کہ اگر اسلام نے بعد میں ان بے قصوروں کو یہ اجازت دی کہ اُن کفار سے جنگ کریں جنھوں نے خواہ مخواہ بلاکسی وجہ کے ان پر ظلم کے پہاڑ توڑے تھے تو آخر کیا ایسا کیا برا کام کیا جس پر آسمان سر پر اٹھالیا جائے؟ ایسے ظالموں کا علاج تو سیدھی سادی باتوں سے ہونے والا تھا ہی نہیں، اگلے تجربات نے اس حقیقت کو سچ کر دکھا دیا کہ جب تک مسلمان اپنے حق کیلئے سر بکف میدان میں نہیں آئے ان کفار کی شرارتوں میں کمی نہیں آئی۔

صلح حدیبیہ کس نے توڑی ؟

اسلام کی امن پسندی کی حد یہ ہے کہ ہجرت فرمانے کے چھ سال بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ کی نیت سے صحابہ کے ساتھ مکہ کا سفر فرمایا تو مکہ کے کافروں نے حدیبیہ کے مقام پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو روک دیا اور عمرہ کے لئے مکہ میں داخل نہیں ہونے دیا آپ نے بہت کہا کہ ہمارا مقصد کوئی جنگ نہیں، ہم احرام باندھ کر آئے ہیں، عمرہ کر کے ہم واپس چلے جائیں گے مگر یہ ضدی اور ہٹ دھرم ظالم مان کر نہیں دیئے، بالآخر بعد میں مسلمانوں نے بظاہر دب کر ایک ناجنگ معاہدہ کیا جسے ''صلح حدیبیہ'' کہا جاتا ہے، اس میں یہ طے کیا گیا تھا کہ آئندہ دس سال تک کفار مکہ سے کوئی جنگ نہیں ہوگی اور یہ کہ اگر کوئی کافر مسلمان ہوکر مدینہ چلا جائیگا تو اسے مدینہ میں رہنے نہیں دیا جائے گا اس کے برخلاف اگر کوئی مسلمان مرتد ہوکر مکہ آجائیگا تو اس کی واپسی ضروری نہ ہوگی، اسی طرح یہ بھی طے ہوا تھا کہ عرب کے قبائل میں سے جو قبیلہ چاہے مسلمانوں سے یا قریش مکہ سے دوستی کا معاہدہ کرلے چنانچہ بنوخزاعہ نے مسلمانوں سے اور بنوبکر نے کفار سے معاہدہ کرلیا، اس معاہدہ کی رو سے یہ لازم تھا کہ کوئی فریق دوسرے فریق پر حملہ نہ کرے، لیکن ابھی دو ہی سال

گذرے تھے کہ قریش مکہ نے معاہدہ کو پاش پاش کرتے ہوئے اپنے حلیف بنوبکر کا خفیہ طور پر تعاون کر کے بنوخزاعہ پر حملہ کر دیا اور ان پر ظلم وتعدی کا بازار گرم کیا جس کی وجہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جوابی کارروائی کرتے ہوئے مکہ کر طرف کوچ کرنا پڑا، اور اللہ نے فتح عطا فرمائی۔

(مستفاد سیرت ابن ہشام مع الروض الانف ۴/۱۴۱ وغیرہ)

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مکہ والوں کی سرشت میں مسلمانوں سے بغض وعناد اوران کی ایذا رسانی کے جذبات کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے اور انہوں نے امن انصاف کے تمام تقاضوں کو بالائے طاق رکھ دیا تھا، لہذا ان کے خلاف جنگ کا اعلان دنیا میں امن وامان کی بقا کے لئے ناگزیر تھا، اوراس طرح کی صورت حال دنیا میں جب بھی اور جہاں بھی پائی جائے گی اس کے تدارک کے لئے کارروائی کرنا لازم اور ضروری ہوگا اسی کارروائی کا نام ''جہاد'' ہے جو قیامت تک باقی اور جاری رہے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

اسلام میں عہد کی پاس داری کا حکم

اسلام کی ایک اہم تعلیم یہ ہے کہ اگر کسی فرد یا جماعت یا قوم سے کوئی معاہدہ کرلیا گیا تو اس معاہدہ کی خلاف ورزی جائز نہیں اگر چہ یہ معاہدہ غیر مسلموں کے ساتھ کیوں نہ ہو۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدعہدی اور غداری کی مذمت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ: ''میدان محشر میں ہر غدار کی غداری کے بقدر ایک جھنڈا اس کے ساتھ لگا دیا جائے گا (جو اس کی سخت رسوائی کا سامان ہوگا)۔ (مسلم شریف ۲/۸۳)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منوّرہ تشریف لائے تو آپ نے مدینہ کے اطراف میں رہنے والے قبائل سے ایک مشترکہ معاہدہ کیا جسمیں ہر شہری کے جان ومال کے تحفظ اور دشمن سے بچاؤ کے لئے مشترک اقدام کرنے کیلئے عہد لیا گیا تھا۔ چنانچہ جب تک متعلقہ فریق اس معاہدہ پر کاربند رہے اور انہوں نے عہد نہیں توڑا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی انکے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ بعد میں جو بھی کارروائی ہوئی انکے عہد توڑنے کے بعد ہوئی۔ اسی طرح جب

کفار مکہ سے صلح حدیبیہ ہوگئی تو جب تک کفار مکہ عہد کے پابند رہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کوئی جنگ نہیں کی۔ جو بھی جنگ ہوئی انکے عہد توڑنے کے بعد ہوئی۔

اور یہی حکم قیامت تک باقی ہے کہ جو مسلمان جب بھی اور جہاں بھی کسی عہد سے وابستہ ہوں تو انھیں اس عہد کی پابندی لازم ہے۔ جب تک وہ عہد موجود ہے اسکی خلاف ورزی انکے لئے صحیح نہیں ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کی شرعی حیثیت

ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کی شرعی پوزیشن یہ ہے کہ یہاں کا ہر شہری ایک جمہوری دستور کا پابند ہے۔ مسلمان بھی اس جمہوری آئین کو قبول کرتے ہیں جس میں ملک کے ہر شہری کے جان و مال کی تحفظ کی ضمانت دی گئی ہے۔ لہذا اس عہد کی پاسداری کرتے ہوئے جب تک بھی یہ دستور موجود ہے یہاں کے رہنے والے مسلمانوں کو یہ اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ ملک کے غیر مسلم بے قصور شہریوں پر کسی طرح کا جانی یا مالی ظلم کریں۔ ہاں اگر کوئی فرد یا جماعت دستور کو توڑتے ہوئے خواہ مخواہ مسلمانوں پر ظلم وستم کرنے لگے تو پھر مسلمانوں کو اپنے دفاع کا حق یقیناً حاصل ہوگا اور ایسے مجرموں کو جو ملک کے دستور کی دھجیاں اڑائیں سبق سکھانے کیلئے ہر قانونی راستہ اپنانے کی اجازت ہوگی۔ تاہم یہ کاروائی صرف قصورواروں تک محدود رہنی چاہئے اور جو غیر مسلم شہری امن پسندی کے ساتھ یہاں صدیوں سے رہتے چلے آرہے ہیں انکے جان و مال پر کسی قسم کی دست درازی کی اجازت نہ ہوگی۔

لہٰذا وشو ہندو پریشد نے جو آیات قرآنیہ پیش کی ہیں انکا زیادہ تر تعلق معاہدہ کے حالات سے نہیں بلکہ جنگ کے حالات سے ہے۔ اس لئے ان آیات کی وجہ سے ہمارے ہندوستانی غیر مسلم شہریوں کو خوف زدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ یہ غیر مسلم شہری مسلمانوں کے ساتھ ایک عہد میں مربوط ہیں، جس کی پاس داری ہر مسلمان پر ضروری ہے۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ خود بھی امن سے رہیں اور دوسروں کو بھی امن سے رہنے دیں، ان آیات کا ہندوستان کے موجودہ حالات پر انطباق کر کے مغالطہ پیدا کرنا شر انگیزی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

آج دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟

آج سارے عالم میں مسلمانوں پر ظلم کا بازار گرم ہے۔ بوسنیا میں کئی سال منظّم طور پر مسلمانوں کی نسل کشی کی گئی اور انکی عورتوں کی بر سر عام بے حرمتی کر کے ذلیل کیا گیا ہے. کوسووا میں اب تک مسلم خون رِس رہا ہے۔ چیچنیا میں خونخوار روسی فوجیں چیچن حریت پسندوں کو تہ تیغ کر رہی ہیں، ہندوستان میں گجرات جیسے شرمناک واقعات پیش آرہے ہیں، انڈونیشیا، اور فلپائن وغیرہ میں عیسائی دہشت گرد تنظیمیں مسلمانوں کے خون کی ہولی کھیل رہی ہیں، اور اس سے بڑھ کر تقریبا تمام ہی یورپین عوام کی پشت پناہی کے ساتھ عالم عرب کے درمیان اسرائیل، فلسطینیوں پر ۵۰ سال سے مسلسل قہر ڈھا رہا ہے، اب تک ہزاروں فلسطینی جام شہادت نوش کر چکے ہیں اور برابر یہ سلسلہ جاری ہے، اور اب سارا عالم عراق پر حملہ کے لئے پَر تول رہا ہے۔ ایسے مسلسل مظالم کو روکنے کے لئے اگر کوئی مسلمان اسلامی ہدایات کی روشنی میں ''جہاد'' کا نعرہ لگائے اور اسلامی حکومتوں کو اپنا فرض منصبی یاد دلائے تو آخر اسے خلاف انصاف کہکر مورد الزام کیسے ٹھہرایا جا سکتا ہے؟ جب بین الاقوامی قانون میں ہر فرد اور ہر قوم کو اپنے دفاع کا حق حاصل ہے تو آخر مسلمانوں کو کیوں حق نہیں کہ وہ اپنے حقوق کے تحفظ اور اپنے دفاع کے لئے جدوجہد کریں؟

اقوام متحدہ! ظلم کا سرچشمہ

آج اقوام متحدہ جس کے قیام کا مقصد بظاہر دنیا میں امن کا قیام بتایا گیا ہے۔ لیکن دیکھا جائے تو یہ جماعت دراصل چند طاقت ور سامراجی ممالک کے اقتدار اور انکے توسیع پسندانہ عزائم کی تکمیل کے لئے وجود میں آئی ہے، اور آج تک صرف اور صرف اسی ایجنڈے پر عمل پیرا ہے۔ اس کا ریکارڈ یہ ہے کہ اگر کوئی کمزور مسلمان ملک اسکی کسی قرارداد کی تعمیل میں ذرا بھی پس وپیش کردے تو فوراً اسکا امن خطرہ میں پڑ جاتا ہے اور ساری سامراجی اقوام علی علی کر کے کمزور کو تباہ اور غارت کر دیتی ہیں جیسا کہ افغانستان کا حشر کیا گیا، اور لعین اسرائیل دسیوں سال سے اقوام متحدہ کی

قراردادوں کو ردی کھاتے میں ڈالکر دنیا کے سینے پر مونگ دَل رہا ہے مگر اس سے اقوام متحدہ کی غیرت کو کبھی جوش نہیں آتا بلکہ اسرائیل کی در پردہ مدد برابر جاری رکھی جاتی ہے، اسی طرح اس جماعت کا حال یہ ہے کہ دنیا کے ترقی یافتہ سامراجی ممالک کتنے ہی خطرناک تباہی کے ہتھیار بنالیں انکے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیا جاتا اور نہ انکے ہتھیاروں کی تباہی کا کوئی انتظام کیا جاتا ہے، اور بے چارے عراق، ایران، یا شمالی کوریا جیسے ممالک اپنے دفاع کے لئے کچھ ہتھیار تیار کرنے لگیں تو محض شبہ کی بنیاد پر ہی پوری اقوام متحدہ انکے خلاف غرّانے لگتی ہے، اور انکو معاشی شکنجہ میں کَس کر انکی اقتصادیات تباہ کر دیتی ہے، اسی طرح اس جماعت میں دنیا کے پانچ بڑے ممالک کو ''ویٹو پاور'' دیکر بدترین تعصب، امتیاز اور ناانصافی کا ارتکاب کیا گیا ہے، کیا اسلامی ممالک اس قابل نہیں کہ انہیں ویٹو پاور (حق تنسیخ) مل سکے، کیا ساری عقل دنیا میں انہی پانچ ممالک کے پاس ہے؟ اور بقیہ پوری دنیا ان جیسے شعور سے محروم ہے؟ بات اصل میں یہ ہے کہ یہ ''چند ممالک کا ٹولہ'' اقوام متحدہ کے ذریعہ پوری دنیا کا استحصال کر کے ساری اقوام عالم کو اپنا غلام بنانے کے لئے سرگرداں ہے، ورنہ قانون اور انصاف کی رو سے اس طرح کے امتیاز کی کوئی گنجائش نہیں ہے، آج دنیا میں جہاں بھی مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہے انکی سرپرستی سب وہی طاقتیں کر رہی ہیں جنھیں اقوام متحدہ میں ویٹو پاور حاصل ہے۔ وہ سمجھتی ہیں کہ چونکہ ہمارا کوئی کچھ بگاڑ نہیں سکتا لہذا جی بھر کر مسلمانوں کے خون سے اپنی پیاس بجھائی جائے۔ اور جب تک یہ صورت حال رہے گی قومی حیثیت سے مسلمانوں کو دنیا میں امن فراہم نہیں ہوسکتا۔

ایسی مایوس کن صورت میں اگر کوئی شخص صدائے احتجاج بلند کرے اور اس کھلی ہوئی بے انصافی کے خلاف آواز اٹھانے کے لئے جہاد کرے اور مسلمانوں کو ایک متحدہ اسلامی مرکز اور ''اسلامی بلاک'' بنا کر اقوام متحدہ کی ناانصافیوں کا مقابلہ کرنے کی دعوت دے تو یہ ''دہشت گردی'' نہیں بلکہ عین تقاضائے انصاف ہوگا۔

اسلام کی تعلیمات آفاقی ہیں

اسلام کوئی عارضی اور وقتی مذہب نہیں بلکہ وہ تا قیامت اپنی اصلی شکل وصورت میں باقی رہنے والا مذہب ہے، لہذا الازمی طور پر اس کی تعلیمات ہر جگہ اور زمانہ کے لئے عام ہیں، اور ہر وقت کے لئے اس میں رہنمائی کی گئی ہے موجودہ زمانہ اور حالات میں بھی قرآن کریم اور پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کی زندگی امت کے لئے مشعل راہ ہے، ایسے مظالم کے ماحول میں اسلام یہ تعلیم دیتا ہے کہ ان طاقتوں سے تعلقات ختم کر لئے جائیں جن کے ہاتھ مسلمانوں کے خون سے رنگین ہیں، اور کسی مرحلہ پر بھی انکا ساتھ نہ دیا جائے، آج اگر سارے اسلامی ممالک متحد ہو کر ظالموں سے ناطہ توڑ لیں اور انجمن اقوام متحدہ سے بے دخل ہو جائیں اسی دن اقوام متحدہ کو اپنی اوقات کا پتہ چل جائے گا اور ظالموں کا سارا غرور ٹوٹ جائے گا یہ کمزوری مسلم حکومتوں کی ہے کہ وہ اپنے بھائیوں کی مظلومیت پر خاموش رہ کر اور اسلامی ہدایات کو روبہ عمل نہ لا کر ظالموں کے ہاتھ مضبوط کر رہی ہیں جسکی بنا پر ظالموں کے حوصلے بلند ہو رہے ہیں جب تک مسلمان جرأت دکھا کر اس طرح کا اقدام نہ کریں گے اس وقت تک انہیں عزت نصیب نہیں ہوگی، اور وہ برابر ذلیل وخوار ہوتے رہیں گے، اور دراصل ہماری اسی کمزوری کی وجہ سے آج وشو ہندو پریشد جیسی جماعتوں کو قرآن پر اعتراض کا موقع ملا ہے، اگر ہماری پوزیشن مضبوط ہوتی تو یہ بزدل کبھی بھی قرآن اور اسلام کے خلاف ایسی گندی زبان کا استعمال کرنے کی جرأت نہ کر پاتے۔ **العیاذ باللہ.**

آج ضرورت ہے

واقعۃً آج اس بات کی ضرورت ہے کہ غیر مسلم حضرات تعصب کی عینک اتار کر آیات قرآنیہ اور اسلامی احکامات کا مطالعہ کریں، اور ساتھ میں مسلمانوں کی موجودہ حالت پر بھی غور کریں اور اقوام عالم کی طرف سے امت مسلمہ پر جو برابر مظالم ہوتے آئے ہیں اور ہو رہے ہیں، ان پر بھی انصاف کے ساتھ نظر ڈالیں اور پھر فیصلہ کریں کہ حالات کے تقاضے کیا ہیں؟ اور دنیا میں امن کیسے

قیام ہوسکتا ہے؟ خالی مسلمانوں کو''دہشت گرد'' کہنے کی رَٹ لگانے اور''نام نہاد دہشت گردی'' کے خلاف جنگ کرنے سے امن نہیں ہوسکتا، بلکہ امن کے قیام کے لئے لازم ہے کہ بدامنی کی بنیاد یعنی''ظلم تشدد'' پر بند لگایا جائے اور ظالموں کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے، ظاہر ہے کہ آج اگر فلسطین، چیچنیا، بوسنیا، کوسوا، افلپائن، نائجیریا وغیرہ میں مسلمانوں پر ظلم کے سلسلہ کو بند کردیا جائے تو پھر نہ کسی جنگ کی ضرورت ہوگی اور نہ کسی کی حق تلفی ہوگی، مگر یہ مظالم بدستور جاری رہیں اور پھر مسلمانوں سے یہ توقع کیجاتی رہے کہ وہ کوئی آواز بھی نہ نکالیں اور خاموشی سے ظلم سہتے رہیں تو یہ نہیں ہوسکتا، کیونکہ ظلم جب پھیلتا ہے تو انتقام کی آگ کو بھڑکنے سے روکا نہیں جاسکتا، اس لئے ہمارے برادران وطن کو اشتعال میں آنے کے بجائے پوری سنجیدگی سے حالات پر نظر ڈالنی چاہیۓ اور حق وانصاف کے نظریہ کو قبول کرنا چاہیۓ۔

دوسری طرف خود مسلمانوں کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ اپنے اعلیٰ کردار اور امتیازی اخلاق کا مظاہرہ اپنے غیر مسلم بھائیوں کے ساتھ کریں، تاکہ ان کے دلوں سے نفرت کا غبار چھٹ سکے اور دشمنوں نے جو خمار انکے دماغ میں بھردیا ہے اسکو مٹایا جاسکے، یہی امن کا راستہ ہے، اسکے بغیر امن کا تصور نہیں کیا جاسکتا، اللہ تعالیٰ سارے عالم میں امن وامان قائم فرمائے، فتنہ پروروں کی فتنہ انگیزیوں سے انسانیت کو محفوظ رکھے، اور ظالموں کو ان کے انجام تک پہنچائے۔ آمین۔

(ندائے شاہی، دسمبر ۲۰۰۲ء)

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

''ہندو رائٹرس فورم'' نئی دہلی نے قرآن کریم کی ان ۲۴ آیات کا ترجمہ جاری کیا ہے جو ہندو شدت پسندوں کے نزدیک قابل اعتراض ہیں، اور جن کے رہتے ہوئے انکے بقول مسلمانوں اور غیر مسلموں میں باہمی رواداری اور اعتماد پیدا نہیں ہوسکتا، ان اعتراضات کا اصولی جواب ''ندائے شاہی'' (دسمبر ۲۰۰۲ء) میں شائع ہوا تھا اب مزید وضاحت کے لئے مذکورہ ۲۴ آیات کی تشریح تفسیر وحدیث کی روشنی میں پیش کی جارہی ہے جس سے اندازہ لگایا جاسکے گا کہ یہ اعتراضات کس قدر بے وزن اور حقیقت سے دور ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں :

ظالم کفار کو سبق سکھانے کا حکم

آیت نمبر (۱) فَإِذَا انسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَإِن تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَوٰةَ وَآتَوُا الزَّكَوٰةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ. (سورۃ توبہ آیت ۵)

ترجمہ: اور جب اشہر حرم (امن کے مہینے) گذر جائیں تو ان مشرکین کو جہاں پاؤ مارو اور باندھو اور داؤ گھات کے موقعوں میں ان کی تاک میں بیٹھو، پھر اگر کفر سے توبہ کرلیں اور نماز پڑھنے لگیں، اور زکوۃ دینے لگیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو، واقعی اللہ تعالی بڑی مغفرت کرنے والے بڑی رحمت کرنے والے ہیں۔

پس منظر: یہ اعلان ۹ھ میں ذی الحجہ کی دس تاریخ کو کیا گیا تھا، جبکہ اسلام کو جزیرۃ العرب میں غلبہ حاصل ہو چکا تھا، کفار ومشرکین کی طاقت بالکل ٹوٹ چکی تھی اب اسلامی حکومت کے

مستقل استحکام کے لئے لازم تھا کہ ان طاقتوں کا بالکل قلع قمع کر دیا جائے جو مسلسل اور بلا وجہ اسلام دشمنی اور عہد شکنی کی مرتکب ہوتی آرہی تھیں، کیونکہ اسلام کی آمد کے بعد ۲۲ رسالہ تجربہ نے یہ باور کرا دیا تھا کہ ان دشمن مشرکین کے ساتھ نرمی کی کوئی گنجائش نہیں ہے، ان کے شر اور فتنہ سے بچنے کے لئے سختی سے نمٹنا ضروری تھا، ورنہ ان کے دوبارہ سر اٹھانے کا حقیقی خطرہ موجود تھا، اس لئے قرآن کریم میں ان مشرکین کی سرشت بیان کرتے ہوئے آگے اسی سورت میں ارشاد فرمایا ہے:

كَيْفَ وَإِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ؕ يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ. (سورة التوبة : ۸)

کیسے ان کا عہد قابل قبول ہوگا حالانکہ ان کی حالت یہ ہے کہ وہ کہیں تم پر غلبہ پا جائیں تو تمہارے بارے میں نہ قرابت کا پاس کریں اور نہ قول و قرار کا، یہ لوگ تم کو اپنی زبانی باتوں سے راضی کر رہے ہیں اور ان کے دل ان باتوں کو نہیں مانتے، اور ان میں زیادہ آدمی شریر ہیں۔

اس آیت میں جن مشرکین کی کیفیت بیان کی گئی ہے انہی جیسے شریر دشمنان اسلام کیلئے وہ حکم ہے جو اوپر آیت میں دیا گیا ہے کہ انھیں بالکل بچ کر جانے نہ دیا جائے، اس کے برخلاف جو مشرکین ایسے نہ ہوں، بلکہ وہ صلح جو ہوں اور امن اور وفاداری کے ساتھ رہنا چاہیں تو ان کے ساتھ احسان کرنے یا فدیہ یا جزیہ لیکر چھوڑ دینے کا حکم ہے جسے قرآن کریم میں سورۃ محمد کی دوسری آیت میں بیان کیا گیا ہے۔ (مستفاد الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۸/ ۴۷، ابن کثیر ۵۹۸ وغیرہ) بہر حال اس آیت کا تعلق برسر پیکار دشمنوں سے ہے عام کفار و مشرکین سے نہیں ہے اس حکم کو مطلق بیان کر کے غلط فہمی پھیلانا محض شر انگیزی ہے۔

مشرکین کی نجاست؟

آیت (۲) **يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا.** (التوبة : ۲۸)

ترجمہ : اے ایمان والو! مشرک (بوجہ عقائد خبیثہ کے) نرے ناپاک ہیں، سو یہ لوگ اس سال کے بعد مسجد حرام کے پاس نہ آنے پاویں۔

پس منظر : مشرکین مکہ، زمانہ جاہلیت سے ہی بیت اللہ شریف اور مقامات مقدسہ میں شرک و بت پرستی کی رسومات انجام دیتے آئے تھے، نیز بہت سے مشرکین مادرزاد ننگے ہونے کی حالت میں بیت اللہ شریف کا طواف کر کے گندگی پھیلاتے تھے، اس بنا پر حج ۹ رہجری کے موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا ابوبکر صدیق اور سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ذریعہ یہ اعلان کروادیا کہ اگلے سال (یعنی ۱۰رہجری) سے نہ تو کسی مشرک کو (حج کے ارادہ سے) مسجد حرام میں آنے کی اجازت ہوگی اور نہ ہی کسی شخص کو ننگے ہونے کی حالت میں طواف کرنے کی اجازت دیجائے گی۔ (تفسیر ابن کثیر ۴؍۶۰)

اور حضرات فقہاء و مفسرین کے نزدیک اس آیت میں مشرکین کی نجاست سے مراد ان کا ظاہری طور پر ناپاک ہونا نہیں ہے یعنی یہ مطلب نہیں کہ ہر مشرک کا بدن ناپاک قرار دیا جائے کہ اس کو چھونا اور ہاتھ لگانا منع ہو بلکہ اس سے عقیدہ اور جذبات کی ناپاکی مراد ہے۔ اور اس ناپاکی کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص اپنے اصل خالق و مالک کو بھول کر اپنے ہی ہاتھ سے بنائے ہوئے بتوں کو پوجنے لگے اور انہی بتوں کو اپنے لئے نفع نقصان میں مؤثر سمجھنے لگے تو ظاہر ہے کہ عقل و انصاف کی رو سے اس کی فکر کو پاک فکر ہرگز نہیں کہا جا سکتا، بلکہ اسے فکری ناپاکی سے ہی تعبیر کرنا مناسب ہوگا، چنانچہ خود ''ہندومت'' کے ویدوں میں بھی بت پرستی کی مذمت کی گئی ہے۔ لہٰذا قرآن کریم نے اگر شرک کو ناپاکی سے تعبیر کر دیا تو کوئی خلاف واقعہ بات نہیں کہی بلکہ حقیقت کو صحیح معنی میں اجاگر کر دیا ہے، اس میں کسی کو ناراض ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ اپنی اصلاح کر کے پاک ہونے کی ضرورت ہے۔

کفار کی دشمنی

آیت (۳) اِنَّ الْکٰفِرِیْنَ کَانُوْا لَکُمْ عَدُوًّا مُّبِیْنًا. (النساء ۱۰۱)

ترجمہ : بلاشبہ کافر لوگ تمہارے صریح دشمن ہیں۔

پس منظر: قرآن کریم کے نزول کے وقت کفار کی دشمنی اظہر من الشمس تھی، کفار تاک میں رہتے تھے کہ راستہ میں بھی اگر کہیں مسلمان غفلت کی حالت میں ملیں تو انھیں نقصان پہنچایا جائے۔ اسی ضمن میں یہ حکم نازل ہوا کہ چونکہ سفر کے دوران لمبی نماز پڑھنے میں کفار کی طرف سے خطرہ ہو

سکتا ہے لہذا نماز میں تخفیف کر کے قصر نماز پڑھی جائے۔ (اب نماز میں قصر کا حکم عام ہے خواہ دشمن کا خوف ہو یا نہ ہو بہر حال شرعی سفر کے وجود کے وقت قصر ہی کا حکم ہے) اور پھر اس کی علت یہ بیان ہوئی کہ کافروں کے دلوں میں اہل ایمان کی دشمنی پیوست ہے۔ (النساء ۱۰۱) اور اب پندرہ سو سال کے تاریخی تجربہ نے بھی یہ بات ثابت کر دی ہے کہ مجموعی طور پر کفار کبھی بھی مسلمانوں کے خیر خواہ نہیں رہے، ہمیشہ انھوں نے اسلام اور اہل اسلام کی جڑ کاٹنے کی کوششیں کی ہیں اور برابر کر رہے ہیں، اس لئے قرآن کریم نے ڈیڑھ ہزار سال پہلے ہی اپنے ماننے والوں کو متنبہ کر دیا تھا کہ جو لوگ تم سے کھلی دشمنی رکھتے ہیں ان سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ اس اعلان سے نفرت پیدا کرنا مقصود نہیں بلکہ اس کا منشاء ملت کو دشمنوں سے محتاط رہنے کی تاکید کرنا ہے۔ اب جو لوگ اپنے طرز عمل سے یہ ثابت کر دیں کہ وہ ملت اسلامیہ کے دشمن نہیں ہیں تو ظاہر ہے کہ قرآن ان سے خواہ مخواہ دشمنی برتنے کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ عہد کی پابندی کی تلقین کرتا ہے۔

کفار سے قتال

آیت (۴) : يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً. (التوبة ۱۲۳)

ترجمہ : اے ایمان والو! ان کفار سے لڑو جو تمہارے آس پاس رہتے ہیں، اور ان کو تمہارے اندر سختی پانا چاہیئے۔

وضاحت : یہ حکم ایک سیاسی حکمت عملی پر مبنی ہے اور وہ یہ ہے کہ جب دشمن قریب سے دور تک پھیلے ہوئے ہوں تو دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ اول قریب والوں کو زیر کیا جائے اور ان سے نپٹنے کے بعد دور والوں کو سبق سکھایا جائے اگر اس کے برعکس معاملہ کیا جائے گا تو کبھی بھی کامیابی نہ مل پائے گی، اور دوسرا حکم یہ دیا گیا کہ کبھی بھی دشمن کے مقابلہ میں کمزوری اور ڈھیلے پن کا اظہار نہ کرنا چاہیے۔ ورنہ اپنی فوجوں کے حوصلے پست ہو جائیں گے اور دشمن کے حوصلے بلند ہو جائیں گے، الغرض یہ دونوں ہدایتیں جنگی حالات سے متعلق ہیں امن اور معاہدہ کی صورت میں قتال وخونریزی کا نہ کوئی مطلب ہے اور نہ ضرورت۔ لہذا اس آیت کو نفرت انگیز قرار دینا محض غلط ہے۔

کفار کو جہنم میں عذاب

آیت (۵) اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِیْهِمْ نَارًا، کُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَیْرَهَا لِیَذُوْقُوا الْعَذَابَ، اِنَّ اللّٰهَ کَانَ عَزِیْزًا حَکِیْمًا. (النساء ۵۶)

ترجمہ : بلاشبہ جو لوگ ہماری آیتوں کے منکر ہوئے ہم ان کو عن قریب ایک سخت آگ میں داخل کریں گے جبکہ ایک دفعہ ان کی کھال جل چکے گی تو ہم اس پہلی کھال کی جگہ فوراً دوسری کھال پیدا کردیں گے تا کہ عذاب ہی بھگتتے رہیں، بے شک اللہ تعالیٰ زبردست حکمت والے ہیں۔

وضاحت :اس طرح کی آیتوں کا تعلق اسلام کے عقیدۂ آخرت سے ہے۔اسلام کی نظر میں اہل ایمان کو مرنے کے بعد جنت میں جگہ ملے گی جبکہ اسلام کو نہ ماننے والے جہنم میں جا کر عذاب میں گرفتار ہونگے اسی سخت عذاب کی ایک جھلک مذکورہ آیت میں بیان کی گئی ہے کہ جب آگ کی شدت سے مجرموں کی کھال جل جائے گی تو دوبارہ نئی کھال چڑھادی جائے گی تا کہ عذاب کا تسلسل برابر جاری رہے۔ یہ اسلام کا حتمی عقیدہ ہے جس میں واقعتہً کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں، لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ دنیا میں رہتے ہوئے کفار کو اس طرح کا عذاب دینے کی ترغیب دیجائے یا ان کو ستانے اور جلانے پر ابھارا جائے ۔اسلام دنیا میں خواہ مخواہ کے مظالم کو برداشت نہیں کرسکتا، آخرت میں جو کچھ ہوگا وہ تو مرنے کے بعد سامنے آجائے گا لیکن کفار سے دنیوی معاملات شرعی حدود کے دائرہ میں رہ کر اختیار کئے جائیں گے۔اوران کے ساتھ بھی ظلم روانہیں رکھا جائے گا۔

غیر مسلم رشتہ داروں سے تعلق کا معاملہ

آیت(۶) یٰٓاَ یُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا اٰبَآءَ کُمْ وَاِخْوَانَکُمْ اَوْلِیَاءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْکُفْرَ عَلَی الْاِیْمَانِ، وَمَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْکُمْ فَاُو لٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ. (سورۂ توبہ آیت ۲۳)

ترجمہ: اے ایمان والو! اپنے باپوں کو، اپنے بھائیوں کو اپنا رفیق مت بناؤ، اگر وہ لوگ کفر کو بمقابلہ ایمان کے عزیز رکھیں اور جو شخص تم میں سے ان کے ساتھ رفاقت رکھے گا سو ایسے لوگ بڑے نافرمان ہیں۔

وضاحت : اسلامی شریعت میں کسی کافر سے دوستی رکھنا مطلقاً منع نہیں ہے بلکہ صرف وہ دوستی منع ہے جس کی وجہ سے مسلمان اپنے کسی اسلامی شعار یا ایمانی عمل کرنے سے محروم ہوجائے، اس کے علاوہ انسانی ہمدردی، تجارتی تعلقات یا معاملات میں کسی غیر مسلم کے ساتھ اچھا برتاؤ نہ صرف جائز بلکہ شرعاً پسندیدہ ہے۔ آیت مذکورہ میں صرف اس تعلق کی ممانعت ہے جو مذہبی اعتبار سے نقصان دہ ہو۔ دراصل اسلام اپنے ماننے والوں کو ایسی ایمانی پختگی عطا کرتا ہے، جس کے مقابلہ میں ہر طرح کے دنیوی تعلقات اور روابط ایک مومن کی نظر میں بے حیثیت بن جاتے ہیں۔ اور جب معاملہ ایمان کا آتا ہے تو پھر وہ اس پر کسی تعلق کو ترجیح نہیں دیتا، بعض حضرات مفسرین نے اس آیت کے شان نزول میں یہ ذکر فرمایا ہے کہ یہ خطاب دراصل ان مؤمنین اہل مکہ کو تھا جو ایمان لانے کے باوجود مدینہ منورہ کی طرف صرف اسی بنا پر ہجرت نہیں کررہے تھے کہ ان کے والدین اور دیگر رشتہ دار مکہ میں بحالت کفر موجود تھے تو ان سے خطاب کرکے انہیں آمادہ کیا گیا کہ وہ ایمانی تقاضہ پر عمل کرتے ہوئے، جلد از جلد ہجرت کریں اور اس راہ میں رشتہ داری کو خیال میں نہ لائیں۔ (تفسیر قرطبی ۸/۶۰)

بہر صورت شان نزول کچھ بھی ہو آیت کا مفہوم عام ہے، کہ ایک مؤمن کی شان یہ ہے کہ وہ ایمان کے مقابلہ میں نہ تو کفر کو پسند کرسکتا ہے اور نہ کفار سے ایسا تعلق اس کے لئے روا ہے جو اس کے ایمان پر اثر انداز ہوجائے۔

کفار ہدایت سے محروم کیوں؟

آیت (۷) وَاللّٰهُ لَايَهْدِى الْقَوْمَ الْكَافِرِيْنَ. (سورۂ توبہ آیت : ۳۷)

ترجمہ : اور اللہ تعالیٰ (ایسے) کافروں کو ہدایت (کی توفیق) نہیں دیتا۔

وضاحت : اللہ تعالیٰ نے جب سے دنیا پیدا فرمائی ہے سال میں بارہ قمری مہینے مقرر فرمائے ہیں، جن میں سے چار مہینے (ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب) اشہر حرم کہلاتے ہیں، ملّتِ ابراہیمی میں ان چار مہینوں میں قتل وقتال اور شکار کرنا منع تھا لیکن عرب کے مشرکین نے اپنی قتل وغارتگری کی

عادت کی بنا پر اس قدرتی نظام کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا تھا۔ جب چاہتے اپنی نفسانی ضرورت سے اشہر حرم کو آگے پیچھے کر لیتے کبھی محرم کو صفر کبھی صفر کو محرم اور اسی طرح کا معاملہ دیگر مہینوں کا بھی تھا۔

قرآن کریم میں ان کے اس عمل پر شدید نکیر فرمائی گئی، اور اس بارے میں پوری آیت اس طرح نازل ہوئی۔

اِنَّمَا النَّسِیٓءُ زِیَادَۃٌ فِی الْکُفْرِ یُضَلُّ بِہِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُحِلُّوْنَہٗ عَاماً وَّ یُحَرِّمُوْنَہٗ عَاماً لِّیُوَاطِئُوْا عِدَّۃَ مَاحَرَّمَ اللّٰہُ فَیُحِلُّوْا مَاحَرَّمَ اللّٰہُ، زُیِّنَ لَھُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِھِمْ، وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْکَافِرِیْنَ.

(سورۂ توبہ آیت ۳۷)

(مہینوں کا) ہٹا دینا کفر میں اور ترقی ہے، جس سے کفار گمراہ کئے جاتے ہیں، حلال کر لیتے ہیں اس مہینے کو ایک برس اور دوسرے سال حرام رکھتے ہیں تا کہ اللہ تعالیٰ نے جو مہینے حرام کئے ہیں ان کی گنتی پوری کر لیں، پھر اللہ کے حرام کئے ہوئے مہینے کو حلال کر لیتے ہیں، ان کی بداعمالیاں ان کو اچھی معلوم ہوتی ہیں، اور اللہ تعالیٰ ایسے کافروں کو ہدایت کی توفیق نہیں دیتا۔

یہ ہے پوری آیت! جس کا صرف آخری جز فرقہ پرستوں نے نفرت انگیزی کے لئے ماقبل سے کاٹ کر پیش کیا ہے جب کہ پوری آیت میں ان کافروں کے اصل جرم کی قلعی کھول دی گئی ہے، اور کوئی بھی منصف مزاج شخص مہینوں کے الٹ پھیر کے جرم کو نظر انداز نہیں کر سکتا، یہ تو ایسا ہی ہے کہ جیسے کوئی جنوری کو دسمبر کہنے لگے اور دسمبر کو جنوری، تو اس جھوٹ کو دنیا ہرگز قبول نہیں کرے گی۔ اور ایسے ضدی اور ہٹ دھرم کفار کو ہدایت بھی نصیب نہ ہوگی۔ اور اس کے علاوہ بھی قرآن کریم میں جہاں بھی اس طرح کی آیات آئی ہیں ان کا تعلق کفار کے ایسے ہی جرائم سے ہے، اس لئے ان آیات کو اصل بدعملیوں سے ہٹ کر نہیں دیکھنا چاہئے۔

کن کافروں سے دوستی منع ہے؟

آیت (۸) یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَکُمْ ھُزُوًا وَّلَعِباً مِّنَ

الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ الْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ، وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ.
(المائدہ آیت ۵۷)

ترجمہ: اے ایمان والو! جن لوگوں کو تم سے پہلے کتاب مل چکی ہے جو ایسے ہیں کہ جنہوں نے تمہارے دین کو ہنسی اور کھیل بنا رکھا ہے ان کو اور دوسرے کفار کو دوست مت بناؤ، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو اگر تم ایمان دار ہو۔

وضاحت: اس آیت میں دراصل غیر مسلموں سے دلی تعلق اور دوستی رکھنے سے منع کیا گیا ہے۔ اور اس کی علت بھی خود آیت ہی کے اندر موجود ہے، وہ علت یہ ہے کہ اگر ایک مؤمن کافر سے دلی تعلق رکھے گا تو رفتہ رفتہ یہ تعلق اتنا بڑھ سکتا ہے کہ کافر کی مذہبی رسومات اور طور طریقوں کی عظمت اس مؤمن کے دل میں بھی پیدا ہو جائے اور وہ بھی یہود و نصاریٰ وغیرہ کی طرح دین کو ہنسی مذاق سمجھنے لگے، جیسا کہ تجربہ سے بھی معلوم ہوتا ہے، کہ جب دوستی دل کی گہرائی تک پیوست ہو جاتی ہے تو دوست کی ہر اچھی بری بات پسند آنے لگتی ہے تو قرآن کریم ایمان کی قیمت پر کفار سے دوستی کو قطعاً ناپسند کرتا ہے، ہاں اگر تعلق اس درجہ کا نہ ہو بلکہ صرف رسمی حد تک ہو مثلاً غیر مسلم مہمان کی خاطر مدارات، تجارتی شرکت، غیر مسلم پڑوسیوں کے حقوق کا خیال یا انسانی ہمدردی کی بنیاد پر تعلق ہو تو اس میں شریعت وسعت ظرفی کے ساتھ اجازت دیتی ہے اور اس کی شرعاً کوئی ممانعت نہیں ہے، قرآن کریم کی کسی ایک آیت کو دیکھ کر اپنے مطلب کی بات نہیں سمجھی جا سکتی بلکہ اس موضوع کی سبھی آیات، احادیث شریفہ اور پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اسوۂ مبارکہ کو سامنے رکھ کر حقیقی اسلامی تعلیمات تک پہنچا جا سکتا ہے۔ (ملخص از معارف القرآن ۲/۵۰، ۵۱)

اسلام تمام غیر مسلموں کے ساتھ رواداری سے منع نہیں کرتا، بلکہ وہ صرف برسرِ پیکار دشمنوں سے مسلمانوں کے علی الرغم تعلق سے خبردار کرتا ہے، اور یہ بات عقل وانصاف کے عین مطابق بھی ہے اس لئے کہ کوئی بھی دانشمند حالت جنگ میں دشمنوں سے پینگیں بڑھانے کو درست قرار نہیں دے سکتا، قرآن کریم میں دوسری جگہ اس کی وضاحت اس طرح فرمائی گئی ہے:

يَـآ اَيُّهَـا الَّـذِيۡـنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡا بِـطَـانَةً مِّنۡ دُوۡنِـكُـمۡ لَا يَأۡلُوۡنَكُمۡ خَبَـالاً ، وَدُّوۡا مَـا عَـنِتُّمۡ، قَدۡ بَدَتِ الۡبَغۡضَآءُ مِنۡ اَفۡوَاهِهِمۡ، وَمَا تُخۡفِىۡ صُدُوۡرُهُمۡ اَكۡبَرُ.

(آل عمران ۱۱۸)

اے ایمان والو! اپنوں کے علاوہ کسی غیر کو راز دار خصوصی مت بناؤ وہ (غیر) تمہاری مضرت رسانی میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑتے ، وہ تمہیں نقصان پہنچانے کی تمنا کرتے ہیں۔ان کی زبانوں سے دشمنی نکلی پڑتی ہے، اور جو کچھ ان کے دل میں مخفی ہے وہ اس سے بہت زیادہ ہے۔

ایسے لوگ جو طبعی طور پر مسلمانوں سے کینہ رکھیں اور زبان کی ہفوات سے زیادہ عداوت کی گندگی انکے دلوں میں بھری ہوئی ہوتو ایسے لوگوں سے دلی تعلق ایمانی غیرت کو ہرگز گوارا نہیں ہو سکتا، ہاں جو لوگ ان صفات کے نہ ہوں، ان سے رواداری برتنا شریعت کا حکم ہے۔اور تاریخ گواہ ہے کہ ایسے موقع پر مسلمانوں نے رواداری میں کبھی کوئی دریغ نہیں کیا، خود ہندوستان میں مسلم بادشاہوں نے اگر رواداری کا نمونہ پیش نہ کیا ہوتا تو آج اس ملک کی آبادی کا نقشہ موجودہ تناسب سے یقیناً مختلف ہوتا، یہ ان حکمرانوں کی عظیم الشان رواداری ہی کا نتیجہ ہے کہ کئی صدیوں تک مسلم حکومت رہنے کے باوجود یہاں غیر مسلموں کو برابر عزت واحترام حاصل رہا ہے اور ان کی کوئی حق تلفی نہیں کی گئی ، اس کے برعکس وہ آج اقتدار کے گلیاروں پر پہنچ کر جس تعصب و امتیاز کا مظاہرہ کررہے ہیں وہ ان کی تنگ نظری کی کھلی دلیل ہے۔

منافقوں کو پھٹکار

آیت (۹): مَلۡعُوۡنِيۡنَ، اَيۡنَمَا ثُقِفُوۡا اُخِذُوۡا وَقُتِّلُوۡا تَقۡتِيۡلاً. (الاحزاب ۶۱)

ترجمہ : پھٹکارے ہوئے، جہاں ملیں گے پکڑ دھکڑ اور مار دھاڑ کی جائے گی۔

پس منظر : اس آیت کا تعلق دور نبوت میں مدینہ منورہ میں رہنے والے شرارت پسند اور فتنہ پرور منافقین سے ہے، یہ لوگ زبانی طور پر اسلام کا اظہار کرتے تھے مگر اندر اندر کافر تھے اور ہمیشہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے درپے رہتے تھے، مسلمان عورتوں کے ساتھ چھیڑ خانی کرتے اور

افواہیں پھیلا کر معاشرہ میں انتشار برپا کرنے میں طاق تھے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ان منافق کفار کو اس طرح آگاہ کیا گیا:

لَئِنۡ لَّمۡ یَنۡتَهِ الۡمُنٰفِقُوۡنَ وَالَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ وَّالۡمُرۡجِفُوۡنَ فِی الۡمَدِیۡنَةِ لَنُغۡرِیَنَّکَ بِهِمۡ ثُمَّ لَا یُجَاوِرُوۡنَکَ فِیۡهَاۤ اِلَّا قَلِیۡلًا، مَلۡعُوۡنِیۡنَ، اَیۡنَمَا ثُقِفُوۡۤا اُخِذُوۡا وَقُتِّلُوۡا تَقۡتِیۡلًا. (الاحزاب ۶۱/۶۰)

البتہ اگر باز نہ آئے منافق اور جنکے دل میں مرض ہے، اور مدینہ میں جھوٹی افواہیں اڑانے والے، تو ضرور ہم آپ کو ان پر مسلط کریں گے، پھر یہ لوگ آپ کے پاس مدینہ میں بہت ہی کم رہنے پاویں گے، وہ بھی ہر طرف سے پھٹکارے ہوئے، جہاں ملیں گے پکڑ دھکڑ اور مار دھاڑ کی جاوے گی۔

ظاہر ہے کہ کوئی بھی حکومت ایسے مجرموں کے ساتھ ڈھیل کا معاملہ نہیں کرسکتی جن کی وجہ سے معاشرہ کا سکون برباد ہو اور لوگوں کی عزتیں محفوظ نہ ہوں، ان کے ساتھ سختی کرنا عین تقاضائے انصاف ہے۔ یہاں ان منافقوں کو جو بھی سزا دی جارہی ہے وہ ان کے کالے کرتوتوں کی بنا پر ہے، ان کے جرائم سے صرف نظر کر کے محض سزا والے جملوں کو نقل کردینا اور پھر انھیں مطلقاً تمام دنیا کے ہر طرح کے کفار پر منطبق کرنا محض تلبیس اور دھوکہ دہی ہے جس کا مقصد سوائے اشتعال انگیزی کے کچھ نہیں، اگر یہ آیت تمام غیر مسلموں کے لئے عام ہوتی تو کسی اسلامی اقتدار میں کوئی غیر مسلم سانس بھی نہیں لے سکتا تھا، مگر دنیا نے دیکھا کہ اسلامی اقتدار میں غیروں کو جو تحفظات حاصل رہے وہ اپنی مثال خود آپ ہیں، اس لئے اس آیت کا تعلق عام کفار سے ہے ہی نہیں، یہ تو صاف طور پر مجرموں سے متعلق ہے۔ (معارف القرآن وغیرہ ۷/ ۲۳۵)

معبودان باطلہ جہنم میں

آیت (۱۰) اِنَّکُمۡ وَمَاتَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ، اَنۡتُمۡ لَهَا وَارِدُوۡنَ.
(الانبیاء:۹۸)

ترجمہ: بے شک تم (اے مشرکین) اور جن کو تم خدا کے سوا پوجتے ہو سب جہنم میں جھونکے جاؤ گے، تم سب اس میں داخل ہو گے۔

وضاحت : اسلام کی نظر میں شرک بدترین گناہ ہے،اور یہ بات ساری دنیا جانتی ہے کہ اسلام کی بنیادی تعلیم وحدانیت کی ہے، قرآن کریم میں دسیوں جگہ شرک کی سخت مذمت اور وحدانیت کی نہایت تاکید وارد ہوئی ہے،اور جابجا غیراللہ کی عبادت کے بطلان پر مضبوط دلائل دیئے گئے ہیں، انہی میں سے ایک مذکورہ آیت بھی ہے جس کے مضمون کی تکمیل اگلی آیت پر ہوتی ہے پہلے یہ بیان کیا گیا کہ مشرکین اورانکے معبودان باطلہ جن پر یہ مشرکین پوری زندگی بھروسہ کیئے رہےاورانکی پوجااورنذرونیازکرکے یہ سمجھتے رہے کہ یہ ہمارے آڑے وقت میں کام آئیں گے،اللہ نے فرمایا کہ وہ تمہیں کیا بچاتے خود بھی نہیں بچ پائیں گے،اس کے بعد آگے ان معبودوں کے غلط ہونے پر دلیل اس طرح قائم فرمائی:

لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا. وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ. (الانبیاء: ۹۹)

اور اگر یہ (تمہارے معبود، واقعی) معبود ہوتے تو جہنم میں نہ جاتے، اور سارے اس میں ہمیشہ پڑے رہیں گے۔

یعنی آخرت میں جب ان معبودوں کے پجاریوں کو مدد کی سخت ضرورت ہوگی تو معبودوں کی جان کے خود ہی لالے پڑے ہونگے، اگر انمیں کچھ دم ہوتا اور انکو واقعۃً کچھ اختیارات حاصل ہوتے تو وہ ہرگز عذاب میں گرفتار نہ ہوتے، حالانکہ ان کا عذاب میں مبتلا رہنا بالکل طے شدہ ہے،تو معلوم ہوا کہ ان کا معبود ہونا بھی محض ڈھونگ ہے، نفع نقصان کچھ ان کے اختیار میں نہیں ہے، الغرض آیت ۹۸ کو آیت ۹۹ سے ملا کر دیکھنا چاہئے، اس کے بغیر صحیح مطلب تک رسائی نہیں ہو سکتی۔اوردونوں کوملا کر دیکھنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آیت کا تعلق وحدانیت کے اثبات کے مضمون سے ہے،اورعقیدۂ توحیداسلام کے بنیادی عقائد میں سے ہے وہ کسی کو اچھا لگے یا برا لگے اسکی بناپرعقیدہ میں ترمیم یا تبدیلی کا نعوذ باللہ خیال بھی دل میں نہیں لایا جا سکتا۔

سب سے بڑا ظالم

آیت (۱۱) وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا، اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ. (الم السجدہ ۲۲)

ترجمہ : اور اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا جس کو اس کے رب کی آیتیں یاد دلائی جائیں، پھر وہ ان سے اعراض کرے، ہم ایسے مجرموں سے بدلہ لیں گے۔

وضاحت : اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا فرمایا، پھر اسکو راہ ہدایت بتانے کے لئے پیغمبروں کو بھیجا اور آیتیں اتاریں، کتابیں عطا کی گئیں اور انھیں سمجھانے والے داعیان بھی آتے رہے اب اگر کوئی شخص ان خدائی آیتوں کو نہ مانے اور پیغمبروں کا انکار کرتا رہے اور اس طرح اپنے رب کی نافرمانی کا مرتکب ہو اور اپنے خالق و مالک کو بھلا بیٹھے تو ظاہر ہے کہ اس سے بڑا بے انصاف اور ظالم شخص کون ہو سکتا ہے؟ اور جو بھی ایسے جرم کا ارتکاب کرے گا خدائے برتر اس سے بدلہ لے گا، یہ نہایت معقول بات ہے جو قرآن کریم میں متعدد جگہ ارشاد فرمائی گئی ہے، لہذا اس میں کسی کو ناراض ہونے کی ضرورت نہیں، اگر عذاب سے بچنے کا واقعی جذبہ ہے تو اس کی واحد صورت یہ ہے کہ انکار و اعراض کی راہ چھوڑ کر تسلیم وانقیاد کا راستہ اپنایا جائے، ورنہ خدا کی نافرمانی اور اس سے اعراض کو کوئی بھی عقل و ہوش رکھنے والا شخص قابل معافی جرم نہیں مان سکتا، یہ جرم اتنا سخت ہے کہ اس سے چشم پوشی کرنے والا شخص خود ہی ناقابل معافی سزا کا مستحق ہے، ہمارے برادران وطن کو چند فتنہ پروروں کے کہنے میں آکر ایسی آیتوں پر برافروختہ ہونے کے بجائے انصاف کی نظر سے اُن آیات خداوندی کا مطالعہ کرنا چاہئے جن سے اعراض کرنے کو قرآن کریم نے ناقابل معافی جرم قرار دیا ہے۔ جب وہ گہری نظر سے قرآن کی واضح اخلاقی ہدایات اور مظاہر قدرت کے کھلے ہوئے دلائل کا مشاہدہ کریں گے تو انھیں خود ہی اندازہ ہو جائے گا کہ ان کھلی ہوئی باتوں کا انکار ظلم ہے یا نہیں؟۔

مال غنیمت کی حلت

آیت (۱۲) وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَأْخُذُوْنَهَا. (الفتح : ۲۰)

ترجمہ : اللہ تعالیٰ نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ کر رکھا ہے جن کو تم لوگے۔

آیت (۱۳) فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلاً طَيِّباً. (الانفال : ٦٩)

ترجمہ : سو کھاؤ جو تم کو غنیمت میں ملا حلال ستھرا۔

وضاحت : ان دونوں آیتوں میں مال غنیمت کے حلال ہونے کا تذکرہ ہے جس کا ترجمہ ہندو شرارت پسندوں نے بریکٹ میں ’’لوٹ‘‘ کا کر کے اشتعال دلانے کی کوشش کی ہے، اور ایسا تاثر دیا گیا ہے کہ گویا قرآن میں مطلقاً لوٹ مار کر کھانے کی ترغیب دی گئی ہے، حالانکہ یہ بات سرے سے غلط ہے مال غنیمت اس مال کو کہا جاتا ہے، جو شرعی شرائط و حدود پر جہاد کرنے کے بعد دشمنوں سے حاصل ہوا ہو، خواہ مخواہ کسی غیر مسلم سے لوٹ مار کر کے حاصل شدہ مال ہرگز مال غنیمت نہیں کہلایا جا سکتا، اور دشمنوں سے حالت جنگ میں مال لینا یا ان کی معیشت پر قبضہ کر کے انکی اقتصادیات کو تباہ کر دینا بسا اوقات نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہو جاتا ہے تا کہ وہ آئندہ شرارت نہ پھیلا سکیں، عقل و انصاف کی رو سے یہ کوئی ناگواری کی بات نہیں ہے، الغرض غنیمت لوٹ نہیں بلکہ دشمنوں کو اقتصادی سزا دینے کا طریقہ ہے۔ اور یہ معاملہ صرف دشمنوں سے ہی کیا جا سکتا ہے، جو کفار پر امن رہتے ہوں، یا ان سے اسلامی حکومت کا معاہدہ ہو تو ان کے جان مال پر دست درازی اسی طرح حرام ہے جیسے ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کی حق تلفی حرام ہوتی ہے، لہذا پر امن کفار کو مال غنیمت کی حلت کے حکم سے پریشان ہونے کوئی ضرورت نہیں ہے۔

کفار منافقین سے جہاد

آیت (۱۴): **يَآ اَيُّهَا النَّبِىُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ، وَمَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ، وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ.** (التحریم : ۹)

ترجمہ :اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کفار سے اور منافقین سے جہاد کیجئے، اور ان پر سختی کیجئے، اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے، اور وہ بری جگہ ہے۔

وضاحت : اس آیت کے پس منظر میں ان مظالم کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے جو کفار و منافقین کی طرف سے اہل اسلام پر ہوتے آرہے تھے، جن کی پیش بندی کے لئے ان دشمنوں سے جہاد کرنے اور ان سے سختی سے نپٹنے کا حکم دیا گیا، قرآن کریم کی دیگر آیات کو سامنے رکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قتل و قتال کا حکم ہر کافر کے ساتھ نہیں ہے بلکہ انہی کفار کے ساتھ ہے جو اسلام اور اہل اسلام کے لئے خطرہ بنے ہوئے ہوں، اور جو جنگ کے بغیر اپنی شرارتوں سے باز آنے پر

تیار ہی نہ ہوں، رہ گئے وہ کفار جو اس صفت کے نہ ہوں تو انکے بارے میں یہ حکم نہیں ہے، بلکہ ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کی قرآن وسنت میں تعلیم دی گئی ہے۔

آخرت میں کفار کا انجام

آیت (۱۵) **فَلَنُذِيقَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا عَذَاباً شَدِيداً وَّلَنَجزِيَنَّهُمْ اَسْوَاَ الَّذِیْ كَانُوا يَعْمَلُونَ.** (حم السجدہ: ۲۷)

ترجمہ: سوہم ان کافروں کو سخت عذاب کا مزہ چکھا دیں گے، اوران کو برے برے کاموں کی سزا دیں گے۔

آیت (۱۶) **ذٰلِکَ جَزَآءُ اَعْدَآءِ اللّٰهِ النَّارُ، لَهُمْ فِيهَا دَارُ الْخُلْدِ، جَزَآءً بِمَا كَانُوا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُونَ.** (حم السجدہ : ۲۸)

ترجمہ: یہی سزا ہے اللہ کے دشمنوں کی، یعنی دوزخ، انکے لئے وہاں ہمیشگی کا مقام ہوگا، اس بات کے بدلے میں کہ وہ ہماری آیتوں کا انکار کیا کرتے تھے۔

وضاحت : مذکورہ دونوں آیتوں میں اسلام کے عقیدۂ آخرت کے بموجب کفار کا انجام بیان کیا گیا ہے۔ ان اعلانات کی حقیقت کا پتہ یہاں دنیا میں نہیں لگایا جا سکتا، یہ حقیقت تو مرنے کے بعد ہی پتہ چل سکے گی کہ کون عذاب میں ہے اورکون راحت میں؟ اس لئے جس کو آیات خداوندی پر یقین ہے وہ عذاب والے عقائد واعمال سے بچنے کی کوشش کرے اور جسے آخرت پر یقین ہی نہ ہو اس کے لئے ایسے سب اعلانات بے معنی ہیں، جب وہ اسے حقیقت ہی نہیں سمجھتا تو اس سے خوف زدہ یا دہشت زدہ ہونے کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے، جیسا کہ مکّہ کے مشرکین کے سامنے جب اس طرح کی آیات پڑھی جاتی تھیں تو وہ صاف کہتے تھے کہ یہ تو سب پرانی باتیں ہیں اب مرنے کے بعد ہمیں دوبارہ زندگی ملنے والی نہیں ہے، اسی طرح آج جو آخرت کے منکر ہیں انھیں بھی کفار کی سزا والے قرآنی اعلانات سے پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں وہ سب موت کا انتظار

کریں پھر خود ہی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔

جان و مال کی قربانی کے بدلہ میں جنت کا وعدہ

آیت (۱۷) اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ، یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ. (التوبہ : ۱۱۱)

ترجمہ : بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جان اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی وہ لوگ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں، جسمیں قتل کرتے ہیں اور قتل کیئے جاتے ہیں۔

وضاحت: اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو جنت کی خوش خبری سنائی ہے، جو دراصل دین کے لئے ان کی طرف سے پیش کردہ جانی اور مالی قربانیوں کا صلہ ہے۔ اہل ایمان کو دشمنوں کے نرغہ سے بچانے کے لئے اگر جان کی بازی لگانی پڑے تو بھی مؤمن کو ہر وقت تیار رہنا چاہیئے، اور ظاہر ہے کہ جب دشمنوں سے جنگ کی نوبت آئے گی تو دونوں باتیں ہونگی کبھی دشمن مارے جائیں گے اور کبھی مؤمن کو شہادت نصیب ہوگی بہر کیف اس آیت کا مقصد دین کے لئے قربانی دینے کے اسی جذبہ سے ہے، اس میں یہ نہیں کہا گیا کہ خواہ مخواہ کفار سے جنگ کی جائے یا بے قصوروں کو ستایا جائے وغیرہ، بلکہ اہل ایمان کی ایک صفت بیان کی گئی کہ جب جانی یا مالی قربانی کا موقع آتا ہے (جو ایک ناگزیر حالت ہے یعنی جب قتال کے علاوہ کوئی راستہ ہی تحفظ دین کا باقی نہ رہے) تو مؤمنین کی شان یہ ہے کہ وہ کسی طرح کی بھی قربانی سے دریغ نہ کریں۔ یہ جذبہ اللہ کے یہاں اتنا گراں قدر ہے کہ اسکے بدلہ میں جنت کا وعدہ فرمایا گیا ہے۔ لہذا اس آیت کو کفار کی دشمنی کے بجائے اہل ایمان کے ایمانی جذبات کے تناظر میں دیکھنا چاہیئے جو آیت کا اصل مدعا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اگر مسلمانوں میں یہ جذبہ بیدار نہ رہتا تو دشمنان دین کب کے دین کو مٹانے میں کامیاب ہو چکے ہوتے، امت میں اس جذبہ کا وجود ہی بظاہرِ اسباب آج دنیا میں دین کی بقا کا سبب بنا ہوا ہے۔

منافقین و کفار جہنم میں

آیت (۱۸) وَعَدَ اللّٰہُ الْمُنٰفِقِیْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْکُفَّارَ نَارَ جَھَنَّمَ خٰلِدِیْنَ

فِيهَا، هِيَ حَسْبُهُمْ، وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ، وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيمٌ. (التوبة : ٦٨)

ترجمہ : اللہ تعالیٰ نے منافق مردوں اور منافق عورتوں اور علانیہ کفر کرنے والوں سے دوزخ کی آگ کا عہد کر رکھا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اور وہ ان کے لئے کافی (سزا) ہے، اور اللہ ان کو اپنی رحمت سے دور کر دے گا اور ان کو عذاب دائمی ہوگا۔

وضاحت: اس آیت کا تعلق بھی عقیدۂ آخرت سے ہے، جو لوگ آخرت پر یقین ہی نہیں رکھتے اور جن کے مذہب میں آخرت کا تصور ہی نہیں ہے انھیں اس طرح کی آیتوں سے ڈرنے کا کوئی مطلب نہیں، ان سے تو صرف وہی ڈرے گا جو آخرت پر یقین رکھتا ہو، اس لئے ان آیات کو فتنہ انگیزی کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔

جہاد کی ترغیب

آیت (۱۹) يَآ اَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ، اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صَابِرُوْنَ يَغْلِبُوْنَ مِائَتَيْنِ، وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْآ اَلْفاً مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ. (الانفال:٦٥)

ترجمہ: اے پیغمبر! آپ مؤمنین کو جہاد کی ترغیب دیجئے اگر تم میں کے بیس آدمی ثابت قدم رہنے والے ہونگے ودوسو پر غالب آجاویں گے اور اگر تم میں کے سو آدمی ہونگے تو ایک ہزار کفار پر غالب آجاویں گے اس وجہ سے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو دین کو کچھ نہیں سمجھتے۔

پس منظر : اس آیت کو بطور اعتراض پیش کرنے والوں کو یہ تو یاد رہا کہ اس میں ایمان والوں کو جہاد کی ترغیب دی گئی لیکن یہ بھول گئے کہ کن حالات میں یہ حکم نازل ہوا، اس کی کچھ تفصیل ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ جب مشرکین کی طرف سے ظلم وستم کی حد ہوگئی اور یقینی طور پر یہ بات آشکارا ہوگئی کہ جہاد کے بغیر مفسدین کے فتنہ وفساد کا سلسلہ بند نہ ہو سکے گا تو مسلمانوں کو آخری حربہ کے طور پر دشمن کفار سے جنگ کرنے کی تلقین کی گئی، تو یہ حکم یقیناً برحق ہے، لیکن اس کا نفاذ وہیں ہوگا جہاں جنگ کے

حالات پائے جائیں حالت امن ومعاہدہ کے لئے یہ حکم نہیں دیا گیا ہے۔

یہود ونصاریٰ سے پکی دوستی کی ممانعت

آیت (۲۰) یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَاتَتَّخِذُوا الْیَھُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓی اَوْلِیَآءَ، بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ، وَمَنْ یَّتَوَلَّھُمْ مِّنْکُمْ فَاِنَّهٗ مِنْھُمْ، اِنَّ اللّٰہَ لَایَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ.
(المائدۃ : ۵۱)

ترجمہ: اے یمان والو ! تم یہود ونصاری کو دوست مت بنا ناوہ ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ اور جو شخص تم میں سے ان کے ساتھ دوستی کرے گا بے شک وہ انہی میں سے ہوگا۔ بے شک اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو سمجھ نہیں دیتے جو دینا نقصان کررہے ہیں۔

وضاحت: یہود ونصاری کی اسلام دشمنی کوئی ڈھکی چھپی نہیں ہے بلکہ اسلام کی آمد سے لیکر آج تک تاریخ کے ہر دور میں ان دونوں فرقوں نے اسلام کی بیخ کنی میں کوئی کسر نہیں اٹھار کھی ہے۔ انھوں نے مادی، علمی، اقتصادی، سیاسی، الغرض ہر میدان میں اسلام اور اہل اسلام کے خلاف محاذ کھول رکھا ہے۔ قرون متوسطہ میں سالہا سال تک صلیبی جنگیں لڑی جاتی رہیں، پھر اسپین میں اسلام کی بساط الٹی گئی۔ بلقان کے علاقوں میں صدیوں سے مسلمانوں کی خونریزی جاری ہے۔ انگریز کے خونچکاں بدترین مظالم سے تاریخ کے صفحات سیاہ ہیں اور آج اسرائیل، چیچنیا، بوسنیا، کوسووا وغیرہ میں بھی یہی طاقتیں اسلام سے برسرپیکار ہیں اور مسلمانوں کا نام ونشان مٹانے پر تلی ہوئی ہیں، ان اقوام کی سرشت اور جبلّی صفات کو اللہ سے زیادہ کون جان سکتا ہے لہذا اس نے یہ حقیقت بیان کردی کہ یہ لوگ آپس ہی میں چٹے بٹے ہیں، یہ تمہارے وفادار نہ کبھی ہوسکے ہیں نہ ہوسکتے ہیں اس لئے ان کی دوستی پر کبھی بھروسہ نہ کرو، جب بھی ان کی دوستی پر بھروسہ کیا جائے گا نقصان اٹھانا پڑے گا، بریں یہ آیت قابل اعتراض ہرگز نہیں کیونکہ اس میں جو حقیقت بیان ہوئی ہے تاریخ کے حقائق اور مشاہدہ کی آنکھیں برابر اس کی تائید کرتی رہی ہیں اس لئے سارے عالم کے مسلمانوں کو یقیناً ان بدخواہ طاقتوں سے ہوشیار رہنا چاہیے اس کے بغیر وہ نقصانات اور ذلتوں سے محفوظ نہیں رہ سکتے، آج دنیا میں مسلمانوں کی ذلت کی اصل وجہ یہی ہے کہ انھوں نے اپنے کھلے ہوئے بدخواہ دشمنوں کو اپنا دوست اور مشیر بنا رکھا ہے جس کا بدترین انجام

عالمی ذلت ونکبت کی صورت میں نمایاں ہے۔ اللّٰهم احفظنا منه.

اہل کتاب سے قتال و جزیہ کا حکم

آیت (۲۱) قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صَاغِرُوْنَ. (التوبہ ۲۹)

ترجمہ :اہل کتاب جو کہ نہ خدا پر (پورا پورا) ایمان رکھتے ہیں اور نہ قیامت کے دن پر اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جن کو خدا نے اور اس کے رسول نے حرام بتلایا ہے اور نہ سچے دین (اسلام) کو قبول کرتے ہیں ان سے یہاں تک لڑو کہ وہ ماتحت ہو کر اور رعیت بن کر جزیہ دینا قبول کر لیں۔

وضاحت : یہ حکم معاہدہ والی قوموں کے متعلق نہیں بلکہ ان اہل کتاب کے بارے میں ہے جو اسلام اور اہل اسلام کے لئے خطرہ بن جائیں، تو ضروری ہو جاتا ہے کہ ان کی فتنہ سامانیوں پر پیشگی بند لگایا جائے اور چونکہ ان کی سرشت میں اسلام دشمنی پیوست ہے اس لئے جب تک ان کی طاقت بالکل مغلوب نہ ہو جائے اور وہ ذلت کے ساتھ اسلامی حکومت کی ماتحتی قبول نہ کر لیں اس وقت تک ان کے ساتھ کوئی رعایت نہ برتی جائے کیوں کہ دشمن کو کسی حد تک پہونچائے بغیر چھوڑ دینا بعد میں مزید خطرات کا باعث بن جاتا ہے۔

اہل کتاب کی آپس میں عداوت

آیت (۲۲) فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ. (المائدہ:۱۴)

ترجمہ: اور ہم نے ان میں باہم قیامت تک کے لئے بغض و عداوت ڈال دیا، اور اللہ تعالی عنقریب ان کو ان کے کرتوتوں کے بارے میں آگاہ فرما دیگا۔

وضاحت: یہ آیت یہود و نصاری کے تذکرہ کے ضمن میں نازل ہوئی جس کا مفہوم یہ ہے کہ

مذہبی اعتبار سے یہودیوں اور عیسائیوں اور اسی طرح عیسائیوں کے مختلف فرقوں کے درمیان دشمنی اور عداوت ڈال دی گئی ہے جو قیامت تک باقی رہے گی، چنانچہ اسلام کے آنے سے قبل یہ دونوں فرقے باہم دست وگریباں رہتے تھے اور اسلام کی آمد کے بعد اگر چہ دونوں اسلام کے مقابلہ میں متحد ہو جاتے ہیں لیکن اندرونی طور پر ان میں آپس میں شدید قسم کے اختلافات پہلے بھی موجود تھے اور اب بھی موجود ہیں، یہودیت اور عیسائیت کی تاریخ سے واقف ہر شخص اس بات کو جانتا ہے، لہٰذا قرآن کریم نے اگر اس حقیقت کو آشکارا کر دیا تو اس پر چیں بجبیں ہونے کا کوئی موقع نہیں اور نہ کسی کی وجہ سے کسی کو ناراض ہونے کی ضرورت ہے اور خاص کر وہ ہندو شدت پسند جن کا اس آیت کے سیاق وسباق سے کوئی تعلق نہیں ان کا اس آیت پر اعتراض قطعاً بے معنی اور محض شر انگیزی ہے۔

کفار و منافقین چاہتے کیا ہیں؟

آیت (۲۳) وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۔(النساء: ۸۹)

ترجمہ : وہ اس تمنا میں ہیں کہ جیسے وہ کافر ہیں تم بھی کافر بن جاؤ، جس میں تم اور وہ سب ایک طرح کے ہو جاؤ، سو اُن میں سے کسی کو دوست مت بنانا جب تک کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت نہ کریں، اور اگر وہ اعراض کریں تو ان کو پکڑو اور قتل کرو جس جگہ ان کو پاؤ، اور نہ ان میں کسی کو دوست بناؤ اور نہ مددگار بناؤ۔

پس منظر :اس آیت کے شان نزول میں متعدد حضرات مفسرین نے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ کچھ کفار مکہ سے مدینہ منورہ آئے اور انھوں نے یہاں آکر اپنے کو مومن ظاہر کیا لیکن مدینہ کی آب وہوا انھیں راس نہ آئی اور وہ بہانہ بنا کر پھر واپس مکہ چلے گئے تو ان کے متعلق مسلمانوں میں اختلاف ہو گیا بعض لوگ کہتے تھے کہ یہ لوگ مومن ہیں اور بعض کہتے تھے کہ نہیں یہ لوگ کافر اور منافق ہیں تو اللہ تعالی نے ان کی اصل حالت کی خبر دیتے ہوئے فرمایا کہ ایسے منافقوں کے بارے

میں اختلاف کرنے کا کوئی جواز نہیں اور ایسے دھوکہ باز لوگ ہرگز رحم کے قابل نہیں ان کا منشا تو اصل میں یہ ہے کہ جس طرح خود کافر ہیں اسی طرح مسلمانوں کو بھی کافر بنا کر دم لیں، لہٰذا ان سے دوستی اپنے ایمان کے لئے خطرناک ہے اس لئے اس سے احتراز لازم ہے (تفسیر قرطبی ۳/۲۶۴) اور جب تک وہ مکہ سے ہجرت (جو ابتداء اسلام میں فرض تھی) نہ کرلیں اس وقت تک وہ اعتبار کے قابل نہیں، اور چونکہ اس وقت مکہ والوں سے جنگی حالات چل رہے تھے لہذا بجا طور پر یہ حکم دیا گیا کہ اگر یہ لوگ ہجرت نہ کریں اور اسلام دشمنی پر کمربستہ رہیں تو پھر ان کی جان کی خیر نہیں ہے، تو یہ حکم صرف کھلے دشمن کے لئے ہے اس کے برعکس جو کفار صلح اور امن وآشتی کے ساتھ رہیں ان کے ساتھ امن کا معاملہ کیا جائے گا اور انھیں ستایا نہیں جائے گا چنانچہ اسی آیت کے فوراً بعد اگلی آیت میں اس کی صراحت اس طرح فرمائی گئی ہے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ، وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ، فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلاً.

(النساء ۹۰)

مگر جو لوگ ایسے ہیں جو کہ ایسے لوگوں سے جا ملتے ہیں کہ تمہارے اور ان کے درمیان عہد ہے یا خود تمہارے پاس اس حالت سے آویں کہ ان کا دل تمہارے ساتھ اور نیز اپنی قوم کے ساتھ لڑنے سے منقبض ہو، اور اگر اللہ تعالی چاہتا تو ان کو تم پر مسلط کر دیتا پھر وہ تم سے لڑنے لگتے پھر اگر وہ تم سے کنارہ کش رہیں یعنی تم سے نہ لڑیں اور تم سے سلامت روی رکھیں تو اللہ تعالی نے تم کو ان پر کوئی راہ نہیں دی۔

اس آیت نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا کہ اسلام "صلح جو" کافروں سے خواہ مخواہ قتل وقتال کی ہرگز اجازت نہیں دیتا معترضین کا اس طرح کی آیتوں سے صرف نظر کر کے دیگر آیتیں پیش کرنا اور پھر اپنی مرضی سے ان کے معنی متعین کر کے فتنہ پھیلانا بدترین قسم کی جعل سازی اور

فریب دہی ہے جسے قطعاً قبول نہیں کیا جا سکتا۔

بدعہدوں کی سزا

آیت (۲۴) قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ. (التوبة : ١٤)

ترجمہ : ان سے لڑو، اللہ تعالیٰ ان کو تمہارے ہاتھوں سے سزا دے گا اور ان کو ذلیل کرے گا اور تم کو ان پر غالب کرے گا اور بہت سے مسلمانوں کے قلوب کو شفا دے گا۔

پس منظر : یہ آیت عام نہیں بلکہ ایک خاص پس منظر میں نازل ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ اوپر سے مکہ کے ان بدعہد کفار کا تذکرہ چل رہا ہے جنھوں نے مسلمانوں کے حلیف بنوخزاعہ کو جانی و مالی نقصان پہچانے میں قبیلۂ بنوبکر کی درپردہ مدد کر کے حدیبیہ کے ناجنگ معاہدہ کو پامال کر دیا تھا اور بیٹھے بٹھائے چھیڑ خوانی کے مرتکب ہوئے تھے جس کی کچھ تفصیل ہم پہلے بیان کر چکے ہیں تو ظاہر ہے کہ ایسے بدعہدوں کو سزا دینی لازم تھی چنانچہ ان کفار کو ان کی اوقات بتانے کے لئے قرآن کریم نے مسلمانوں کو ان الفاظ میں للکارا۔

اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْماً نَّكَثُوْا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ، اَتَخْشَوْنَهُمْ، فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ. (التوبة : ١٣)

تم ایسے لوگوں سے کیوں نہیں لڑتے جنھوں نے اپنی قسموں کو توڑ ڈالا اور رسول کے جلا وطن کر دینے کی تجویز کی اور انہوں نے تم سے پہلے خود چھیڑ نکالی، کیا ان سے (لڑنے سے) تم ڈرتے ہو! سو اللہ تعالیٰ اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ تم ان سے ڈرو اگر تم ایمان رکھتے ہو۔

اس کے بعد اگلی آیت ۱۴ میں باقاعدہ ان بدعہدوں سے جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اس لئے آیت ۱۴ کو آیت ۱۳ کے ساتھ ملا کر مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ مطلب واضح ہو سکے قرآن کریم میں ایک مضمون کی آیات ایک دوسرے سے مربوط ہوتی ہیں، ان میں سے کسی ایک آیت کو دیکھ کر صحیح

مفہوم تک نہیں پہنچا جا سکتا، بلکہ سیاق وسباق کا مطالعہ ضروری ہوتا ہے ورنہ مطلب خبط ہو جائے گا۔

الغرض یہ آیات خاص دشمنوں اور بدعہدی کرنے والے شریروں سے متعلق ہیں ان کو عمومی معنی میں رکھ کر فتنہ انگیزی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

کیا پتہ چلا؟

مذکورہ وضاحتوں سے قارئین نے اندازہ لگالیا ہوگا کہ وشو ہندو پریشد وغیرہ کی طرف سے قرآنی آیات پر اعتراضات محض دھوکہ ہیں جن کا حقیقت اور واقعیت سے کوئی تعلق نہیں ہے قرآن کی آیتیں ہرگز نفرت نہیں پھیلاتیں بلکہ ان پر اعتراض کرنے والے یہ لوگ ہی دراصل نفرت کے سوداگر ہیں جو مسلمانوں اور اقلیتوں کی لاشوں اور ان کی جلی ہوئی املاک پر اپنی قیادت کی کرسی جمارہے ہیں یہ لوگ چونکہ خود تنگ نظر ہیں اسلئے اسلام کی تعلیمات کو بھی تنگ نظر ثابت کرنا چاہتے ہیں، جبکہ اسلام کی وسعت ظرفی، انسانیت نوازی اور فطرت انسانی سے پوری طرح ہم آہنگی اور آفاقیت روز روشن کی طرح عیاں ہے، کوئی بھی منصف مزاج اس سے انکار کرنے کی ہمت نہیں کرسکتا، ہاں جس نے خود اپنی آنکھوں پر تعصب کی پٹی باندھ رکھی ہو اس سے واقعۃً ہدایت وانصاف کی امید نہیں رکھی جاسکتی، اور جنھوں نے اپنی زندگی کا مقصد ہی فتنہ پروری اور منافرت کا بنالیا ہو ان سے کسی معقول بات کی تمنا کرنا بھی فضول ہے۔

قرآن کریم نئی کتاب نہیں

ذرا سوچیں تو سہی قرآن کریم کوئی نئی کتاب نہیں، آج اس کو نازل ہوئے ۱۵ سو سال کا عرصہ ہورہا ہے اس درمیان قرآن کے تراجم دنیا کی تمام بڑی زبانوں میں ہو چکے ہیں اور عالم کے چپہ چپہ پر اسے صدیوں سے پڑھا اور سمجھا جاتا ہے مسلمان تو پڑھتے ہی ہیں بڑی تعداد میں غیر مسلم بھی اسے پڑھتے آئے ہیں، ان پندرہ صدیوں کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے اسلامی حکومتوں میں کب اور کہاں غیر مسلموں پر مظالم ڈھائے گئے؟ اگر اکّا دکّا کوئی واقعہ کہیں ملے گا تو اس کا تعلق اسلامی تعلیمات سے نہیں بلکہ حاکم کے شخصی عمل سے ہوگا لیکن جب اسلامی تعلیم کی روشنی میں فیصلہ اور حکم کی

بات آئے گی تو ہمیشہ امن اور انصاف کا پہلو نمایاں نظر آئے گا۔

اگر قرآن کی تعلیمات ایسی ہی نفرت انگیز ہوتیں جیسی باور کرانے کی وشو ہندو پریشد نے کوشش کی ہے تو ان ممالک میں جہاں صدیوں مسلم حکومتیں رہی ہیں کوئی کافر نمونہ کے طور پر بھی ہاتھ نہ آتا، اور جو بدزبان آج زہر اگل رہے ہیں ان کے آباؤ اجداد کے وجود سے قبل ہی ان کی نسلوں کا نام ونشان مٹا دیا جاتا، مگر ایسی نفرت کی بات کوئی تھی ہی نہیں اسی لئے مسلم حکومتوں کے زیر نگیں غیر مسلم بھی پوری آزادی کے ساتھ پروان چڑھتے رہے، اور انھوں نے کبھی یہ آواز نہیں اٹھائی کہ ''قرآنی آیات بدل دی جائیں کیونکہ اس سے نفرت پھیلتی ہے'' اس لئے کہ وہ علی وجہ البصیرت یہ جانتے تھے کہ قرآن ہرگز نفرت کی تعلیم نہیں دیتا، اور تو اور خود غیر مسلم، ہندو مفکرین گاندھی وغیرہ نے قرآن کا مکمل مطالعہ کر کے اس کے بارے میں شاندار الفاظ میں تبصرے تاریخ کے صفحات پر درج کرائے ہیں، تو کیا یہ غیر مسلم اتنے کم فہم تھے کہ انھیں وہ آیتیں نظر نہ آئیں جنھیں لیکر آج اعتراض اٹھایا جا رہا ہے؟ کیا یہ ان کے مطالعہ کے وقت قرآن میں موجود نہ تھیں؟ یقیناً موجود تھیں اور انشاء اللہ تا قیامت رہیں گی، لیکن فرق دیکھنے والے کی آنکھوں کا ہے اگر انصاف کی عینک لگا کر قرآن دیکھا جائے تو وہ حقیقت آشکارا ہوگی جسے ہم نے گزشتہ صفحات میں بیان کیا اور اگر تعصب، تنگ نظری اور نفرت کے چشمہ کو لگا کر قرآن پڑھا جائے تو ظاہر ہے کہ نفرت کا متلاشی اپنے مریض ذہن سے نفرت ہی کے معنی نکالے گا اور اسے اچھال کر ماحول کو نفرت آمیز بنانے کی کوشش کرے گا، وشو ہندو پریشد کی قرآن کے خلاف مذموم کوشش اسی نفرت پر مبنی مہم کا ایک حصہ ہے، لہذا عام برادران وطن کو چاہیے کہ وہ ان کے مغالطّوں سے متاثر ہوئے بغیر حقیقت کا انصاف سے مطالعہ کریں اور صحیح نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کریں اور نفرت کی گرم بازاری پر روک لگائیں ورنہ اس ملک میں امن وامان ہرگز باقی نہ رہ سکے گا۔

شیش محل میں بیٹھ کر پتھر نہ چلائیں

ہمارا خیال یہ ہے کہ اس وقت قرآن کریم کے خلاف زور وشور سے جو مہم چلائی جا رہی ہے

اس کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے کہ ہندو قوم کو خود اپنے مذہب پر غور کرنے کا موقع نہ دیا جائے اور مسلمانوں سے ٹکراؤ کا ماحول بنا کر انھیں ''جعلی ہندوتو'' کے جذبات میں گم کر دیا جائے، کیونکہ اگر موجودہ زمانہ کی آزادی اور عقلیت پسندی سے متاثر ہو کر ہندو قوم خود اپنے مذہب کی چھان پھٹک اور تحقیق و تفتیش کی طرف متوجہ ہوگئی تو بہت جلد یہ پتہ چل جائے گا کہ یہ ایسا مذہب ہے جس کا کوئی سر پیر ہی نہیں، یہ چند بے سرو پا خیالات کا مجموعہ اور بے ہنگم تہذیب و تمدن کا آئینہ دار ہے، آج ہندو مت کو دنیا کا سب سے امن پسند مذہب کہا جاتا ہے حالانکہ اس سے بڑا جھوٹ اور کوئی نہیں ہو سکتا، جس مذہب میں مہا بھارت کی لڑائی کو مذہبی حیثیت حاصل ہو، جس مذہب میں ''شودر'' کے طبقہ کے انسان کو جانوروں سے بدتر سمجھا جاتا ہو اور جس مذہب میں نیوگ (غیر کے نطفہ سے بچہ حاصل کرنا) جیسی گھناؤنی رسم موجود ہو وہ مذہب اپنے کو امن پسند انسانیت نواز کہے اس سے بڑا دھوکہ اور کیا ہوگا؟۔

اس لئے بہتر یہی ہے کہ ان غلطیوں کو نہ اچھلوایا جائے اور گندگیوں کو کرید کر دنیا کو متعفن اور بدبو دار نہ بنا جائے، وشوہندو پریشد کے لوگ قرآن پر اعتراض کرنے سے پہلے خود آئینہ اٹھا کر اپنی اور اپنے پروجوں کی تصویر دیکھیں اور ان کے خط و خال درست کرنے کی کوشش کریں یہی عافیت کا راستہ ہے، ورنہ اگر قرآن پر کوئی کیچڑ اچھالی جائیگی تو پھر اچھالنے والوں کی پگڑیاں بھی سلامت نہ رہ سکیں گے، اس لئے رسوائی سے بچنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ کسی کے مذہب پر طعن و تشنیع کا سلسلہ بند ہو، وفاداری اور احترام کی فضا قائم ہو اور ہر شہری اپنی مذہبی، انسانی اور اخلاقی ذمہ داری ادا کرنے کا پابند ہو، اسی کے ذریعہ ماحول میں امن و امان برقرار رہ سکتا ہے۔ اللہ تعالی سارے عالم کیلئے عافیت اور امن کے فیصلے فرمائے۔ آمین۔

(ندائے شاہی، جنوری، فروری ۲۰۰۳ء)

مرتب کی علمی کاوشیں

◻ اللہ سے شرم کیجئے :

اس کتاب میں اللہ تعالیٰ سے حیاء کرنے کے متعلق ایک جامع ارشاد نبوی ﷺ کی تفصیلی شرح کے ضمن میں نہایت مفید اصلاحی مضامین (آیات قرآنیہ احادیث طیبہ اور احوال واقوال سلف) خوبصورتی کے ساتھ جمع کردئے گئے ہیں، یہ کتاب مردہ ضمیر کو جھنجوڑنے، اور غفلت کے پردے ہٹانے میں تریاق کی حیثیت رکھتی ہے۔ جو شخص بھی صدق دل سے اور عمل کی نیت سے اس کا مطالعہ کرے گا اسے انشاء اللہ یقیناً نفع ہوگا، کتاب کی زبان سادہ اور عام فہم ہے۔ ہر بات حوالہ جات سے مزین ہے۔ عوام وخواص کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ اب تک ہندو پاک کے مختلف کتب خانوں سے اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، اور مسلسل اس کی اشاعت جاری ہے۔ ہندی زبان میں بھی اس کا ترجمہ ہو چکا ہے، فالحمدللہ۔

صفحات : ۴۳۲، عام قیمت : ۱۰۸ / روپیے، ناشر: فرید بک ڈپو دہلی وغیرہ

◻ اللہ والوں کی مقبولیت کا راز :

یہ کتاب پہلے ۹۶ / صفحات پر شائع ہوئی تھی اب اضافہ ہو کر ۱۹۲ / صفحات میں خوب صورت کمپیوٹر کتابت پر شائع کی گئی ہے، جس میں اکابر واسلاف کی مقبول صفات مثلاً: تواضع، زہد وتقویٰ، عفو ودرگذر، حلم وبردباری، جود وسخا اور خوف وخشیت سے متعلق پُر اثر اور حیرت انگیز حالات وواقعات بیان کرکے ان کی روشنی میں اپنے کردار کا مؤثر انداز میں جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ کتاب علماء، طلباء اور اپنی اصلاح کے خواہش مند حضرات کے لئے اکسیر کی حیثیت رکھتی ہے۔ زبان بہت آسان اور عام فہم ہے، آج ہی طلب کرکے اپنی روحانی تشفی کا سامان کریں۔ یہ کتاب بھی ہندوپاک کے متعدد کتب خانوں سے شائع ہورہی ہے، الحمدللہ۔

صفحات : ۱۹۲، قیمت: ۶۰ / روپئے، ناشر: فرید بک ڈپو دہلی وغیرہ

◻ کتاب المسائل (طہارت ونماز) :

فقہی مسائل پر یہ ایک عام فہم، آسان، مستند اور مدلل کتاب ہے، پہلے یہ مسائل قسط وار ماہنامہ ''ندائے شاہی'' مرادآباد میں شائع ہوکر عوام وخواص کی نظروں سے گذرتے رہے، ۵۵ / قسطوں میں شائع شدہ ''طہارت'' سے لے کر ''جنائز'' تک کے کئی سو اہم مسائل اور ان سے متعلق اہم معلومات کو اب مزید تنقیح وتحقیق کے بعد کتابی شکل میں شائع کردیا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مسائل کا یہ مجموعہ ہر مسلمان گھرانے کی

دینی ضرورت ہے، اور عوام وخواص سب کے لئے یکساں طور پر مفید ہے، اور چوں کہ ہر مسئلہ کے ساتھ اصل فقہی عبارات مذکور ہیں؛ اس لئے یہ کتاب حضراتِ علماء کرام اور مفتیانِ عظام کے لئے اصل ماٰخذ سے مراجعت میں سہولت کا سبب بھی ہے۔ کتاب کی اصل افادیت کا اندازہ اس کے مطالعہ ہی سے ہوسکتا ہے، اس منصوبہ پر آگے بھی کام جاری ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے تکمیل کی توفیق عطا فرمائیں، آمین۔

صفحات: ۶۰۰۸، قیمت: ۳۰۰/روپئے، ملنے کا پتہ: فرید بک ڈپو دریا گنج دہلی

❑ ذکر رفتگاں :

یہ ماہ نامہ ''ندائے شاہی'' مرادآباد میں گذشتہ ۱۶/سالوں (۱۹۸۹ء تا ۲۰۰۴ء) میں وفات پانے والی امت کی اہم اور مؤثر شخصیات پر شائع شدہ تعزیتی مضامین کا بیش قیمت مجموعہ ہے، جس میں تقریباً ڈیڑھ سو حضرات کے مختصر سوانحی خاکے اور تأثرات جمع ہوگئے ہیں، تذکرۂ اکابر کے شائقین کے لئے یہ بیش بہا تحفہ اور سیر وسوانح کے باب میں قیمتی معلومات کا ذخیرہ ہے، جس کا مطالعہ انشاءاللہ ذہن میں تازگی اور روح میں بالیدگی کا سبب ہوگا۔

صفحات : ۵۶۸، عام قیمت : ۱۶۰/روپے، ملنے کا پتہ: فرید بک ڈپو دہلی وغیرہ

❑ دعوت فکر وعمل :

یہ کتاب مختلف دینی، اصلاحی، سماجی اور معاشرتی موضوعات پر مبنی ۹۷/قیمتی مضامین کا مجموعہ ہے، جن میں پوری قوت کے ساتھ فکری اصلاح پر زور دیا گیا ہے۔ ان مضامین کے مطالعہ سے اصابت رائے اور اعتدال کے جذبات پروان چڑھتے ہیں، موجودہ دور میں دینی خدمات میں مشغول حضرات کے لئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت کارآمد ہے، اکابر علماء کی تقریظات سے کتاب مزین ہے اور باذوق قارئین کی نظر میں یہ دور حاضر کا ایک گراں قدر تحفہ ہے، متعدد کتب خانوں سے اس کی اشاعت ہورہی ہے۔

صفحات: ۵۴۰، قیمت: ۱۵۰/روپے، ملنے کا پتہ: فرید بک ڈپو دہلی وغیرہ

❑ لمحاتِ فکریہ :

اس کتاب میں ندائے شاہی مارچ ۲۰۰۳ء سے لے کر مئی ۲۰۰۵ء تک کے ادارتی مضامین اور دو رسالوں ''اسلامی کی انسانیت نوازی'' اور ''اسلامی معاشرت'' کو یکجا کر کے شائع کیا گیا ہے۔ اس مجموعۂ مضامین میں قرآن وسنت اور آثارِ صحابہ سے نہایت قیمتی ہدایات نقل کی گئی ہیں۔ ۳۲۰/صفحات پر یہ کتاب اسلامی تعلیمات کے تعارف، اصلاح امت اور باطل افکار وخیالات کی مدلل تردید پر مبنی مضامین کو شامل ہے، اور عوام وخواص کے لئے یکساں مفید ہے۔

صفحات: ۳۲۰، قیمت: ۱۰۰/روپے ناشر: فرید بک ڈپو دہلی

❑ دینی مسائل اوران کا حل :

دور حاضر کے اہم پیش آمدہ مسائل کے مختصراور جامع جوابات پر مشتمل یہ قیمتی مجموعہ ہر گھر کی ضرورت اور قدم قدم پر رہنمائی کا ذریعہ ہے۔ یہ مسائل کئی سال سے رسالہ تحفۂ خواتین مرادآباد میں سوال وجواب کی صورت میں شائع ہورہے تھے، اب انہیں عربی عبارات اورحوالوں کے ساتھ جمع کر کے شائع کیا گیا ہے، جوعوام کے علاوہ اہل علم اورارباب افتاء کے لئے بھی مفید ہے۔

صفحات:۱۴۴، قیمت: ۴۰/روپے، ناشر:فرید بک ڈپو دہلی

❑ فتاوی شیخ الاسلامؒ :

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہٗ کی علمی اور فقہی آراء اور مکتوبات کا یہ مرتب مجموعہ بالخصوص فقہ وفتاوی کے شائقین کے لئے گراں قدر تحفہ ہے۔ ہر مسئلہ حوالہ جات سے مزین ہے اور نادر علمی نکات، فقہی تحقیقات اور قیمتی افادات کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے یہ کتاب ہندوستان کے علاوہ پاکستان میں بھی شائع ہوچکی ہے۔

صفحات: ۲۵۱، قیمت : ۸۰/روپے، ناشر: مکتبہ دینیہ دیوبند

❑ فتوی نویسی کے رہنما اصول :

یہ فقیہ العصر علامہ ابن عابد بن شامیؒ کی معروف کتاب ''شرح عقود رسم المفتی'' کی روشنی میں اصول افتاء پر ایک انوکھی کتاب ہے، جس میں ۳۴/اصول متعین کر کے ہر اصول کے اجراء اور تمرین کے لئے رہنمائی کی گئی ہے۔ جو طلبۂ افتاء نظر میں گہرائی اور مطالعہ میں گیرائی کے مشتاق ہیں ان کے لئے یہ کتاب قدم قدم پر معاون بن رہی ہے۔ نیز بفضلہ تعالیٰ تجربہ سے یہ طرز اجراء بہت مفید ثابت ہوا ہے۔

پہلے یہ کتاب ۲۴۵/صفحات پر شائع ہوئی تھی، بعد میں اس پر نظر ثانی اور مزید اضافات کئے گئے، خاص طور پر شروع میں ایک قیمتی ابتدائیہ لگایا گیا، جس میں فقہ وحدیث اور تفسیر سے متعلق ماٰخذ کی ۱۱۹/کتابوں کا تعارف کرایا گیا ہے، جو طلبہ اور علماء کے لئے نہایت مفید اور کارآمد ہے، اب یہ کتاب کمپیوٹر کتابت کے ساتھ ۴۲۹/صفحات پر شائع ہوئی ہے

صفحات:۴۲۹، قیمت: ۱۵۰/روپے، ناشر: کتب خانہ نعیمیہ دیوبند

❑ ردمرزائیت کے زریں اصول :

یہ سفیر ختم نبوت حضرت مولانا منظور احمد صاحب چینوٹیؒ (پاکستان) کے ان تربیتی محاضرات کا مجموعہ ہے جوموصوف نے چندسال قبل دارالعلوم دیوبند میں رونق افروز ہوکر علماء وطلباء کے بڑے مجمع کے سامنے دئے تھے۔ انہیں مرتب نے ازسرنو ترتیب دیا، اصل کتابوں سے مراجعت کر کے حوالہ جات نوٹ

کئے، اور پھر صاحب محاضرات کی نظر کے بعد اسے شائع کیا گیا، یہ اپنے موضوع پر ایک جامع کتاب ہے جس کے متعدد ایڈیشن ہندو پاک میں شائع ہو چکے ہیں۔

صفحات: ۲۱۶، قیمت: ۴۰؍روپے۔ شائع کردہ: کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند

❑ قادیانی مغالطے :

یہ مختصر رسالہ ان ہرزہ سرائیوں کے جوابات پر مشتمل ہے جو قادیانی لوگ عام مسلمانوں کو بہکانے اور شکوک وشبہات میں مبتلا کرنے کے لئے عوام میں پھیلاتے رہتے ہیں۔ مرزائیوں کی تلبیسات کا اس رسالہ میں مضبوط جواب دیا گیا ہے۔

صفحات: ۱۲۴، قیمت: ۲۰؍روپے، شائع کردہ: کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند

❑ تحریک آزادئ ہند میں مسلم عوام اور علماء کا کردار :

ہندوستان کی تحریکات آزادی میں شروع سے لیکر اخیر تک مسلم عوام اور علماء نے جو عظیم ترین قربانیاں پیش کی ہیں ان کو نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ سوال و جواب کے انداز میں اس کتاب میں جمع کر دیا گیا ہے۔ انداز نہایت دلچسپ ہے. اور ہر بات حوالہ سے مدلل ہے۔ کتاب کے اخیر میں ان حضرات کا جامع تعارف بھی شامل ہے جن کا نام کتاب کے اندر کسی نہ کسی عنوان سے آیا ہے. اپنے اسلاف کے کارناموں سے واقفیت کے لئے نئی نسل کے حضرات کو اس کتاب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہئے۔

صفحات: ۲۲۸، قیمت: ۸۰؍روپے، ناشر: مرکز نشر و تحقیق لال باغ مرادآباد، ملنے کا پتہ: کتب خانہ نعیمیہ دیوبند

❑ پیکر عزم وہمت، استاذ اور شاگرد :

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی اور شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہما کی سبق آموز حیات طیبہ پر مشتمل کئی قیمتی مضامین اس مختصر رسالہ میں شامل ہیں، جن کا مطالعہ علماء اور طلباء کے لئے بالخصوص مفید ہے۔

صفحات: ۸۰، قیمت: ۴۰؍روپے، ناشر: مرکز نشر و تحقیق لال باغ مرادآباد، ملنے کا پتہ: کتب خانہ نعیمیہ دیوبند

❑ نورِ نبوت :

یہ رسالہ ۹۹ قیمتی احادیث طیبہ اور ان کی مختصر تشریحات پر مشتمل ہے۔ جو حضرات احادیث شریفہ کو یاد رکھنا چاہیں ان کے لئے یہ بہت مفید اور نفع بخش مجموعہ ہے۔

صفحات: ۷۲ قیمت: ۳۰؍روپے ناشر: مرکز نشر و تحقیق لالباغ مرادآباد

❍❖❍